سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے

پچاس صحابہ رضؓ

طالب الہاشمی

ترتیب

اسمائے صحابہ کرامؓ

بلحاظ ترتیب کتاب

اسمائے صحابہ کرامؓ

بلحاظ حروف تہجی

﴿الف﴾

﴿ث﴾

﴿ج﴾

﴿ح﴾

صحابہؓ سے محبت مجھ سے محبت کا تقاضا ہے

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''لوگو! میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو! میرے بعد ان کو ہدفِ تنقید نہ بنالینا۔ (یاد رکھو!) جس نے اُن سے محبت رکھی تو اُن کی یہ محبت مجھ سے محبت کی وجہ سے ہے اور جس نے اُن سے بغض رکھا تو یہ گویا اس کو مجھ سے بغض ہے، جس کا اظہار اُن سے بغض کے پردے میں کیا جارہا ہے۔ اور (یاد رکھو) جس نے اُن کو اذیت پہنچائی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی، بلاشبہ اس نے اللہ کو تکلیف دی، اور جو اللہ کو تکلیف دے گا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا مؤاخذہ فرمائے۔''

(جامع ترمذی)

اصحابِ رسول اللہؓ

''رسول اللہ ﷺ کے تمام اصحاب کی تعظیم کرنا اور سب کو اچھائی سے یاد کرنا چاہیے اور ان میں سے کسی کے بارے میں بھی بدگمان نہیں ہونا چاہیے ـــــ ان کی منازعت کو دوسروں کی مصالحت سے بہتر قرار دینا چاہیے۔ طریقِ فلاح ونجات یہی ہے اس لیے کہ ـــــ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دوستی رکھنا ـــــ دوستی کی ہی وجہ سے ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بغض رکھنا بغضِ رسول اللہ ﷺ تک کھینچ کر لے جائے گا۔

ـــــ ایک بزرگ فرماتے ہیں، جس نے اصحاب رسول اللہؓ کی تعظیم وتوقیر نہیں کی، وہ جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لایا۔''

(حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ)

مکتوبات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

جناب طالب ہاشمی سے میرا اولین تعارف استاذی المکرّم مولانا نعیم صدیقی صاحب کے توسط سے ہوا۔ یہ غالباً ۱۹۶۸ کی بات ہے میں مولانا صدیقی کی نگرانی میں ''سیّارہ ڈائجسٹ'' کا قرآن نمبر مرتب کر رہا تھا کہ ایک روز مولانا نے فرمایا کہ ہاشمی صاحب سے بھی مل لیں، اُن کے پاس بڑی نادر چیزیں ہیں۔ نادر چیزوں سے اُن کی مراد قرآن مجید کے محاسن پر لکھے ہوئے معروف مصنفین کے مضامین تھے۔ میں انہی نادر چیزوں کی تلاش میں ہاشمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ نادر چیزیں تو یقیناً اُن کے پاس بہت سی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ خود ایک نادرالوجود شخصیت ہیں۔ اُن دنوں بھی وہ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی مبارک زندگیوں پر بڑی محنت، جان فشانی اور انہماک سے کام کر رہے تھے، جس نے خاص طور پر مجھے بے حد متاثر کیا۔

۱۹۷۱ میں ''ماہنامہ ضیائے حرم'' میرے سپرد ہوا، تو میں نے ہاشمی صاحب سے درخواست کی کہ وہ صحابۂ کرامؓ کی حیات طیّبات پر لکھے ہوئے اپنے مضامین ''ضیائے حرم'' کے لیے عنایت فرمائیں، محبت اور عنایت کا یہ سلسلہ اس وقت سے قائم ہے اور یہ اُن کی عالی ظرفی اور وضعداری ہے کہ گزشتہ پندرہ سالوں میں یہ سلسلہ اُن کی طرف سے ایک بار بھی منقطع نہیں ہوا۔ فجزاه الله احسن الجزاء۔

صحابۂ کرامؓ پر لکھے ہوئے اُن کے مضامین کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ادارے کی کسی مجبوری کے باعث اگر کسی مہینے ان کا مضمون شائع نہیں ہوتا تو قارئین کے

شکایت ناموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا اُن کے مضامین کے بغیر قارئین رسالے میں ایک تشنگی سی محسوس کرتے ہیں۔

تاریخ اسلام پر جناب ہاشمی کی نظر بڑی گہری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مؤرّخانہ بصیرت وصلاحیت سے نوازا ہے۔ ان شاء اللہ تاریخ وسیرت پر لکھی ہوئی ان کی بلند پایہ کتابیں ہمیشہ زندہ و یادگار رہیں گی۔ انھوں نے تاریخ اسلام کی بعض نامور شخصیتوں مثلاً نورالدین زنگی، ملک شاہ سلجوقی، الملک الظاہر بیبرس، یعقوب المنصور اور بعض صوفیائے اسلام مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ اجمیریؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ پر بھی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں، لیکن اب کئی سالوں سے وہ صرف صحابۂ کرامؓ کے حالات وواقعات پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر رہے ہیں۔

۱۹۷۸ میں اُن کی کتاب ''تیس پروانے شمع رسالتؐ کے'' شائع ہوئی تو ملک بھر کے اہل علم کی نگاہیں اُن پر مرکوز ہوگئیں اور انھوں نے ہاشمی صاحب سے بڑی توقعات وابستہ کر لیں کیونکہ اُن کا کام نہایت دلچسپ، تحقیقی اور عام فہم تھا، جس کی اس وقت بڑی ضرورت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہاشمی صاحب نے اپنے قدر دانوں کو مایوس نہیں کیا اور اس سلسلے میں مسلسل کام کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ گزشتہ سات آٹھ سالوں میں صحابۂ کرامؓ وصحابیاتؓ پر ان کی لکھی ہوئی کئی کتابیں (تیس پروانے شمع رسالت کے، تذکار صحابیاتؓ، خیر البشر کے چالیس جاں نثارؓ، رحمتِ دارینؐ کے سوشیدائیؓ، سیرت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، سیرت حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، سیرت حضرت ابوایوب انصاریؓ اور تیرے پُراسرار بندے وغیرہ) شائع ہو چکی ہیں، اور اب یہ تازہ ترین تالیف ''سرورِ کائناتؐ کے پچاس صحابہؓ'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے حالات یوں تو دوسری کتابوں میں بھی مل جاتے ہیں، مگر جناب طالب ہاشمی جس تحقیق وتفحّص اور تفصیل کے ساتھ صحابہؓ کی سیرت قلم بند کرتے ہیں، وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان اعظم الرجال پر لکھتے ہوئے وہ صرف اردو کتابوں سے نہیں بلکہ اصل عربی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، جو انتہائی عرق ریزی اور جاں سوزی کا کام ہے۔ پھر اُن کا اندازِ تحریر ایسا ہے کہ مطالعے کے وقت قاری کی نظروں کے سامنے صاحب تذکرہ مجسم آن کھڑا ہوتا ہے، جس سے قاری کے دل و دماغ پر صاحبِ تذکرہ کی عالی نسبی، خدا ترسی، نیکی وشرافت، زہد وتقویٰ، شجاعت اور

سرفروشی کے نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں۔ یہ اعجاز ہے اُن کے اندازِ تحریر اور حسن بیان کا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ پایے کا سیرت نگار اور مؤرّخ بنانے کے ساتھ ساتھ صاحبِ طرز ادیب و انشا پرداز بھی بنایا ہے۔ یہ دو خوبیاں بیک وقت بہت کم لوگوں میں جمع ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کے بعد غالباً انہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اِن کے اسلوب نگارش اور شگفتگیِ زبان کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا ماہر القادری مرحوم نے بالکل درست لکھا تھا:

> ''اُن کی زبان شگفتہ، قلم منجھا ہوا اور اسلوب نگارش بے حد دلچسپ، سادہ اور عام فہم ہے۔ اُن کے قلم اور دل و دماغ میں کوئی ژولیدگی نہیں۔ انھوں نے سلجھی ہوئی طبیعت پائی ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں بھی سلجھاؤ پایا جاتا ہے۔ جہاں ''اطناب'' ہے، وہاں قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا اور جہاں ایجاز ہے وہاں طبیعت گھٹن اور انقباض کی بجائے انشراح وانبساط محسوس کرتی ہے۔

طالب ہاشمی صاحب پر ہمہ وقت کام کی دھن سوار رہتی ہے۔ اُن سے جب بھی ملاقات ہو وہ کسی نہ کسی صحابیِ رسولؐ کے حالات میں مصروف تحقیق نظر آتے ہیں اور اس حقیقت سے تو میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ وہ ہر صحابیؓ کے حالات لکھتے وقت بے پناہ محنت اور مطالعہ کرتے ہیں اور بسا اوقات ایک شخصیت پر لکھنے کے لیے اس قدر تحقیق و جستجو سے کام لیتے ہیں کہ اس پر ہفتوں بلکہ مہینوں صرف کر دیتے ہیں۔ وہ ہر صحابیِ رسولؐ پر اپنی تحقیق اس وقت تک جاری رکھتے ہیں جب تک اپنے تئیں اس پر مطمئن نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسے صحابہٴ کرامؓ، جن کا تذکرہ دوسری کتابوں میں صرف چند سطور سے زیادہ نہیں ملتا، ہاشمی صاحب کے ہاں اُن کے بارے میں صفحوں کے صفحے مل جاتے ہیں۔

ہاشمی صاحب سے پہلے اردو زبان میں صحابہٴ کرامؓ پر جس قدر بھی کام ہوا ہے، وہ مختلف اداروں اور تنظیموں کے توسط سے ہمارے سامنے آیا ہے، جنھیں حکومت اور مخیّر حضرات کی سرپرستی بھی حاصل رہی، لیکن جناب ہاشمی کا تن تنہا بغیر کسی سرکاری یا نجی معاونت کے یہ عظیم علمی و تحقیقی کام بیشتر اداروں اور اکادمیوں کے کاموں پر بھاری ہے۔

صحابہٴ کرامؓ کی سیرت پر دارالمصنفین (بھارت) نے بڑا کام کیا ہے، جس کے لیے وہ بجاطور پر ملت اسلامیہ کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں، لیکن میں نہایت ادب سے عرض کروں گا

کہ اس ادارے کا کام من حیث المجموع بلند پایہ اور قابل قدر ہونے کے باوجود اغلاط سے پاک نہیں۔ بعض چھوٹی موٹی اور کتابت کی غلطیوں کے علاوہ واقعاتی غلطیاں بھی ان کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن جناب ہاشمی تمام حالات و واقعات پوری طرح چھان پھٹک اور تحقیق کے بعد لکھتے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں بھی اُن کی کتابوں میں بہت کم ہیں کیونکہ وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کتاب کی پروف ریڈنگ کسی عام اردو خواں کے بجائے کسی اہل علم و فضل سے کرائیں۔

صحابۂ کرامؓ کے ناموں کے سلسلے میں اردو خواں حضرات کو عموماً بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ بظاہر پڑھے لکھے حضرات بھی صحابۂ کرامؓ کے اسمائے گرامی درست اور صحیح اعراب کے ساتھ ادا نہیں کرتے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اکثر اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے لیکن جناب ہاشمی نے اپنی کتابوں میں صحابۂ کرامؓ کے اسمائے گرامی پر اعراب لگا کر اردو خواں حضرات اور بالخصوص نئی نسل پر بڑا احسان کیا ہے۔ ان شاء اللہ اس کے مطالعے کے بعد وہ گفتگو کے دوران صحابۂ کرامؓ کے اسمائے گرامی صحیح اور درست بولیں گے۔

طالب ہاشمی صاحب کی یہ تازہ ترین تالیف ''سرور کائناتؐ کے پچاس صحابہؓ'' بھی ان کی تحقیق انیق کا بہترین نمونہ ہے۔ جس سے عوام ہمیشہ مستفیض ہوتے رہیں گے اور اہل قلم بطورِ کتابِ حوالہ اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں طویل اور صحت مند عمر عطا فرمائے تاکہ اصحابِ رسولؐ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) پر اپنی مستند، وقیع اور ضخیم کتابیں اسی طرح قوم کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ آمین۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

خواجہ عابد نظامی

لاہور

مورخہ ۴/ مارچ ۱۹۸۵ء

مدیر ماہنامہ ''ضیائے حرم''

حرفے چند

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

میرے جسم کا رُواں رُواں اپنے خالق و مالک کا شکریہ ادا کر رہا ہے کہ اس ذاتِ بے ہمتا نے مجھ جیسے بندۂ حقیر کو اپنے اُن برگزیدہ بندوں کے نقوشِ سیرت اجاگر کرنے کی توفیق بخشی، جو آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بعد جن سے بہتر کسی انسان پر آفتاب طلوع نہیں ہوا۔ زیرِ نظر کتاب پچاس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے تذکار جمیل پر مشتمل ہے اور یہ تذکارِ صحابہؓ وصحابیاتؓ کے سلسلے کی آٹھویں کڑی ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر جو کتابیں پیش کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیب فرمائی ان کے نام یہ ہیں:

(۱) تذکارِ صحابیاتؓ

(۲) تیس پروانے شمعِ رسالتؐ کے

(۳) خیر البشرؐ کے چالیس جاں نثارؓ

(۴) رحمتِ دارین کے سو شیدائی

(۵) سیرت حضرت سعدؓ بن ابی وقاص

(۶) سیرت حضرت ابوایوب انصاری

(۷) سیرت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

ان کے علاوہ میری تالیف ''یہ تیرے پُراسرار بندے میں بھی 53 صحابۂ کرامؓ کے تذکار شامل ہیں۔

میں اس کتاب کے دیباچے میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا وہ ایک الگ مضمون ''قرآن کریم اور عظمت صحابہؓ'' میں لکھ دیا ہے، جو اس کتاب میں شامل ہے۔ یہاں صرف اتنی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ بعض صحابۂ کرامؓ کے حالات لکھتے وقت ''مشاجرات صحابہؓ'' کا تذکرہ ناگزیر تھا۔ اس بارے میں میرا مسلک ''کفِّ لسان'' کا ہے۔ اس لیے جہاں بھی مشاجرات کا ذکر آیا ہے میں نے بڑی احتیاط اور اختصار سے کام لیا ہے، پھر بھی میری تحریر کے کسی پہلو سے قارئین کرام کو اختلاف ہو تو وہ اسے نظر انداز کر دیں اور جو بات ان کی تحقیق اور صوابدید کے مطابق صحیح ہو اسے اختیار کریں۔ البتہ یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے عقیدے اور مسلک کے مطابق صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں حسن ظن سے کام لینا چاہیے۔ سب کا بلا تخصیص احترام کرنا چاہیے اور کسی صورت میں بھی ان پر زبانِ طعن دراز نہیں کرنی چاہیے۔ اگر لاشعوری طور پر میرے قلم سے کوئی بات نکل گئی ہو تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوں اور قارئین کرام سے بھی درخواست ہے کہ وہ میری لغزشِ قلم کو معاف فرما دیں اور میرے تسامحات سے مجھے آگاہ فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

میں اپنے محترم دوست خواجہ عابد نظامی صاحب مدیر ضیائے حرم لاہور کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں، جنھوں نے اس کتاب کا تعارف لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ خواجہ صاحب نے اس تعارف میں مؤلف کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے یہ ان کی ذرّہ نوازی ہے، ورنہ ناچیز مؤلف کسی درجے میں بھی ان کا مستحق نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس حسنِ ظن کے لیے اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

راجی غفران وشفاعت
طالب الہاشمی

۲۵ رفروری ۱۹۸۵

قرآن حکیم اور عظمت صحابہؓ

جس طرح سرور کائنات رحمتِ عالم فخر موجودات خیر الخلائق ختمی مرتبت جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام کمالات وصفات کی جامع اور انسانیت کی معراج ہے، اسی طرح حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سیرت وکردار کے اعتبار سے اتنے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر آج تک ان سے بہتر کسی انسان پر آفتاب طلوع نہیں ہوا۔ یہ وہ نفوس قدسی تھے، جنھوں نے خیر البشر ﷺ کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں۔ صاحبِ خُلقِ عظیم پر صدقِ دل سے ایمان لائے، آپؐ سے براہِ راست صحبت و استفاضہ کا شرف حاصل کیا اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ یہ آسمانِ ہدایت کے وہ روشن ستارے تھے، جن کے صدق واخلاص، دیانت وامانت، خیر وایثار اور زہد واتقا کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ ان کے نفس گرم سے آج تک فوز وسعادت کے چراغ روشن ہیں۔ تہذیب و تمدّن کی زلفوں کو انھوں نے سنوارا۔ سیاست ومعیشت کے چہرے کو انھوں نے نکھارا، جہالت کے اندھیروں اور کفر وشرک کی ظلمتوں میں انھوں نے ہدایت کی شمعیں روشن کیں۔ اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے جان مال اولاد، جس شے کی ضرورت پڑی حاضر کردی۔

رسول اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ کوئی شخص تم میں مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے میرے ساتھ ماں باپ اولاد اور باقی سب لوگوں سے بڑھ کر محبت نہ ہو۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد کی تصدیق آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے اپنے عمل سے، جس طرح کی، تاریخِ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ شمع رسالتؐ کے ان پروانوں نے راہِ حق میں، جو مصائب وآلام برداشت کیے، ان کا حال پڑھ کر جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ ان پروانوں کی

دلسوزی اور جانگدازی کی عجیب شان تھی۔ دینِ حنیف کی ترویج و اشاعت اور پرچم حق کی سربلندی کے لیے انہوں نے زندگی کے ہر میدان میں وہ قربانیاں دیں کہ ان کا اجتماعی و انفرادی کردار قیامت تک تمام فرزندانِ توحید کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ ان قدسی صفات انسانوں نے رضائے الٰہی کی خاطر ماں باپ کو چھوڑا، اہل وعیال سے جدائی اختیار کی، قبیلے اور وطنِ عزیز کو خیر باد کہا، گھر بار لٹایا، فاقے سہے، ہر قسم کی جسمانی اذیتیں برداشت کیں یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر راہِ حق میں اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔ سرورِ عالم ﷺ کے سامنے ہی نہیں، آپؐ کے وصال کے بعد بھی صحابۂ کرامؓ نے اللہ کے دین کی، جس دردمندی اور خلوص کے ساتھ خدمت، حفاظت اور اشاعت کی اس کا اعتراف ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ یہ نفوسِ قدسیہ امتِ اسلامیہ کے محسنین ہیں اور یہ امت ان کے احسانات کے بارِ گراں سے تاابد سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ کسی نبی اور رسول کو حضور خاتم النبیین ﷺ کے صحابہؓ کی طرح جاں نثار حواری اور ساتھی نہیں ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر صحابی اپنی ذات میں آیت الٰہی تھا۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ انہی عظیم رجالِ کار کے واسطے سے ہم تک پہنچی ہے۔ ان کے نقوشِ سیرت، دینی جذبہ اور قوتِ ایمانی کے ایسے قوی سرچشمے ہیں، جن کی بدولت یہ امت فوز و فلاح کے راستے پر گامزن ہو سکتی ہے۔ آسمانِ صداقت کے یہ وہ روشن ستارے ہیں، جنھیں دیکھ کر امت کے سفینے کے لیے منزلِ مقصود کا رُخ متعین کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان پاکباز اور برگزیدہ بندوں کا جذبۂ ایثار و فدویت بارگاہِ خداوندی میں اتنا پسند آیا کہ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ ان کے اوصاف بیان کیے گئے، ان کی تعریف و تحسین کی گئی اور کھلے لفظوں میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی۔ جب ربّ ذوالجلال والاکرام خود اصحابِ رسولؐ کی شان بیان کرتا ہو تو پھر ان نفوسِ قدسی کی عظمت کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن حکیم صحابۂ کرامؓ کے اوصاف، ان کا مقام و مرتبہ اور ان کی عظمت کس طرح بیان کرتا ہے۔ سورۂ فتح میں ارشاد ہوتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ
وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ
مَثَلُهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ ۛۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ

شَطْاَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ
لِیَغِیْظَ بِہِمُ الْکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنْہُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (الفتح:۲۹)

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں، جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے شان ان کی توراۃ میں اور انجیل میں، ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے، جس نے پہلے کونپل نکالی پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔''

ان آیات میں صحابۂ کرامؓ کے تین اوصاف خصوصیت سے بیان کیے گئے ہیں، کفار پر سخت، آپس میں رحیم، اتنے عبادت گزار کہ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر نمایاں۔ کفار پر سخت ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کافروں کے ساتھ تلخی اور درشتی سے پیش آتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ کوئی دھمکی، سختی، دباؤ یا ترغیب و تحریص انہیں راہِ حق سے برگشتہ نہیں کرسکتی۔ وہ تو اپنے آقا و مولاؐ کی حمایت میں کافروں کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے لوگ ہیں۔

آپس میں رحیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (اور مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی تصویر بن گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم گسار ہیں۔ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، خوش کلام اور خندہ رو ہیں، ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون اپنے اوپر حرام سمجھتے ہیں، قطع رحمی، ظلم، انتقام، بدعہدی، بدگمانی، تہمت طرازی، تمسخر اور فتنہ و فساد سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے آپس میں رحیم ہونے یا جذبۂ اخوّت کی انتہا یہ تھی کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تو حضرت سعدؓ بن ربیع انصاری کے

ہاں قیام کیا۔ حضرت سعدؓ کی دو بیویاں تھیں، انہوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا کہ میرا تمام مال و اسباب آپ نصف بانٹ لیں یہاں تک کہ میں اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں۔ عدّت کے بعد آپ اس سے نکاح کر لیجیے گا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کے دل میں بھی وہی جذبۂ اخوّت موجزن تھا، جو حضرت سعدؓ کے دل میں تھا، انہیں اپنے بھائی کو اس آزمائش میں ڈالنا گوارا نہ ہوا، ان کے جذبۂ اخوت کو سراہا اور کہا، اللہ تعالیٰ تمہارے مال اور اولاد میں برکت دے اور تم پر اپنی رحمت نازل کرے، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے صرف اتنا بتا دو کہ بازار کا راستہ کدھر ہے، میں تجارت کر کے اپنی روزی کماؤں گا۔

سجدوں کے اثرات سے مراد پیشانی کا وہ گٹّہ نہیں ہے، جو سجدے کرنے کی وجہ سے اکثر نمازیوں کے ماتھے پر پڑ جاتا ہے بلکہ اس سے مراد خشیتِ الٰہی، تواضع، صداقت و شرافت اور حسن اخلاق کے وہ آثار ہیں، جو اللہ کے آگے جھکنے کی وجہ سے آدمی کے چہرے پر نمایا ہو جاتے ہیں۔ ایک مغرور، بدکردار، اور بے حیا آدمی کا چہرہ ایک شریف پاکباز اور منکسر المزاج آدمی کے چہرے سے یقیناً مختلف ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے صحابہ کرامؓ کی یہ شان بیان کی ہے کہ ان کے چہرے خدا پرستی کے نور سے تاباں ہوتے ہیں۔ یہ وہ شان ہے، جس کے متعلق امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب صحابۂ کرام کے لشکر سرزمینِ شام میں داخل ہوئے تو وہاں کے عیسائی کہتے تھے کہ مسیح علیہ السلام کے حواریوں کی جو شان ہم نے کتابوں میں پڑھی ہے یا اپنے علماء سے سنی ہے عرب سے آنے والے ان لوگوں میں وہی شان نظر آتی ہے۔

سورۃ الانفال میں صحابۂ کرامؓ کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (آیات ۲-۴)

”ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب

ان کے سامنے اللہ کا کلام پڑھا جائے تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں وہی سچے ایمان والے ہیں ان کے لیے اپنے ربّ کے پاس درجے ہیں نیز مغفرت اور عزّت کی روزی بھی۔''

سورہ توبہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ o (التوبہ:۷۱)

''اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ نیک بات سکھلاتے ہیں اور بُری بات سے منع کرتے ہیں اور قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں، جن پر اللہ رحم کرے گا، بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

گویا صحابۂ کرامؓ کی شان یہ ہے کہ ان کے دل خوفِ خدا سے لبریز ہوتے ہیں، ان کے سامنے قرآنِ حکیم کی آیات پڑھی جائیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے (برعکس کفّار کے کہ جب ان کے سامنے کلامِ الٰہی پڑھا جاتا تھا تو وہ اس کا تمسخر اڑاتے تھے)۔ وہ اپنے خالقِ حقیقی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور اپنی حلال کمائی سے اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے حکم پر چلتے ہیں۔'' سورۃ التوبہ'' میں ایک اور جگہ مہاجرین و انصار صحابہؓ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی اور رضامندی کی بشارت ان الفاظ میں دی ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ لا رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ (التوبہ:۲۰-۲۲)

''وہ مہاجر وانصار، جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کرر کھے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اسی سے ملتا جلتا مضمون سورۃ الانفال میں بھی ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ○ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَکُمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنْکُمْ ؕ (الانفال:۷۴،۷۵)

''جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔''

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے ان مہاجرین وانصار کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی اور یوں ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کے عظیم الشان لقب کے مستحق ٹھہرے۔ ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' یعنی قدیم الاسلام صحابۂ کرامؓ کو یہ مقام ومرتبہ عطا ہوا کہ نہ صرف خود ان سے جنت کا وعدہ کیا گیا بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر سعادت اندوزِ اسلام ہونے والے صحابہؓ کو بھی جنت کی بشارت دی گئی۔ مہاجر سابقین اوّلین میں وہ صحابۂ کرامؓ شامل ہیں، جو بعثتِ نبوی کے ابتدائی سالوں میں سخت نامساعد حالات میں مشرف بہ ایمان ہوئے اور راہِ حق میں زہرہ گداز مصائب وآلام برداشت کیے، یہاں تک کہ اپنا گھر بار تک چھوڑ دیا۔ ان کی یہی قربانیاں تھیں، جنہوں نے بارگاہِ ربُّ العزّت میں درجۂ قبولیت پایا اور وہ اللہ تعالیٰ

کے نزدیک سچے مومن اور جنتی قرار پائے۔ راہِ حق میں ان کی عدیم المثال قربانیوں کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

سرورِ عالم ﷺ بعثت کے ابتدائی تین سالوں میں نہایت رازداری کے ساتھ فریضۂ تبلیغ ادافرماتے رہے۔ چوتھے سالِ بعثت کے آغاز میں فَاصْدَعْ بِمَا تُؤمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنِ (احکامِ خداوندی برملا سنایئے اور مشرکین کی پروانہ کیجیے) کا حکم نازل ہوا اور اس کے مطابق سرورِ عالم ﷺ نے علانیہ تبلیغِ حق کا آغاز فرمایا تو مشرکینِ مکّہ کے قہر وغضب کا آتش فشاں پوری قوت سے پھٹ پڑا۔ دعوتِ توحید قبول کرنے والے اصحاب پر انھوں نے ایسے ایسے لرزہ خیز مظالم ڈھائے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔

حضرت بلال حبشیؓ مکہ کے ایک مشرک رئیس امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اسلام کی منادی سنتے ہی صدقِ دل سے ایمان لے آئے۔ اُمیہ کو ان کے مسلمان ہونے کی خبر ملی تو فرطِ غضب میں آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے قبولِ حق کے جرم میں حضرت بلالؓ کے لیے طرح طرح کے عذاب ایجاد کیے۔ ان کی گردن میں رسی باندھ کر شریر لڑکوں کے ہاتھ میں تھما دیتا اور وہ ان کو مکہ کی پہاڑیوں میں گھسیٹتے پھرتے، پھر جلتی ہوئی ریت پر لا کر اوندھے منہ لٹا دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ شاعرِ دربارِ رسالت حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری سے روایت ہے کہ میں زمانۂ جاہلیت میں حج (یا عمرے) کے لیے مدینہ سے مکہ گیا تو دیکھا کہ لڑکوں نے بلالؓ کو ایک رسی سے باندھ رکھا ہے اور اِدھر اُدھر گھسیٹ رہے ہیں لیکن وہ کہے جا رہے ہیں کہ میں لات وعزّٰی، ہبل، اساف، نائلہ اور بوانہ (بتوں اور دیوی دیوتاؤں کے نام) سب کا انکار کرتا ہوں۔

کبھی کبھی اُمیہ خود حضرت بلالؓ کو گھر سے نکال کر لے جاتا اور حرّہ کی جلتی ہوئی بالو پر لٹا کر ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا تاکہ جنبش نہ کرسکیں، پھر کہتا کہ محمدؐ کی پیروی سے باز آجا اور لات وعزّیٰ کے معبودِ برحق ہونے کا اقرار کرلے ورنہ اسی طرح پڑا رہے گا اس کے جواب میں شیدائے حق حضرت بلالؓ کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کی آواز نکلتی تھی۔ مشہور صحابی حضرت عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ میں نے بلالؓ کو اس حالت میں دیکھا کہ امیہ نے ان کو ایسی سخت تپتی ہوئی زمین پر لٹا رکھا تھا کہ جس پر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ گل جاتا مگر وہ اس حالت میں بھی کہہ رہے تھے کہ میں لات وعزّٰی کا انکار کرتا ہوں۔

کسی کسی دن بنوجمح کے لونڈے حضرت بلالؓ کو بُری طرح مارتے پیٹتے، دن کے وقت ان کے کپڑے اتروا کر لوہے کی زرہ پہناتے اور دھوپ میں ڈال دیتے۔ شام کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کوٹھری میں پھینک دیتے اور رات کو انہیں تازیانے رسید کرتے رہتے لیکن کیا مجال کہ ان کے قدم جادۂ حق سے ڈگمگا جائیں، زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کے سوا کچھ نہ نکلتا۔

ابوفکیہہ یسار ازدیؓ بھی امیہ بن خلف کے غلام تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا تو اُمیہ نے انہیں بھی اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بنالیا۔ تپتی ہوئی ریت پر انہیں منہ کے بل لٹا دیتا اور پیٹھ پر ایک وزنی پتھر رکھ دیتا وہ ہولناک گرمی اور بوجھ کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے۔ ایک دن شقی القلب امیہ نے حضرت ابوفکیہہؓ کے دونوں پاؤں میں رسی باندھی اور انہیں بری طرح گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا وہاں انہیں تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیا اور پھر اس زور سے ان کا گلا دبایا کہ ان کی زبان باہر نکل پڑی اور وہ بالکل بے حس وحرکت ہو گئے۔ اُمیہ نے سمجھا کہ ختم ہو گئے لیکن ابھی ان میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ حسن اتفاق سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے حضرت ابوفکیہہؓ کی دردناک بلاکشی کا منظر دیکھا تو دل بھر آیا اور اسی وقت حضرت ابوفکیہہؓ کو امیہ سے خرید کر آزاد کر دیا، لیکن اس زمانے میں کفّار کے جور وتعدّی سے نہ کوئی آزاد مسلمان محفوظ تھا نہ کوئی غلام۔ حضرت ابوفکیہہؓ آزاد ہونے کے باوجود کفار کے مظالم کا نشانہ بنے رہے یہاں تک کہ ۶ بعد بعثت میں ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ راہِ حق میں مصیبتیں جھیلتے جھیلتے صحت بگڑ گئی تھی غزوۂ بدر سے کچھ عرصہ پہلے پیک اجل کو لبیک کہا۔

رئیس قریش سہیل بن عمرو کے سعید الفطرت فرزندوں حضرت ابوجندلؓ اور حضرت عبداللہؓ نے اوائلِ بعثت میں اسلام قبول کیا تو باپ اس قدر غضبناک ہوا کہ اس نے دونوں بیٹوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر قید خانے میں ڈال دیا جہاں وہ سالہا سال تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔

حضرت یاسرؓ بن عامر، ان کی اہلیہ حضرت سمیہؓ بنتِ خباط اور دو فرزندوں عبداللہؓ اور عمارؓ نے قبول حق کی سعادت حاصل کی تو ابوجہل نے انہیں ایسی ایسی اذیتیں پہنچائیں کہ ان کا حال پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ انہیں پانی میں غوطے دیتا، گرم ریت اور دہکتے انگاروں پر لٹاتا، مکے کی چلچلاتی دھوپ میں پہروں کھڑا رکھتا۔ کوڑوں سے پیٹتا۔ غرض اس نے

شقاوت کی انتہا کردی۔ ایک دن سرورِ عالم ﷺ نے انہیں سخت مار کھاتے اور سزائیں سہتے دیکھا تو فرمایا۔ ''اے یاسر کے خاندان والو، صبر سے کام لو بلاشبہ تمہارا مقام جنت ہے۔''

ظالم ابو جہل نے ایک دن حضرت سمیہؓ کے پوشیدہ نازک مقام پر اس زور سے نیزہ مارا کہ وہ جاں بحق ہوگئیں۔ پھر ایک دن اس بد بخت نے حضرت عبداللہؓ کو تیر مار کر شہید کر ڈالا۔ حضرت یاسرؓ بھی ضعیف العمری کے عالم میں مصیبتیں جھیلتے جھیلتے وفات پا گئے۔ حضرت عمارؓ کی زندگی باقی تھی بچ گئے ورنہ ابو جہل نے انہیں بھی مارنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

حضرت زبیرؓ بن العوام حلقہ بگوش ایمان ہوئے تو ان کا سرپرست چچا نوفل بن خویلد غم و غصے سے دیوانہ ہوگیا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں بیان کیا ہے کہ نوفل حضرت زبیرؓ کو چٹائی میں لپیٹ دیتا پھر آگ سلگا کر اس کی دھونی دیتا اور حضرت زبیرؓ سے کہتا، اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آ۔ لیکن زبیرؓ ہر بار یہی کہتے ''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں اب میں کبھی کفر اختیار نہ کروں گا۔''

حضرت مصعبؓ بن عمیر بنو عبدالدار کے ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مکے میں ان جیسا شکیل سجیلا اور خوش پوش نوجوان کوئی نہیں تھا۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنتے اور عمدہ سے عمدہ خوشبویات استعمال کرتے تھے، جس گلی سے گزر جاتے وہ گلی مہک جاتی تھی۔ ان کے ایک جوڑے کی قیمت دو دو سو درہم تک ہوتی تھی۔ پاؤں میں زری حضرمی جوتا ہوتا تھا، والدین کے یہ لاڈلے نوجوان اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنی تزئین و آرائش اور خوب صورت زلفوں کو سنوارنے پر صرف کرتے تھے تاہم اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ اوائلِ بعثت میں جونہی صدائے توحید کانوں میں پڑی بلا تامل اس پر لبیک کہا۔ گھر والوں کو خبر ملی تو اسلام لانے کے جرم میں ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قید تنہائی میں ڈال دیا لیکن انہوں نے کسی صورت میں راہِ حق سے منہ موڑنا گوارا نہ کیا۔ آخر انہیں گھر سے نکال دیا گیا اور وہ ۵ بعدِ بعثت میں حضورؐ کے ایماء پر ہجرت کر کے حبش چلے گئے وہاں سے واپس آئے تو ابتلا اور مصیبتوں نے سارا رنگ روپ ختم کر دیا تھا حریر و قاقم کے بجائے ایک کمبل آدھا باندھے اور آدھا اوڑھے ہوئے نظر آتے تھے، جسے اگلی طرف سے ببول کے کانٹوں سے اٹکاتے تھے۔ ۱۲ بعدِ بعثت میں حضورؐ نے انہیں اسلام کا معلم اوّل بنا کر مدینہ منورہ بھیجا جہاں وہ بڑی تندہی سے اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ ۳ ہجری میں غزوۂ اُحد میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی تو حضورؐ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپؐ ان کی

لاش کے قریب کھڑے ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(سورۂ احزاب: ۲۳)

''مومنین میں سے کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا اسے سچ کر دکھایا۔ بعض ان میں سے اپنی نذر (مدت) پوری کر چکے ہیں اور بعض ابھی انتظار کر رہے ہیں اور اپنے ارادے میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا۔

اس کے بعد آپؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا:

''میں نے مکہ میں تمہارے جیسا حسین اور خوش لباس اور کوئی نہ دیکھا تھا لیکن آج میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے بال گرد آلود اور الجھے ہوئے ہیں اور تمہارے جسم پر ایک چادر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم لوگ قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو گے۔''

حضرت خبابؓ بن الارت نے اسلام قبول کیا تو کفّار نے ان پر ہولناک مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ وہ ان کے کپڑے اتروا کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹاتے اور سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیتے۔ کبھی انگاروں پر لٹا کر ایک قوی ہیکل آدمی ان کے سینے پر بیٹھ جاتا تا کہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ خبابؓ نہایت صبر و استقامت کے ساتھ ان انگاروں پر کباب ہوتے رہتے یہاں تک کہ زخموں سے خون اور پیپ رس رس کر ان انگاروں کو ٹھنڈا کر دیتے۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ خبابؓ ایک قسی القلب عورت اُمّ انمار کے غلام تھے۔ وہ انہیں قبولِ اسلام کے جرم میں کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں لٹاتی اور کبھی تپتے ہوئے لوہے سے ان کا سر داغا کرتی۔ حضرت خبابؓ کو اسی طرح کے لرزہ خیز مظالم سہتے سہتے ایک مدت گزر گئی تو ایک دن فریاد لے کر سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ اس وقت کعبہ کی دیوار کے سائے میں ردائے مبارک سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ حضرت خبابؓ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ آپ اللہ پاک سے ہمارے لیے دُعا کیوں نہیں کرتے؟'' یہ سن کر حضورؐ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ آپؐ کا چہرۂ اقدس سرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا:

''تم سے پہلے گزشتہ زمانہ میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کا

گوشت نوچ ڈالا گیا۔ سوائے ہڈیوں اور پٹھوں کے کچھ نہ چھوڑا گیا۔ ایسی سختیوں نے بھی ان کا دین پر اعتقاد متزلزل نہ کیا۔ ان کے سروں پر آرے چلائے گئے اور چیر کر بیچ میں سے دو کر دیے گئے تاہم دین کو نہ چھوڑا۔ اللہ اس دین کو ضرور کامیاب کرے گا اور تم دیکھ لوگے کہ اکیلا سوار صنعا (یمن) سے حضر موت تک جائے گا اور سوائے اللہ عزّوجل کے کسی سے نہیں ڈرے گا۔''

حضورؐ کے ارشادات سن کر حضرت خبّابؓ منشائے خداوندی سمجھ گئے اور خاموشی سے واپس چلے گئے۔ علاّمہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت خبّابؓ سے اپنی داستانِ مصائب سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے امیر المؤمنینؓ کو کپڑا اٹھا کر اپنی پشت دکھائی تو وہ حیران رہ گئے۔ ساری پشت اس طرح سفید تھی جیسے کسی مبروص کی جلد ہوتی ہے۔ حضرت خبّابؓ نے بتایا:

''امیر المؤمنین آگ دہکا کر مجھے اس پر لٹایا جاتا تھا یہاں تک کہ میری پشت کی چربی اس کو بجھا دیتی تھی۔''

حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے وطن سے مکہ آ کر قبولِ حق کا اعلان کیا تو مشرکین چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے اور مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اگر حضرت عباسؓ آ کر انہیں نہ چھڑاتے تو بس اس دن ان کا خاتمہ تھا۔

حضرت عثمانؓ بن مظعون جمحی نے ساقیِ کوثرؐ کے دستِ مبارک سے بادۂ توحید پیا تو مشرکین نے انہیں طرح طرح کے جور و ستم، تضحیک، استہزا اور معاشی دباؤ کا نشانہ بنالیا یہاں تک کہ انہیں اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی غریب الوطنی اختیار کرنی پڑی۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے قبولِ اسلام کے بعد مشرکین کے سامنے قرآنِ پاک کی تلاوت کی تو ان ظالموں نے حضرت عبداللہؓ کو اس قدر مارا کہ ان کا چہرہ متورم ہو گیا اور جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ نکلا لیکن جوشِ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ پٹتے جاتے تھے اور قرآن خوانی جاری تھی۔ جب ان پر کفّار کے مظالم ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو حضورؐ کے ایماء پر حبش کو ہجرت کر گئے۔

حضرت عثمان غنیؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو ان کے چچا نے انہیں باندھ کر مارا اور اس

قدر سختیاں کیں کہ بالآخر انہیں اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنتِ رسول اللہؐ کے ہمراہ ارضِ وطن کو الوداع کہہ کر حبش جانا پڑا۔

حضرت طلحہؓ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے تو کفّارِ مکہ نے ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے، اس وقت تک ان کی والدہ اسلام نہیں لائی تھیں وہ بھی بیٹے کے قبولِ اسلام پر سخت برافروختہ ہوئیں۔ امام بخاریؒ نے ''تاریخ الصغیر'' میں مسعودؓ بن خراش کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ہم صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگا رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک نوجوان کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ طلحہ بن عبید اللہ بے دین ہو گیا ہے۔ ایک عورت اس نوجوان کے پیچھے پیچھے غرّاتی ہوئی اور گالیاں دیتی ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا، یہ عورت کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ اس کی ماں صعبہ بنتِ حضرمی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ نوفل بن خویلد عدویہ جو شیرِ قریش کے لقب سے مشہور تھا، حضرت طلحہؓ کے قبولِ اسلام پر سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت طلحہؓ کو (جو دونوں بنو تیم سے تھے اور آپس میں رشتہ دار تھے) ایک رسی میں باندھ دیا اور بڑی سختی کی۔

ابنِ اثیرؒ اور امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ جب حضرت طلحہؓ کے قبولِ اسلام کی خبر اُن کے چچا اور بڑے بھائی عثمان بن عبید اللہ کو ہوئی تو انہوں نے حضرت طلحہؓ اور حضرت ابوبکر صدّیقؓ دونوں کو رسی سے باندھ کر بہت پیٹا تا کہ اس تشدّد سے وہ دینِ اسلام کو ترک کر دیں لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر لغزش آئی ہو۔

حضرت عامرؓ بن فہیرہ، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اخیافی بھائی طفیل بن عبد اللہ کے غلام تھے۔ وہ دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہوئے تو مشرکین مکہ کے قہر و غضب کا طوفان پوری قوت سے ان پر پھٹ پڑا۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو ان بدبختوں نے اس مردِ حق پر نہ توڑا۔ کبھی انہیں بے دردی سے زدوکوب کرتے تھے۔ کبھی گرم ریت اور کانٹوں پر گھسیٹتے تھے۔ ایک دن حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے انہیں اس حال میں دیکھا کہ کفّار انہیں کانٹے چبھو رہے تھے اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر طمانچے مار رہے تھے۔ صدیقِ اکبرؓ نے انہیں اسی وقت خرید کر آزاد کر دیا تاہم جب تک وہ حضورؐ کے ہمراہ ہجرت کر کے مکہ نہ چلے گئے کفّار نے انہیں ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ، حضرت سلمہؓ بن ہشام اور حضرت ولیدؓ بن ولید مشرف بہ اسلام ہوئے تو کفّار نے انہیں قید خانے میں ڈال دیا جہاں وہ سالہا سال تک قیدِ تنہائی کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔

حضرت زِنّیرہؓ، قریش کے خاندانِ مخزوم کی لونڈی تھیں، دعوتِ حق کے ابتدائی زمانے میں نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئیں۔ قبولِ حق کے جرم میں ابوجہل ان پر نت نئے مظالم ڈھاتا تھا لیکن انہیں جان دینا تو منظور تھا، خدائے واحد سے منہ موڑنا کسی صورت میں گوارا نہ تھا۔ علاّمہ بلاذُریؒ کا بیان ہے کہ راہِ حق میں بے پناہ مظالم سہتے سہتے ان کی بینائی جاتی رہی اس پر ابوجہل نے انہیں طعنہ دیا کہ لات وعزّیٰ نے تجھے اندھا کر دیا۔ انہوں نے بے دھڑک جواب دیا۔ لات وعزّیٰ پتھر کے بت ہیں وہ کیا جانیں کہ انہیں کون پوج رہا ہے اگر میری بینائی زائل ہوگئی ہے تو یہ مصیبت میرے اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر وہ چاہے تو میری بینائی واپس بھی دے سکتا ہے۔ اللہ کو ان کی شانِ استقامت اس قدر پسند آئی کہ دوسرے دن سو کر اٹھیں تو ان کی بینائی بحال ہو چکی تھی۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ انہیں بھی حضرت ابوبکر صدّیق نے خرید کر آزاد کیا۔

حضرت لبینہؓ قریش کے خاندان بنو عدی کی ایک شاخ بنی مؤمّل کی لونڈی تھیں۔ بعثتِ نبوی کے ابتدائی سالوں میں سعادت اندوزِ اسلام ہوگئیں۔ اس پر حضرت عمرؓ بن خطّاب (اپنے زمانۂ جاہلیت میں) اتنے برافروختہ ہوئے کہ ان کو روزانہ زدوکوب کیا کرتے تھے۔ جب مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے میں تھک گیا ہوں اس لیے تجھے چھوڑا ہے اب بھی اس نئے دین کو ترک کر دے۔ وہ جواب میں کہتیں ''ہرگز نہیں تو جتنا ظلم ڈھا سکتا ہے ڈھالے۔'' بالآخر انہیں بھی حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے خرید کر آزاد کیا۔

حضرت نہدیہؓ اور ان کی بیٹی بنو عبدالدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ بعدِ بعثت کے ابتدائی زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئیں اس پر ان کی مالکہ نے ان پر سخت ظلم ڈھائے لیکن وہ برابر جادۂ مستقیم پر گامزن رہیں۔

حضرت اُمِ عبیسؓ خاندانِ بنو زہرہ کی لونڈی تھیں۔ دعوتِ حق پر لبّیک کہنے والے ابتدائی مسلمانوں میں سے تھیں۔ حق پرستی کے جرم میں مکہ کا مشہور مشرک رئیس اسود بن لغوث ان پر بے پناہ ظلم کرتا تھا لیکن وہ کسی صورت میں اسلام سے منحرف نہ ہوتی تھیں۔ آخر حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے انہیں اس کے پنجۂ ستم سے رہائی دلائی۔

حضرت حمامہؓ حضرت بلال حبشیؓ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ وہ بھی بیٹے کی طرح دعوتِ حق کے اوائل میں مشرف بہ اسلام ہوگئی تھیں۔ مشرکین نے جہاں ان کے فرزند کو لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بنایا وہاں ان کو بھی طرح طرح کے عذاب دیے لیکن وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔

یہ مکہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے سابقون الاوّلون کی بلاکشی کی صرف چند مثالیں ہیں ورنہ ابتدائے بعثت میں لوائے توحید تھامنے والا کوئی بھی متنفس کفّار کے دستِ تعدّی سے محفوظ نہیں تھا۔ جب کفّار کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو سرورِ عالم علیہ وسلم نے مظلوم مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ۵ اور ۶ بعدِ بعثت میں بہت سے مسلمان مرد اور خواتین مکہ سے ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ ہر انسان میں بہت سے مسلمان مرد اور خواتین مکہ سے ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ ہر انسان کو اپنے وطن اور گھر بار سے فطری طور پر گہرا لگاؤ ہوتا ہے اور انہیں چھوڑنا اس کے لیے بہت بڑا امتحان ہوتا ہے لیکن اللہ کے یہ پاکباز بندے اس امتحان میں بھی سرخرو ہوئے۔ ان میں سے ایک جماعت تو ہجرتِ نبوی سے پہلے مکہ واپس آ گئی اور دوسری جماعت غزوۂ خیبر (۷ ہجری) تک حبش میں غریب الوطنی کی مصیبتیں جھیلتی رہی۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں حضورؐ نے صحابہؓ کرامؓ کو ہجرت الیٰ المدینہ کا حکم دیا تو حق کے تمام نام لیواؤں نے اس پر لبیک کہا اور اپنے محبوب وطن مال جائداد اور گھر بار کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر مدینہ میں جا بسے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ قربانی ایسی پسند آئی کہ اس نے نہ صرف انہیں بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر بعد میں آنے والوں کو بھی اپنے راضی ہونے کی بشارت دی۔ گو ان بعد میں آنے والوں نے اوائلِ بعثت کے بلاکشوں جیسی مصیبتیں نہیں جھیلیں تاہم انہوں نے بھی اپنے مال، اولادیں اور جانیں راہِ حق میں وقف کر دیں اور پرچم حق کو بلند رکھنے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے انہیں بھی سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں شامل کر دیا ہاں اتنا فرق ضرور رکھا کہ فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کو فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں سے بہت افضل قرار دیا، جیسا کہ سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ

وَالۡاَرۡضِ ؕ لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَقٰتَلَ ؕ
اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَقٰتَلُوۡا ؕ
وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۝
(الحدید:۱۰)

’جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کیے وہ) برابر نہیں ہو سکتے۔ اُن کا درجہ اُن لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے، جنھوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا اور خدا نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے اور جو کام تم کرتے ہو خدا ان سے واقف ہے۔‘‘

قرآن کریم نے مہاجرین کے ساتھ ساتھ انصار کے رتبۂ بلند کا بھی واضح طور پر ذکر کیا ہے اور اپنی رضا مندی اور آخرت کے اجر و ثواب میں انہیں بھی برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ انصار کو صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مقدّس صف میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ وہ نفوسِ قدسی تھے جو مکہ سے تین سو میل دُور ایک قدیم شہر یثرب میں آباد تھے اور اپنے طور پر بڑے امن چین سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ لوگ نہ اسلام قبول کرنے کے مکلّف تھے اور نہ مکہ کے اہلِ حق کو پناہ دینے پر مجبور تھے یہ صرف ان کی فطرتِ سعید تھی جس نے انہیں دعوتِ حق پر لبّیک کہنے پر آمادہ کیا۔

۱۱ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں یثرب کے چھ سلیم الفطرت خزرجی مکہ آئے۔ حضوؐر نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہوں نے بلا تامل اسے قبول کرلیا۔ یثرب واپس گئے تو دوسرے لوگوں کو بھی توحید کی دعوت دی۔ ۱۲ بعدِ بعثت کے موسم حج میں دوبارہ مکہ آئے تو چھ اور مردانِ حق بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ سب حضوؐر کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ ان کی درخواست پر آپؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اسلام کا داعیِ اوّل بنا کر یثرب بھیجا۔ ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ ۱۳ بعد بعثت میں یثرب کے ۷۵ اہل حق (۷۳ مرد اور دو عورتیں) مکہ آئے اور کفّار سے در پردہ رات کو عقبہ کی گھاٹی میں سرورِ عالم ﷺ سے ملاقات کی، آپؐ کی بیعت سے مشرّف ہوئے اور پھر اس عہد کے ساتھ آپؐ کو یثرب

تشریف لانے کی دعوت دی کہ ہم اپنی جانوں اولادوں اور مالوں کے ساتھ آپ کی حفاظت اور مدد کریں گے۔ اس بیعث کو تاریخ میں بیعث عقبۂ ثانیہ، بیعت لیلۃ العقبہ یا بیعت عقبۂ کبیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بیعت تاریخِ اسلام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فی الحقیقت یہ بیعت عرب وعجم اور جن وانس سے اللہ کی خاطر جنگ کرنے کی بیعت تھی۔ ٹھیک اس وقت جب عرب کا ذرّہ ذرّہ علم بردارانِ حق کے خون کا پیاسا تھا، ارضِ یثرب کے یہ مقدس انسان اٹھے اور اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کو مکہ کے دُرِّ یتیم ﷺ کے قدموں میں لا ڈالا۔ ان مبارک ہستیوں نے اپنا سب کچھ راہِ حق میں داؤ پر لگا دیا اور کسی خطرے اور ملامت کو خاطر میں نہ لائے۔ اس بیعت نے انصار کو ایک ایسا شرف اور امتیاز عطا کر دیا جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے حضوؐر نے مکہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے صحابہؓ کو ہجرت الیٰ المدینہ کا اِذن دیا تو قریب قریب تمام صحابہؓ وصحابیاتؓ ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ پہنچ گئے۔ انصار نے انہیں اہلاً وسہلاً ومرحبا کہا اور نہایت خوش دلی سے ان کی میزبانی کی۔ کچھ عرصہ بعد خود سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عامرؓ بن فہیرہ کے ہمراہ یثرب میں نزولِ اجلال فرمایا تو انصار نے آپؐ کے سامنے دیدہ ودل فرشِ راہ کر دیے اور ایسے والہانہ جوش وخروش اور بے پناہ ذوق وشوق سے حضوؐر کا استقبال کیا کہ تاریخِ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس دن ''یثرب'' ''مدینۃ النبیؐ'' بن گیا اور اس کی زمین رشکِ آسمان بن گئی۔

مہاجرین کرامؓ سالہا سال تک زہرہ گداز مصائب ونوائب جھیلنے کے بعد اپنے اہل و عیال گھر بار اور مال وجائداد چھوڑ کر جب مدینہ پہنچے تو ان کے پاس خدا کے نام کے سوا کچھ نہ تھا لیکن انصارِ مدینہ نے جس محبت اور خلوص سے ان غریب الوطنوں کی مہمانداری کی وہ ایک ایمان افروز داستان ہے، جس سے تاریخ اسلام کے اوراق تا ابد جگمگاتے رہیں گے۔

انصار فطرتاً بڑے شریف، سادہ، بامروّت اور وسیع القلب لوگ تھے لیکن ان کے صدیوں پرانے باہمی نفاق وعداوت نے ان کے خصائل شریفہ کو قریب قریب غارت کر دیا تھا۔ اسلام نے انصار کے باہمی نفاق کو ختم کیا اور جو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ان کو دین کے مستحکم رشتہ اخوّت میں منسلک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح انصار کو ہولناک تباہی سے بچالیا۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۖ وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۝

(اٰل عمران: ۱۰۳)

''اللہ کی رسی کو مل کر مضبوطی سے پکڑلو اور تفرقہ مت پیدا کرو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں (باہمی) الفت پیدا کر دی۔ سو تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ حالانکہ تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے۔ سو اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ تم سے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے شاید تم راہ پاؤ۔''

حق تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کا انصار نے کماحقہٗ شکرادا کیا۔ انہوں نے اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کو راہِ حق میں وقف کر دیا اور اپنے ایثار، خلوص اور فداکاریوں کے انمٹ نقوش صفحاتِ تاریخ پر ثبت کیے۔ ہجرت کے چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتۂ مؤاخاۃ قائم کرایا۔ اس رشتہ کا قیام محض ایک ہنگامی ضرورت کے تابع نہ تھا بلکہ اس کے اندر خاص حکمت اور مصلحت تھی، ایک تو یہ کہ مہاجرین کے دل سے غریب الوطنی کا احساس جاتا رہے۔ دوسرے یہ کہ مہاجرین جو ابتلاء و مصائب کی بھٹی میں پڑ کر کندن بن چکے تھے اور جن کی تربیت و اصلاح سرورِ عالم ﷺ نے خود فرمائی تھی اپنے نو مسلم انصار بھائیوں کی تربیت کر سکیں۔ مؤاخاۃ سے پہلے بھی انصار نے مہاجرین کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر رکھے تھے لیکن مؤاخاۃ کے بعد تو انہوں نے اپنے مواخاتی بھائیوں سے حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر سلوک کیا۔ وہ انہیں اپنے گھروں میں لے گئے اور تمام مال و متاع اور جائداد غرض گھر کی ایک ایک چیز شمار کر کے آدھی آدھی ان کو دے دی۔ اس ملکوتی جذبہ کی انتہا یہ تھی کہ حضرت سعدؓ بن ربیع انصاریؓ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو اپنے مہاجر بھائی کے لیے الگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے اس کی تفصیل پیچھے آچکی ہے۔

انصار نے اپنے نصف نخلستان اور زمینیں اپنے مہاجر بھائیوں کو پیش کیں تو انہوں نے

فن باغبانی اور زراعت سے نا آشنا ہونے کے باعث ان کے لینے میں عذر کیا۔ انصار کا جوشِ ایمان ملاحظہ ہو، انہوں نے کہا کہ یہ نخلستان اور زمینیں ہم آپ کو ضرور دیں گے۔ ان میں کھیتی باڑی ہم خود کرلیں گے اور پیداوار کا نصف حصہ آپ کو دے دیا کریں گے۔ مہاجرین نے احسان مندی کے ساتھ اپنے انصار بھائیوں کی اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ جنگ خیبر تک مہاجرین ان نخلستانوں سے متمتّع ہوتے رہے۔ فتح خیبر کے بعد یہ نخلستان انہوں نے شکریہ کے ساتھ انصار کو واپس کردیے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ مؤاخاتی رشتہ سگے بھائیوں جیسا رشتہ بن گیا تھا یہاں تک کہ اگر کوئی انصاری سفرِ آخرت اختیار کرتا تو اس کا مہاجر بھائی اس کے ترکہ کا وارث ہوتا اور مرحوم کے قریبی رشتہ دار اس سے محروم رہتے تھے۔ جنگِ بدر کے بعد مہاجرین کی مالی حالت درست ہوگئی تو سورۂ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ۔ (الانفال:۷۵)

''قرابت والے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں''

چنانچہ اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں انصار ومہاجرین کا باہمی توارث منسوخ کردیا گیا اور صرف خویش واقارب ہی میں میراث کا قاعدہ جاری ہوگیا۔

انصار نے اپنا ایثار واخلاص اپنے مؤاخاتی بھائیوں تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ جب بھی ضرورت پڑی انہوں نے راہِ حق میں اپنی استطاعت سے بڑھ کر قربانیاں پیش کیں۔ حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری نے اپنے کئی مکانات سرورِ کائنات ﷺ کی نذر کردیے تھے۔ اسی طرح اصحابِ صفّہ کی کفالت انصار نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ جہاد کا موقع آتا تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اسلام کے لیے سینہ سپر ہوجاتے تھے۔ حضوؐر نے غزوۂ بدر سے پہلے انصار کا منشا بطورِ خاص معلوم کیا کیونکہ انہوں نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ ہم مدینہ سے باہر جاکر بھی دشمن سے لڑیں گے۔ مہاجرین سے مشورہ کے بعد جب حضوؐر نے فرمایا کہ اب دوسرے حضرات بھی مشورہ دیں تو رئیس اوس حضرت سعدؓ بن معاذ معاً اٹھ کھڑے ہوئے اور پُر جوش لہجے میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی رسالت کی تصدیق کی، آپ کی اطاعت کا عہد کیا پس جو بھی مرضی مبارک میں ہو وہ کیجیے۔ خدائے برتر کی قسم جس نے آپؐ کو رسول بنا کر بھیجا ہے آپ ہمیں سمندر میں کودنے کا حکم دیں گے تو ہم کود جائیں گے۔ ہمارا ایک متنفس بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ان شاء اللہ آپ ہمیں میدانِ جنگ میں ثابت قدم اور شجاعت پائیں گے اور اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے گا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقعے پر رئیس خزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ نے یہ تقریر کی:

"یا رسول اللہ شاید آپؐ کا اشارہ انصار کی طرف ہے اگر آپ سمندر کا حکم دیں تو ہم اسے پامال کر دیں اور خشکی کا حکم دیں تو برک غماد (حبش یا یمن کی ایک جگہ کا نام ہے) تک اونٹوں کے کلیجے پگھلا دیں۔"

انصار کا جوشِ جہاد اور جذبۂ فدویت دیکھ کر حضورؐ کا چہرۂ مبارک فرطِ مسرت سے چمک اٹھا۔

انصار نے صرف غزوۂ بدر ہی میں نہیں بلکہ ہر غزوہ اور ہر موقعے پر مہاجرین کے پہلو بہ پہلو راہِ حق میں سرفروشی اور جاں بازی کا حق ادا کر دیا اور زیادہ سے زیادہ جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ راہِ حق میں ان کی جاں سپاری اور عشقِ رسولؐ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت ہندؓ بنتِ عمرو بن حرام انصاریہ کے شوہر حضرت عمروؓ بن جموح، فرزند حضرت خلّادؓ بن عمروؓ اور بھائی حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام نے جنگِ اُحد میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ حضرت ہندؓ نے شوہر، فرزند اور بھائی کی شہادت کی خبر سنی تو کسی غم و اندوہ کا اظہار کرنے کی بجائے لوگوں سے پوچھا:

"مجھے یہ بتاؤ کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ آپؐ کو تو کوئی ضرر نہیں پہنچا؟"

جب لوگوں نے بتایا کہ خدا کے فضل سے حضورؐ بخیریت ہیں تو ان کا چہرہ کھل اٹھا، کشاں کشاں میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئیں۔ جب سرورِ عالم ﷺ کو دیکھا تو زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

''آپ سلامت ہیں تو سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔''

حضرت انسؓ بن نضر انصاری نے غزوۂ اُحد میں چند بہادر مسلمانوں کو دیکھا کہ ہتھیار پھینک کر مغموم بیٹھے ہیں۔ پوچھا، تم لڑائی چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا، افسوس کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت انسؓ بولے، تو پھر تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، اٹھو اور کافروں سے لڑ کر مر جاؤ جس طرح حق کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان دی۔ یہ کہہ کر بڑے جوش سے تلوار چلاتے ہوئے کفّار کے ہجوم میں گھس گئے اور ستر زخم کھا کر شہید ہو گئے۔ ان کے بھتیجے حضرت انسؓ بن مالک خادمِ رسول اللہؐ سے روایت ہے کہ سورۂ احزاب کی یہ آیت حضرت انسؓ بن نضر کے بارے میں نازل ہوئی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ (الاحزاب:۲۳)

''ایمان والوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں، جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدہ کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر (مدت) پوری کر چکا ہے اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔''

حضرت خبیبؓ بن عدی انصاری اور حضرت زیدؓ بن دثنہ انصاری کو عضل وقارہ کے لوگوں نے غدّاری کر کے رجیع کے مقام پر گرفتار کر لیا اور پھر قریشِ مکہ کے حوالے کر دیا۔ ان ظالموں نے ان دونوں مردانِ حق کو سولی دینے کا فیصلہ کیا۔ عروہؒ اور موسیٰؒ بن عقبہ سے روایت ہے کہ مشرکین جب حضرت خبیبؓ کو سولی پر لٹکانے لگے تو ان کو پکار کر اور قسم دے کر پوچھا، کیا تجھے پسند ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری جگہ سولی پر ہو اور تو اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے۔

حضرت خُبیبؓ نے فرمایا:

''خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے اقدس میں کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔''

اسی طرح حضرت زیدؓ بن دثنہ کو سولی دینے سے پہلے ابوسفیان نے (جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے) پوچھا ''اے زید تجھ کو خدا کی قسم سچ سچ بتانا کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گردن ماردی جائے اور تم اپنے اہل وعیال میں خوش وخرم رہو۔''

اس مردِ حق آ گاہ نے ابوسفیان کو بعینہٖ وہی جواب دیا جو حضرت خُبَیبؓ نے مشرکین کو دیا تھا یعنی مجھے تو محمد ﷺ کے پاؤں میں کانٹا چبھنا بھی گوارا نہیں۔ ان کا جواب سن کر ابوسفیانؓ کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''محمد (ﷺ) کے ساتھی جس قدر محبت ان سے کرتے ہیں دنیا میں اور کسی شخص کے ایسے شیدائی نہیں ہیں۔''

غزوۂ اُحد میں حضرت سعدؓ بن ربیع انصاری مشرکین کے خلاف دادِ شجاعت دیتے ہوئے شدید زخمی ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کو بارہ زخم آئے اور وہ بے سدھ ہو کر فرشِ خاک پر گر گئے۔ انہیں حضورؐ سے بے پناہ محبت تھی اور آپؐ کو بھی ان سے بڑا تعلقِ خاطر تھا۔ جنگ کے بعد آپؐ کو سعدؓ نظر نہ آئے تو صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''کوئی ہے جو سعد بن ربیع کی خبر لائے؟''

حضرت اُبَیؓ بن کعب انصاری نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ میں جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ میدانِ جنگ میں گئے اور لاشوں کے درمیان پھر کر حضرت سعدؓ بن ربیع کو تلاش کرنے لگے۔ بار بار ان کا نام لے کر پکارتے تھے لیکن کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ آخر انہوں نے بہ آوازِ بلند یہ الفاظ کہے ''سعد اگر زندہ ہو تو جواب دو۔ مجھے رسول اللہ ﷺ نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔''

اس وقت حضرت سعدؓ بن ربیع کا دمِ واپسیں تھا۔ حضورؐ کا اسمِ گرامی سنا تو رُوح اور جسم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے نحیف سی آواز میں جواب دیا:

> ''رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں میرا سلام عرض کرنا اور میرے انصاری بھائیوں سے کہنا کہ اگر آج خدانخواستہ رسول اللہ شہید ہو گئے اور تم میں سے کوئی ایک بھی زندہ بچا تو اللہ کو ہرگز منہ نہ دکھا سکو گے اور اس کے سامنے تمہارا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہم نے لیلۃ العقبہ میں رسول اللہ پر فدا ہونے کا حلف اٹھایا تھا۔''

یہ کہا اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

انصار کی ایسی ہی قربانیاں تھیں، جنھوں نے بارگاہِ خداوندی میں انہیں مہاجرین کی طرح عزّت وعظمت کا مستحق ٹھہرایا، سچے مومن کا لقب دلایا اور جنت کی بشارت دلائی۔

قرآنِ کریم میں صحابۂ کرامؓ کی عظمت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ کہیں تو تمام صحابۂ کرامؓ کی جلالتِ قدر کو اجتماعی طور پر بیان کیا گیا ہے اور سب کو کسی استثنا کے بغیر مغفرت اور

جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ کہیں کسی خاص جماعت کو رضائے الٰہی کی نوید سنائی گئی ہے۔ بعض مقامات پر ایسی آیات بھی ہیں، جو کسی خاص صاحبِؓ رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور ان کی شانِ نزول اُن صاحبِؓ رسولؐ کا کوئی ایسا عملِ صالح ہے، جسے بارگاہِ خداوندی میں خاص درجۂ قبولیت حاصل ہوا۔ ایسی متعدد آیات بھی ہیں جو نازل تو پہلے ہو چکی تھیں تاہم جب حضورؐ نے کسی صحابیؓ کا کوئی خاص عملِ صالح دیکھا تو اس وقت ان آیات کی تلاوت لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کی کہ ان صاحبِؓ رسولؐ کا یہ عمل بارگاہِ خداوندی میں اتنا مقبول ہوا ہے کہ اُن پر اِن آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔

جن آیات میں جمیع صحابۂ کرامؓ کو جنتی ٹھہرایا گیا ہے ان میں سے کچھ اوپر بیان کر دی گئی ہیں۔ اب دوسری نوع کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

یکم ذیقعدہ ۶ ہجری کو سرورِ عالم ﷺ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور چودہ سو صحابۂ کرام کے ہمراہ مدینہ منورہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس خیال سے کہ مسلمانوں کی اتنی جمعیت دیکھ کر قریش کے دل میں کوئی شک نہ گزرے، حضورؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ تلوار کے سوا کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھو اور تلوار بھی نیام میں ہو۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر حضورؐ اور صحابۂ کرامؓ نے عمرہ کا احرام باندھ لیا۔ ادھر قریش مکہ کو مسلمانوں کی آمد آمد کی خبر پہنچی تو وہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضورؐ کو جب یہ اطلاع دی گئی کہ قریش مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ حدیبیہ پہنچ کر وہیں خیمہ زن ہو گئے اور وہاں سے قریش کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں۔ قریش نے دو دن بعد عروہؓ بن مسعود ثقفی کو (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ انہوں نے گفت وشنید کے بعد واپس جا کر قریش کو اپنی گفتگو کی تفصیل بتائی اور ساتھ ہی بتایا کہ:

> ''اے برادرانِ قریش مجھے دنیا کے بڑے بڑے فرماں رواؤں کے درباروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار اور نجاشی کی شان وشوکت دیکھی ہے لیکن خدا کی قسم میں نے کسی زرخرید غلام کو بھی اپنے بادشاہ کی اتنی عزت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد (ﷺ) کے ساتھی اُن کی کرتے ہیں۔ محمد تھوکتے ہیں تو یہ لوگ آگے بڑھ کر ان کے تھوک کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں اور جوشِ عقیدت میں

اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ مستعمل پانی کے ایک ایک قطرے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اس کی خاطر آپس میں لڑ مریں گے۔ محمدؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص تعمیل کے لیے لپکتا ہے۔ محمدؐ جب کوئی بات کرتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ محمدؐ کی عظمت کا یہ حال ہے کہ ان کا کوئی ساتھی ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، میری مانو تو محمدؐ سے عارضی طور پر صلح کر لو۔''

قریش اگرچہ عروہؓ بن مسعود کو اپنا بزرگ مانتے تھے لیکن انہوں نے ان کے مشورے پر کان نہ دھرے۔ اُدھر حضورؐ نے عروہؓ کے جانے کے بعد حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا۔ قریش نے حضرت عثمانؓ کو مکہ میں روک لیا۔ جب وہ واپس نہ آئے تو مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمانؓ کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔'' صحابۂ کرامؓ اگرچہ بے سروسامان تھے لیکن سب نے حضورؐ کے ارشاد پر لبیک کہا۔ حضورؐ ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی کہ جب تک جان میں جان ہے کفّار سے لڑیں گے اور قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔

تمام صحابۂ کرامؓ نے نہایت ذوق وشوق سے جاں نثاری کی بیعت کی۔ تاریخِ اسلام میں یہ بیعت ''بیعتِ رضوان'' کے نام سے مشہور ہے اس موقع پر سورۂ فتح کی یہ آیت نازل ہوئی:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ (آیت:۱۸)

''اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا۔''

ہجرت کے موقعے پر سیدنا حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو غارِ ثور اور سفرِ مدینہ میں سرورِ عالم ﷺ کی معیت کا شرفِ عظیم حاصل ہوا۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا کیونکہ اس وقت کفّارِ مکہ رسولِ اکرم ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کی جانوں کے درپے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت ابوبکر صدّیقؓ کا جذبۂ فدویت اس قدر پسند آیا کہ یہ آیت نازل فرمائی:

اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ اِذۡهُمَا فِى الۡغَارِ اِذۡيَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (التوبہ:۴۰)

''اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت اس کو نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا (ثانی اثنین) جب وہ دونوں غار میں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا اپنے ساتھی سے تو غم نہ کھا۔ بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

گویا خود ربّ ذوالجلال والاکرام نے حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو ثانیِ اثنین کا مہتم بالشان لقب عطا فرمایا۔

جب سورۂ ''الحدید'' کی یہ آیت نازل ہوئی

مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجۡرٌ كَرِيۡمٌ ۝ (آیت:۱۱)

''کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کر دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔''

تو حضرت ابوالدّاحداح انصاریؓ نے یہ آیت سن کر حضوؐر سے پوچھا۔ ''یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟'' حضوؐر نے فرمایا ''ہاں اے ابوالدحداح'' انہوں نے عرض کیا ''ذرا اپنا دستِ مبارک مجھے دکھایئے'' حضوؐر نے اپنا دستِ مبارک اُن کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے اسے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''یا رسول اللہ میں نے اللہ کو اپنا باغ قرض دے دیا۔'' یہ باغ جو حضرت ابوالدّ حداحؓ نے راہِ خدا میں دیا، اس میں کھجور کے چھ سو درخت تھے اور اسی میں ان کا گھر تھا۔ حضوؐر سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا ''دحداح کی ماں نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے ربّ کو قرض دے دیا ہے۔''

بیوی بھی نیک بخت تھیں، بولیں ''اے ابوالدّ حداح تم نے نفع کا سودا کیا۔'' اور اسی وقت اپنا سامان لے کر باغ سے نکل آئیں۔

ایک دن سرورِ عالم ﷺ صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کے درمیان رونق افروز تھے کہ

ایک شخص بہ حالِ پریشاں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

''یا رسول اللہ، مسافر ہوں اور مدینہ میں میرے قیام و طعام کا کوئی بندوبست نہیں، آپؐ کی اعانت کا محتاج ہوں۔''

حضورؐ نے اسی وقت ازواجِ مطہراتؓ سے پوچھ بھیجا کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے۔ سب طرف سے جواب آیا کہ آج فاقہ ہے۔ اب حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

''کوئی ہے جو اس اللہ کے بندے کو مہمان بنائے۔''

حضورؐ کا ارشاد سن کر حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی۔ ''یا رسول اللہ اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر فوراً گھر گئے اور بیوی کو مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے کہا:

''بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا پکا ہے اس کے سوا، خدا کی قسم گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں۔''

حضرت ابوطلحہؓ نے کہا ''کوئی مضائقہ نہیں، بچوں کو بہلا کر سلا دو۔ جب وہ سو جائیں تو ہم ان کا کھانا مہمان کے آگے رکھ دیں گے۔ تم چراغ درست کرنے کے بہانے سے اٹھ کر اس کو بجھا دینا۔ اندھیرے میں مہمان کھانا کھا لے گا اور ہم بھی یونہی منہ چلاتے رہیں گے۔''

غرض اس طرح مہمان کو کھانا کھلا کر دونوں میاں بیوی اور بچوں نے رات فاقے سے گزار دی۔ صبح کو جب یہ نرالے میزبان حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو زبانِ رسالتؐ پر سورۂ حشر کی یہ آیت جاری تھی:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ اَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر:۹)

''اور وہ لوگ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان پر تنگی (فاقہ) ہی ہو۔''

اور حضورؐ فرما رہے تھے ''رات کو تمہارا اپنے مہمان کے ساتھ برتاؤ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آیا۔''

اور پھر ایک دن یہی حضرت ابوطلحہؓ بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے کہ سورۂ آلِ عمران کی

یہ آیت نازل ہوئی:

لَنۡ تَنَالُوۡا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ (آیت:۹۲)

''تمہیں ہرگز ثواب نہ ملے گا جب تک کہ اپنی عزیز ترین دولت اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔''

حضرت ابوطلحہؓ مسجدِ نبوی کے سامنے ایک وسیع اور پُر فضا باغ کے مالک تھے۔ اس کے کنوئیں ''بیرحاء'' کا پانی بہت صاف، شیریں اور خوشبودار تھا اور حضورؐ اسے بڑے شوق سے پیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں اس قسم کی جائداد بہت بڑی نعمت تھی لیکن حضرت ابوطلحہؓ اٹھے اور عرض کی:

''یارسول اللہ میری محبوب ترین جائداد ''بیرحاء'' ہے میں یہ راہِ خدا میں وقف کرتا ہوں اور خدا کی قسم اگر یہ بات چھپ سکتی تو میں اسے کبھی ظاہر نہ کرتا۔''

ان کا جذبۂ انفاق دیکھ کر حضورؐ کا روئے اقدس چمک اٹھا انہیں دُعائے خیر دی اور فرمایا کہ اسے اپنے اعزّہ واقارب میں تقسیم کردو۔ انہوں نے فوراً فرمانِ رسالت کی تعمیل کی اور یہ ساری جائداد اپنے رشتے داروں میں تقسیم کردی۔

صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ خیر و ایثار اور انفاق فی سبیل اللہ جس کی قرآنِ حکیم میں جابجا تعریف وتحسین کی گئی ہے اس کی انتہا یہ تھی کہ غزوۂ تبوک کے موقعے پر جب حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی تو جہاں دوسرے صحابۂ کرامؓ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر مالی قربانی دی وہاں صدّیق اکبرؓ نے گھر کی سوئی سلائی تک راہِ حق میں پیش کردی اور جب حضورؐ نے پوچھا کہ ابوبکر گھر میں بھی کچھ چھوڑ آئے ہو تو عرض کیا ''یارسول اللہ، اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے نام کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑا اور یہی میرے لیے کافی ہے۔''

صحابۂ کرامؓ ایسے اعلیٰ سیرت وکردار اور اخلاق واعمال کے حامل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے راستہ کو ایک معیاری راستہ قرار دیا اور ان کی مخالفت کو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت قرار دیا۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (النساء:۱۱۵)

''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے جب کہ اس کے سامنے ہدایت کھل چکی ہو اور چلے مؤمنین کی راہ چھوڑ کر، ہم اسے پھیر دیں گے، جس طرف پھرتا ہے اور قیامت کے دن جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔''

مفسرین کے نزدیک یہاں ''مؤمنین کی راہ'' سے مراد صحابۂ کرامؓ کی راہ ہے اور صحابۂ کرامؓ وہی نفوسِ قدسی ہیں، جن کے اوصاف ومحاسن قرآن حکیم میں جابجا بیان کیے گئے ہیں ان کا احاطہ کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے یہاں ہم صرف چند اوصاف بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے فرماں بردار، صادق الایمان، نیک نیت، نیکیوں میں سبقت کرنے والے، ہر بھلائی میں پیش پیش، حق کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے، راہِ حق میں عزیز و اقارب، وطن، گھر بار مال جائداد سب کچھ قربان کر دینے والے، حلال کمانے اور حلال کھانے والے۔ حرام سے بچنے والے۔ راست باز (عدول) امانت دار، عہد کو پورا کرنے والے، راہِ حق میں ہر قسم کی مصیبت صبر و استقامت سے جھیلنے والے۔ حق وصداقت کے معاملے میں مداہنت سے بیزار، بے ریا، مخلص، راہِ حق میں بڑھ چڑھ کر مالی قربانی دینے والے، اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینے والے، اپنی زبان پر قابو رکھنے والے، آپس میں رحیم، کفّار پر سخت، کبائر اور بے حیائی سے بچنے والے، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے، غصہ آنے پر معاف کر دینے والے، نماز قائم کرنے والے، حج کرنے والے، روزہ رکھنے والے، زکوٰۃ دینے والے، علم سیکھنے والے، نیکی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے والے، سچی گواہی دینے والے، اللہ کے ڈر سے رونے والے، مصیبت پر صبر کرنے والے، غرور اور فخر سے اجتناب کرنے والے، غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور سائلوں کی مدد کرنے والے، پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنے والے، والدین کی خدمت کرنے والے، رات کی تنہائی میں بکثرت سجدے کرنے والے وعلیٰ ہذا القیاس۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے یہی اوصاف تھے، جن کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ بندے بن گئے تھے۔ ان کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ قرآنِ پاک میں انہیں دنیا اور آخرت میں شاندار کامیابی سے ہم کنار لوگ قرار دیا گیا ہے اور کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے:

''اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔''

ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسے رضائے ربّ حاصل ہو جائے اور یوں اس کی آخرت سنور جائے لیکن جن نفوسِ عظیم و جلیل کو خود اللہ تعالیٰ اپنے راضی ہونے کی بشارت دے رہا ہو ان کے مقام و مرتبہ اور عظمت کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ بلاشبہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کائنات کی بزرگ ترین ہستیاں ہیں اور اس شخص کی خوش بختی میں کیا کلام ہوسکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو یہ توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

طالب ہاشمی
یکم نومبر ۱۹۸۴

ضروری وضاحت

اس مضمون میں صحابۂ کرامؓ سے مراد وہ نُفُوسِ قُدسی ہیں، جن کو اخیر دم تک شرفِ صحابیت حاصل رہا۔ ایسے لوگ جنھوں نے پہلے شرفِ صحابیت حاصل کیا اور پھر کسی گناہِ کبیرہ کی بنا پر اس شرف سے محروم ہو گئے وہ صحابۂ کرامؓ میں داخل نہیں ہیں۔ مثلاً حضورؐ کا پھوپھی زاد بھائی اور اُمُّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ کا پہلا شوہر عبیداللہ بن جحش جو اوائلِ بعثت میں اسلام لایا اور پھر ہجرت کرکے حبشہ چلا گیا۔ وہاں جا کر اسلام سے منحرف ہو گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔ حارث بن سوید جس نے غزوۂ اُحد کے موقع پر حضرت مُجذّر بن زیاد کو ناحق شہید کر دیا اور مرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا۔ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد اس کو حضرت مُجذّرؓ کے قصاص میں قتل کرا دیا۔ وغیرہ

طالب ہاشمی

حضرت عمّار بن یاسرؓ ــــ طیّب المطیّب

①

سرورِ عالم ﷺ ایک دن اپنے کاشانۂ اقدس میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے، اتنے میں تنومند، دراز قد کشادہ سینے اور نرگسی آنکھوں والے ایک وجیہ شخص نے آپؐ سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ ان کی آواز سن کر رحمتِ عالم ﷺ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور آپؐ نے فرمایا:

"مرحبا بالطیّب المطیّب"

(خوش آمدید! پاکیزہ مصفّا انسان)

یہ صاحبِ رسولؐ جن کو سرورِ کائنات فخرِ موجودات سید الانبیاء والمرسلین ﷺ نے "طیّب المطیّب" کے مہتم بالشان لقب سے نوازا، سیدنا حضرت عمّار بن یاسرؓ تھے۔

②

سیدنا حضرت ابوالیقظان عمار بن یاسرؓ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابۂ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ ان کے والد یاسر بن عامرؓ اور والدہ سمیہؓ بنتِ خیاط کو بھی شرفِ صحابیت حاصل تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن الحصین بن لوذیم (ودیم) بن عوف بن عامر الاکبر بن یام بن عنس۔

حضرت عمارؓ کے والد حضرت یاسرؓ بن عامر قحطانی النسل تھے اور یمن کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے مفقود الخبر بھائی کی تلاش کرتے ہوئے مکہ میں وارد ہوئے۔ ان کے دو بھائی مالک اور حارث بھی ساتھ تھے۔ جب ان کا گمشدہ بھائی مکہ میں نہ ملا تو مالک اور حارث تو واپس لوٹ گئے لیکن یاسرؓ بن عامر نے ابو حذیفہ بن المغیرہ مخزومی سے حلیفانہ تعلقات قائم کر کے مکہ ہی میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ یہ بعثتِ نبوی سے تقریباً پینتالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ابو حذیفہ بن المغیرہ نے اپنی لونڈی سُمَیّہؓ بنتِ خباط کی شادی حضرت یاسرؓ بن عامر سے کر دی۔ ان کی صُلب سے حضرت سُمَیّہ کے دو بیٹے عمارؓ اور عبداللہؓ پیدا ہوئے۔ ابو حُذیفہ نے اس سارے خاندان کو بڑی لطف و محبت سے رکھا۔ اس کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد حضورؐ کی بعثت ہوئی اور آپؐ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو اس سعید الفطرت خاندان کے تمام افراد نے بعثت کے ابتدائی زمانے ہی میں حضورؐ کی دعوت پر لبّیک کہا۔ ان کے قبولِ اسلام کا صحیح زمانہ کون سا تھا؟ اس کے بارے میں مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت عمّارؓ نے بعثت کے ابتدائی تین سالوں کے اندر کسی وقت اسلام قبول کیا۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عَمّارؓ نے مشرّف بہ ایمان ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے علاوہ صرف پانچ غلاموں اور دو عورتوں کو سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ دیکھا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت عَمّارؓ کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے سے پہلے صرف سات نفُوس نے اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن حافظ ابنِ حجرؒ نے ''فتح الباری'' میں اور علاّمہ ابنِ اثیرؒ نے ''اُسدُ الغابہ'' میں لکھا ہے کہ فی الحقیقت اس وقت تیس سے کچھ زیادہ نفوس مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے البتہ مشرکین کے خوف سے انہوں نے اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرورِ عالم ﷺ رازداری کے ساتھ فریضۂ تبلیغ ادا فرما رہے تھے اور ابھی دعوتِ عام کی ابتدا نہیں کی تھی۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عَمّارؓ کے قبولِ اسلام کے وقت سرورِ عالم ﷺ حضرت ارقمؓ بن ابی ارقم کے مکان میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ حضرت عمارؓ اور حضرت صہیبؓ بن سنان رومی نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا۔ خود حضرت عمارؓ سے روایت ہے کہ میں نے صہیبؓ کو ارقم بن ابی ارقم کے دروازہ پر دیکھ کر پوچھا، تم کس ارادے سے آئے ہو؟ صہیبؓ بولے، پہلے تم اپنا مقصد

بیان کرو۔ میں نے کہا، میں محمد (ﷺ) سے مل کر ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ (ان کی دعوت کا حال جاننا چاہتا ہوں)۔ صہیبؓ نے کہا، میرا بھی یہی مقصد ہے۔ چنانچہ ہم دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے مل کر اسلام قبول کرلیا۔ حضرت عمار کے ساتھ یا کچھ آگے پیچھے ان کے والدین اور بھائی بھی مشرف بہ ایمان ہوگئے۔

ابنِ سعدؒ کہتے ہیں کہ ابوحذیفہ نے حضرت عمارؓ کو ان کے بچپن ہی میں آزاد کردیا تھا لیکن حضرت سمیہؓ کو اپنی غلامی ہی میں رکھا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے ورثا (ابوجہل وغیرہ) کی غلامی میں آگئی تھیں۔ حضرت عمارؓ کے بھائی عبداللہؓ کے بارے میں کسی نے وضاحت نہیں کی کہ وہ بھی آزاد کردیے گئے تھے یا غلام ہی تھے۔ بہرصورت یہ خاندان، بنومخزوم سے وابستہ تھا۔ اہلِ حق کے لیے یہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا مکہ کا جو شخص اسلام قبول کرتا، مشرکینِ قریش کے غیظ وغضب اور جور وتعدّی کا نشانہ بن جاتا تھا۔ مشرکین اس معاملے میں اپنے قریب ترین عزیزوں کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ان غریب الوطن اور بے یار ومددگار باپ بیٹوں اور حضرت سُمَیّہ پر مشرکین نے قبولِ اسلام کے جرم میں ایسے ایسے لرزہ خیز مظالم ڈھائے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ حضرت یاسرؓ اور حضرت سُمَیہ دونوں بہت ضعیف اور کبیر السن تھے لیکن کفّار کی تمام سختیوں کے باوجود ان کے قدم جادۂ حق سے لمحہ بھر کے لیے بھی نہ ڈگمگائے۔ یہی حال ان کے بیٹوں کا تھا۔ ان مظلوموں کو لوہے کی زرہیں پہنا کر مکہ کی جلتی تپتی ریت پر لٹانا اور ان کی پشت کو انگاروں سے داغنا کفّار کا روز کا معمول بن گیا تھا لیکن وہ نشۂ توحید میں ایسے مخمور تھے کہ راہِ حق سے ہٹنے کا نام بھی نہ لیتے تھے۔

بلاذُریؒ نے حضرت اُمِّ ہانیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن جب یہ چاروں نفوسِ قدسی کفّار کے ہاتھوں لرزہ خیز اذیتیں جھیل رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا اُدھر سے گزر ہوا، ان کو مبتلائے اذیت دیکھ کر آپؐ کو سخت رنج ہوا اور آپؐ نے فرمایا:

”صبر کرو اے آلِ یاسر تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔“

ابنِ سعدؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت عثمانؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس مقام سے گزرا جہاں اس خاندان کو عذاب دیا جارہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا:

''صبر کرو۔ یا اللہ آلِ یاسر کی مغفرت فرما دے اور تو نے ان کی مغفرت کر ہی دی۔''

بوڑھے یاسرؓ یہ ظلم سہتے سہتے ایک دن جاں بحق ہو گئے۔ پھر ایک دن ابو جہل نے حضرت سُمیّہؓ کے نازک مقام پر اپنا برچھا کھینچ مارا جس کے صدمہ سے وہ شہید ہو گئیں۔ عہدِ رسالت کی یہ پہلی شہادت تھی جو راہِ حق میں واقع ہوئی۔ ظالم ابو جہل نے حضرت عبداللہؓ بن یاسرؓ کو بھی تیر مار کر شہید کر دیا۔ اب صرف عمارؓ باقی رہ گئے تھے ان کو اپنی والدہ کی مرگِ بیکسی پر سخت صدمہ ہوا۔ روتے ہوئے سرورِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ سنا کر عرض کیا:

''یا رسول اللہ اب تو ظلم کی انتہا ہو گئی۔''

حضورؐ نے ان کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا:

''اے اللہ آلِ یاسر کو دوزخ سے بچا۔''

والدین اور بھائی کی شہادت کے بعد بھی حضرت عمارؓ بدستور کفّار کی مشقِ ستم کا نشانہ بنے رہے۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمارؓ کو کرتہ اتارے ہوئے دیکھا تو ان کی پیٹھ پر داغ ہی داغ نظر آئے، پوچھا، یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اس عذاب کے نشانات ہیں، جو مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر مجھے دیے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ مشرکین نے حضرت عمارؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا۔ سرورِ عالم ﷺ اُدھر سے گزرے تو ان کے سر پر دست مبارک پھیرا اور فرمایا:

''اے آگ عمار پر اس طرح ٹھنڈی ہو جا جس طرح تو ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہوئی تھی۔''

ایک مرتبہ مشرکین نے حضرت عمارؓ کو پانی میں اس قدر غوطے دیے کہ وہ بالکل بدحواس ہو گئے یہاں تک کہ ان ظالموں نے ان کی زبان سے ایسے نازیبا کلمے کہلوا لیے، جن میں حضورؐ کا انکار اور بتوں (مشرکین کے معبودوں) کی تعریف تھی۔ جب ان بدبختوں سے جان چھوٹی تو روتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا بات ہے تمہارے پیچھے کیا چیز لگی ہوئی ہے کہ رو رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا:

''بہت بڑی برائی یا رسول اللہ، مجھے ان ظالموں نے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے آپؐ کے حق میں نازیبا کلمہ نہیں کہا اور ان کے معبودوں کے حق میں ذکرِ خیر نہیں کیا۔''

حضورؐ نے پوچھا، تم اپنے دل کی کیا کیفیت پاتے ہو؟

عرض کیا، ''یارسول اللہ، میرا دل تو بفضلہٖ تعالیٰ ایمان باللہ و ایمان بالرسولؐ کے ساتھ مطمئن ہے۔

حضورؐ نے نہایت شفقت کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور فرمایا:

''کچھ مضائقہ نہیں، اگر آئندہ بھی وہ تمہاری اذیت کے درپے ہوں اور اس قسم کا مطالبہ کریں تو جان بچانے کے لیے ایسا کر لینا۔''

متعدد مفسرین نے لکھا ہے کہ سورۃ النّحل کی یہ آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ (النحل:۱۰۶)

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہے۔ (اس سے مواخذہ نہ ہوگا)۔

۳

حضرت عمّارؓ ہجرت الی المدینہ تک مسلسل مکہ میں رہ کر کفّار کے مظالم برداشت کرتے رہے یا اس دوران میں کچھ عرصہ کے لیے حبشہ چلے گئے، اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ وہ دوسری ہجرتِ حبشہ (۶ بعدِ بعثت) میں حضورؐ کے ایماء پر حبش چلے گئے اور کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد مکہ واپس آ گئے لیکن جمہور اربابِ سِیَر نے دوسری ہجرتِ حبشہ کے مہاجرین کی جو فہرست دی ہے اس میں حضرت عمارؓ کا نام شامل نہیں ہے۔ بہرصورت اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت عمّارؓ ان صحابۂ کرامؓ میں ہیں، جنھوں نے ہجرتِ نبوی سے کچھ عرصہ (ایک دو ماہ) پہلے مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ صحیح بخاری کے مطابق جو نفوسِ قدسی سب سے پہلے مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱- حضرت ابو سلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد مخزومی۔
۲- حضرت عامرؓ بن ربیعہ عنزی۔
۳- (حضرت عامرؓ کی اہلیہ) حضرت لیلیٰؓ بنتِ ابی خثمہ۔
۴- حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔
۵- حضرت عمّار بن یاسرؓ
۶- حضرت بلالؓ بن رباح

حضرت عمارؓ پہلے قبا میں وارد ہوئے جہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے حضرت مبشرؓ بن عبدالمنذر نے انہیں اپنا مہمان بنایا یہاں تک کہ سرورِ عالم ﷺ نے بھی مکہ سے ہجرت کر کے قبا میں نزولِ اجلال فرمایا۔ حضورؐ نے مسجدِ قبا کی تاسیس فرمائی تو حضرت عمارؓ نے بھی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ اس کی تعمیر میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیا۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ مسجد قبا سے مدینہ آ گئے۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمارؓ کو مدینہ میں مستقل سکونت کے لیے ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ قطعۂ زمین انہیں ہجرت کے فوراً بعد نہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد عنایت کیا گیا کیونکہ حضرت عمارؓ کچھ مدت اصحابِ صفہ میں بھی شامل رہے۔

مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے کچھ عرصے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار میں برادری (مؤاخاۃ) قائم کی تو حضرت عمارؓ کو حضرت حُذیفہؓ بن الیمانؓ کا اسلامی بھائی بنایا۔

حضورؐ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا آغاز فرمایا تو سب صحابۂ کرامؓ نے اس کام میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ خود سید کونین ﷺ دوسروں کی طرح برابر گارا اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ صحابۂ کرامؓ منتیں کرتے تھے کہ حضورؐ یہ زحمت گوارا نہ فرمائیں ہم یہ کام کر لیں گے۔ لیکن آپؐ نے اس کو منظور نہ فرمایا۔

اس موقعے پر حضرت عمارؓ اینٹیں اور گارا لا لا کر دیتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے:

نحن المسلمون نبنی المساجدا

ہم مسلمان ہیں ہم مسجد بناتے ہیں

صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ:

''ہم ایک ایک اینٹ اٹھا رہے تھے اور عمار دو دو، رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا تو ان کے بدن سے مٹی صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے، ہائے عمار۔ اس کو باغی جماعت قتل کرے گی۔ (بخاری جلد ا، کتاب الصلوٰۃ باب التعاون فی بناء المسجد) (۱)

طبقات ابنِ سعدؒ میں ہے کہ ایک دن کسی نے حضرت عمارؓ کے سر پر اتنا بوجھ لاد دیا کہ لوگ چلا اٹھے ''یہ بوجھ عمار کو مار ڈالے گا۔'' وہ پہلے بھی ایسی شکایت کر چکے تھے (کہ ان پر ان کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ لاد دیا جاتا ہے) سرورِ عالم ﷺ نے سنا تو کچھ اینٹیں اتار کر پھینک دیں اور فرمایا:

''افسوس ابنِ سُمَیَّہؓ تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''

(۴)

حضرت عمار راہِ حق کے ایک جانباز سپاہی تھے اور سرورِ عالم ﷺ سے ان کی عقیدت اور محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ بدر سے لے کر تبوک تک تمام غزوات میں اپنے آقا و مولا ﷺ کے ہمرکاب رہے اور ہر غزوے میں جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ عہدِ رسالت کا شاید ہی کوئی شرف ایسا ہو، جو انہیں حاصل نہ ہوا ہو۔ مشہور غزوات کے علاوہ حضرت عمارؓ بعض چھوٹی چھوٹی مہموں میں بھی شریک ہوئے۔ سید الانام ﷺ ان کے اخلاص فی الدّین اور

(۱) مولوی سعید انصاری مرحوم نے اپنی کتاب سیر الصحابہ جلد دوم میں اس روایت پر تنقید کی ہے اور اس کے بعض راویوں کی ثقاہت میں کلام کیا ہے لیکن جمہور اربابِ حدیث، سِیَر مغازی و تاریخ نے اپنی کتابوں میں الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ اس حدیث کو تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب الجہاد (باب مسح، اخبار عن الراس فی السبیل) میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، طبرانی، بیہقی، مسندِ ابوداؤد، طیالسی وغیرہ کتبِ حدیث میں بھی اس مضمون کی روایات موجود ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص، حضرت ابورافعؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت ابوقتادہ انصاریؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ جیسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں۔ چونکہ احادیث کی جرح و تعدیل یا مشاجراتِ صحابہؓ پر بحث کرنا ہمارے موضوعِ گفتگو سے خارج ہے اس لیے کسی روایت کی کوئی تاویل کرنا یا اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا ہم قارئین کی صوابدید اور تحقیق پر چھوڑتے ہیں۔

جذبۂ فدویت کا اعتراف فرماتے تھے اور ان کا بہت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت خالد بن ولید کو ایک مہم کا امیر بنا کر بھیجا۔ ان کے ماتحت لشکر میں حضرت عمارؓ بن یاسرؓ بھی شامل تھے۔ یہ لشکر روانہ ہوا اور اس قبیلے کے قریب پہنچ گیا، جس سے صبح جنگ کرنی تھی اور رات کے آخری حصے میں وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس قبیلے کو کسی شخص نے مسلمانوں کی آمد کی اطلاع دے دی۔ وہ لوگ بھاگ گئے، البتہ ایک آدمی وہیں ٹھہرا رہا کیونکہ وہ اور اس کے گھر والے اسلام لا چکے تھے۔ (بہ نظرِ احتیاط) اس کے اہلِ خانہ نے بھی (فرار کے لیے) سواریوں پر سامان لاد لیا لیکن اس شخص نے ان سے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ اور میری واپسی کا انتظار کرو۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کے پڑاؤ میں آ کر حضرت عمارؓ سے ملا اور ان سے کہا ''اے ابوالیقظان میں اور میرے گھر والے اسلام لا چکے ہیں کیا یہ بات مجھے نفع پہنچائے گی؟ میری قوم تو تم لوگوں کی آمد کا سن کر بھاگ گئی۔'' حضرت عمارؓ نے اس سے کہا، تو ٹھہر جا تجھے امن ہے۔ چنانچہ وہ آدمی اور اس کے گھر والے اپنی بستی ہی میں ٹھہر گئے۔ علی الصباح حضرت خالدؓ نے اس بستی پر چڑھائی کی، دیکھا کہ سب لوگ بھاگ گئے ہیں۔ انہوں نے اس آدمی اور اس کے گھر والوں کو پکڑ لیا۔ حضرت عمارؓ نے حضرت خالدؓ سے کہا کہ تمہیں اس آدمی سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ اسلام لا چکا ہے۔ حضرت خالدؓ نے کہا تمہیں اس آدمی سے کیا واسطہ، کیا تم اسے پناہ دو گے حالانکہ امیرِ لشکر میں ہوں۔

حضرت عمارؓ نے فرمایا، ہاں میں پناہ دوں گا خواہ تم امیر ہو، یہ آدمی ایمان لا چکا ہے اور اگر چاہتا تو یہ بھی اسی طرح بھاگ جاتا جس طرح اس کی قوم بھاگ گئی۔ میں نے ہی اس کے اسلام کی وجہ سے اس کو یہاں ٹھہرنے کا مشورہ دیا ہے، اس معاملے نے تلخ کلامی کی صورت اختیار کر لی۔ جب یہ لشکر واپس مدینہ آیا تو حضرت خالدؓ اور حضرت عمارؓ دونوں بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمارؓ نے سارا واقعہ حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؐ نے حضرت عمارؓ کے امن دینے کو برقرار رکھا البتہ ہدایت فرمائی کہ آئندہ کوئی شخص امیر (کے مشورہ یا اجازت) کے خلاف کسی کو پناہ نہ دے۔ اس کے بعد پھر ان دونوں میں آپؐ کے سامنے تیزی ترشی ہوئی۔ حضرت خالدؓ نے غیظ و غضب کی حالت میں کہا، یا رسول اللہ آپؐ کے سامنے یہ غلام مجھے سخت سست کہہ رہا ہے خدا کی قسم اگر آپؐ نہ ہوتے تو اس کو یہ جرأت نہ ہوتی۔

حضورؐ نے فرمایا، ''خالد عمار سے رُک جاؤ، جو عمار کو بُرا کہتا ہے اللہ اس کو بُرا کہتا ہے، جو عمار کو مبغوض رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہوتا ہے اور جو عمار کی تحقیر کرتا ہے اللہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔''

اس کے بعد حضرت عمارؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے چل دیے۔ حضرت خالدؓ بن ولید ان کے پیچھے لپکے اور ان کے کپڑوں کو پکڑ لیا پھر ان کو منانے لگے یہاں تک کہ حضرت عمارؓ ان سے راضی ہو گئے۔ (ابنِ عساکر)

''مستدرکِ حاکم'' میں حضرت خالدؓ بن ولید سے روایت ہے کہ یہ دن میرے لیے بڑا ہی سخت تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ میرے لیے استغفار کیجیے اور حضرت عمارؓ سے بھی معافی مانگی۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدّیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو قریب قریب سارے عرب کو فتنۂ ارتداد نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صدّیق اکبرؓ نے عدیم المثال حوصلے اور استقامت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ اس سلسلے میں متعدد خونریز معرکے پیش آئے۔ حضرت عمارؓ نے اکثر معرکوں میں مرتدین کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کی لڑائی میں بھی شریک تھے۔ طبری کا بیان ہے کہ مرتدین کے خلاف تمام لڑائیوں میں یہ سب سے زیادہ سخت لڑائی تھی۔ اس لڑائی میں حضرت عمارؓ نے حیرت انگیز شجاعت و بسالت کا مظاہرہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ یمامہ کی لڑائی میں حضرت عمارؓ کا ایک کان شہید ہو گیا، جو پاس ہی زمین پر پھڑک رہا تھا لیکن وہ بے پروائی سے حملے پر حملے کر رہے تھے۔ جس طرف رُخ کرتے تھے دشمن کی صفیں ابتر ہو جاتی تھیں۔ ایک موقعے پر مسلمانوں کے قدم اکھڑنے لگے تو وہ ایک بلند چٹان پر کھڑے ہو کر للکارے:

''مسلمانو! کیا تم جنت سے بھاگتے ہو، دیکھو میں عمار بن یاسر ہوں، آؤ میری طرف آؤ۔''

ان کی آواز سن کر مسلمانوں کے قدم جم گئے اور انہوں نے حضرت عمارؓ کے ساتھ مل کر اس زور کا حملہ کیا کہ مرتدین کا منہ پھر گیا اور بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ جنگ یمامہ (۱۱ ہجری) کے وقت حضرت عمارؓ کی عمر ۶۵ برس کے قریب تھی لیکن شجاعت اور جانبازی میں وہ جوانوں پر بھی بازی لے گئے۔

⑤

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کو بہت مانتے تھے اور ان کا بہت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سردارانِ قریش حضرت ابوسفیانؓ بن حرب، حضرت حارثؓ بن ہشام اور حضرت سہیلؓ بن عمرو امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات کے لیے آئے عین اسی وقت حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ بھی اسی غرض کے لیے کاشانۂ خلافت پر پہنچے۔ امیر المؤمنینؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے پہلے حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ کو ملاقات کے لیے اندر بلایا اور سرداران قریش سے بعد میں ملاقات کی۔ حضرت ابوسفیانؓ نے اسے محسوس کیا اور امیر المؤمنینؓ سے شکوہ کیا کہ غلاموں کو تو فوراً باریاب کیا جاتا ہے اور ہم جو قریش کے سر برآوردہ لوگ ہیں، بیٹھے ہوئے راہ تکتے ہیں۔

امیر المؤمنینؓ نے فرمایا، اس کا جواب آپ لوگوں کو خود اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہیے، اسلام نے سب کے ساتھ آپ کو بھی بلایا مگر یہ لوگ آپ پر سبقت لے گئے۔

۲۰ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کو کوفہ کا والی (گورنر) بنایا۔ اس موقعے پر انہوں نے اہلِ کوفہ کے نام یہ فرمان بھیجا:

> ''میں تمہارے پاس عمار بن یاسرؓ کو امیر اور ابنِ مسعودؓ کو معلّم و مشیر (وزیر) بنا کر بھیج رہا ہوں۔ یہ دونوں رسول اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ ساتھی اور بدر کے مجاہد ہیں۔ ان کی پیروی کرو اور ان کا حکم مانو۔ میں نے عبداللہؓ بن مسعود کو ایثار کر کے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ میں نے انہیں تمہارے خزانہ کا نگران (منتظم و منصرم) بھی بنا دیا ہے اور عثمانؓ بن حنیف کو مغربی عراق کی پیمائش اور لگان بندی کا منتظم مقرر کیا ہے اور تینوں کی رسد کے لیے ایک بکری یومیہ مقرر کی ہے، نصف مع پیٹ عمارؓ کے لیے اور بقیہ ابنِ مسعودؓ اور عثمانؓ کے لیے۔''

حضرت عمارؓ کی امارتِ کوفہ کے زمانہ میں جنگِ نہاوند پیش آئی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت کے مطابق حضرت عمارؓ کوفہ سے کمک لے کر نہاوند پہنچے تو اس وقت جنگ ختم ہو چکی تھی اور مسلمان فتح یاب ہو چکے تھے۔ امام بیہقیؒ اور شمس الائمہ سرخسیؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمارؓ نے اپنے ساتھی لشکریوں کے لیے مالِ غنیمت سے حصہ طلب کیا۔ فاتح فوج کے بہت سے آدمی اس پر

برافروختہ ہوگئے۔ انہوں نے کہا، آپ جنگ میں شریک نہیں تھے اس لیے مالِ غنیمت کے مستحق نہیں ہیں۔ ایک بدوی سپاہی تو طیش میں آ کر بدکلامی پر اتر آیا اور بولا، کنکٹے غلام (جنگ یمامہ میں حضرت عمارؓ کا ایک کان کٹ گیا تھا) تم ہمارے مالِ غنیمت میں (جسے ہم نے جنگ کی بھٹی میں جل کر حاصل کیا ہے) شریک ہونا چاہتے ہو۔ حضرت عمارؓ بڑے بردبار تھے انہوں نے کسی سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا البتہ امیر المؤمنینؓ کو شکایتی خط لکھا۔ وہاں سے جواب آیا:

''بلاشبہ مالِ غنیمت ان لوگوں کا حق ہے جو عملاً لڑائی میں شریک ہوں۔''

اسی زمانے میں مسلمانوں کو مدائن میں کسی قبر میں زربفت کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک لاش ملی، اس کے پاس بہت سارو پیہ بھی رکھا ہوا تھا۔ کفن اور روپیہ حضرت عمارؓ کے پاس کوفہ لایا گیا۔ انہوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ دونوں چیزوں کو خزانے میں جمع کر دوں یا پانے والوں کو دے دوں۔ امیر المؤمنین نے جواب دیا:

''یہ چیزیں پانے والوں کو دے دو اور ان سے نہ لو۔''

حضرت عمارؓ نے ایک سال نو ماہ تک امارتِ کوفہ کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے لیکن اسی دوران میں اہلِ کوفہ اور اہل بصرہ کی باہمی منافست اور حضرت عمارؓ کی غیر جانبداری نے اہلِ کوفہ کو ان سے ناراض کر دیا۔ ابنِ جریر طبری کا بیان ہے کہ خوزستان کی فتح کے بعد اہلِ بصرہ کی خواہش تھی کہ ماہ یا ماسپندان کا پرگنہ اور کچھ دوسرے مفتوحہ علاقے صوبہ بصرہ سے ملحق کر دیے جائیں کیونکہ صوبہ بصرہ کا رقبہ اس کی کثیر آبادی کے اعتبار سے بہت مختصر تھا۔ لیکن اہل کوفہ ان علاقوں کے بصرہ سے الحاق کے خلاف تھے۔ والیِ بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ان علاقوں کے بصرہ سے الحاق کے لیے دربارِ خلافت میں تحریک کی تو اہلِ کوفہ نے اپنے والی حضرت عمارؓ پر زور دیا کہ وہ اس تحریک کی مخالفت کریں لیکن حضرت عمارؓ نے اس معاملے میں بالکل غیر جانبداری اختیار کی اور فرمایا۔ ''مجھے ان جھگڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔'' ان کا جواب سن کر کوفہ کے ایک رئیس عطارد نے غضب ناک ہو کر کہا:

''اے کن کٹے پھر تم ہم سے خراج کس بنا پر طلب کرتے ہو۔''

حضرت عمارؓ بہرحال کوفہ کے سب سے بڑے حاکم تھے، چاہتے تو عطارد کو اس گستاخی

پر سزا دے سکتے تھے لیکن انہوں نے بڑے تحمل سے کام لیا اور صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے:

''افسوس تم نے میرے نہایت اچھے اور محبوب کان کو گالی دی۔''

حضرت عمارؓ کی غیر جانبداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ علاقے صوبہ بصرہ میں شامل کر دیے گئے۔ اس پر اہلِ کوفہ نے دربارِ خلافت میں حضرت عمارؓ کے خلاف شکایتوں کا طومار باندھ دیا اور بار بار لکھا کہ عمارؓ ایک کمزور امیر ہیں، انہیں سیاست نہیں آتی۔ اس سے پہلے اہلِ کوفہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے خلاف شکایتیں بھیج کر انہیں معزول کرا چکے تھے۔ علاّمہ بلاذریؒ نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اہلِ کوفہ کے طرزِ عمل پر افسوس ہوا اور انہوں نے فرمایا:

''اہل کوفہ کی طرف سے مجھ کو معذور رکھنے والا کون ہے اگر میں ان پر قوی کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس سے سرکشی کرتے ہیں اور اگر کسی ضعیف کو ان کا امیر بناتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر کرتے ہیں۔''

تاہم انہوں نے حضرت عمار بن یاسرؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو کوفہ کا والی بنا دیا۔

ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ معزولی کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمارؓ سے پوچھا، ''تم معزولی کے حکم سے ناراض تو نہیں ہوئے؟'' حضرت عمارؓ نے جواب دیا ''آپ پوچھتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ میں نہ تو اس منصب پر اپنے تقرر سے خوش تھا اور نہ اب اپنی معزولی سے ناخوش ہوں۔

(۶)

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت کے نصفِ ثانی میں ملک میں فتنوں نے سر اٹھایا تو ۳۵ھ میں امیر المؤمنینؓ نے شورش کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک تحقیقی جماعت مقرر کی، جس کے ایک رکن حضرت عمارؓ بھی تھے۔ اس جماعت کو فتنہ پردازی کے اصل مرکز مصر بھیجا گیا۔ تحقیق جماعت کے دوسرے ارکان تو جلد واپس آ گئے اور اپنے متعلقہ علاقوں کی صورتِ حالات سے امیر المؤمنینؓ کو آگاہ کر دیا لیکن حضرت عمارؓ کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ جب ایک عرصے کے بعد وہاں سے واپس مدینہ منورہ آئے تو انقلاب پسند گروہ کے بعض

مطالبوں اور شکایتوں کی کھلے عام تائید کی۔ اسی بنا پر انہیں ایک مرتبہ سخت تکلیف اٹھانا پڑی۔ مولانا حاجی معین الدین ندوی مرحوم نے ''سیر الصحابہ'' میں لکھا ہے:

''ایک دفعہ حضرت عثمانؓ کے غلاموں نے ان کو (حضرت عمارؓ کو) اس قدر مارا کہ تمام جسم ورم کر گیا۔ شکم میں خراش آ گئی اور پسلی کی ایک ہڈی کو سخت صدمہ پہنچا۔ بنی مخزوم نے جن سے جاہلیت میں حلف وموالات کا تعلق تھا، یہ سن کر کاشانۂ خلافت کو گھیر لیا اور دھمکی دی کہ اگر عمارؓ بن یاسرؓ اس صدمہ سے جانبر نہ ہوئے تو ہم ضرور انتقام لیں گے۔''

(سیر الصحابہ جلد دوم ترجمہ حضرت عمار بن یاسرؓ بحوالہ الاستیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۳۴ لابنِ عبدالبرؒ)

اگر یہ روایت درست ہے تو باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ ہوا، امیر المؤمنین حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے علم اور ایمان کے بغیر ہوا کیونکہ وہ اس قدر نیک طینت، حلیم الطبع اور خیر خواہِ امت تھے کہ آخری دم تک اپنے حامیوں کو باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ سلفِ صالحین نے مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں کفِ لسان ہی کو بہترین شعار قرار دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ بعض معاملات میں حضرت عمارؓ کو امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ سے اختلاف تھا۔

خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت عمارؓ نے ان کی پُر جوش حمایت کی اور ان کے دست و بازو ثابت ہوئے۔ جنگِ جمل سے پہلے حضرت علیؓ نے انہیں سیدنا حضرت حسنؓ کے ساتھ کوفہ بھیجا تاکہ وہاں کے لوگوں کی حمایت حاصل کریں۔ کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا رویہ غیر جانبدارانہ تھا جو حضرت حسنؓ اور حضرت عمارؓ کو پسند نہیں تھا۔ وہ جامع کوفہ میں لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین فرما رہے تھے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت عمارؓ وہاں پہنچ گئے۔ حضرت حسنؓ حضرت ابوموسیٰؓ کو پیچھے ہٹا کر منبر پر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے ایک پُر جوش تقریر کی۔ حضرت عمارؓ بھی ان کے ساتھ منبر پر چڑھ گئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا:

''لوگو! میں جانتا ہوں کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ دنیا اور آخرت میں رسول اللہ ﷺ کی حرم محترم ہیں لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لے رہا ہے کہ تم اس کی فرمانبرداری کرتے ہو یا حضرت عائشہؓ کی؟''

کوفہ کے ایک صاحب اثر صحابی حضرت حجرؓ بن عدی نے حضرت عمارؓ کی پُر زور تائید کی۔اس طرح کوفہ کے تقریباً دس ہزار آدمی حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے حضرت عمارؓ کے ساتھ ہوگئے۔

جنگِ جمل کا آغاز ہوا تو حضرت علیؓ نے حضرت عمارؓ کو میسرہ کا افسر بنایا چونکہ انہیں حضرت علیؓ کے برسرِ حق ہونے کا پورا یقین تھا اس لیے غیر معمولی جوش اور ثابت قدمی سے لڑے یہاں تک کہ حضرت علیؓ کو فتح ہوئی۔یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۳۶ھ کا ہے۔

۷

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے گئے یہاں تک کہ صفین کی لڑائی چھڑ گئی۔اس لڑائی میں بھی حضرت عمارؓ نے حضرت علیؓ کی طرف سے پر جوش حصہ لیا۔ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ''جب وہ حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہو کر میدانِ جنگ کی طرف بڑھ رہے تھے تو بار بار کہتے جاتے تھے الٰہی اگر میں جانتا کہ پہاڑ سے کود کر، پانی میں ڈوب کر یا آگ میں جل کر جان دینا تیری خوشنودی کا باعث ہوگا تو میں ہر طریقے سے تجھے خوش کرتا۔اب میں لڑنے جا رہا ہوں تو اس میں بھی تیری رضا جوئی مقصود ہے، امید ہے کہ تو اس مقصد میں مجھے ناکام نہ کرے گا۔'' اس وقت ان کی عمر نوّے برس سے اوپر تھی (باختلافِ روایت اکانوے، ترانوے یا چورانوے برس)۔لیکن جوش و جذبہ سے سرشار تھے اور قویٰ مضبوط تھے اس لیے جنگ میں محیر العقول شجاعت و مردانگی دکھائی۔جس طرف رخ کرتے تھے، صفیں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ایک مرتبہ اثنائے جنگ میں امیر معاویہؓ کے علم بردار حضرت عمروؓ بن العاص پر نظر پڑی تو جوشِ غضب سے بے قرار ہو گئے اور زبان پر یہ الفاظ آ گئے:

''میں اس علم بردار سے تین بار رسول اللہ ﷺ کی ہمرکابی میں لڑ چکا ہوں۔اب چوتھی بار اس کا سامنا کر رہا ہوں۔واللہ اگر وہ ہم کو شکست دیتے ہوئے مقام ہجر تک بھی پیچھے دھکیل دیں تو پھر بھی میں یہی سمجھوں گا کہ ہم حق پر ہیں اور وہ غلطی پر۔''

ایک دن شام کے وقت جب سورج غروب ہو رہا تھا اور لڑائی پوری شدّت سے جاری تھی، حضرت عمارؓ نے دودھ کے چند گھونٹ پیے اور فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آخری گھونٹ جو تم پیو گے، دودھ کا ہوگا۔''

یہ فرما کر غنیم پر شیر کی طرح حملہ آور ہوئے اس وقت زبان پر یہ رجز جاری تھا:

''آج میں دوستوں سے ملوں گا آج میں اپنے محبوب محمد ﷺ اور آپؐ کی جماعت سے ملوں گا۔''

حضرت ہاشمؓ بن عتبہ نے حضرت علیؓ کا علم اٹھا رکھا تھا ان پر نظر پڑی تو کہا:

''اے ہاشم، آگے بڑھو، جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے اور موت نیزوں کے کناروں پر۔ جنت کے دروازے کھولے جا چکے ہیں اور حورانِ بہشتی مزّین ہو چکی ہیں۔''

پھر اس بے جگری سے لڑے کہ شامی فوج کے پرے کے پرے صاف کر دیے۔ بالآخر ایک شامی سپاہی نے انہیں اپنے نیزے سے مجروح کر کے زمین پر گرا دیا اور ایک شامی نے ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہ رَاجِعُوْن۔

علامہ ابن اثیرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمارؓ کے شہید ہونے کی خبر امیر معاویہؓ کو پہنچائی گئی تو اس وقت ان کے پاس حضرت عمرؓ بن العاص اور ان کے فرزند حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بھی موجود تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے حضرت معاویہؓ اور اپنے والد کو رسولِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد یاد دلایا کہ عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا تو حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا:

''کیا ہم نے عمار کو قتل کیا ہے؟ ان کو تو اس نے قتل کیا جو انہیں میدانِ جنگ میں لایا۔''

ان کا اشارہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی طرف تھا، جن کی حمایت میں لڑتے ہوئے حضرت عمارؓ نے شہادت پائی تھی۔

ابنِ اثیرؒ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ دو آدمی جھگڑتے ہوئے حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس آئے اور ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ عمارؓ کو میں نے قتل کیا ہے (اس لیے انعام کا مستحق ہوں)۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے فرمایا، خدا کی قسم یہ دونوں دوزخ کے لیے جھگڑ رہے ہیں واللہ میں پسند کرتا ہوں کہ آج سے بیس برس پہلے مر گیا ہوتا۔''

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ یہ واقعہ حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے پیش آیا۔ جب حضرت

عمروؓ بن العاص نے کہا کہ یہ دونوں (حضرت عمار کا قاتل ہونے کا دعویٰ کرنے والے) جہنم کے لیے جھگڑ رہے ہیں تو امیر معاویہؓ نے برہم ہو کر کہا:

''عمرو تم کیا کہہ رہے ہو، جو لوگ ہماری خاطر جانیں قربان کر رہے ہیں تم ان کو ایسا کہتے ہو۔''

حضرت عمروؓ بن العاص نے فرمایا۔ ''خدا کی قسم ایسا ہی ہے کاش آج سے بیس برس پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی۔''

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمارؓ کی شہادت کے بعد بعض غیر جانبدار صحابۂ کرامؓ بھی حضرت علیؓ کے طرفدار ہو گئے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت عمارؓ کی شہادت کی خبر سنی تو اشکبار ہو گئے۔ جب ان کی خون آغشتہ نعش میدانِ جنگ سے اٹھا کر لائی گئی تو شیرِ خداؓ نے اس کے قریب کھڑے ہو کر فرمایا:

''اللہ نے عمار پر رحم کیا، جس دن وہ ایمان لائے، اللہ نے عمار پر رحم کیا، جس دن وہ شہید ہوئے، اللہ ان پر رحم فرمائے گا، جس دن وہ اٹھائے جائیں گے میں نے ان کو اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دیکھا تھا جب صرف چار یا پانچ صحابہ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا۔ قدیم صحابہ میں سے کسی کو ان کی مغفرت میں شک نہیں ہو سکتا۔ عمارؓ اور حق لازم و ملزوم تھے اس لیے ان کا قاتل یقیناً جہنمی ہو گا۔''

اس کے بعد خود ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور رحمتِ عالم ﷺ کے اس عظیم المرتبت جاں نثار کو ارضِ کوفہ میں سپردِ خاک کر دیا۔

(۲)

حضرت عمارؓ بن یاسرؓ طویل مدت تک نبوت کے سرچشمۂ فیض سے براہِ راست سیراب ہوئے تھے اس لیے علم و فضل کے اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتے تھے لیکن وہ بہت کم گو اور روایتِ حدیث میں بے حد محتاط تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان سے صرف ۶۲ احادیث مروی ہیں اور ان کا شمار راویانِ حدیث صحابہ کے طبقۂ چہارم میں ہوتا ہے۔

حضرت عمارؓ کے صحیفۂ حیات میں سبقت الیٰ الاسلام، جفاکشی، صبر و استقامت حُبِّ رسول، شوقِ جہاد، زہد و ورع، شغفِ عبادت، حلم وتحمل، سادگی، تواضع اور انکسار سب سے روشن ابواب ہیں۔

انہوں نے دعوتِ حق پر اس وقت لبیک کہا جب ایسا کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا، راہِ حق میں ان پر جو لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے ان کا حال پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ ہر وقت آپؐ پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کے جذبۂ فدویت کی بنا پر حضورؐ بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر میں ابوجہل مارا گیا تو آپؐ نے حضرت عمارؓ کو بلا کر فرمایا:

''اللہ نے تمہاری ماں کے قاتل کو قتل کر دیا (یعنی اس سے اس کی شقاوت کا بدلہ لے لیا)۔''

شوقِ جہاد کی یہ کیفیت تھی کہ راہِ حق میں ہر وقت سر بکف رہتے تھے۔ عہدِ رسالت کے تمام غزوات میں سرفروشانہ شریک ہوئے، صدّیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں مرتدین کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں انہوں نے شام اور ایران کے بعض معرکوں میں بھی دادِ شجاعت دی۔

زہد و ورع اور شغفِ عبادت میں ان کی ذات مثالی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ حرام تو حرام مشتبہات تک سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے تھے، خود سرورِ عالم ﷺ نے ایک مرتبہ انہیں ''طیب المطیب'' کے لقب سے نوازا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ عمار کے اندر ہڈیوں تک ایمان بھرا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، عمار سر سے لے کر پاؤں تک ایمان سے پُر ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک جنت ان چار آدمیوں کے لیے مشتاق ہے، عمارؓ، علیؓ، سلمانؓ اور مقدادؓ۔

نمازِ پنج گانہ پابندی سے ادا کرنے کے علاوہ حضرت عمارؓ رات بھر نماز اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے تھے۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت حضرت عمارؓ کی شان میں ہی نازل ہوئی ہے:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ط (سورہ الزُّمر:۹)

(بھلا مشرک اچھا ہے یا) وہ جو رات کے وقت زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا اور آخرت سے ڈرتا اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔

معذوری کی حالت میں بھی نماز قضا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حالتِ سفر میں غسل کی حاجت ہوگئی، پانی میسر نہیں تھا اس لیے سارے جسم پر خاک مل کر نماز پڑھ لی۔ مدینہ منورہ واپس آ کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں واقعہ عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا، ''ایسی حالت میں بھی صرف تیمّم کافی تھا۔'' صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں خود حضرت عمارؓ کی زبانی یہ واقعہ اس طرح منقول ہے:

''ایک شخص حضرت عمرؓ بن الخطاب کی خدمت میں آیا اور اس نے مسئلہ پوچھا کہ مجھے غسل کی حاجت ہوگئی اور پانی مجھے ملا نہیں (تو کیا کروں)۔

میں نے (یعنی حضرت عمار نے جو وہاں موجود تھے) حضرت عمرؓ سے کہا، کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک دفعہ میں اور آپ سفر میں تھے (اور ہم دونوں کو غسل کی حاجت ہوگئی تھی) تو آپ نے اس حالت میں نماز نہیں پڑھی۔ اور میں نے یہ کیا کہ میں زمین پر خوب لوٹا پوٹا (کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ جنابت والا تیمّم بھی غسل کی طرح سارے جسم کا ہوتا ہوگا) تو جب ہم سفر سے واپس آئے تو میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ (زمین پر سارے جسم کو لوٹ پوٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی) تمہارے لیے بس اتنا کرنا کافی تھا۔ یہ فرما کر آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو پھونکا (تاکہ جو خاک دھول لگی ہو وہ اُڑ جائے) پھر آپؐ نے ان دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر اور ہاتھوں پر پھیر لیا۔''

جمعۃ المبارک کے دن خطبے سے پہلے منبر پر بیٹھ کر بالعموم سورۂ یٰسین کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ خطبہ اگرچہ مختصر ہوتا تھا لیکن نہایت فصیح و بلیغ ہوتا تھا اور اختصار میں بھی جامعیت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کسی شخص نے خطبہ کے اختصار پر اعتراض کیا تو فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز کو طول دینا اور خطبہ کو مختصر کرنا انسان کی سمجھ کی نشانی ہے۔''

مزاج میں بے حد سادگی، قناعت اور تواضع تھی۔ ساری عمر کوئی مکان نہیں بنایا۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے اپنا مکان بنوایا اور انہیں دکھانے کے لیے لے گئے تو فرمایا۔

''سخت چیز بنائی اور لمبی امید کی۔''

عہدِ فاروقی میں کوفہ کے امیر تھے لیکن ضرورت کی سب چیزیں خود بازار جا کر خریدتے، باندھتے اور پھر اپنی پشت یا کندھے پر اٹھا کر لاتے تھے گھر کا دوسرا کام کاج بھی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ معذور لوگوں کا سودا سلف بھی خرید کر خود ان کے گھر پہنچا دیا کرتے تھے۔ لباس بھی بے حد سادہ ہوتا تھا، پھٹ جاتا تو اس میں پیوند لگانے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔

نہایت بردبار اور متحمل مزاج تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ''اے کان کٹے'' کہہ کر ان کو غصہ دلانا چاہا۔ انہوں نے نہایت نرمی سے جواب دیا:

''اے عمدہ کان والے، مجھے کیوں عار دلا رہے ہو، میرا یہ کان تو اللہ کی راہ میں کاٹا گیا ہے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بڑی محبت تھی۔ ان کی شان میں کسی کے منہ سے کوئی نا ملائم کلمہ نہ سن سکتے تھے۔ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس پر اڑ جاتے تھے اور کسی خطرے اور مصیبت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہر کام میں ان کی نیت یہ ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے۔ دنیوی منفعت کو انہوں نے کبھی اپنا مطمح نظر نہیں بنایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت شجاع بن وہب اسدیؓ

(۱)

سیدنا حضرت ابو وہب شجاع بن وہبؓ کا شمار سرورِ عالم ﷺ کے ان جاں نثاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اُس پُر آشوب زمانے میں دعوتِ توحید پر لبّیک کہا جب ایسا کرنا مشرکین مکہ کے نزدیک بدترین جرم تھا۔ حضرت شجاعؓ کا تعلق بنو اسد بن خزیمہ سے تھا اور زمانۂ جاہلیت میں ان کا خاندان بنوعبدِ شمس کا حلیف تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

شجاعؓ بن وہب بن ربیعہ بن اسد بن صہیب بن مالک بن کثیر (کبیر) بن غنم بن دودان بن اسد بن خُزَیمہ۔

خُزَیمہ پر ان کا نسب رسولِ اکرم ﷺ کے نسب میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعثت کے تین سال بعد سرورِ عالم ﷺ نے اہل مکہ کو اعلانیہ دعوت توحید دینی شروع کی تو اس وقت حضرت شجاعؓ کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور یہ ان کا عیش اور کھیل کا زمانہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے مشرکین کے ظلم وستم کا نشانہ بن جاتا ہے، انہوں نے صدائے توحید کانوں میں پڑتے ہی اس پر بلا تامل لبّیک کہا۔ کفّارِ مکہ کو ان کے قبولِ اسلام کا علم ہوا تو انہوں نے ان پر بے پناہ ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ جب یہ مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو وہ ۶ بعدِ بعثت میں حضورؐ کے ایماء پر مہاجرین حبش کے دوسرے قافلے میں شریک ہو کر حبش چلے گئے۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ افواہ سن کر کہ اہلِ مکہ مسلمان ہو گئے ہیں، حضرت شجاعؓ حبش سے مکہ واپس آ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا

کہ یہ افواہ غلط تھی اور قریش مکہ کے وہی لیل و نہار ہیں۔ صبر کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے اور پھر مشرکین کے ظلم سہنے لگے۔ کچھ مدت کے بعد حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو ہجرت الیٰ المدینہ کا اِذن دیا تو وہ بھی اپنے بھائی عقبہ بن وہبؓ کے ساتھ ارضِ مکہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ چلے گئے۔

(۲)

سرورِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو قبیلہ خزرج کے ایک معزز شخص اوس بن خولیؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ صاحب شہسواری، کتابت اور تیرنے میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ''کامل'' کہلاتے تھے۔ ہجرت کے پانچ ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخاۃ قائم کرائی تو حضرت اوس بن خولیؓ کو حضرت شجاعؓ کا دینی بھائی بنایا کیونکہ دونوں کی طبیعتوں میں بڑی مناسبت تھی۔ اگر حضرت اوسؓ اعلیٰ درجے کے شہسوار اور شمشیرزن تھے تو حضرت شجاعؓ بھی نہایت اچھے شہسوار اور دلاورِ صف شکن تھے۔

غزوات کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے حضرت شجاعؓ کی تلوار بدر کے میدان میں چمکی اور یوں انہیں سابق الاسلام اور ذوالہجرتین (دو ہجرتیں کرنے والے) کے علاوہ بدری صحابی ہونے کا عظیم شرف بھی حاصل ہو گیا۔ غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب اور عہدِ رسالت کے دوسرے مشہور غزوات میں بھی دادِ شجاعت دی۔

ربیع الاوّل ۸ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کو خبر ملی کہ بنو ہوازن کی ایک شاخ بنو عامر کے لوگ مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ بنو عامر مدینہ منورہ سے پانچ منزل کی مسافت پر مکہ اور بصرہ کی راہ میں نجد کے ایک مقام سِیّ میں آباد تھے جہاں اسی نام کا ایک چشمہ یا کنواں ان کے قبضے میں تھا۔ حضورؐ نے حضرت شجاع کو چوبیس مجاہدین دے کر ان لوگوں کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔ حضرت شجاعؓ اور ان کے ساتھیوں نے مدینہ سے سِیّ تک کا سفر نہایت رازداری کے ساتھ طے کیا۔ وہ دن کو پہاڑوں، ریت کے ٹیلوں یا درختوں کی آڑ میں چھپ رہتے اور رات کو برق رفتاری سے سفر کرتے۔ اس طرح وہ اچانک بنو عامر کے سر پر جا پہنچے۔ وہ مسلمانوں کو یکا یک اپنے سر پر دیکھ کر بوکھلا گئے اور بدحواسی کے عالم میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے

ہوئے۔ مسلمانوں کو مالِ غنیمت میں دوسرے مال و اسباب کے علاوہ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی جسے وہ ساتھ لے کر مدینہ آئے۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو ہر ایک مجاہد کے حصے میں پندرہ پندرہ اونٹ آئے۔ بعض مجاہدین نے اپنے حصے کے کچھ اونٹوں کے بدلے میں بھیڑ بکریاں لے لیں۔ مبادلہ کی غرض سے ایک اونٹ کو بیس بھیڑ بکریوں کے مساوی قرار دیا گیا۔

۳

صلح حدیبیہ (٦ ہجری) کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے اطراف و جوانب کے حکمرانوں اور رئیسوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط روانہ فرمائے تو حضرت شجاعؓ کو حارث بن ابی شمر غسانی اور جبلہ بن ایہم غسّانی کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔

حافظ ابنِ قیمؒ نے ''زادالمعاد'' میں لکھا ہے کہ حارث بن ابی شمر غسانی دمشق کے قریب غوطہ کا رئیس تھا۔ حضوؐر نے اس کو جو خط حضرت شجاعؓ کے ہاتھ بھیجا اس کے ابتدائی فقرے یہ تھے:

> اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔
>
> محمد رسول اللہ کی طرف سے حارث بن ابی شمر کے نام۔ سلام ہے اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے، ایمان لائے اور تصدیق کرے۔ بے شک میں تم کو اس اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں جو ایک ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی صورت میں تمہاری سلطنت باقی رکھی جائے گی (کہ تم خدائے واحد پر ایمان لے آؤ)

علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حارث بن ابی شمر نے اس مکتوبِ نبوی کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور اپنے مذہب پر قائم رہا لیکن اس کا وزیر ''مرّی'' جو ایک سلیم الفطرت شخص تھا، اس نامۂ گرامی سے اتنا متاثر ہوا کہ دل میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لے آیا لیکن اعلانِ حق کے لیے ماحول سخت ناساز گار تھا۔ اس نے حضرت شجاعؓ سے تخلیہ میں ملاقات کی، ان کے سامنے اپنے قبولِ اسلام کا اظہار کیا اور ان سے درخواست کی کہ میرا اسلام رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پہنچا دیجیے گا اور یہ بھی عرض کر دیجیے گا کہ میں نے صدقِ دل سے اسلام قبول کر لیا ہے اور ان شاء اللہ مرتے دم تک اس پر قائم رہوں گا۔

حبیلہ بن ایہم غسّانی جو عرب کے شمال میں تبوک کے نواحی علاقوں کا حکمران تھا اُس نے اُس وقت تو اسلام قبول نہ کیا لیکن چند سال بعد حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بڑے کرّ وفر سے مدینہ گیا اور حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد امیر المؤمنینؓ کے ساتھ حج کے لیے مکہ گیا۔ طواف کے دوران میں اس کی ازار کے نیچے گھسٹتے ہوئے کونے پر بنوفزارہ کے ایک غریب مسلمان کا پاؤں پڑ گیا۔ حبیلہ نے اس کے منہ پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ اس کی ناک کا بانسہ پھوٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ فزاری نے بارگاہِ خلافت میں شکایت کی تو انہوں نے حبیلہ سے جواب طلب کیا۔ اس نے بڑے تکبر سے کہا کہ یہ تو تھپڑ تھا اگر مجھے حرمت کعبہ کا پاس نہ ہوتا تو میں اس ادنیٰ شخص کا سر اڑا دیتا کہ اسے بادشاہوں کی ازار پر پاؤں رکھنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا، اسلام نے تمہیں اور اس فزاری کو برابر کر دیا، اب صرف تقویٰ ہی فضیلت کا معیار ہے۔ تم یا تو فزاری کو راضی کرلو یا قصاص دو۔ حبیلہ نے کہا، مجھے کل تک کی مہلت دیجیے۔ امیر المؤمنینؓ نے اس کی درخواست مان لی۔ وہ راتوں رات اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ سے بھاگ گیا اور قلمرو روم میں داخل ہو کر ہرقل کے پاس پناہ لی، یوں اس کا خاتمہ ارتداد پر ہوا۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدّیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو سارے عرب میں فتنۂ رِدّہ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ صدّیق اکبر نے بڑے عزم و استقلال کے ساتھ اس فتنے کا مقابلہ کیا اور مختلف اطراف و جوانب میں گیارہ لشکر بھیج کر چند ماہ کے اندر اندر تمام مرتدین کو کچل دیا۔ اس سلسلے میں سب سے سخت لڑائی مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کے میدان میں پیش آئی۔ مسیلمہ کی سرکوبی کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید مامور ہوئے تھے۔ حضرت شجاعؓ بھی ان کے لشکر میں شامل ہوگئے اور یمامہ کے میدانِ کارزار میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس سے کچھ اوپر تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عاقل بن بکیر لیثیؓ

بعثتِ نبوی کے اڑھائی سال بعد سرورِ عالم ﷺ نے دارِ ارقم کو مرکز تبلیغ و ہدایت بنایا تو سب سے پہلے بنولیث کے چار جوان آپ ؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

''یارسول اللہ ہم آپ کی دعوت پر ایمان لاتے ہیں ہمیں اپنے حلقہ بگوشوں میں شامل فرما لیجیے۔''

یہ چاروں جوان آپس میں حقیقی بھائی تھے اور قریش کے خاندان ''بنوعدی بن کعب بن لُوّیٰ'' کے حلیف تھے۔ حضورؐ نے ان کے جذبۂ سبقت الی الاسلام کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور ان سے پوچھا، تمہارے نام کیا ہیں۔ ایک نے اپنا نام خالد بتایا، دوسرے نے عامر، تیسرے نے ایاس اور چوتھے نے غافل بتایا۔ حضورؐ نے چوتھے بھائی سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''غافل نہیں آج سے تمہارا نام عاقل ہے۔''

انہوں نے عرض کیا ''بسر و چشم''

اسی دن سے لوگ غافل کو عاقل کہنے لگے اور اسی نام سے انہوں نے تاریخ میں شہرت پائی۔ حضرت عاقلؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عاقلؓ بن بکیر (بقولِ بعض ابی بکیر) بن عبدِ یا لیل بن ناشب بن غیرہ بن سعد بن لیث بن بکیر بن عبد مناۃ بن کنانہ۔

سرورِ عالم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو ہجرت الی المدینہ کا اِذن دیا تو سالہا سال سے مشرکین مکہ کے ظلم وستم کا شکار بننے والے اہلِ حق آہستہ آہستہ کفّار کی نظریں بچا کر مدینہ پہنچنے لگے کیوں کہ کفّار کو یہ گوارا نہ تھا کہ پرستارانِ حق ان کے پنجۂ ستم سے بچ کر نکل جائیں۔ حضرت

علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مکہ سے ہجرت کرنا سخت مشکل کام تھا۔ اس لیے سب نے چھپ چھپ کر ہی ہجرت کی۔ لیکن جس دن حضرت عمر فاروقؓ نے ہجرت کا ارادہ کیا انہوں نے پہلے سب لوگوں کے سامنے بیت اللہ کا طواف کیا، پھر دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد قریش کے مجمع میں جا کر اعلان کیا:

''بد بختو، جو کوئی اپنی ماں کو بے اولادی کا، اپنی اولاد کو یتیمی کا اور اپنی بیوی کو رنڈاپے کا داغ دینا چاہے وہی میرا تعاقب کرے میں اب یہاں سے مدینہ جا رہا ہوں۔''

مشرکین نے حضرت عمر فاروقؓ کا اعلان سنا لیکن کسی کو ان کا تعاقب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی معیت میں بیس دوسرے فرزندانِ توحید بھی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ ان میں حضرت عاقلؓ اور ان کے تینوں بھائی بھی شامل تھے۔ بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ ان چاروں بھائیوں نے اپنے اہل وعیال سمیت ایک ساتھ ہجرت کی اور مکہ میں ان کے گھر (یا گھروں) کے دروازے بالکل بند ہو گئے۔

مدینہ پہنچ کر چاروں بھائی حضرت رفاعہؓ بن عبدالمنذر انصاری کے مہمان بنے۔ سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان عقدِ مواخاۃ قائم کیا تو حضرت عاقلؓ کو حضرت مُجذَّرؓ بن زیاد کا دینی بھائی بنایا۔

ہجرت کے بعد حق و باطل کا معرکۂ اوّل ١٧ رمضان المبارک ٢ ہجری کو بدر کے میدان میں پیش آیا۔ اس میں حضرت عاقلؓ اور ان کے تینوں بھائی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ حضرت عاقلؓ ان سب میں خوش نصیب تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دادِ شجاعت دے رہے تھے کہ ایک مشرک مالک بن زہیر نے تاک کر ان پر نیزے یا تلوار کا بھرپور وار کیا اور وہ شہید ہو کر گر پڑے۔ سابقون الاوّلون اور مہاجرین اوّلین کی مقدّس جماعت کے وہ پہلے ہی رکن تھے، اب شہدائے بدر میں شامل ہو کر اتنا بلند مقام حاصل کر لیا کہ دوسرے صحابۂ کرامؓ ان پر رشک کیا کرتے تھے۔

حضرت عاقلؓ کے بھائی حضرت خالدؓ بن بکیر نے بدر کے بعد اُحد میں دادِ شجاعت دی اور سریۂ رجیع (٤ ہجری) میں شہادت پائی۔ حضرت عامرؓ نے بدر کے بعد عہدِ رسالت کے

دوسرے تمام غزوات میں بھی سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا اور حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے عہدِ خلافت میں جنگِ یمامہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

حضرت ایاسؓ نے بھی عہدِ رسالت کے تمام غزوات میں ملتزمِ رکابِ نبویؐ ہونے کا شرف حاصل کیا۔

ابنِ اثیرؒ ''اُسدُ الغابہ'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے ۳۴ ہجری میں وفات پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت واقد بن عبداللہ یربوعی التمیمیؓ

(١)

سیدنا حضرت واقد بن عبداللہؓ اُن عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ کی مقدّس جماعت میں سے ہیں، جن کو بعثتِ نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں قبولِ حق کا شرف حاصل ہوا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ سرورِ عالم ﷺ اس وقت تک دارِ ارقم میں پناہ گزین نہیں ہوئے تھے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت واقدؓ بعدِ بعثت کے ابتدائی تیس مہینوں کے اندر کسی وقت سعادت اندوزِ ایمان ہوئے کیونکہ حضورؐ بعثت کے اڑھائی سال بعد دارِ ارقم میں تشریف لے گئے۔

حضرت واقدؓ کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنو تمیم سے تھا۔ اہلِ سِیَر نے یہ وضاحت نہیں کی کہ حضرت واقدؓ کب سے مکہ میں مقیم تھے کیونکہ مکہ بنو تمیم کا وطن نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت واقدؓ کے آباء و اجداد میں سے کوئی صاحب مکہ میں آ کر بس گئے ہوں گے اور حضرت واقدؓ مکہ ہی میں پلے بڑھے ہوں۔ کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت واقدؓ بن عبداللہ کو حضرت عمر فاروقؓ کے والد خطّاب نے اپنا حلیف اور متبنّٰی بنا رکھا تھا گویا وہ قریش کی شاخ بنو عدی کے حلیف تھے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:

واقدؓ بن عبداللہ بن عبدِ مناف بن عرین بن ثعلبہ بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم

اپنے قبیلے کی جس شاخ سے حضرت واقدؓ کا تعلق تھا، اس کو یربوعی اور حنظلی بھی کہا جاتا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کی طرح حضرت واقدؓ بھی کئی سال تک مشرکینِ قریش کے تشدّد کا نشانہ بنے رہے۔ سرورِ عالم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو ہجرتِ مدینہ کا اِذن دیا تو بیشتر صحابۂ کرامؓ خفیہ طور پر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے لیکن حضرت واقدؓ بن عبداللہ نے حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ علانیہ ہجرت کی۔ مدینہ پہنچ کر حضرت واقدؓ نے حضرت رفاعہؓ بن عبدالمنذر انصاری کے ہاں قیام کیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا اور چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم فرمائی تو حضرت واقدؓ بن عبداللہ کو حضرت بشر بن براء بن معرورؓ انصاری کا دینی بھائی بنایا۔

(۲)

جمادی الاخریٰ ۲ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو آٹھ یا بارہ صحابہؓ کی معیت میں قریش کی نقل وحرکت کی ٹوہ لینے پر مامور فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن جحش کے ماتحت دستے میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عتبہ بن غزوان، حضرت عکاشہ بن محصن عبداللہ جیسے کبار صحابہؓ شامل تھے۔ حضورؐ نے اُن کی روانگی کے وقت ایک خط لکھوا کر حضرت عبداللہؓ بن جحش کو دیا اور ہدایت فرمائی کہ دو دن کے سفر کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھنا اور اس میں درج ہدایات پر عمل کرنا۔ حضرت عبداللہؓ نے حضورؐ کے حکم کے مطابق دو دن کے سفر کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھا، اس پر حضورؐ کا یہ فرمان درج تھا۔

> ''اس خط کے پڑھنے کے بعد تم سیدھے مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ جا کر ٹھہرو۔ وہاں سے قریش کے تجارتی قافلوں پر کڑی نظر رکھو اور کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ جو چاہے تمہارے ہمراہ جائے اور جس کی مرضی ہو واپس آ جائے۔''

حضرت عبداللہؓ بن جحش نے اپنے ساتھیوں کو مکتوبِ نبوی کے مضمون سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ میرے ساتھ جانا یا نہ جانا تمہاری مرضی پر منحصر ہے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ اے امیر ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اب انہوں نے بطنِ نخلہ کا رُخ کیا۔ اثنائے راہ میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عتبہؓ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا۔ دونوں حضرات عبداللہؓ بن جحش سے اجازت لے کر اس کی تلاش میں گئے اور اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے۔

حضرت عبداللہؓ بن جحش نخلہ پہنچ کر قریش کے تجارتی قافلوں کی ٹوہ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ ناگاہ قریش کا ایک قافلہ جو طائف سے کچا چمڑا، منقہ اور دوسرا تجارتی سامان بار کر کے لایا تھا، مسلمانوں کی قیام گاہ کے قریب ہی آ کر خیمہ زن ہوا۔ اس قافلہ کے ساتھ قریش کے کئی سر برآوردہ آدمی تھے مثلاً عثمان بن عبداللہ مخزومی، نوفل بن عبداللہ مخزومی، حکم بن کیسان اور عمرو بن حضرمی۔

مسلمانوں نے اس قافلہ کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ اس دن رجب کی پہلی تاریخ تھی لیکن مسلمانوں کا گمان تھا کہ آج جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ ہے۔ انہوں نے طے کیا کہ آج ہی اس قافلے سے دو دو ہاتھ کر لیے جائیں ورنہ کل رجب شروع ہو جائے گا جو حرمت والے مہینوں میں ہے۔ چنانچہ مسلمان قافلہ کی طرف بڑھے۔ حضرت واقدؓ بن عبداللہ نے جوشِ شجاعت میں عمرو بن حضرمی کو تیر کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا۔ یہ سب سے پہلا مشرک تھا جو ایک مسلمان (حضرت واقدؓ) کے ہاتھ سے ہلاک ہوا۔ حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ باقی اہلِ قافلہ بھاگ گئے۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش اور ان کے رفقاء مالِ غنیمت اور دونوں قیدیوں کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ حضورؐ کو سارے واقعہ کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش سے فرمایا کہ میں نے حرمت والے مہینے میں تم کو خونریزی کی اجازت نہیں دی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش نے تاریخ کی غلط فہمی کا عذر پیش کیا۔ ادھر قریش نے اس واقعے کو بڑی شہرت دی اور کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں نے ماہِ حرام کی حرمت توڑ دی، خونریزی کی، مال لوٹا اور ہمارے آدمی پکڑ لیے۔ مدینہ کے یہودی اور غیر مسلم بھی مسلمانوں کو طعنے دینے لگے کہ تم نے ماہِ حرام کو حلال کر لیا ہے۔ خود مسلمانوں نے اہلِ سریہّ کے اس کام پر ناگواری محسوس کی اور ان سے برملا کہا کہ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ اس پر حضرت عبداللہؓ بن جحش اور دوسرے اصحابِ سریہّ سخت دل گرفتہ ہوئے اور عذابِ الٰہی کے خوف نے انہیں نڈھال کر دیا۔ اس پر رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور یہ آیت نازل ہوئی:

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ
كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ
وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ
(البقرہ:۲۱۷)

یعنی (اے نبی) لوگ آپ سے ماہِ حرام میں لڑائی کرنے کی نسبت پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دیں کہ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور لوگوں کو مسجدِ حرام میں نہ جانے دینا اور اُن لوگوں کو جو اِس کے اہل ہیں (مسلمانوں) کو اس سے نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فساد برپا کرنا قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہ آیت مسلمانوں کی طرف سے ایک طرح کا اعتذار تھا کہ اگرچہ ان سے خطا ہوئی (خواہ ظن واشتباہ اور التباس کی بنا پر) لیکن کفر، مسلمانوں کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روکنا یا مسجدِ حرام سے ان کو نکال دینا ایسے فتنے ہیں، جو ماہِ حرام میں خونریزی کرنے سے کہیں بڑھ کر گناہ ہیں پس تم کس منہ سے مسلمانوں پر زبانِ طعن دراز کر سکتے ہو۔

اس آیت کے نزول سے اہلِ سریہ کو تسکین حاصل ہوگئی۔ سرورِ عالم ﷺ نے بھی ان کو مالِ غنیمت میں تصرّف کرنے کی اجازت دے دی اور بقول ابنِ جریر طبری خود بھی خمس قبول فرمالیا۔ قیدیوں میں سے حکم بن کیسان نے اسلام قبول کرلیا اور عثمان بن عبداللہ کو اہلِ مکہ نے فدیہ بھیج کر چھڑالیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے عمرو بن حضرمی کے ورثا کو دِیت ادا کردی۔

(۳)

رمضان ۲ ہجری میں عہدِ رسالت کا پہلا معرکۂ حق و باطل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت واقدؓ کو ان تین سو تیرہ سرفروشوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، جو اس موقعے پر سید الاوّلین والآخرین ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ یوں وہ اصحاب کی مقدس جماعت کا ایک رکن ہونے کے لازوال اور عظیم مرتبے پر فائز ہوگئے۔

غزوۂ بدر کے بعد حضرت واقدؓ نے اُحد، احزاب، فتح مکہ، حنین، تبوک وغیرہ عہدِ رسالت کے تمام غزوات میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد ان کی کسی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔ ان کی عائلی زندگی کے بارے میں کتبِ سیر خاموش ہیں۔

فضل و کمال کے اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر مرتبہ نہ تھا تاہم کتبِ حدیث میں ان سے مروی ایک دو حدیثیں موجود ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ابو برزہ اسلمیؓ

۱

پہلی صدی ہجری کے چھٹے عشرے کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ بصرے کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کو حوضِ کوثر کے وجود کے بارے میں شک پیدا ہوا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا، کیا کوئی شخص حوضِ کوثر کے بارے میں میرا اشکال دُور کرسکتا ہے؟ انہوں نے بصرہ میں مقیم ایک ضعیف العمر صاحبؓ رسولؐ کا پتہ بتایا۔ ابن زیاد نے انہیں بلا بھیجا۔ وہ تشریف لائے تو انہیں دیکھ کر اس نے ازارہِ استہزا کہا:

''یہ ہیں تمہارے.........محمدی!''

ان صاحبِؓ رسولؐ نے ابنِ زیاد کی بات سنی تو انہیں بڑا دُکھ ہوا اور انہوں نے بڑے پُر جلال لہجے میں فرمایا:

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں کبھی ان لوگوں کو بھی دیکھوں گا جو مجھے رسول اللہ ﷺ کے شرفِ صحبت پر عار دلائیں گے۔''

پھر وہ آگے بڑھ کر ابنِ زیاد کی مسند پر اس کے برابر بیٹھ گئے۔ اب ابنِ زیاد نے بات بدل کر کہا، ''محمد ﷺ کی صحبت تو آپ کے لیے زینت ہے باعثِ عیب نہیں۔'' پھر اس نے حوضِ کوثر کے بارے میں ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے حوضِ کوثر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے فرمایا، ''ہاں ہاں ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں، تین دفعہ نہیں

چار دفعہ نہیں...... (بلکہ بارہا) کہ جو شخص حوضِ کوثر کا انکار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو نہ اس کے قریب پھٹکنے دے گا اور نہ اس کے پانی سے اس کو سیراب کرے گا۔'' یہ فرما کر غصے کی حالت میں فوراً وہاں سے چل دیے۔

یہ صاحبؓ رسولؐ جو سید المرسلین ﷺ کے شرفِ صحبت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے اور حق بات کہنے میں حاکمِ وقت تک کی پروا نہیں کرتے تھے، سیدنا حضرت ابو برزہ اسلمیؓ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابو برزہؓ کا نام نضلہ تھا اور ان کا تعلق قبیلہ اسلم بن افصیٰ سے تھا۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:

نضلہؓ بن عبداللہ بن حارث بن حبال بن ربیعہ بن دعیل بن انس بن خزیمہ بن مالک بن سلامان بن اسلم بن افصیٰ۔

بنو اسلم مرّ ظہران اور اس کے قرب وجوار میں آباد تھے۔ حضرت ابو برزہؓ کی ابتدائی زندگی کے حالات کا پتہ نہیں چلتا اور نہ مکے میں ان کی آمد کے زمانہ کا تعین کیا جاسکتا ہے تاہم علامہ ابنِ سعدؒ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ہجرت نبوی کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ تقریباً تمام غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کے ہم رکاب رہے۔

فتح مکہ (۸ ہجری) کے موقع پر سرورِ عالم ﷺ نے جن چند اشخاص کو واجب القتل قرار دیا ان میں ایک عبداللہ بن خطل بھی تھا۔ یہ شخص سخت بد باطن تھا۔ دینِ حق اور ہادیِ برحق ﷺ سے اس کی دشمنی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی دو کنیزوں کو حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ کی ہجو کے اشعار حفظ کرا رکھے تھے اور وہ انہیں سر تال کے ساتھ گایا کرتی تھیں۔ مسندِ ابوداؤد میں ہے کہ حضور ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو عبداللہ بن خطل خانۂ کعبہ کا غلاف پکڑ کر لٹک گیا تاکہ اس کو امان مل جائے، لیکن اس کے جرائم اتنے بھیانک تھے کہ حضورؐ کے نزدیک وہ کسی صورت میں امان کا مستحق نہیں تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت ابو برزہؓ کو حکم دیا کہ اس کو کیفرِ کردار تک پہنچا دو۔ انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا۔

حضرت ابو برزہؓ نے پورا عہدِ رسالت مدینہ منورہ میں گزارا۔ عہدِ صدیقی میں بھی یہیں قیام رہا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو انہوں نے بصرہ کی سکونت اختیار کر لی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا تو انہوں نے حضرت علیؓ کی پُر جوش حمایت کی اور جنگِ صفین میں شامی فوجوں کے خلاف بڑی ثابت قدمی سے لڑے۔ اس کے بعد جنگ نہروان میں خارجیوں کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابو برزہؓ نے خراسان کی فتوحات میں مجاہدانہ حصہ لیا، لیکن انہوں نے یہ تصریح نہیں کی کہ وہ کس زمانے میں اور خراسان کی کون سی مہم میں شریک ہوئے۔ قیاس یہ ہے کہ وہ خراسان کی اُن مہموں میں شریک ہوئے جو امیر معاویہؓ کے عہد میں بھیجی گئیں۔

حضرت ابو برزہؓ نے ۶۵ ہجری میں وفات پائی۔ اپنے پیچھے ایک لڑکا مغیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔

(۲)

حضرت ابو برزہؓ کو فیضانِ نبوت سے بہرہ یاب ہونے کا کافی موقع ملا اس لیے وہ علم و فضل کے اعتبار سے بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان سے چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ۲۷ متفق علیہ ہیں، ۲ میں بخاری اور ۴ میں مسلم منفرد ہیں۔

ان کے کثیر التعداد شاگردوں میں ابو عثمان نہدیؒ، ابو منہال ریاحیؒ، ارزق بن قیسؒ ابو طالوتؒ، مغیرہؒ، ابو العالیہ ریاحیؒ، کنانہ بن نعیمؒ، رابسیؒ اور ابو السوار عدویؒ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت ابو برزہؓ نہایت پاکیزہ اخلاق و کردار کے حامل تھے۔ سبقت فی الاسلام، شوقِ علم، شوق جہاد، حُبِ رسولؐ، جود وسخا اور سادگی ان کی کتابِ سیرت کے خاص ابواب ہیں۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ ان کا معمول تھا کہ صبح وشام غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ حسن بن حکیمؒ اپنی والدہ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو برزہؓ ثرید (عربوں کا ایک مرغوب کھانا) کا ایک بڑا طشت بھر کر ہر صبح شام بیواؤں یتیموں اور مسکینوں کو کھلاتے تھے۔

حضرت ابو برزہؓ کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا تھا، لیکن وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زندگی بھر کبھی پُر تکلف لباس نہ پہنا، صرف دو گیروے کپڑے پہنتے تھے۔ گھوڑے

کی سواری سے بھی اجتناب تھا۔ ان کے ایک ہم عصر صحابی حضرت عائذؓ بن عمر عمدہ کپڑے بھی پہنتے تھے اور گھوڑے پر بھی سوار ہوتے تھے۔ کسی شخص نے ان دونوں بزرگوں کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کے خیال سے حضرت عائذؓ سے کہا کہ ابو برزہؓ نے تو آپ کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ آپ خز (ایک قیمتی کپڑا) استعمال کرتے ہیں اور گھوڑے پر بھی سوار ہوتے ہیں لیکن ابو برزہؓ ان دونوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ حضرت عائذؓ نے فرمایا، ''اللہ تعالیٰ ابو برزہؓ پر اپنی رحمت نازل کرے آج ہم میں کون ان کی ہمسری کرسکتا ہے؟'' وہ شخص حضرت عائذؓ کے جواب سے مایوس ہوکر حضرت ابو برزہؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا، دیکھیے عائذ کس ٹھاٹھ سے زندگی گزارتے ہیں، خز کا لباس پہنتے ہیں اور گھوڑے پر سواری کرتے ہیں۔ حضرت ابو برزہؓ نے جواب دیا ''اللہ تعالیٰ عائذ پر رحم کرے ہم میں ان کے مرتبہ کا کون ہے؟''

حضرت ابو برزہؓ نے جنگ صفین میں بلاشبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ساتھ دیا لیکن طبعًا وہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں حصہ لینا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ بعد میں انہوں نے مسلمانوں کی کسی باہمی آویزش میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ مروان اور ابنِ زبیرؓ کے درمیان جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، وہ ان سے بالکل کنارہ کش رہے اور اس چپقلش پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عبداللہ بن سہیلؓ

حضرت ابوسہیل عبداللہؓ اس نامور باپ کے فرزند تھے جو اپنی طلاقتِ لسانی اور فصیح البیانی کی بدولت خطیبِ قریش کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مجمعوں کو آناً فاناً متحرک کردیا کرتے تھے۔ صرف خطابت ہی نہیں ان کی دانائی اور معاملہ فہمی بھی قریش کے نزدیک مسلم تھی، یہ خطیبِ قریش سہیل بن عمروؓ تھے۔ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ سہیلؓ اپنی دانش وحکمت اور جہاندیدگی کے باوجود فتح مکہ تک کفر وشرک کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے رہے لیکن اولاد (ذکور واناث) ایسی سعادت مند نکلی کہ بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے ہی میں شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوکر سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں شامل ہوگئی۔ حضرت عبداللہ، سہیل بن عمروؓ ہی کے فرزند تھے۔ ان کا تعلق قبیلہ عامر بن لوی سے تھا نسب نامہ یہ ہے:

عبداللہ بن سہیل بن عمرو بن عبدِ شمس بن عبدِ ودّ بن نضر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی۔

والدہ کا نام فاختہ بنتِ عامر (بن نوفل بن عبد مناف بن قصیّ) تھا۔

اس طرح والد اور والدہ دونوں طرف سے ان کا سلسلۂ نسب اوپر جاکر سرورِ عالم ﷺ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے دعوتِ حق کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کیا تو ان کے والد سخت غضب ناک ہوئے۔ انہیں مارا پیٹا قیدِ تنہائی میں رکھا لیکن وہ حق پر قائم رہے اس پر والد نے ان کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مشرکینِ مکہ بھی اسلام لانے کے ”جرم“ میں

انہیں ستانے لگے۔ آخر ۶ بعدِ بعثت میں۔ وہ سرورعالم ﷺ کے ایما پر مہاجرین حبش کے دوسرے قافلے میں شامل ہوکر حبش کے دارالغربت میں پہنچ گئے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ وہ کچھ عرصہ بعد حبش سے مکہ واپس آ گئے۔ والد اب ان پر پہلے سے بھی زیادہ سختی کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کوٹھڑی میں قید کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک محمد (ﷺ) کا دین نہیں چھوڑو گے اسی طرح قید و بند اور بھوک پیاس کی مصیبتیں جھیلتے رہو گے۔ حضرت عبداللہؓ نے مجبور ہوکر بظاہر باپ کا کہنا مان لیا اور رہائی حاصل کر لی لیکن دل سے وہ پکے اور سچے مسلمان ہی رہے۔

۲ ہجری میں مشرکینِ قریش بدر کی لڑائی کے لیے مکہ سے روانہ ہوئے تو حضرت عبداللہؓ بن سہیلؓ کو بھی اپنے لشکر میں شامل کر لیا۔ جب میدانِ بدر میں حق و باطل کے پیرو ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو حضرت عبداللہؓ شرک کا ظاہری جامہ چاک کر کے جھٹ لوائے توحید کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ان کے والد غیظ و غضب میں دانت پیسنے لگے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

حضرت عبداللہؓ بڑی بہادری سے مشرکین کے خلاف لڑے اور یوں اصحابِ بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل کر لیا۔

غزوۂ بدر کے بعد حضرت عبداللہؓ نے اُحد، خندق، حدیبیہ، فتح مکہ اور عہدِ نبوی کے دوسرے مشہور غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ بیعتِ رضوان (۶ ہجری) میں بھی شریک تھے اور صلح نامۂ حدیبیہ پر انہوں نے بھی گواہ کے طور پر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔

فتح مکہ (۸ ہجری) کے موقع پر حضرت عبداللہؓ کے والد سہیلؓ گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے اور حضرت عبداللہؓ کو کہلا بھیجا کہ محمد (ﷺ) سے میری جاں بخشی کرا دو ورنہ میری جان کی خیر نہیں۔ حضرت عبداللہؓ کو باپ کی بے بسی پر رحم آ گیا۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کی "یارسول اللہ میرے باپ کو امان دے دیجیے۔" حضورؐ کا دریائے کرم اس وقت جوش پر تھا آپؐ نے فرمایا "ان کو امان ہے بلا خطر گھر سے باہر نکل کر گھومیں پھریں۔" "مستدرک حاکم" میں ہے کہ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ سہیلؓ سے کوئی شخص سختی سے پیش نہ آئے۔

خدا کی قسم وہ ایک دانا آدمی ہے ایسا دانش مند اسلام سے دور نہیں رہ سکتا۔ اس طرح اپنے سعادت مند فرزند کی بدولت سہیلؓ کو امان مل گئی اور ساتھ ہی انہوں نے قبولِ ایمان کا شرف حاصل کرلیا۔ اس کے بعد ان کی ساری زندگی گزشتہ اعمال کی تلافی کرنے میں گزری۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں فتنۂ ارتداد نے زور پکڑا تو حضرت عبداللہؓ بن سہیلؓ اس لشکر میں شامل ہوگئے جو حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں مسیلمہ کذّاب کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ مسلمانوں اور مسیلمہ کے درمیان یمامہ کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی۔ حضرت عبداللہؓ نے اس لڑائی میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت پیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے والد حضرت سہیلؓ سے تعزیت کی تو انہوں نے کہا، میں نے سنا ہے کہ شہید اپنے گھرانے کے ستر آدمیوں کی شفاعت کرسکتا ہے مجھے اُمید ہے کہ میرا شہید فرزند سب سے پہلے بارگاہِ خداوندی میں میری سفارش کرے گا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابوجندل بن سہیلؓ

(۱)

اصل نام عاص تھا لیکن تاریخ میں وہ اپنی کنیت ابوجندل سے مشہور ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوجندل عاصؓ بن سہیلؓ بن عمرو بن عبدِ شمس بن عبدِ ودّ بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لُوَیّ۔

حضرت ابوجندلؓ کے والد سہیلؓ بن عمرو رؤسائے قریش میں سے تھے اور اپنی طلاقتِ لسانی کی بدولت ''خطیب قریش'' کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ اپنی فصیح و بلیغ اور زوردار تقریروں سے لوگوں میں زبردست جوش اور ولولہ پیدا کر دیا کرتے تھے بدقسمتی سے ان کا سارا زورِ بیان اور ملکۂ خطابت فتح مکہ تک اسلام کے خلاف صرف ہوتا رہا۔ خدا کی قدرت سہیلؓ جس قدر اسلام کی مخالفت میں سرگرم تھے ان کی اولاد اسی قدر اسلام کی والہ وشیدا تھی۔ ان کی دو بیٹیاں سہلہؓ اور اُمِ کلثومؓ اور دو بیٹے عبداللہؓ اور ابوجندل عاصؓ ان سعادت مند روحوں میں سے تھے جنہوں نے بعدِ بعثت کے ابتدائی زمانے میں دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ حضرت ابوجندلؓ کو ان کے والد نے قبول اسلام کے ''جرم'' کی یہ سزا دی کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر قید خانے میں ڈال دیا جہاں وہ سالہا سال تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلتے رہے یہاں تک کہ ہادیِ برحق ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے اور بدر، اُحد اور احزاب کے معرکے بھی گزر گئے۔

(۲)

ذیقعدہ ۶ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے چودہ سو صحابہؓ کے ہم راہ عمرہ کے لیے مدینہ منورہ

سے مکہ معظّمہ کا عزم فرمایا۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے مسلمانوں کو مکہ معظّمہ میں داخل ہونے سے روکنے کا ارادہ کرلیا۔ حضورؐ نے مکہ معظّمہ سے ایک منزل ادھر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا اور قریش کو پیغام بھیجا کہ ہم صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں اور لڑنا بھڑنا ہمارا مقصد نہیں ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ قریش کچھ مدت کے لیے ہم سے صلح کرلیں۔ اس کے جواب میں قریش نے عروہ بن مسعود ثقفی کو اپنا سفیر بنا کر حضورؐ کے پاس گفتگو کے لیے بھیجا۔ انہوں نے واپس جا کر قریش کو بتایا کہ محمد (ﷺ) کے ساتھی ان سے دیوانہ وار محبت کرتے ہیں اور محمد (ﷺ) کی خاطر وہ اپنی جانیں کسی تامل کے بغیر قربان کرسکتے ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ مسلمانوں سے صلح کرلی جائے۔ لیکن قریش نے عروہؓ کی بات نہ مانی۔ حضورؐ نے پھر ایک سفیر بھیجا لیکن قریش نے اس سے بھی بدسلوکی کی اور مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ایک دستہ بھیج دیا۔ مسلمانوں نے اس کو پکڑ لیا لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے معاف فرمادیا اور اتمامِ حجت کے لیے حضرت عثمان غنیؓ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا۔ قریش نے ان کو مکہ میں روک لیا۔

ادھر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے اپنے ساتھ آنے والے تمام صحابۂ کرامؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ یہ بیعت تاریخ میں ''بیعتِ رضوان'' کہلاتی ہے کیوں کہ بیعت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی تاہم مسلمانوں کے جوش و خروش کی خبر پا کر مشرکین مکہ کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ مسلمانوں سے صلح کا معاہدہ کرنے پر تیار ہوگئے۔ ان کی طرف سے حضرت ابوجندلؓ کے والد سہیل بن عمرو شرائطِ صلح طے کرنے حدیبیہ آئے۔ حضورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو معاہدۂ صلح لکھنے کا حکم دیا۔ پہلے ''رحمٰن'' اور ''رسول اللہ'' کے الفاظ پر ردوکد ہوئی۔ یہ معاملہ طے ہوا تو پہلی شرط یہ لکھی گئی کہ مسلمان اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں البتہ آئندہ سال وہ اس مقصد کے لیے آسکیں گے۔

اس کے بعد سہیلؓ نے دوسری شرط یہ پیش کی کہ اہلِ مکہ میں سے جو شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، مسلمانوں کو اسے قریش کے پاس واپس بھیجنا ہوگا اور اگر کوئی مسلمان اہلِ مکہ کے قبضے میں آجائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

مسلمانوں کو یہ شرط بڑی عجیب معلوم ہوئی اور انہوں نے بیک زبان کہا "یہ شرط قرینِ انصاف نہیں اور ہمیں منظور نہیں۔" لیکن سہیلؓ کا اصرار تھا کہ یہ شرط ضرور لکھی جائے۔ ابھی اس پر ردوقدح جاری تھی کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ حضرت ابوجندلؓ کسی طرح قید خانے سے نکل کر گرتے پڑتے حدیبیہ آ پہنچے۔ ان کے ٹخنوں اور پنڈلیوں سے خون رس رہا تھا، پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ پکار پکار کر مسلمانوں سے فریاد کر رہے تھے:

"مسلمانو! دیکھو اسلام لانے کے جرم میں میرے والد نے میری یہ گت بنائی ہے کیا تم مجھے اس مصیبت سے نجات نہیں دلاؤ گے؟"

انہیں اس حال میں دیکھ کر مسلمانوں میں کہرام مچ گیا لیکن سہیل بھپر گئے اور کہنے لگے:

"اے محمد (ﷺ) اس صلح نامے کی تکمیل اسی صورت میں ہوگی کہ پہلے اس سر پھرے کو واپس کیا جائے۔ شرائطِ صلح پورا کرنے کا یہ پہلا موقع ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا: "بھائی یہ شرط تو ابھی لکھی بھی نہیں گئی اس لیے ابوجندل پر اس کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے؟"

سہیل نے چمک کر جواب دیا۔ "کچھ بھی ہو جب تک ابوجندل کو ہمارے حوالے نہیں کیا جائے گا ہم کسی شرط پر صلح نہیں کریں گے۔"

سرورِ عالم ﷺ اور صحابہؑ کرامؓ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ کسی طرح نہ مانے۔ بالآخر حضورؐ نے سہیل کی شرط قبول کر لی اور فرمایا:

"اچھا تم ابوجندل کو اپنے ساتھ واپس لے جاؤ۔"

اس موقع پر حضرت ابوجندلؓ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور بآواز بلند پکارے:

"اے گروہِ مسلمین! ایک مسلمان کو پھر مشرکوں کے سپرد کر رہے ہو تا کہ وہ اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ سکیں۔ ذرا میرے جسم پر ان کی مار کے نشانات دیکھو کہ کس طرح ان سے خون کے دھارے بہہ رہے ہیں۔"

ان کی فریاد سن کر حضرت عمر فاروقؓ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا:

"یارسول اللہ، کیا آپ پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟"

فرمایا، ''بے شک میں پیغمبرِ برحق ہوں۔''

حضرت عمرؓ نے پوچھا'' کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟''

حضورؐ نے فرمایا، ''بے شک ہیں۔''

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، ''پھر ہم دب کر صلح کیوں کریں۔''

حضورؐ نے فرمایا، ''میں اللہ کا رسول ہوں اور اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتا، وہی میرا حامی و ناصر ہے۔''

حضرت عمر فاروقؓ حضورؐ کا ارشاد سن کر خاموش ہو گئے اب حضرت ابوجندلؓ نے پھر فریاد کی:

''مسلمانو کیا تم مجھے اس لیے قریش کے حوالے کر رہے ہو کہ وہ مجھے دینِ حق سے برگشتہ کریں۔''

سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوجندلؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''ابوجندل صبر کرو، ہمارے طرزِ عمل کا نتیجہ بہت جلد ظاہر ہونے کو ہے (یہ آپؐ نے کنایتاً فرمایا) اللہ تمہارے اور دوسرے مظلوم مسلمانوں کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔''

غرض حضرت ابوجندلؓ اسی طرح پابہ زنجیر سہیلؓ کے حوالے کر دیے گئے اور صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔

رحمتِ عالم ﷺ عمرہ کیے بغیر ہی صحابہؓ کے ہمراہ عازمِ مدینہ ہوئے تو بارگاہِ خداوندی سے ارشاد ہوا:

اِنَّا فَتَحنَا لَکَ فَتحاً مُّبِیناً

اے رسول ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کی

یہ ارشادِ خداوندی فی الحقیقت ان فتوحات اور کامرانیوں کی نوید تھا، جو مسلمانوں کو آئندہ حاصل ہونے والی تھیں ورنہ اکثر صحابہؓ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے دب کر صلح کی ہے۔

(۲)

سرورِ عالم ﷺ حدیبیہ سے مدینہ واپس تشریف لائے تو بنوثقیف کے ایک مظلوم

مسلمان حضرت ابوبصیرؓ کسی طریقے سے کفّارِ مکہ کے پنجۂ ستم سے چھوٹ کر مدینہ آ گئے۔ مشرکین مکہ نے انہیں واپس لانے کے لیے اپنے دو آدمی حضورؐ کے پاس بھیجے۔ آپؐ نے معاہدۂ حدیبیہ کی شرط کے مطابق حضرت ابوبصیرؓ کو ان آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ اثنائے راہ میں حضرت ابوبصیرؓ نے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا اور دوسرا بھاگ کر مدینہ آ گیا۔ اس نے حضورؐ کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ بیان کیا، اتنے میں حضرت ابوبصیرؓ بھی بارگاہِ رسالت میں پہنچ گئے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ آپؐ کو اللہ نے اپنی ذمے داری سے سبکدوش کر دیا کیوں کہ آپؐ نے معاہدے کی شرط پوری کر دی۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے مجھے مشرکوں کے پنجۂ ستم سے نجات دلا دی۔''

حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا، ''اس شخص کو اگر چند ساتھی مل جائیں تو یہ جنگ کے شعلے بھڑکا سکتا ہے۔''

حضرت ابوبصیرؓ سمجھ گئے کہ حضورؐ انہیں ضرور مکہ واپس بھیج دیں گے وہ چپکے سے مدینہ کے ساحلی مقامات کی طرف نکل گئے اور مکہ سے شام جانے والے تجارتی راستے کے قریب ایک مقام کو اپنا مستقر بنا لیا۔

چند دن بعد حضرت ابوجندلؓ بھی کسی طرح موقع پا کر قید سے نکل بھاگے اور حضرت ابوبصیرؓ کے پاس پہنچ گئے۔ اسی طرح کچھ اور مظلوم مسلمان بھی قریشِ مکہ سے بچ کر وہاں آ گئے، رفتہ رفتہ حضرت ابوبصیرؓ کے پاس خاصی جمعیت ہو گئی۔ ان لوگوں نے اب قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ قریش کے لیے کوئی تجارتی قافلہ بھیجنا مشکل ہو گیا۔ اس طرح تجارت، جس پر ان کی معیشت کا انحصار تھا سخت خطرے میں پڑ گئی۔ اب وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کو واپس نہ کرنے کی شرط کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب تک یہ شرط قائم ہے ان کے پنجے سے نکل جانے والے مسلمان قریش کی تجارت کے لیے خطرہ بنے رہیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ شرط منسوخ کر دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں ایک قاصد بھیج کر درخواست کی کہ خدا اور صلۂ رحمی کا واسطہ اس شرط کو منسوخ کر دیں اور ابوبصیرؓ، ابوجندلؓ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلا لیں۔ آئندہ جو مسلمان بھاگ جائے گا وہ آزاد ہے آپ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔

حضورؐ نے قریش کی درخواست منظور فرمالی اور حضرت ابوبصیرؓ کی جماعت کو ایک خط لکھا

کہ ابوبصیر اور ابوجندل ہمارے پاس مدینہ آ جائیں اور دوسرے لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ جب یہ نامۂ مبارک حضرت ابوبصیرؓ کو ملا تو وہ بسترِ مرگ پر تھے، اسے پڑھتے پڑھتے ہی جاں بحق ہوگئے۔ حضرت ابوجندلؓ نے نمازِ جنازہ پڑھا کر اسی جگہ سپردِ خاک کر دیا اور خود ارشادِ نبوی کی تعمیل میں مدینہ چلے آئے۔ مدینہ آنے کے بعد حضرت ابوجندلؓ نے فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک وغیرہ تمام غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

حضرت ابوجندلؓ حضورؐ کے وصال تک مدینہ منورہ ہی میں رہے اور عہدِ صدیقی بھی یہیں گزارا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہوگئے اور رومیوں کے خلاف متعدد معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ وہ مسلسل چھ سال تک شام کے میدانِ جہاد میں سرگرم و غار رہے۔ ۱۸ھ میں طاعونِ عمواس کی وبا پھیلی تو دوسرے ہزاروں مجاہدین کی طرح حضرت ابوجندلؓ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے اور گھر سے سینکڑوں میل دور میدانِ جہاد میں وفات پائی۔

ابنِ جریر طبری نے حضرت ابوجندلؓ کے قیامِ شام کے زمانے کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ مجاہدین سے شراب نوشی کی لغزش سرزد ہوگئی۔ حضرت ابوجندلؓ بھی ان میں شامل تھے۔ امیرِ شام حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت کے مطابق ان سب پر مجمع عام میں حد جاری کی (ہر ایک کو اسّی اسّی کوڑے لگائے گئے)۔ ان اصحاب کو اپنی لغزش اور اس سزا پر اتنی ندامت ہوئی کہ منہ چھپا کر بیٹھ رہے اور باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ حضرت ابوجندلؓ بہت زیادہ حساس تھے۔ ان کے دماغ پر بہت برا اثر پڑا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو ان کی حالت سے مطّلع کیا اور درخواست کی کہ ابوجندلؓ کے نام ایک تسلّی آمیز خط لکھ دیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوجندلؓ کے نام یہ خط لکھا:

> ”عمر کی طرف سے ابوجندل کے نام۔ اللہ ان لوگوں کی خطا کبھی نہیں معاف کرے گا جو اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ اس سے کم درجہ کے خطاواروں کو اگر اس کی مرضی ہوگی تو معاف کر دے گا۔ لہٰذا تم توبہ کرو، سر اٹھاؤ، باہر نکلو اور مایوس نہ ہو۔ اللہ عزوجلّ فرماتا ہے اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے نفس کے ساتھ زیادتیاں کی

ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، وہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقاضائے بشری کی بنا پر کسی صحابی سے کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو وہ اپنے اوپر بخوشی حد بھی جاری کروا لیتے تھے اور سخت ندامت بھی محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو جندلؓ کو بطورِ خاص خط لکھ کر تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ شرک کے سوا سب گناہ معاف کر دے گا اس لیے تم عزلت گزینی مت اختیار کرو۔ اس خط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو جندلؓ مسلمانوں میں بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے اور حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک ان کی بڑی وقعت تھی۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو جندلؓ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے اور بڑے اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ انہوں نے ''الاستیعاب'' میں حضرت ابو جندلؓ کے چند اشعار نقل بھی کیے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ـــ فقیہ الاُمّت

۱

حضرت سفیان ثوریؒ، امام شعبیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش کے چار نوجوان حرم کعبہ میں جمع ہوئے اور چاروں میں طے پایا کہ ہم میں سے ہر شخص رکنِ یمانی پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے کے لیے دُعا مانگے۔ چنانچہ پہلے ایک جوان اٹھا اور اس نے دعا مانگی:

> ''الٰہی تو عظیم ہے اور تجھ سے عظیم چیزیں ہی مانگی جاتی ہیں اس لیے میں تجھ کو تیرے عرش، تیرے حرم، تیرے نبیؐ اور تیری ذات کی حرمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک ارضِ حجاز پر میری خلافت نہ قائم ہو جائے۔''

اس کے بعد دوسرے جوان نے رکنِ یمانی پکڑ کر دُعا مانگی:

> ''بارِ الٰہا تو کائنات کی ہر شے کا خالق ہے۔ آخر میں ہر چیز کو تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ میں تجھ سے تیری قدرت کا واسطہ دے کر جس کے قبضہ میں تمام عالم ہے، دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ میں عراق کا والی نہ ہو جاؤں......''

پھر تیسرے جوان نے دعا مانگی:

> ''اے ارض و سما کے مالک میں تجھ سے ایسی چیز مانگتا ہوں جس کو تیرے اطاعت گزار بندوں نے تیرے حکم سے مانگا ہے۔ میں تجھ سے تیری ذات کی کبریائی، تیری مخلوقات اور اہلِ حرم کے حق کا واسطہ دے کر دعا مانگتا ہوں کہ تو مجھے دنیا سے اس وقت

تک نہ اٹھا جب تک مشرق و مغرب پر میری حکومت قائم نہ ہو جائے اور جو شخص میرے خلاف کھڑا ہو اس کا سر نہ کچل دوں۔"

اس کے بعد چوتھا جوان اٹھا اور اس نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دعا مانگی:

"اے اللہ تو رحمٰن و رحیم ہے میں تیری اُس رحمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں جو تیرے غضب پر غالب ہے کہ مجھے آخرت میں رُسوا نہ کرنا اور مجھے اُس عالم میں جنت عطا فرمانا۔"

پہلے جوان حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تھے، دوسرے ان کے چھوٹے بھائی مُصعَب بن زبیرؓ، تیسرا جوان عبدالملک بن مروان تھا اور چوتھے جوان جن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا صرف اور صرف آخرت کی بھلائی تھی، فقیہ الاُمّت حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن عمرؓ کا شمار اساطینِ اُمت میں ہوتا ہے وہ عام طور پر "ابنِ عمرؓ" کے نام سے مشہور ہیں یعنی اس عمرِ فاروقؓ کے فرزند جن کے بارے میں سیدالانبیاء والمرسلینؐ نے فرمایا تھا:

"لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَّکَانَ عُمَرُ نَبِیًّا الا اِنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِی۔"

(اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔)

حضرت ابنِ عمرؓ بن خطاب بن نُفَیل بن عبدالعزّیٰ بن رباح بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لُوَیّ۔

کعب بن لُوَیّ پر ان کا سلسلۂ نسب سرورِ عالم ﷺ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔

ماں کا نام زینبؓ بنتِ مظعون تھا وہ بنو جُمح سے تھیں اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھیں۔

اُمُّ المومنین حضرت حفصہؓ بنتِ عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تاریخِ اسلام کے چار معروف عبادلہ میں سے ایک ہیں۔ باقی تین عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ یہ چاروں نادرِ روزگار شخصیات تھیں۔

معتبر روایات کی رو سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ ۲ بعد بعثت میں پیدا ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے ۶ بعدِ بعثت میں اسلام قبول کیا تو حضرت ابنِ عمرؓ تقریباً پانچ برس کے بچے تھے۔ والدِ گرامی کے قبولِ اسلام کے ساتھ وہ خود بخود ہی اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گئے اور ان کا نشو ونما خالص اسلامی ماحول میں ہوا۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت عبداللہؓ بھی والدِ گرامی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے اس وقت ان کا سن گیارہ برس کا تھا۔ غزوات کا آغاز ہوا اور سرورِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے شوقِ جہاد سے بے تاب ہو کر حضورؐ سے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مانگی لیکن آپؐ کا معمول تھا کہ پندرہ برس سے کم عمر کے لڑکوں کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے چونکہ حضرت ابنِ عمرؓ کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس کی تھی اس لیے حضورؐ نے انہیں واپس بھیج دیا۔ غزوۂ اُحد میں وہ چودہ برس کے تھے اس لیے اس میں بھی شریک نہ ہو سکے۔

۳

سب سے پہلا غزوہ جس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے دادِ شجاعت دی غزوۂ احزاب (۵ ھ) تھا۔ اس وقت ان کی عمر لڑائی کے قابل ہو چکی تھی۔

۶ ہجری میں صلح حدیبیہ سے پہلے انہیں بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس طرح وہ اصحاب الشجرہ میں شامل ہو گئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حسنِ اتفاق سے بیعتِ رضوان کا شرف انہیں اپنے جلیل القدر والد سے پہلے حاصل ہو گیا وہ اس طرح کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک انصاری سے گھوڑا لانے کے لیے بھیجا۔ حضرت عبداللہؓ باہر نکلے تو سرورِ عالم ﷺ صحابۂ کرامؓ سے بیعت لے رہے تھے، انہوں نے لپک کر پہلے خود بیعت کی اور پھر والدِ گرامی کو جا کر اطلاع دی۔ وہ بھی فوراً بارگاہِ رسالت میں پہنچے اور بیعت کی سعادت حاصل کی۔

بیعتِ رضوان کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ نے خیبر، فتح، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

امام بخاریؒ نے فتح مکہ کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے وقت حضرت ابنِ عمرؓ کا سن بیس برس کا تھا اور وہ ایک منہ زور تیز رفتار گھوڑے پر سوار تھے۔ ان کے جسم پر ایک چھوٹی سی چادر تھی اور ہاتھ میں ایک بھاری نیزہ۔ ایک جگہ گھوڑے سے اتر کر اس کے لیے گھاس کاٹنے لگے۔ اتفاق سے حضورؐ کی نظر ان پر پڑی تو آپؐ نے مدح و تحسین کے لہجے میں فرمایا، ''یہ عبداللہ ہے عبداللہ۔'' اس کے بعد وہ حضورؐ کے پیچھے پیچھے مکہ میں داخل ہوئے۔ حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ حضورؐ کے ساتھ سوار تھے اور حضرت بلالؓ اور حضرت عثمانؓ بن طلحہ آپ کے جلو میں تھے۔ خانۂ کعبہ کے صحن میں اونٹ بٹھا کر کنجی منگائی گئی اور کعبہ کا دروازہ کھول کر تینوں ایک ساتھ داخل ہوئے ان کے بعد خانۂ کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہونے کی سعادت حضرت ابنِ عمرؓ کو حاصل ہوئی۔

۱۰ ہجری میں حضرت ابنِ عمرؓ نے حجۃ الوداع میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

۱۱ ہجری میں حضورؐ کا وصال ہوا تو حضرت ابنِ عمرؓ اس قدر ملول اور شکستہ دل ہوئے کہ عمر بھر نہ کوئی مکان بنایا اور نہ کوئی باغ لگایا۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ کی یاد آتی بے قابو ہو کر رونے لگتے۔

(۴)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دل میں جہادِ فی سبیل اللہ کی بے پناہ تڑپ تھی۔ عہدِ صدیقی میں تو وہ بعض وجوہ کی بنا پر مدینہ منورہ سے باہر نہ جا سکے لیکن عہدِ فاروقی میں ایران، شام اور مصر کی فتوحات میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ والدِ گرامی امیر المؤمنین تھے لیکن وہ ایک عام مجاہد کی حیثیت سے لشکرِ اسلام میں شریک ہوئے اور کبھی کسی عہدے کی خواہش نہیں کی۔ واقدی نے کئی معرکوں میں ان کی شجاعت اور جانبازی کے واقعات بیان کیے ہیں۔

۲۳ ہجری کے اواخر میں حضرت عمر فاروقؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کی جاں بری کی کوئی امید نہ رہی تو انھوں نے اپنی جانشینی کا مسئلہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے سپرد کر دیا، جس میں اکابر صحابہؓ داخل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگرچہ اپنے علم و فضل اور دوسری صلاحیتوں کی بنا پر ہر طرح سے خلافت کے اہل تھے لیکن حضرت عمر فاروقؓ تقویٰ کے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ

انھیں اپنے فرزند کو خلیفہ نامزد کرنا گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے وصیت کردی کہ وہ خلیفہ کے انتخاب میں مشیر کی حیثیت سے تو شریک ہو سکتے ہیں لیکن خلافت کے لیے ان کے نام پر کسی صورت میں غور نہ کیا جائے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے اپنے عہد خلافت میں حضرت ابنِ عمرؓ کو قضا کا عہدہ پیش کیا لیکن انہوں نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کردی۔ علاّمہ بلاذریؒ نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ ۲۷ ہجری میں حضرت عثمانؓ نے افریقہ (تیونس، الجزائر اور مراکش) پر فوج کشی کی تو حضرت ابنِ عمرؓ لشکرِ اسلام میں شریک ہو گئے اور جہادِ فی سبیل اللہ میں پُر جوش حصہ لیا۔ ابنِ اثیرؒ کے بیان کے مطابق ۳۰ ہجری میں انہوں نے خراسان اور طبرستان کے معرکوں میں بھی حصہ لیا۔

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں فتنوں نے سر اٹھایا تو حضرت ابنِ عمرؓ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی کیونکہ انہیں مسلمانوں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونا کسی صورت میں گوارا نہ تھا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے انہیں مسندِ خلافت پر بٹھانا چاہا لیکن انہوں نے یہ بارِ گراں اٹھانے سے صاف انکار کردیا۔

امام حاکمؒ نے اپنے ''مستدرک'' میں غسان بن عبدالحمید کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت ابنِ عمرؓ نے اس شرط پر ان کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ خانہ جنگی میں شریک نہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین سے بالکل کنارہ کش رہے لیکن بعد میں ہمیشہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی عملاً حمایت نہیں کی۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کرلی اور قسطنطنیہ کی مہم میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بعد یزید تختِ حکومت پر بیٹھا تو بقولِ ابنِ سعدؒ انہوں نے اختلافِ اُمت کے فتنے سے بچنے کے لیے یہ کہہ کر اس کی بیعت کرلی کہ اگر یہ خیر ہے تو ہم اس پر راضی ہیں اور اگر بلا ہے تو ہم نے صبر کیا۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ۔

(پھر اگر تم نے منہ پھیرا تو اس کے ذمہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا گیا۔ اور تمہارے ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا گیا۔)

یزید کے بعد معاویہ ثانی اور مروان بن الحکم مسندِ حکومت پر بیٹھے۔ ۶۵ ہجری میں مروان نے وفات پائی تو اس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ بنا۔ حضرت ابن عمرؓ نے اس کو تحریری بیعت نامہ بھیج دیا، جس میں لکھا کہ میں اور میرے لڑکے اللہ اور اللہ کے رسول کی سنت پر امیر المؤمنین عبدالملک کی سمع واطاعت کا بقدرِ استطاعت عہد کرتے ہیں۔

حضرت ابنِ عمرؓ نے عبدالملک ہی کے عہدِ خلافت میں ۷۴ ہجری میں بہ عمر چوراسی سال وفات پائی۔ اہلِ سیر نے ان کی وفات کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔ ابنِ سعدؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج بن یوسف خطبہ دے رہا تھا اس میں اُس نے اپنے حریف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر تہمت لگائی کہ انہوں نے قرآنِ حکیم میں تحریف کی ہے۔ حضرت ابنِ عمرؓ یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بھرے مجمع میں کڑک کر کہا، تو جھوٹ بولتا ہے۔ نہ ابنِ زبیرؓ میں اتنی طاقت ہے اور نہ تجھ میں یہ مجال کہ کلام اللہ میں تحریف کرسکو۔ حجاج کو حضرت ابنِ عمرؓ کی یہ ڈانٹ سخت ناگوار گزری لیکن علانیہ ان پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی البتہ ایک شامی کو اس بات پر مقرر کر دیا کہ حج کے موقعے پر نیزہ کی زہر آلود نوک ان کے پاؤں میں چبھو دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ زہر ان کے جسم میں سرایت کر گیا اور وہ جانبر نہ ہوسکے۔

امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں بیان کیا ہے کہ جب حجاج ابنِ زبیرؓ سے لڑنے کے لیے مکہ معظمہ آیا اور منجنیق نصب کرا کر خانۂ کعبہ کو سنگ باری کا نشانہ بنایا تو وہ سخت برہم ہوئے اور حجاج کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اس پر وہ غضب ناک ہوگیا اور اس کے اشارے پر ایک شامی نے ان کو اپنے نیزے کی زہر آلود نوک سے زخمی کر دیا۔ جب وہ بیمار ہوئے تو حجاج ان کی عیادت کے لیے آیا اور کہا، کاش مجھ کو مجرم کا پتہ چل جاتا تو میں اس کا سر اڑا دیتا۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا، یہ سب کچھ تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ تم حرم میں ہتھیار لانے کی اجازت دیتے اور نہ یہ واقعہ پیش آتا۔

ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا۔ اس کو اتنا طول دیا کہ عصر کا وقت تنگ ہوگیا۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا، آفتاب تیرا انتظار نہیں کرسکتا۔ اس پر حجاج برافروختہ ہوگیا اور ان کا دشمن بن گیا۔

ابنِ خلکان نے لکھا ہے کہ عبدالملک نے فرمان جاری کیا کہ تمام مناسکِ حج حضرت ابنِ عمرؓ کی اقتدا میں ادا کیے جائیں۔ حجاج بن یوسف کو یہ حکم سخت ناگوار گزرا لیکن خلیفہ کے حکم

سے مجبور تھا۔ اس نے اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالی کہ حضرت ابنِ عمرؓ کو نیزے کی زہر آلود نوک سے زخمی کرا دیا۔

ابنِ سعدؒ نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج کو خطبہ دیتے دیتے شام ہوگئی۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت ابنِ عمرؓ نے کہا ''اے شخص نماز کا وقت آ گیا ہے اب بیٹھ جا۔'' ان الفاظ کا تین بار اعادہ کیا لیکن اس نے خطبہ جاری رکھا۔ چوتھی بار انہوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر میں اٹھ جاؤں تو کیا تم لوگ اٹھنے کے لیے تیار ہو۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم تیار ہیں۔ یہ کہہ کر اٹھے اور حجاج سے کہا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے تمہیں نماز کی ضرورت نہیں ہے۔ اب حجاج منبر سے اتر آیا اور نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ کو بلا کر پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے فرمایا، ہم نماز کے لیے آتے ہیں اس لیے جب نماز کا وقت آ جائے تو ٹھیک وقت پر نماز پڑھ لو اس کے بعد جو چاہو کہتے رہو۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی اسی صاف گوئی کی وجہ سے حجاج ان کا دشمن بن گیا اور زہر آلود نیزہ سے حج کی بھیڑ بھاڑ میں انہیں زخمی کرا دیا۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی دلی تمنا تھی کہ وہ مدینہ منورہ میں وفات پائیں لیکن قدرت نے ان کی وفات مکہ معظّمہ میں لکھ رکھی تھی۔ وفات سے پہلے اپنے فرزند سالمؒ کو وصیت کی کہ اب میں یہاں وفات پا رہا ہوں تو مجھے حدودِ حرم کے باہر دفن کرنا۔ انہوں نے والدِ گرامی کی وصیت پر عمل کرنا چاہا لیکن حجاج نے مداخلت کی اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھا کر ''فخِ مہاجرین'' کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔

۵

علم وفضل کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار ان صحابۂ کبارؓ میں ہوتا ہے، جو جملہ دینی علوم کا بحرِ بے پایاں تھے۔ انہیں نہ صرف سالہا سال تک فیضانِ نبوی سے براہِ راست بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا بلکہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ جیسے نابغۂ عصر والد کی تعلیم وتربیت بھی میسر آئی۔ اس طرح وہ فضل وکمال کے اتنے بلند مقام پر فائز ہوگئے کہ بڑے بڑے فضلاء صحابہ ان پر رشک کیا کرتے تھے۔ قرآنِ حکیم اور اس کی تفسیر سے اتنا شغف تھا کہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ

قرآنی سورتوں اور آیات پر فکر و تدبر میں گزارتے تھے۔ مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ انہوں نے صرف سورۂ بقرہ پر فکر و تدبر میں چودہ برس صرف کیے۔ عہدِ رسالت میں انہیں اکابر صحابہؓ کے ساتھ اکثر سرورِ عالم ﷺ کی علمی مجلسوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوتی تھی، اس طرح ان کو قرآنِ حکیم کی تفسیر اور تفہیم میں غیر معمولی بصیرت حاصل ہوگئی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ صحابۂ کرامؓ کے مجمع میں رونق افروز تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضورؐ نے قرآنِ حکیم کی یہ آیت پڑھی:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (سورۂ ابراہیم: ۲۴، ۲۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا اور میوے دیتا ہو۔

پھر آپؐ نے صحابۂ کرامؓ سے پوچھا کہ اس آیت میں کس درخت کی مثال دی گئی ہے؟ تمام صحابۂ کرامؓ خاموش رہے تو آپؐ نے خود بتایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ بعد میں حضرت ابنِ عمرؓ نے اپنے والدِ گرامی حضرت عمرؓ کو بتایا کہ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ کھجور کے درخت کی مثال ہے لیکن بزرگ صحابہ کی خاموشی کی وجہ سے چپ رہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بیٹے اگر تم اس مجلس میں بتا دیتے تو مجھے فلاں فلاں چیز سے زیادہ محبوب ہوتا۔

قرآنِ حکیم میں فہم و بصیرت کے علاوہ حضرت ابنِ عمرؓ کو حدیث سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ان سے ایک ہزار چھ سو تیس احادیث مروی ہیں۔ ان میں ۱۷۰ متفق علیہ ہیں۔ ۸۱ میں بخاری اور ۳۱ میں مسلم منفرد ہیں۔ وہ حضورؐ کے نہ صرف ان ارشادات کو جو آپؐ سے براہِ راست سنتے تھے، حرزِ جان بنا لیتے تھے بلکہ ان کو بھی جو دوسروں کی وساطت سے ان تک پہنچتے تھے یاد رکھتے تھے، اس طرح حُفّاظِ حدیث میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہوگیا تھا۔ بایں ہمہ وہ روایتِ حدیث میں بہت محتاط تھے اور اسی وقت کوئی حدیث بیان کرتے تھے جب پورا یقین ہوتا تھا کہ اس میں

کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہے۔ اسی شدّتِ احتیاط کی بنا پر ان کی مرویات کو بہت مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے اساتذہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت بلال حبشیؓ، حضرت صہیب رومیؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت رافعؓ بن خدیج جیسے عظیم المرتبت صحابہؓ وصحابیاتؓ شامل ہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں سالمؒ، عبیداللہؒ، محمدؒ، نافعؒ، حفصؒ، عروہؒ بن زبیرؒ، موسیٰ بن طلحہؒ، ابوسلمہؒ بن عبدالرحمٰنؒ، سعیدؒ بن مسیبؒ، قاسمؒ، ابو بردہؒ بن ابوموسیٰ اشعریؒ، سعید بن یسارؒ، عکرمہؒ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، طاؤسؒ، عطاءؒ، ابوالزبیرؒ اور ابی ملیکہؒ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

فقہ جس پر تشریعِ اسلامی کا دارومدار ہے، حضرت ابنِ عمرؓ کو اس میں بھی درجۂ تبحرّ حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تعلیم وتعلّم اور درس وافتاء میں گزارا۔ حافظ ابنِ قیم کہتے ہیں کہ ''اگر حضرت ابنِ عمرؓ کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔'' فقہ مالکی کا تمام تر دارومدار حضرت ابنِ عمرؓ ہی کے فتاویٰ پر ہے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ ائمۂ دین میں سے تھے۔ اپنے تفقہ فی الدّین کی بنا پر حضرت ابنِ عمرؓ فقیہ الاُمّت کے لقب سے مشہور ہوگئے تھے۔ بایں ہمہ وہ فتویٰ دینے میں بے حد محتاط تھے۔ اگر کسی بات میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو ہرگز فتویٰ نہ دیتے اور مستفتی کو یہ کہہ کر لوٹا دیتے کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم نہیں۔ قیاس واجتہاد میں بھی خداداد ملکہ حاصل تھا لیکن اس سے اسی وقت کام لیتے جب کتاب وسنت میں کسی مسئلے کے بارے میں واضح احکام نہ ملتے ہوں۔ ایسا کرتے وقت وہ مستفتی سے صاف صاف کہہ دیتے کہ یہ میرا قیاس ہے اس کے باوجود بڑے بڑے ائمہ ان کی رائے کے بعد پھر کسی دوسری رائے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔

دینی علوم کے علاوہ حضرت ابنِ عمرؓ عرب کے دیگر علوم، شاعری، خطابت اور نسّابی میں بھی درک رکھتے تھے لیکن ان میں اپنا وقت صرف کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بحیثیتِ مجموعی وہ علم و فضل کے مجمع البحرین تھے اور بقول ابنِ سعدؒ ایک زمانہ میں لوگ دُعا مانگا کرتے تھے کہ الٰہی ہماری زندگی میں ابنِ عمرؓ کو زندہ رکھ تاکہ ہم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہیں، آج ان سے زیادہ عہدِ رسالت کا کوئی واقف کار نہیں۔

(۶)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے گلشنِ اخلاق میں حُبِّ رسولؐ، اتباعِ سنت، خشیتِ الٰہی، شوقِ جہاد و عبادت، زُہد و تقویٰ، فیاضی و ایثار نفسی، تواضع و انکسار، استغنا و قناعت، سادگی اور حق گوئی و بیباکی سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔

حُبِّ رسولؐ کی یہ کیفیت تھی کہ عہدِ رسالت میں زیادہ سے زیادہ وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضورؐ کا وصال ہوا تو وہ اس قدر مغموم اور شکستہ دل ہوئے کہ عمر بھر نہ کوئی مکان بنایا اور نہ کوئی باغ لگایا۔ جب بھی زبان پر رسول اللہ ﷺ کا اسمِ گرامی آتا آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ جب غزواتِ رسولؐ کے مقامات سے گزر ہوتا تو آنکھوں کے سامنے عہدِ رسالت کا نقشہ کھنچ جاتا اور اشک بار ہو جاتے۔ کوئی ان کے سامنے حضورؐ کا ذکر کرتا تو بے قابو ہو کر رونے لگتے۔ یحییٰ بن یحییٰؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیوخ سے سنا ہے کہ بعض لوگ حضرت ابنِ عمرؓ کے عشقِ رسولؐ کی کیفیت دیکھ کر انہیں مجنون تک کہنے لگے تھے۔ دراصل حضرت ابنِ عمرؓ کو عشقِ رسولؐ کی بنا پر پابندیِ سنت کا والہانہ جنون تھا اور ان کی زندگی سرورِ عالم ﷺ کی حسین و دلکش زندگی کا پرتو جمیل بن گئی تھی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں بھی نہایت شدت کے ساتھ اتباعِ سنت کا التزام کرتے تھے حتیٰ کہ اتفاقی اور بشری عادت میں بھی وہ حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ سفر و حضر میں حضورؐ نے جہاں کبھی نماز ادا کی، حضرت ابنِ عمرؓ بھی وہاں نماز ادا کرتے تھے جہاں آپؐ نے آرام فرمایا وہاں آرام کرتے تھے۔ جہاں آپؐ نے تھوڑی دیر کے لیے قیام فرمایا، حضرت ابنِ عمرؓ نے بھی وہاں ضرور قیام کیا۔ جن درختوں کے سایے میں حضورؐ نے کبھی آرام فرمایا تھا، حضرت ابن عمرؓ ان کو پانی دیتے تھے تاکہ خشک نہ ہونے پائیں اور وہ بھی ان کے سایہ میں آرام کر کے سنت کی پیروی کر سکیں۔ جب سفر سے لوٹتے تو سب سے پہلے روضۂ نبویؐ پر حاضر ہوتے اور سلام کہتے۔ مدینہ منورہ سے اس قدر محبت تھی کہ کسی حالت میں بھی وہاں سے نکلنا گوارا نہ تھا۔ ایک مرتبہ ان کے غلام نے تنگ دستی کی بنا پر مدینہ چھوڑنے کی اجازت چاہی۔ فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص مدینہ کے مصائب پر صبر کرے گا، قیامت کے دن میں اس کی شفاعت کروں گا۔

سرورِ عالم ﷺ کی آل اولاد سے بھی غیر معمولی محبت تھی اور وہ لوگوں کو اکثر ان کے فضائل سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ عام طور پر معلوم ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مناسکِ حج میں رسول اللہ ﷺ کے تمام سنن کا بدرجۂ غایت لحاظ رکھتے تھے یہاں تک کہ آپؐ نے جہاں جہاں طہارت کی تھی وہاں وہ بھی ضرور طہارت کرتے تھے۔ حج کے سفر میں وہی راستہ اختیار کرتے تھے جو حضورؐ نے اختیار کیا تھا۔ حضورؐ ذوالحلیفہ میں اتر کر نماز پڑھتے، حضرت ابنِ عمرؓ بھی ذوالحلیفہ میں ضرور نماز پڑھتے تھے۔ حضورؐ نے جن مقامات پر منزل کی تھی وہ بھی وہاں منزل کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجدِ قبا میں کبھی پا پیادہ اور کبھی سواری پر تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ حضورؐ مکہ میں داخل ہونے سے قبل بطحا میں تھوڑا سا سو لیتے تھے، حضرت ابنِ عمرؓ کا بھی یہی معمول تھا۔ حضورؐ اپنے جاں نثاروں کی دعوت ہمیشہ قبول فرما لیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ بھی کسی کی دعوت رَدّ نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ روزہ کی حالت میں بھی دعوت میں تشریف لے جاتے تھے گو کھانے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ غرض وہ تمام کاموں میں اسوۂ نبویؐ کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔

حضرت ابنِ عمرؓ نے نہایت گداز دل پایا تھا۔ خوف خدا اور روزِ جزا سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ کوئی آیت جس میں محاسبۂ آخرت کا ذکر ہوتا، سنتے تو لرزہ براندام ہو جاتے اور رونے لگتے۔ ایک دن عبید بن عمر سے یہ آیت سنی:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيْدًا ۝ (النسآء:۴۱)

اے رسولؐ! (آخرت کے) اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت سے ایک گواہ لا کھڑا کریں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے۔)

آیت سنتے ہی بے اختیار رونے لگے۔ یہاں تک کہ ڈاڑھی اور گریبان آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

خشیتِ الٰہی نے ان کے دل میں جہاد اور عبادت کا ایسا شوق پیدا کر دیا تھا کہ ان کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر سے لے کر بڑھاپے تک جہادِ فی سبیل اللہ میں برابر

حصہ لیتے رہے۔ عبادت کی یہ کیفیت تھی کہ قائم اللّیل اور دائم الصّوم تھے (نہایت کثرت سے نمازیں پڑھتے تھے اور نہایت کثرت سے روزے رکھتے تھے) بعض اوقات ایک رات میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے۔ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ساٹھ حج کیے اور ایک ہزار عمرے۔

زہد وتقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ''تہذیب التھذیب'' میں لکھا ہے کہ جوانانِ قریش میں عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ کوئی شخص اپنے نفس پر قابو رکھنے والا نہیں تھا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ آغازِ شباب ہی میں مسجد میں جا کر سویا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے خواب میں دوزخ کے فرشتوں کو دیکھا۔ دوسرے دن اس کا ذکر اپنی بہن اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ سے کیا۔ انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''عبداللہ جوانِ صالح ہے۔''

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاریؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سوائے ابنِ عمرؓ کے کوئی شخص ایسا نہ تھا، جس کو دنیا کی دلفریبیوں نے اپنی طرف مائل نہ کیا ہو لیکن ان کا دامن کبھی دنیا سے آلودہ نہ ہوا۔ جو شخص حضورؐ کے کسی ایسے صحابی کو دیکھنا چاہے جس میں آپؐ کے وصال کے بعد بھی مطلق کوئی تغیر نہیں ہوا تو وہ ابنِ عمرؓ کو دیکھے۔

ایک دفعہ کوئی شخص ان کی خدمت میں جوارش (یا چورن) لے کر حاضر ہوا۔ پوچھا، یہ کیا ہے؟ اس نے کہا، ہاضمِ طعام۔ انہوں نے فرمایا، مجھے اس کی کیا ضرورت ہے، میں نے تو مہینوں سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

ایک مرتبہ کسی سے پانی مانگا۔ اس نے شیشے کے پیالے میں لا کر پیش کیا۔ انہوں نے پینے سے انکار کر دیا۔ پھر ان کے سامنے لکڑی کے پیالے میں پانی پیش کیا گیا، اب انہوں نے پی لیا۔ پانی پی کر وضو کے لیے برتن مانگا تو ان کے سامنے طشت وآفتابہ لایا گیا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور لوٹے سے وضو کیا۔

میمون بن مہرانؒ کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے تمام اثاث البیت کی قیمت لگائی تو سو درہم سے زیادہ کا سامان نہ تھا۔ اس میں فرش اور بستر بھی شامل تھا۔

حضرت ابنِ عمرؓ کے پاس دنیا کئی بار پورے ساز وسامان کے ساتھ آئی لیکن انہوں نے

اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ان کو بارہا ایسے موقعے ملے کہ اگر چاہتے تو بڑے سے بڑا عہدہ کیا، مسند خلافت تک پہنچ سکتے تھے۔ زر و جواہر سمیٹنا چاہتے تو اپنے دور کے متمول ترین آدمی بن سکتے تھے لیکن انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی اور اپنے زہد و تقویٰ سے باہر قدم نہ نکالا۔ ان کے زمانے میں جو سیاسی لڑائیاں ہوئیں انہوں نے ان میں مطلق کوئی حصہ نہیں لیا۔ خانہ جنگی کے فتنے میں مبتلا ہونے کے خوف سے ہر امیر کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تھے اور نتائج کو خدا پر چھوڑ دیتے تھے۔

سادگی کا یہ عالم تھا کہ تمام کام جو خود کر سکتے تھے اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے حتیٰ کہ اونٹنی وغیرہ بٹھانے میں بھی دوسروں سے مدد نہ لیتے تھے۔ لباس عموماً نہایت معمولی پہنتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار عمدہ لباس بھی زیبِ تن کر لیتے تھے وہ بھی اس لیے کہ ایک دو مرتبہ حضورؐ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔ لباس قمیص، ازار اور سیاہ عمامہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ ازار نصف ساق تک ہوتا تھا۔ حضورؐ کو زرد رنگ پسند تھا اس لیے ان کو بھی زرد رنگ مرغوب تھا۔

دستر خوان بھی تکلفات سے خالی ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک بڑے برتن میں کھانا رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس کے گرد بیٹھ کر کھا لیتے۔ انہیں ہر وہ چیز ناپسند تھی، جس میں کسی قسم کی نمائش یا تکلف کی آمیزش ہوتی یہاں تک کہ جمعہ کے دن کے سوا کبھی سر ڈاڑھی اور کپڑوں میں خوشبو نہیں لگائی۔

دنیوی حیثیت سے حضرت ابنِ عمرؓ بہت مرفہ الحال تھے۔ دینی خدمات کی بنا پر ان کا ڈھائی ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کے مطابق وہ بہت سی لگانی زمینوں کے مالک بھی تھے لیکن وہ اپنے مال کو بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ فیاضی اور سیر چشمی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کسی سائل کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ بیسیوں فقراء و مساکین ان کے دستر خوان پر پرورش پاتے تھے۔ عموماً کسی مسکین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھائے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے، بلکہ بعض اوقات اپنے حصے کا کھانا بھی مسکینوں کو کھلا دیتے اور خود بھوکے رہتے۔ ایک مرتبہ ان کو مچھلی کی خواہش ہوئی جب مچھلی بھون کر ان کے سامنے رکھی گئی تو ایک سائل کا گزر ہوا وہ اٹھا کر اس کو دے دی۔

ایک دفعہ علیل ہوئے اور ان کے لیے انگور کے چند دانے ایک درہم کو خریدے گئے، اتفاق سے ایک سائل آ گیا۔ انہوں نے حکم دیا، یہ انگور اس کو دے دو۔ اہلِ خانہ نے عرض کیا، آپ ان کو کھا لیں ہم اس کو کچھ اور دے دیں گے، لیکن وہ مصر ہوئے کہ یہ انگور سائل کو دے دو۔ مجبوراً وہی دینے پڑے اور پھر اس سے خرید کر ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

ایک مرتبہ راستے میں ایک کھجور پائی، منہ تک لے جانے بھی نہ پائے تھے کہ ایک سائل کا گزر ہوا، انہوں نے یہ کھجور اس کو دے دی۔

طبقات ابنِ سعد میں حضرت ابنِ عمرؓ کے غلام اور شاگرد نافعؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ان کے پاس ہزار درہم یا دینار (اس کی تصریح نہیں کی گئی) آئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو دینے شروع کیے یہاں تک کہ سب ختم کر ڈالے۔ تقسیم ہو جانے کے بعد جو لوگ آئے ان کو دوسرے لوگوں سے (جنہیں پہلے دے چکے تھے) قرض لے کر دیے۔

کہیں قیام ہوتا تو اکثر روزہ رکھتے تھے لیکن کوئی مہمان آ جاتا تو روزہ توڑ دیتے اور فرماتے کہ مہمان کی موجودگی میں روزہ (نفلی) رکھنا فیاضی سے بعید ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ دو دو تین تین ہزار کی رقمیں تو آئے دن خیرات کرتے رہتے تھے لیکن بعض اوقات بیس بیس اور تیس تیس ہزار کی رقمیں بھی یکمشت راہِ خدا میں لٹا دیتے تھے۔

اگر کبھی کوئی غلام یا لونڈی بہت پسند ہوتی یا اپنے کسی غلام کو بہت عبادت گزار دیکھتے تو اس کو آزاد کر دیتے۔ اس طرح انہوں نے اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زیادہ غلام آزاد کیے۔

ایک دفعہ سفرِ حج کے لیے ایک اونٹنی خریدی سوار ہوئے، اس کی چال بہت پسند آئی، فوراً اتر پڑے اور حکم دیا کہ سامان اتار لو اور اس کو قربانی کے اونٹوں میں شامل کر دو۔

ایک مرتبہ چند دوستوں کے ساتھ مدینہ کے ایک نواحی علاقے میں تشریف لے گئے۔ ایک مقام پر دستر خوان بچھایا گیا تو ایک چرواہا اُدھر آ نکلا۔ اس نے سلام کیا۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے اس کو کھانے کی دعوت دی۔ اس نے عذر کیا کہ میں روزے سے ہوں۔ انہوں نے فرمایا، اتنی گرمی میں روزہ رکھتے ہو اور پھر بکریاں بھی چراتے ہو؟ پھر اس سے پوچھا، کیا یہ بکریاں ہمارے ہاتھ فروخت کر سکتے ہو، ہم تمہیں نقد قیمت بھی دیں گے اور افطار کے لیے گوشت بھی۔

چرواہے نے عرض کیا، یہ بکریاں میری نہیں ہیں ان کا مالک میرا آقا ہے۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے (اس کے تقویٰ کا امتحان لینے کی خاطر) فرمایا، تو تمہارا آقا کیا کرلے گا؟

چرواہے نے آسمان کی طرف انگلیاں اٹھائیں اور این اللہ این اللہ (اللہ کہاں ہے اللہ کہاں ہے) کہتا ہوا چلا۔ (مطلب یہ تھا کہ اللہ تو اس بد دیانتی کو جان لے گا)۔ حضرت ابنِ عمرؓ کو اس کا یہ قول بہت پسند آیا اور اس کو بار بار دہراتے رہے۔ چونکہ اس کی دیانت اور خدا خوفی سے بے حد خوش ہوئے تھے اس لیے جب مدینے آئے تو اس کے آقا سے بکریوں سمیت خرید کر آزاد کر دیا اور تمام بکریاں بھی اس کو بخش دیں۔

ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بدو ملا۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے اس کو سلام کیا اور سواری کا گدھا اور سر کا عمامہ اتار کر اس کو دے دیا۔ ابنِ دینارؒ ساتھ تھے انہوں نے عرض کیا، اللہ آپ کو صلاحیت دے، یہ بدو تو معمولی چیزوں سے خوش ہو جاتے ہیں (گدھا اور عمامہ دینے کی کیا ضرورت تھی) فرمایا، اس کے والد میرے والد کے دوست تھے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ سب سے بڑی نیکی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔

حضرت ابنِ عمرؓ کے بعض غلام آزاد ہونے کے لیے بڑے عبادت گزار بن جاتے تھے۔ ان کے بعض احباب نے عرض کیا کہ یہ لوگ عبادت میں مخلص نہیں ہیں اور آپ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا، جو شخص ہم کو اللہ کے ذریعے دھوکا دیتا ہے، ہم اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

ان کے ہاتھ سے جو مال نکل جاتا تھا اس کو پھر واپس نہیں لیتے تھے۔ عطاءؒ کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے ان کو دو ہزار درہم قرض دیے۔ انہوں نے جب اس قرض کو چکایا تو میں نے ان کے درہموں کا وزن کیا وہ وزن میں دو سو درہم زیادہ نکلے۔ میں نے یہ دو سو درہم واپس کرنے چاہے تو فرمایا، اب یہ تمہارے ہیں۔

چوں کہ اکثر اپنا کھانا مسکینوں کو کھلا دیتے تھے اس لیے بہت لاغر ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان کی بی بی کو ملامت کی کہ آپ ان کی خدمت اچھی طرح نہیں کرتیں۔ انہوں نے کہا، میں کیا کروں، جب ان کے لیے کوئی کھانا پکتا ہے تو وہ مساکین کو کھلا دیتے ہیں۔ ان کی اس عادت کی بنا پر جب وہ مسجد سے نکلتے تو فقراء و مساکین ان کے راستے میں آ بیٹھتے وہ انہیں اپنے ساتھ لے

آتے اور کھانا کھلا کر بھیجتے۔ چنانچہ ایک دن ان کی بی بی نے ان فقراء کے گھروں پر کھانا بھجوادیا اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ ان کے راستے میں مت بیٹھنا اور وہ بلائیں بھی تو مت آنا۔

حضرت ابنِ عمرؓ اس دن مسجد سے نکلے تو کسی فقیر کو راستے میں بیٹھا نہ پایا، گھر آئے تو واقعہ معلوم ہوا۔ غصہ سے فرمایا کیا تم چاہتی ہو کہ مساکین میرے دسترخوان پر نہ ہوں اور میں رات فاقے سے بسر کروں۔ چنانچہ اس رات کھانا نہ کھایا اور بھوکے پڑ رہے۔

(۸)

اپنی جلالتِ قدر کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمرؓ تواضع، انکسار اور اخلاقِ حسنہ کا مجسمہ تھے۔ لوگوں کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کیا کرتے تھے اس میں امیر وغریب کی بالکل تفریق نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں بازار میں اس لیے نکلتا ہوں کہ لوگوں کو سلام کروں اور (جواب میں) مجھ پر سلام کیا جائے۔ اگر کسی کو سلام کرنا بھول جاتے تو پلٹ کر سلام کرتے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ سفر میں ہوتا تھا، جہاں تک ممکن ہوتا وہ اپنا کام خود کرتے تھے یہاں تک کہ خود اونٹ کا پاؤں دباتے تو میں اس پر سوار ہوتا۔

مسند احمد میں ہے کہ اپنی تعریف سننا ان کو سخت ناپسند تھا۔ ایک مرتبہ کوئی شخص ان کی تعریف کر رہا تھا انہوں نے اس کے منہ میں مٹی جھونک دی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ منہ پر تعریف کرنے والوں (خوشامدیوں) کے منہ میں مٹی ڈالا کرو۔

حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے جواب میں صرف اتنا فرمایا، بھائی ہم لوگ عالی نسب ہیں۔ پھر خاموش ہو گئے۔ (الاصابہ)

ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے پوچھا، آپ کون ہیں؟ فرمایا، جو تم کہو میں وہی ہوں، اس نے کہا، آپ سبط ہیں، آپ وسط ہیں۔

فرمایا، سبحان اللہ، سبط تو بنی اسرائیل تھے اور وسط تمام اُمتِ محمدؐیہ ہے البتہ ہم قبیلہ مضر کے اوسط ہیں۔ اس سے زیادہ رتبہ کوئی ہمیں دیتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

وہ ہمیشہ اس کو مکروہ سمجھتے تھے کہ کوئی ان کو وضو کرائے۔

ایک دفعہ کسی نے ان کو نہایت بیش قیمت ہروی کپڑے ہدیۃً پیش کیے۔ انہوں نے ان

کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ان کے پہننے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن ہم کبر و غرور کے خوف سے ان کو نہیں پہن سکتے۔

ایک دفعہ حالتِ احرام میں سردی محسوس ہوئی تو اپنے ایک شاگرد قرعہ عقیلی سے فرمایا، میرے اوپر چادر ڈال دو۔ انہوں نے چادر اوڑھادی۔ بیدار ہوئے تو اس کے نقش و نگار اور بوٹوں کو جو ریشمی تھے، دیکھنے لگے۔ پھر فرمایا، اگر یہ بوٹے نہ ہوتے تو اس کے اوڑھنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

اگر کسی ایسی جگہ تشریف لے جاتے جہاں لوگ انہیں دیکھ کر ازراہِ تعظیم کھڑے ہو جاتے تو وہاں نہ بیٹھتے تھے۔ (ابن سعد)

غلاموں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ مساویانہ ہوتا تھا۔ انہیں اپنے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھلاتے تھے اور اپنے اہل و عیال کی طرح ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان لوگوں کو کھانا کھلانے میں دیر ہوگئی۔ حضرت ابنِ عمرؓ کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے۔ اور حکم دیا کہ انہیں فوراً کھانا کھلایا جائے۔ پھر فرمایا، انسان کے لیے یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ اپنے غلاموں کے کھانے پینے کا خیال نہ رکھے۔ (مسلم)

دستر خوان پر بیٹھے ہوتے اور کسی دوسرے کا غلام بھی وہاں آ جاتا تو اس کو بھی شریکِ طعام کر لیتے۔ انہوں نے اپنے غلاموں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جب مجھے خط لکھو تو اس میں میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھو، حالانکہ اس وقت کے رواج کے مطابق آقا کا نام پہلے لکھا جاتا تھا۔ (ابن سعد)

غلاموں کو نہ کبھی سخت سست کہتے تھے اور نہ کبھی ان پر ہاتھ اٹھاتے تھے اگر کبھی ایک آدھ مرتبہ غصہ کی حالت میں کسی غلام پر سختی کر بیٹھے تو کفّارہ کے طور پر اس کو آزاد کر دیا۔ (صحیح مسلم)

اپنے اخلاقِ حسنہ، تواضع اور انکسار کی بدولت انہیں عوام الناس میں درجۂ محبوبیت حاصل ہو گیا تھا۔ لوگ ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے تو قدم قدم پر لوگ ان کو سلام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مجاہدؒ ساتھ تھے، ان سے مخاطب ہو کر تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا، لوگ مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اگر سونے چاندی کے بدلے میں بھی محبت خریدنا چاہوں تو اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔ (طبقات ابنِ سعد)

⑨

حضرت ابنِ عمرؓ کی طبیعت میں استغنا اور قناعت کا مادہ بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ سنت نبوی کے مطابق ہدیہ قبول کر لیتے تھے لیکن کسی کے سامنے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ علامہ ابن سعدؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''میں کسی سے مانگتا نہیں لیکن جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کو رَدّ بھی نہیں کرتا۔'' ایک دفعہ ان کی پھوپھی رملہؓ نے دوسو دینار بھیجے۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیے اور انہیں دُعا دی۔

ایک مرتبہ عبدالعزیز بن ہارون نے ان کو لکھا کہ آپ کی جو حاجت ہو، مجھ سے طلب فرمایئے۔ انہوں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اپنے اہل و عیال سے (لینے دینے کی) ابتدا کرو اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ دینے والا ہاتھ اوپر کا ہے اور لینے والا نیچے کا۔ میں آپ سے نہ سوال کروں گا اور نہ اس مال کو رَدّ کروں گا جس کو خدا نے میری طرف بھیجا ہے۔

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے ایک لاکھ کی رقم ایک خاص مقصد کے لیے انہیں بھیجی لیکن انہوں نے یہ رقم قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

مال و دولت ان کے نزدیک بالکل بے حقیقت شے تھی۔ اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ مالی ہدیہ خلوص سے نہیں بلکہ کسی ذاتی غرض سے پیش کیا گیا ہے تو اس کو قبول نہ کرتے۔ اسی طرح کسی چیز میں صدقہ کے شائبہ کا بھی خیال ہوتا تو اس کو استعمال نہ کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی والدہ پر ایک غلام صدقہ کیا۔ اتفاق سے اس غلام کے ساتھ بازار گئے وہاں ایک شِیر دار بکری فروخت ہو رہی تھی۔ انہوں نے غلام سے کہا، اپنے مال سے اس کو خرید لو۔ اس نے خرید لی اور افطار کے وقت اسی بکری کا دودھ ان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا، یہ دودھ بکری کا ہے، بکری غلام کے مال کی ہے اور غلام صدقے کا ہے، اس کو ہٹاؤ میں نہیں پیوں گا۔

مشتبہ چیزوں سے سخت اجتناب کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے کھجور کا سرکہ بطور ہدیہ بھیجا پوچھا، کیا چیز ہے، معلوم ہوا کھجور کا سرکہ ہے۔ انہوں نے اس کو فوراً پھینکوا دیا کیونکہ اس کے استعمال سے سُکر پیدا ہونے کا احتمال تھا۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ ککڑی اور خربوزہ صرف اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ ان میں گندی چیزوں کی کھاد دی جاتی ہے۔ (یہ ان کی شدّتِ احتیاط تھی ورنہ ان چیزوں کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں)

مروان بن الحکم نے اپنے زمانہ میں راستوں پر میل کے سنگی نشان نصب کرائے تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ ان پتھروں کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے اور ان سے ہٹ کر نماز پڑھتے تھے کیونکہ ان کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے پر پتھر کی پرستش کا خیالی شائبہ تھا۔

۱۰

حضرت ابنِ عمرؓ کی زندگی ہمیشہ مصالحانہ اور مرنجاں مرنج رہی۔ انہوں نے مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں حصہ لیا نہ حکومت وقت کے خلاف کسی سرگرمی میں۔ تاہم جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے خواہ حاکمِ وقت کی پیشانی پر بل ہی کیوں نہ پڑ جائیں۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی کے کچھ واقعات اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اکثر مؤرخین کی رائے میں ان کی یہی حق گوئی ان کی شہادت کا باعث بنی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ مچھر کے خون کا کفّارہ کیا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا، تم کون ہو؟ اس نے کہا، عراقی۔ فرمایا، لوگو ذرا اس کو دیکھنا یہ شخص مجھ سے مچھر کے خون کا کفارہ پوچھتا ہے حالانکہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے جگر گوشے کو شہید کیا ہے، جن کے بارے میں حضورؐ فرماتے تھے کہ یہ دونوں (حسنؓ و حسینؓ) میرے باغِ دنیا کے دو پھول ہیں۔

سانحۂ کربلا کے بارے میں اس طرح کے جذبات کا اظہار اربابِ اقتدار کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن حضرت ابنِ عمرؓ نے اس کی کبھی پروا نہیں کی، جو دل میں ہوتا وہ بلا جھجک زبان پر لے آتے۔

حضرت ابنِ عمرؓ نہایت صائب الرائے اور دانا تھے۔ اہلِ سِیَر نے ان کے متعدد حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں، جن سے ان کی غیر معمولی بصیرت و حکمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

- سب سے آسان نیکی خندہ پیشانی اور شیریں کلامی ہے۔
- علم تلاش کرو چاہے وہ دشمن کے پاس ہو۔
- دوسروں کے عیوب ڈھونڈنے سے پہلے اپنے عیوب پر نظر ڈالو۔

- جس طرح میٹھا شربت پی جاتے ہو اسی طرح غصہ بھی پی جایا کرو۔
- بندہ خواہ خدا کے نزدیک برگزیدہ ہی کیوں نہ ہو مگر جب اس کو دنیا کا کچھ حصہ مل جاتا ہے تو خدا کے یہاں اس کا کوئی نہ کوئی درجہ ضرور گھٹ جاتا ہے۔
- آدمی اس وقت اہلِ علم کی جماعت میں شمار ہونے کے قابل ہوگا جب وہ اپنے بلند آدمی پر حسد نہیں کرے گا، اپنے سے کم تر کو حقیر نہ سمجھے گا اور اپنے علم کی قیمت نہ لے گا۔
- اخلاق خراب ہیں تو ایمان بھی خراب ہوگا۔
- گناہ کرنا چاہتے ہو تو وہ جگہ تلاش کرو جہاں اللہ موجود نہ ہو۔
- عبادت کی لذّت حاصل کرنا چاہتے ہو تو تنہائی ڈھونڈو، دوستوں اور واقف کاروں سے علاحدگی اختیار کرو مگر یہ اس وقت جب روزی تلاش کرلو اور اہل وعیال کو میٹھی نیند سو لینے دو۔
- میں پہلے خود حدیث پر عمل کرتا ہوں اور پھر لوگوں کو سناتا ہوں۔

سیدنا ابن عمرؓ شکل وصورت میں اپنے جلیل القدر والد حضرت عمر فاروقؓ کے مشابہ تھے۔ دراز قد، گندمی رنگ اور بھاری بھرکم جسم، کندھوں تک کاکلیں تھیں، جن میں کبھی کبھی مانگ نکالا کرتے تھے۔ ڈاڑھی بقدر یک مشت۔ مونچھیں بہت باریک کترواتے تھے۔ بقول ابنِ سعدؒ زرد خضاب کرتے تھے۔

تمام صحابہؓ و تابعین جنھوں نے حضرت ابنِ عمرؓ کو دیکھا تھا بالاتفاق ان کے اوصاف حمیدہ تبحرِ علمی اور جلالتِ قدر کے معترف اور مداح تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ عہدِ رسالت کی حالت وکیفیت کا عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ پابند کوئی نہیں رہا۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ بدل گیا مگر عمرؓ اور ان کے بیٹے عبداللہؓ نہیں بدلے۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ کہا کرتے تھے کہ میں کسی کے جنتی ہونے کی گواہی دے سکتا ہوں تو وہ ابنِ عمرؓ ہیں۔ میمون بن مہرانؒ کہتے تھے کہ میں نے ابنِ عمرؓ سے بڑھ کر کوئی متقی اور پرہیزگار نہیں دیکھا۔ حضرت سلمہؒ بن عبدالرحمٰنؒ فرماتے تھے کہ میں نے ابنِ عمرؓ کی وفات کے بعد ان جیسا کوئی نہیں دیکھا وہ فضیلت میں اپنے والد کے قریب تھے۔ حضرت علی بن حسینؓ زین العابدین فرماتے تھے کہ عبداللہ بن عمرؓ کو زہد وتقویٰ اور اصابتِ رائے میں ہم سب پر برتری حاصل تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن عبّاسؓ
ترجمان القرآن

①

اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ اپنے ایک نوعمر بھانجے کو بہت عزیز رکھتی تھیں، بھانجے کو بھی نہ صرف خالہ سے بڑی محبت تھی بلکہ اپنے عالی مقام خالو جناب سیدِ دوعالم ﷺ سے بھی بے انتہا محبت اور عقیدت تھی۔ اسی لیے وہ اکثر خالہ محترمہ کے گھر آ جاتے تھے۔ وہاں دوڑ دوڑ کر حضورؐ کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتے تھے اور آپؐ سے دُعائیں لیتے تھے۔ بعض اوقات وہ رات کو بھی خالہؓ ہی کے گھر ٹھہر جاتے تھے۔ اس طرح اُن کو حضورؐ پرنور ﷺ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا بہترین موقع میسر آ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورؐ رات کے پچھلے پہر نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ سعادت مند صاحب زادے بھی آپؐ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر کر لیا۔ اُس وقت تو وہ ساتھ کھڑے ہو گئے مگر جونہی حضورؐ نے نماز شروع کی، وہ ہٹ کر اپنی جگہ پر آ گئے۔ سلام پھیرنے کے بعد آپؐ نے ان سے پوچھا۔ ”میں نے تم کو اپنے ساتھ کھڑا کیا تھا، تم پیچھے کیوں ہٹ گئے؟“

انہوں نے نہایت ادب سے عرض کیا:

”یا رسول اللہ، کس کی مجال ہے کہ وہ اللہ کے رسولؐ کے برابر کھڑا ہو کر نماز پڑھے۔
(میں اور حضورؐ کے برابر کھڑا ہو کر نماز پڑھوں؟ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے)“

حضورؐ ان کے جواب پر بہت خوش ہوئے اور بارگاہِ رب العزّت میں دُعا کی:

''الٰہی اس لڑکے کو علم کثیر عطا فرما اور اس کو اور زیادہ فہم وفراست سے نواز۔''

اُمُّ المومنین حضرت میمونہؓ کے یہ نوعمر بھانجے جن کے حق میں —— دانائے کونین رحمتِ دو عالم ﷺ نے ازدیادِ علم وفہم کی دعا فرمائی اور اُن کے جذبۂ ادب واحترام رسالت پر خوشنودی کا اظہار فرمایا، دودمانِ ہاشمی کے چشم وچراغ حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابوالعباس عبداللہ بن عباسؓ ان عظیم المرتبت صحابہؓ میں سے ہیں جو علم و فضل کے اعتبار سے اساطینِ اُمت میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے خاندانی شرف ومجد کے بارے میں اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ وہ سرورِ عالم ﷺ کے محبوب چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے فرزندِ ارجمند تھے۔ ان کی والدہ حضرت اُمّ الفضل لبابہؓ ان جلیل القدر صحابیات میں سے ہیں، جن کو اُمُّ المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے بعد (خواتین میں سے) سب سے پہلے قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ اُمّ المومنین حضرت میمونہؓ حضرت عبداللہؓ کی حقیقی خالہ تھیں۔ اس نسبت سے سرورِ عالم ﷺ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ خالو بھی ہوتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور القاب یہ ہیں:

الحِبر (بہت بڑے عالم)، البَحر (علم کے سمندر) ترجمان القرآن اور امام المفسّرین

حضرت عباسؓ کے اور بھی کئی فرزند تھے لیکن جب ''ابن عباسؓ'' کہا جاتا ہے تو اس سے مراد حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ ہجرتِ نبوی سے تین سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں مشرکین قریش نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کر رکھا تھا۔ حضرت عبداللہؓ اسی شعب میں پیدا ہوئے۔ ابن اثیرؒ نے ''اُسدُ الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کی ولادت کے بعد حضرت عباسؓ ان کو گود میں اٹھا کر سرورِ عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں لے گئے۔ حضورؐ نے اپنا لعابِ دہن نومولود کے منہ میں ڈالا اور ان کے لیے دعائے خیر و

برکت کی۔ بہت سے اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ ہجرتِ نبوی سے قبل مسلمان ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا تھا۔ اس کا اعلان انہوں نے فتح مکہ (۸ ہجری) سے کچھ عرصہ پہلے کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے اہل و عیال سمیت ہجرت کر کے مدینہ منورتشریف لے گئے البتہ ان کی اہلیہ حضرت اُمُّ الفضلؓ بعثتِ نبوی کے بالکل ابتدائی زمانے میں علی الاعلان مسلمان ہوگئی تھیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ نے اپنی پیدائش کے پہلے دن ہی سے توحید کی لوریوں میں پرورش پائی۔ والدین کے ساتھ ہجرت کے وقت ان کی عمر گیارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ مدینہ منورہ پہنچ کر ان کو سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت گزاری اور آپؐ کے فیضان سے بہرہ یاب ہونے کا خوب خوب موقع ملا۔ وہ خود بھی حضورؐ سے بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور والدِ محترم کی ہدایت بھی تھی اس لیے بارگاہِ رسالت میں اکثر حاضر ہوتے تھے اور آپؐ کے ارشادات سے مستفیض ہوتے تھے۔ ایک دن بارگاہِ نبوی سے واپس آ کر حضرت عباسؓ سے ذکر کیا کہ آج میں نے رسول اللہ کے پاس ایک ایسے آدمی کو دیکھا جن کو میں نہیں پہچانتا کیا اچھا ہوتا اگر مجھے ان کے بارے میں علم ہو جاتا۔

حضرت عباسؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے حضرت عبداللہؓ کی بات کا تذکرہ کیا۔ حضورؐ نے ان کو طلب فرما کر فرطِ محبت سے اپنی آغوش میں لے لیا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی:

''الٰہی اس پر اپنی برکت نازل فرما اور اس کو علم کا نور پھیلانے کا ذریعہ بنا۔'' (الِاصابہ)

حضرت عبداللہؓ اگرچہ نہایت سلیم الفطرت تھے لیکن پھر بھی لڑکپن کا زمانہ تھا اس لیے کبھی کبھی اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے مدینہ منورہ کی گلیوں میں نکل جاتے تھے۔ اُسی دَور کا ایک واقعہ ان کو عمر بھر یاد رہا۔ خود بیان کرتے ہیں کہ:

> ''میں لڑکوں کے ساتھ گلیوں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کو تشریف لاتے دیکھا تو دوڑ کر ایک گھر کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ لیکن حضورؐ نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ آپؐ نے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا، جاؤ معاویہؓ کو بلا لاؤ۔ وہ آپؐ کے کاتبِ وحی تھے۔ میں دوڑا دوڑا حضرت معاویہؓ کے پاس گیا اور ان کو بلا لایا۔'' (مسندِ احمدؒ)

حضرت عبداللہؓ اکثر اپنی خالہ اُمُّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور کبھی کبھی کاشانۂ رسالت میں ہی سو رہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنی خالہ کے پاس سو رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور چار رکعت نماز پڑھ کر استراحت فرمائی۔ ابھی کچھ رات باقی تھی کہ بیدار ہوئے اور مشکیزہ کے پانی سے وضو کر کے نماز شروع کی۔ میں بھی آپؐ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے مجھے سر سے پکڑ کر دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ (صحیح بخاری)

ایک مرتبہ رسولِ اکرم ﷺ نماز کے لیے بیدار ہوئے تو وضو کے لیے ایک برتن میں پانی موجود پایا۔ وضو فرمانے کے بعد آپؐ نے اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ سے پوچھا، وضو کے لیے پانی کون لایا تھا؟ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف اشارہ کیا۔ سرورِ عالم ﷺ بہت خوش ہوئے اور دعا کی:

''اے اللہ اسے تفقّہ فی الدّین عطا کر اور تاویل کا طریقہ سکھا۔''

اسی قسم کا ایک واقعہ جس میں حضرت ابنِ عباسؓ نے ازراہِ ادب نماز میں حضورؐ کے برابر کھڑے ہونے سے گریز کیا اور آپؐ سے دعائیں لیں، اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ غرض لڑکپن میں ان کو بارہا سید کونین ﷺ کی خدمت گزاری اور آپؐ سے دعائیں لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

(۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ابھی عمر کی تیرہ منزلیں طے کی تھیں کہ سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہو گیا۔ چونکہ عہدِ رسالت میں کمسن تھے اس لیے کسی غزوے میں شریک نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضورؐ نے لڑائی میں شریک ہونے کے لیے کم از کم پندرہ برس کی عمر مقرر فرمائی تھی۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے عہد خلافت میں بھی انہیں کوئی کارنامہ دکھانے کا موقع نہ ملا تاہم انہوں نے کبار صحابہؓ سے استفاضہ کرنا شروع کر دیا اور ان کی شہرت ایک انتہائی ذہین و فطین اور صاحب علم نوجوان کی حیثیت سے پھیلنے لگی۔ حضرت عمر فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا اور ان کی حوصلہ افزائی اور تربیت پر خاص توجہ دی۔ وہ اپنی علمی صحبتوں میں جہاں اکابر صحابہؓ کو بلاتے تھے وہاں حضرت ابنِ عباسؓ کو بھی شریک کرتے تھے یہاں تک کہ لوگ ان پر رشک کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں خود

حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ مجھے اصحابِ بدر کے ساتھ بٹھایا کرتے تھے ایک مرتبہ بعض بزرگوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ آپ اس نوجوان کو ہمارے ساتھ بٹھاتے ہیں ان کے برابر تو ہمارے لڑکے ہیں (یا یہ کہ ان کے ہم عصر ہمارے لڑکوں کو آپ یہاں بیٹھنے کا موقع نہیں دیتے) حضرت عمرؓ نے فرمایا، یہ وہ شخص ہے، جس کی قابلیت کا تمہیں بھی علم ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی مجلس میں کبھی کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا، جس کا جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ دینا چاہتے لیکن اپنی کم عمری کی بنا پر اکابر صحابہؓ کے سامنے بات کرنے سے جھجکتے تو امیر المومنینؓ بدیں الفاظ ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ''ابن عباس، علم عمر کی کمی یا زیادتی پر موقوف نہیں ہے، تم اپنے آپ کو حقیر نہ جانو، جو بات ہوا کرے یا جو دل میں خیال آیا کرے صاف صاف بیان کر دیا کرو۔'' (صحیح بخاری)

حافظ ابن عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ ان کو بہت محبوب تھے۔

'دائرۂ معارفِ اسلامیہ'' میں متعدد اربابِ سِیَر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ خوش اخلاقی، وجاہت اور تفقہ فی کتاب اللہ کے باعث حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ کی بہت قدر کرتے اور مشکل مسائل میں ان سے مشورے کیا کرتے تھے اور اکثر ان کی رائے پر عمل کرتے اور کہتے تھے کہ ابنِ عباسؓ تم میں سب سے بڑے عالم ہیں۔ وہ فتی الکہول یعنی بوڑھوں کے جوان یا نوجوان بزرگ ہیں، ان کی زبان بکثرت سوال پوچھنے والی اور دل بڑا عقلمند ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر کی تسخیر پر مامور فرمایا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی جہاد کے لیے مصر تشریف لے گئے (۱۸ھ سے ۲۱ھ کے درمیان کسی وقت)۔ (دائرۂ معارفِ اسلامیہ)

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں عبداللہؓ بن ابی سرح کی سرکردگی میں افریقہ پر فوج کشی ہوئی (۲۷ھ) تو حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بھی ایک جماعت کی معیت میں شریک مہم ہوئے۔ ایک موقع پر انہیں سفیر بنا کر افریقیہ کے حاکم جرجیر (Gregory گریگوری) کے پاس بھیجا گیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''اِصابہ'' میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے جرجیر کے ساتھ اس عمدگی سے گفتگو کی وہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت پر ششدر رہ گیا اور اس کی زبان پر

بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

''آپ حبرِ عرب (یعنی عرب کے بہت بڑے عالم) ہیں۔''

۲۹، ۳۰ ہجری میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے حکم پر حضرت سعیدؓ بن عاص والیِ کوفہ نے جرجان اور طبرستان پر چڑھائی کی۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت سعیدؓ بن عاص کے لشکر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ تمام نوجوانانِ قریش شامل تھے۔ (اُسدُ الغابہ)

۳۵ ہجری میں مفسدہ پردازوں نے مدینہ منورہ پر تسلّط جمالیا اور کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کرلیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے مقدور بھر امیر المؤمنینؓ کی حمایت کی۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے بعض دوسرے جوانانِ قریش کے ساتھ مل کر کاشانۂ خلافت کے دروازے پر پہرہ بھی دیا۔ اسی دوران میں حج کا موسم آ گیا۔ چونکہ امیر المؤمنینؓ محصور تھے اور مکہ نہیں جاسکتے تھے اس لیے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو امیرِ حج مقرر فرمایا اور انہیں مناسب ہدایات دے کر قافلۂ حج کے ساتھ مکہ معظّمہ روانہ کردیا۔ اس طرح گویا امیر المؤمنینؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو اپنا قائم مقام بنا دیا۔ وہ ابھی مکہ ہی میں تھے کہ امیر المؤمنینؓ کی شہادت کا دلدوز سانحہ پیش آیا۔ امارتِ حج کے فرائض سرانجام دے کر مدینہ منورہ واپس آئے تو وہاں حشر برپا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بہت سے لوگ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہٗ کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر مجبور کررہے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے رائے دی کہ اس وقت جس کے ہاتھ پر بھی بیعت کی جائے گی اس پر حضرت عثمانؓ کے خونِ ناحق کا اتہام لگایا جائے گا لیکن لوگوں کو اس وقت آپ کی ضرورت ہے اس لیے اللہ کے بھروسے پر اس بارِ گراں کو اٹھا لیجیے۔

ایک اور روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ الفاظ منسوب ہیں کہ ''آپ گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ جایئے یا اپنی جاگیر پر چلے جایئے اور خاموشی کا رویہ اختیار کیجیے۔ یہ لوگ ساری دنیا کی خاک چھان ماریں گے لیکن آپ کے سوا خلافت کا بارِ گراں اٹھانے کے قابل انہیں کوئی شخص نہیں ملے گا۔ خدا کی قسم اگر آپ ان مصریوں کو اپنے ساتھ لیں گے تو لوگ ضرور آپ پر قتلِ عثمانؓ کی تہمت لگائیں گے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے گوشہ نشین ہونا مناسب نہ سمجھا اور اہل مدینہ کے اتفاقِ عام سے مسند نشین خلافت ہوگئے۔ نئے سرے سے ملکی نظم ونسق کا اہتمام شروع ہوا تو حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو امیر معاویہؓ کی جگہ شام کا گورنر مقرر کرنا چاہا۔ انہوں نے یہ منصب قبول کرنے سے معذرت کی اور امیر المؤمنینؓ کو مشورہ دیا کہ ''امیر معاویہؓ کو موجودہ عہدے پر برقرار رکھیے اور انہیں اپنا حامی بنا لیجیے۔ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ سے شام کے گورنر چلے آتے ہیں۔''

حضرت علیؓ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا تاہم حضرت ابن عباسؓ کو بھی شام جانے پر مجبور نہ کیا۔ بہر حال حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت کرلی اور ان کی حمایت پر کمر بستہ ہوگئے۔

۳۶ھ میں جمل کی افسوسناک لڑائی پیش آئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس لڑائی میں حضرت علیؓ کی طرف سے نہایت بہادری سے لڑے۔ بعض اربابِ سیَر نے لکھا ہے کہ وہ لشکرِ مرتضوی میں اہل حجاز کی قیادت کررہے تھے۔ بصرہ پر اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حامیوں نے قبضہ کرلیا تھا، جنگ جمل میں حضرت علیؓ کو فتح ہوئی تو انہوں نے دوبارہ بصرہ پر قبضہ کرلیا اور حضرت عبداللہؓ بن عباس کو وہاں کا گورنر بنا دیا۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلاف شدت اختیار کرگیا یہاں تک کہ صفین کی جنگ پیش آئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اہلِ بصرہ کی فوج لے کر حضرت علیؓ کی مدد کے لیے پہنچے۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو اپنی فوج کے میسرہ کا افسر بنایا۔ وہ نہایت شجاعت اور پامردی سے لڑے۔ اثنائے جنگ میں فریقین تحکیم (ثالثی) پر متفق ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی معاہدۂ تحکیم پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھے۔ امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرؓو بن العاص حکم مقرر ہوئے اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو حکم بنانا چاہتے تھے لیکن فریقِ مخالف نے اس پر یہ کہہ کر اعتراض کیا کہ عبداللہ بن عباسؓ اور آپ ایک ہی ہیں حالانکہ حکم (ثالث) کسی غیر جانبدار شخص ہونا چاہیے۔

تحکیم کا کوئی تسلی بخش نتیجہ برآمد نہ ہوسکا تاہم لڑائی کا خاتمہ ہوگیا۔ حضرت علیؓ نے کوفہ کو مراجعت کی اور حضرت معاویہؓ دمشق کو پلٹ گئے۔ اسی اثنا میں خوارج نے نہروان میں جمع ہوکر

علم بغاوت بلند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی سرکشی کا سبب یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے ثالثی (تحکیم) کیوں قبول کی۔ ان کے نزدیک معاملاتِ دین میں حکم مقرر کرنا کفر تھا۔

مسند احمدؒ میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خارجیوں کے پاس بھیجا کہ ان کو سمجھائیں بجھائیں اور بحث مباحثہ کر کے راہِ راست پر لائیں۔ حضرت ابن عباسؓ خوارج کے لشکر میں پہنچے تو ان کا ایک سردار ابن الکواء خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''اے حاملینِ قرآن، یہ عبداللہ بن عباس ہیں میں ان کو خوب پہچانتا ہوں، ان کو ان کے دوست (علیؓ) کی طرف پلٹا دو، ہمیں مناظرہ کی ضرورت نہیں۔''

اس پر خوارج کے کچھ اور خطباء کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم ان سے ضرور گفتگو کریں گے، اگر انہوں نے حق بات کہی جو ہماری سمجھ میں آ گئی تو ہم اس کا اتباع کریں گے اور اگر باطل کہی تو ہم ان کو قائل کریں گے۔ چنانچہ تین دن تک حضرت ابن عباسؓ اور خوارج کے درمیان قرآنِ حکیم کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی یہاں تک کہ چار ہزار آدمیوں نے اپنے خیالات سے توبہ کی۔ ان میں ابن الکواء بھی شامل تھا۔ حضرت ابن عباسؓ ان کو حضرت علیؓ کے پاس کوفہ لے آئے لیکن باقی خوارج اپنی روش پر قائم رہے۔ حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا کہ:

''اگر تم خونریزی نہ کرو، ڈاکہ زنی نہ کرو اور ذمی رعایا کو نہ ستاؤ تو جہاں چاہو ٹھہر سکتے ہو بصورتِ دیگر میں تم سے لڑوں گا۔''

خوارج نے حضرت علیؓ کی بات نہ مانی۔ چنانچہ امیر المؤمنینؓ کوفہ سے ان کے استیصال کے لیے روانہ ہوئے۔ اُدھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ بصرہ سے سات ہزار آدمیوں کے ساتھ حضرت علیؓ کی مدد کے لیے روانہ ہوئے اور نخیلہ کے مقام پر ان کے لشکر کے ساتھ آ ملے نہروان کے قریب حضرت علیؓ اور خوارج کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی، جس میں خوارج کو عبرتناک شکست ہوئی۔ اس لڑائی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے نہایت پامردی سے دادِ شجاعت دی۔

(۴)

جنگِ نہروان میں شکست کھانے کے بعد بچے کھچے خوارج ایران میں جا داخل ہوئے اور وہاں کے ذمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ہر طرف شورش برپا کر دی۔ اہل ایران نے اکثر صوبوں

سے حکومت کے عمال کو نکال دیا اور خراج اور جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت علیؓ نے اپنے تمام عمال کو طلب کر کے اس شورش کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عرض کیا ''ایران میں حالات پر قابو پانے کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔''

چونکہ بصرہ کی حدود ایران کے باغی اضلاع کی حدود سے ملی تھیں اور حضرت ابن عباسؓ بصرہ کے فرائض امارت نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے اس لیے حضرت علیؓ نے ان کو تمام ایران کی حکومت بھی سونپ دی اور وہاں کے حالات پر قابو پانے کی پوری ذمہ داری ان پر ڈال دی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بصرہ واپس آ کر ایک زبردست لشکر زیاد بن ابیہ کی سرکردگی میں باغیوں کی سرکوبی کے لیے ایران روانہ کیا۔ زیاد نے تھوڑے ہی عرصے میں باغیوں کو کچل دیا اور کرمان، فارس اور ایران کے دوسرے تمام صوبوں میں مکمل امن و امان قائم کر دیا۔

کچھ عرصے بعد حضرت عبداللہ بن عباسؓ بصرہ کے عہدۂ امارت سے مستعفی ہو گئے اور مکہ معظّمہ جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے امارتِ بصرہ سے کب استعفا دیا، اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، بعض نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۳۸ھ میں پیش آیا۔ بعض نے اس کا سالِ وقوع ۳۹ھ اور ۴۰ھ بتایا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی شہادت ۴۰ھ تک بصرہ کی امارت پر فائز رہے۔ ''دائرۂ معارفِ اسلامیہ'' میں ہے:

> ''اس بات کو باور کرنے کے لیے قوی وجوہ ہیں کہ یہ علاحدگی (امارتِ بصرہ سے) ۳۸ھ میں واقع ہوئی۔''

حضرت ابنِ عباسؓ نے بصرہ کی امارت سے علاحدگی کیوں اختیار کی؟ اس کے بارے میں بھی مؤرّخین میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کا سبب یہ لکھا ہے کہ قاضیِ بصرہ ابوالاسود دوئلی نے ان پر بیت المال میں بے جا تصرف کرنے کا الزام لگایا۔ حضرت علیؓ نے ان سے جواب طلب کیا تو انھوں نے لکھا:

> ''امیر المؤمنین، آپ کو جو کچھ بتایا گیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے میں اس کا محافظ اور نگران ہوں آپ کسی قسم کی بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دیں۔''

یہ خط ملنے پر حضرت علیؓ نے ان سے بیت المال کا مفصل حساب کتاب طلب کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کو بہت محسوس کیا اور امیر المؤمنینؓ کو خط بھیجا:

''میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اس شکایت کو کہ میں نے اہلِ بصرہ کے مال میں تصرف کیا ہے، زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہیں اس لیے آپ اس منصب پر جس کو مناسب سمجھیں مقرر فرمائیں، میں اس سے سبکدوش ہوتا ہوں۔''

اس قسم کی کچھ اور روایات بھی ہیں، جن کو مغربی مستشرقین نے بہت اچھالا ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اپنی وفات تک ہمیشہ مسلمانوں کی عقیدت اور عزّت واحترام کا مرجع بنے رہے تو یہی باور کرنا پڑتا ہے کہ ان روایتوں میں کافی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے ان کا کسی معاملے میں اختلاف ہوگیا ہو لیکن یہ بات کہ ان کا دامن کبھی بیت المال میں تصرفِ بے جا سے آلودہ ہوا، لائق اعتنا نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اپنی فوج کا سالار مقرر کیا۔ ''دائرۂ معارف اسلامیہ'' میں ہے کہ ''اس اثنا میں انہوں (ابن عباسؓ) نے امیر معاویہؓ کے ساتھ مصالحت کی کوشش شروع کردی لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کام خود اپنی مرضی سے کیا یا امام الحسنؓ کے کہنے پر کیا۔ غالباً یہ ابن عباسؓ ہی تھے، جنہوں نے خلافت کے ان دو دعوے داروں کے درمیان مصالحت کرائی۔''

صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ سیدنا حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری سے پہلے ہی حضرت ابن عباسؓ نے امیر معاویہؓ کو خط لکھ کر جان و مال کی امان حاصل کرلی اور مکہ جاکر عزلت گزیں ہوگئے۔

امیر معاویہؓ کے طویل عہد خلافت میں حضرت ابن عباسؓ کا مستقل قیام حجاز ہی میں رہا لیکن اس دوران میں وہ وقتاً فوقتاً امیر معاویہؓ سے ملنے دمشق جاتے رہتے تھے اس سے ان کی غرض بنو ہاشم کے مفادات کی حفاظت ہوتی تھی۔ جس زمانے میں سیدنا حضرت حسنؓ نے وفات پائی (۵۰ھ) حضرت ابن عباسؓ دمشق گئے ہوئے تھے۔ امیر معاویہؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان سے حضرت حسنؓ کی وفات پر تعزیت کی۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے الاستیعاب میں بیان کیا ہے کہ اس موقعے پر دونوں بزرگوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

حضرت امیر معاویہؓ: ابوالعباس اللہ تمہیں ابی محمد الحسن بن علیؓ کی موت پر اجر دے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ (آنسو ضبط کرتے ہوئے)
اللہ کی قسم ان کی موت سے آپ کی قبر پُر نہ ہو جائے گی اور نہ ان کی موت سے آپ کی زندگی بڑھ جائے گی۔ واللہ ہم کو ان سے بڑے کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا، خدا کی قسم اس کے بعد ہمارا کیا چارہ تھا؟

حضرت امیر معاویہؓ: وہ کس عمر کے تھے؟

حضرت ابن عباسؓ: ان کی ولادت اتنی مشہور ہے کہ آپ کو ان کی عمر معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ: میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے۔

حضرت ابن عباسؓ: ہم سب چھوٹے تھے پھر بڑے ہوئے۔ اگر اللہ نے ابی محمدؓ کو اپنے دامن رحمت میں چھپالیا تو ابھی ابو عبداللہ (حسینؓ) کو زندہ رکھا ہے اور ان جیسے نفوس خلفِ صالح ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ جب بھی حضرت امیر معاویہؓ سے ملتے وہ ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے، اعلیٰ پیمانے پر خاطر مدارات کرتے اور ان کو عطیے اور تحفے دیتے۔

مشہور شیعی مؤرّخ محمد بن علی بن طباطبا (ابن طقطقی) کا بیان ہے:

> ''اشرافِ قریش میں سے عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، ابان بن عثمانؓ اور آلِ ابی طالب کے افراد امیر معاویہؓ کے پاس دمشق آیا کرتے تھے وہ ان کی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر خاطر داری اور مہمان نوازی کرتے تھے اور ان کی تمام ضروریات پوری کرتے تھے اس کے برعکس یہ اصحاب ان سے سختی کے ساتھ گفتگو کرتے اور چیں بہ جبیں رہتے لیکن امیر معاویہؓ ان کی باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتے یا ٹال جاتے اور ان کو قیمتی تحائف اور بڑی بڑی رقمیں دیتے۔'' (الفخری)

۴۹، ۵۰ھ (یا بروایت دیگر ۵۱، ۵۲ھ) میں امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے ایک لشکر روانہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کئی دوسرے جوانانِ قریش کے ساتھ اس لشکر میں شامل ہو گئے اور رومیوں کے خلاف جہادِ فی سبیل اللہ کا شرف حاصل کیا۔ یہ وہی لشکر تھا، جس کے بارے میں سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر جہاد کرے گا، اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔

۶۰ ہجری میں امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید تختِ حکومت پر بیٹھا اور سیدنا حضرت حسینؓ نے اہلِ کوفہ کے اصرار پر مکہ سے سفر کی تیاری کی تو حضرت ابن عباسؓ حضرت حسینؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا، ''اے ابن عم! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کوفہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

حضرت حسینؓ نے جواب دیا، ''ارادہ تو یہی ہے۔''

حضرت ابن عباسؓ نے کہا، ''اے ابن عم میں تمہارے لیے اللہ سے پناہ کا طالب ہوں، یہ ارادہ ترک کردو۔''

سیدنا حسینؓ نے جواب دیا: ''میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے اب تو جانا ہی ہوگا۔''

حضرت ابن عباسؓ نے کہا، ''کیا تم اس قوم کے پاس جارہے ہو، جس نے اپنے والی کو اپنے شہر سے نکال دیا ہے اور نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟ اگر واقعی وہ یہ کر گزرے ہیں تو تم بے شک ان کے پاس چلے جاؤ اور اگر ان کا والی بدستور ان پر حکومت کررہا ہے اور اس کے حکام ان لوگوں سے واجبات وصول کررہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تمہیں لڑائی کی آگ میں کودنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تم کو بھی اسی طرح چھوڑ دیں گے جس طرح تمہارے والد اور بھائی کو چھوڑ دیا تھا۔''

سیدنا حضرت حسینؓ نے فرمایا: اے ابن عم جو کچھ آپ نے کہا ہے میں اس پر غور کروں گا۔''

حضرت ابن عباسؓ اس وقت واپس چلے گئے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ سیدنا حسینؓ اپنے ارادے پر قائم ہیں تو وہ تیسرے دن پھر ان کے پاس گئے اور کہا:

> ''اے ابن عم! میں نے بہت چاہا کہ اس معاملے میں دخل نہ دوں لیکن دل نہیں مانتا، میں پھر کہتا ہوں کہ کوفہ جانے میں مجھے تمہاری بربادی کا ڈر ہے۔ اہل کوفہ غدار لوگ ہیں ان پر بھروسا نہ کرو۔ تم اسی شہر میں مقیم رہو، تم اس شہر کے باشندوں کے سردار ہو اور اگر یہ بات قبول نہیں تو پھر یمن چلے جاؤ وہاں قلعے، گھاٹیاں اور سرنگیں ہیں۔ علاقہ بڑا طویل وعریض اور محفوظ ہے، وہاں تمہارے والد کے حامی بھی موجود ہیں۔ ویسے بھی تم وہاں لوگوں سے الگ ایک گوشے میں پڑے ہوگے، لوگوں سے آسانی کے ساتھ نامہ و پیام کرسکو گے پھر وہیں سے اپنے داعی تمام ملک میں پھیلا سکتے ہو۔ اگر تم یہ طریق عمل اختیار کرو تو مجھے امید ہے کہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگے۔''

سیدنا حسینؓ نے جواب دیا۔ ''اے ابن عم! خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ آپ میرے سچے خیر خواہ اور شفیق ہیں لیکن اب میں نے کوفہ جانے کا عزم بالجزم کرلیا ہے۔''

حضرت ابن عباسؓ نے کہا: ''اگر تمہارا جانا ناگزیر ہے تو پھر عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جاؤ۔ خدا کی قسم مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم بھی اسی طرح شہید نہ کر دیے جاؤ، جس طرح عثمانؓ کو ان کے عیال کے سامنے شہید کر دیا گیا تھا۔''

سیدنا حسینؓ نے جواب دیا: ''اے ابن عم میں تو اہل وعیال کے ساتھ ہی جاؤں گا۔''

اب حضرت ابن عباسؓ خاموش ہو گئے۔ قضا وقدر کو یہی منظور تھا کہ کربلا کا سانحۂ جانگداز پیش آئے۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت حسینؓ سے رخصت ہو کر واپس جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا گمان تھا کہ ابن زبیرؓ خلافت کے دعویدار ہیں اس لیے حضرت حسینؓ کے مکہ چھوڑ دینے پر خوش ہوں گے حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ خود ابن زبیرؓ سیدنا حسینؓ کو مکہ میں مقیم رہنے اور کوفہ نہ جانے کا مشورہ دے چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اپنے گمان کے تحت ابن زبیرؓ سے مخاطب ہو کر کہا: ''حسینؓ کے جانے سے تمہارے دل میں تو ٹھنڈک پڑ گئی۔'' پھر یہ شعر پڑھا:

خَلَا لَکِ الجوّ فَبِیْضِیْ واصْفرِیْ
و نَقّری مَاشِئتِ اَنْ تُنقّرِی

(اے پرندے اب تو ساری فضا کا مالک ہے، انڈے دے، چہچہا اور جب تک اور جو کچھ جی چاہے چگتا پھر)

حضرت ابن عباسؓ کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ سیدنا حسینؓ میدان کربلا میں اپنے متعدد اعزّہ و اقربا اور اعوان و انصار سمیت خواتین اور بچوں کے سامنے شہید کر دیے گئے۔ حضرت ابنِ عباسؓ کو اس دلدوز سانحہ کی خبر سن کر اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ساری عمر اس پر اشکبار رہے۔

(۵)

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ میں خلافت کا دعویٰ کیا اور لوگوں سے بیعت خلافت لینی شروع کی۔ اہل حجاز کی بہت بڑی تعداد نے ان کے

ہاتھ پر خوش دلی سے بیعت کرلی لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان کی بیعت کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ابن زبیرؓ کے حریف اور یزید کے حامی تھے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ سیاسی تنازعات اور سیاسی بکھیڑوں سے بالکل کنارہ کش ہو چکے تھے، امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں ان سے یزید کی بیعت کے لیے کہا تھا تو اس وقت بھی انہوں نے اس سے انکار کردیا تھا۔ ابن زبیرؓ نے ان پر بیعت کے لیے بڑا زور دیا لیکن وہ نہ مانے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ابن زبیرؓ نے بیعت سے مسلسل انکار کی بنا پر انہیں اور محمد بن حنیفہ کو قید کردیا تھا، ابن زبیرؓ کے دوسرے بڑے حریف مختار بن ابی عبید ثقفی کو اطلاع ملی تو اس نے کوفے سے سواروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا۔ اس دستے نے اچانک چھاپہ مار کر انہیں رہائی دلائی۔ یہ دستہ چاہتا تھا کہ ابن زبیرؓ کی فوج سے بھی نبرد آزما ہو لیکن ابن عباسؓ نے اسے منع کردیا اور فرمایا کہ میں حرم میں خونریزی پسند نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں ابن اثیرؒ نے مختار کے فرستادہ اس دستے میں شامل ایک شخص کی زبانی دو عجیب باتیں نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابن زبیرؓ محمد بن حنیفہؒ اور ابن عباسؓ کو زندہ جلا دینا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ان کی قیام گاہ کے گرد (جس میں وہ قید تھے) لکڑیوں کا انبار لگوا دیا تھا۔

دوسری یہ کہ جب یہ دستہ مکہ پہنچا تو ابن زبیرؓ نے کعبہ کا غلاف پکڑ کر پناہ مانگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ابن زبیرؓ کے مخالفین نے انہیں بدنام کرنے کے لیے وضع کیں۔ اگر درایت سے کام لیا جائے تو ان کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اگرچہ صغارِ صحابہؓ میں سے تھے لیکن اپنے علم و فضل اور اوصاف و محاسن کی وجہ سے اکابر صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے، وہ بیعت سے انکار کی بنا پر کسی کو زندہ جلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت محمد بن حنفیہؒ کوئی معمولی شخصیتیں نہیں تھیں کہ انہیں زندہ جلا دیا جاتا اور اہل مکہ خاموش تماشائی بنے رہتے۔ حضرت ابن زبیرؓ عرب کے شجاع ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ اپنے مخالفین کا ایک دستہ دیکھ کر وہ غلاف کعبہ سے لٹک کر پناہ مانگنے لگے، محض کذب و افترا ہے۔

مختلف روایتوں کو سامنے رکھ کر صورت واقعہ اس طرح نظر آتی ہے:

۱- ابن زبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ سے بیعت کا مطالبہ کیا جب وہ نہ مانے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

۲- مختار بن ابی عبید ثقفی نے قاتلانِ حسینؓ سے انتقام لیا تو ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ نے اس پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ بعد میں مختار نے ابن زبیرؓ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ابن زبیرؓ کو شبہ ہوا کہ مختار کو ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کی حمایت حاصل ہے۔ انہوں نے ازراہِ احتیاط ان دونوں بزرگوں کو (ابن عباسؓ کو ان کے مکان میں اور محمد بن حنفیہؒ کو چاہِ زمزم کی چاردیواری میں) نظر بند کر دیا لیکن وہ ہر وقت مکہ سے باہر جانے کی قدرت رکھتے تھے۔ حضرت محمد بن حنفیہؒ نے تو کوفہ جانے کا ارادہ بھی کیا مگر مختار کو ان کا کوفہ آنا پسند نہیں تھا اس لیے وہ مکہ ہی میں رک گئے۔

۳- مختار نے سواروں کا ایک مسلح دستہ مکہ بھیجا، جو ان دونوں بزرگوں کو اپنے ساتھ منیٰ لے آیا اور خود واپس چلا گیا۔ وہاں چند دن قیام کرنے کے بعد دونوں طائف چلے گئے۔ ایک روایت کے مطابق طائف جانے سے پہلے حضرت ابن عباسؓ نے ابن زبیرؓ سے سخت لہجے میں گفتگو کی تاہم اس کے بعد ابن زبیرؓ نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ مختار کے بھیجے ہوئے دستے سے حضرت ابن زبیرؓ اس لیے نبرد آزما نہ ہوئے کہ وہ حرمِ مکہ میں خونریزی کی ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

۴- یہ درست ہے کہ ابن عباسؓ نے ابن زبیرؓ کی بیعت نہیں کی لیکن وہ ابن زبیرؓ کے دشمن نہیں تھے اور ان کے فضائل و محامد کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھنا چاہتے ہو تو ابن زبیرؓ کی نماز دیکھو۔ (مسند احمد)

صحیح بخاری میں ابن ابی ملیکہؒ سے روایت ہے کہ ایک دن میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا، کیا آپ ابن زبیرؓ سے لڑ کر حرم الٰہی کو حلال کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، معاذ اللہ، حرم میں خونریزی کرنا بنوامیہ اور ابن زبیرؓ کی قسمت میں لکھا ہے، خدا کی قسم میں ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔

میں نے کہا، لوگ ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، معلوم نہیں وہ خلافت کا دعویٰ کس بنا پر کر رہے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا، کیوں نہ کریں، ان کے والد زبیرؓ حواریِ رسول ﷺ تھے، ان کے نانا ابوبکرؓ رسول اللہ ﷺ کے رفیق غار تھے، ان کی والدہ اسماءؓ ذات النطاق تھیں، ان کی خالہ عائشہؓ اُمّ المؤمنین تھیں، ان کے والد کی پھوپھی خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کی حرم محترم تھیں

اوران کی دادی صفیہؓ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ پھر وہ خود اسلام میں پاکباز اور قاریِ قرآن ہیں۔ خدا کی قسم اگر وہ میرے ساتھ کوئی احسان کریں گے تو یہ ایک رشتہ دار کا احسان ہوگا اور اگر وہ میری پرورش کریں گے تو یہ اپنے ذی عزت ہم عصر کی پرورش ہوگی۔

امام ذہبیؒ اور بعض دوسرے اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ زندگی کے آخری دَور میں حضرت ابن عباسؓ کی بینائی جاتی رہی۔ قیامِ طائف ہی کے دوران ۶۸ھ (۶۸۷ء) میں سخت بیمار ہوگئے۔ جب جانبری کی امید نہ رہی تو اپنے بستر کے گرد جمع احباب و اقارب اور معتقدین کے ہجوم سے مخاطب ہوکر فرمایا:

> ''میں ایک ایسی جماعت کے درمیان دنیا سے رخصت ہوں گا، جو زمین پر اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور مقرب ہے۔ اس لیے اگر میں تم لوگوں کے درمیان دم توڑوں تو یقیناً تم ہی وہ جماعت ہو۔''

سات روز کی علالت کے بعد اس آفتابِ علم و فضل نے پیک اجل کو لبیک کہا۔ وفات کی خبر پھیلی تو ہر طرف کہرام مچ گیا اور مخلوقِ خدا چاروں طرف سے آخری بار زیارت کے لیے اُمڈ پڑی۔ حضرت محمد بن حنفیہؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور امام المفسرین کو سرزمین طائف میں سپردِ خاک کر کے فرمایا:

> ''خدا کی قسم آج اُمت کا بہت بڑا عالم دنیا سے اٹھ گیا۔''

(٦)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کتابِ زندگی کا سب سے زیادہ روشن باب ان کا علم و فضل ہے۔ اس اعتبار سے وہ حقیقی معنوں میں حِبر یا بحر تھے۔ بڑے بڑے عظیم المرتبت صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور دوسرے علمائے سلف ان کے علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت کے معترف اور مدّاح تھے۔ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک ان کا جو مقام اور مرتبہ تھا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے تھے کہ ابن عباسؓ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ شفاف پردے کے پس منظر سے غیب کی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے کہ ابن عباسؓ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے، اسے امت محمدیہ میں ابن عباسؓ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

حضرت عبیداللہؒ بن عباسؓ کا قول ہے کہ میں نے عبداللہ بن عباسؓ سے بڑھ کر کسی کو سنت کا عالم، ان سے زیادہ صائب الرائے اور ان سے بڑا دقیق النظر کسی کو نہیں دیکھا۔

حضرت اُبیؓ بن کعب انصاری کے صاحب زادے محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن عبداللہ بن عباسؓ میرے والد کے پاس بیٹھے تھے وہ اٹھ کر گئے تو میرے والد نے فرمایا، ایک دن یہ شخص اِس اُمّت کا حِبر ہوگا۔

حضرت طاؤس تابعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ستر اصحاب کو دیکھا ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں ابن عباسؓ سے گفتگو کرتے تھے اور دونوں میں اختلاف رائے ہوتا تو آخر میں ابن عباسؓ کے قول پر ہی فیصلہ ہوتا۔

حضرت قاسم بن محمدؒ کا بیان ہے کہ ہم نے عبداللہ بن عباسؓ کی مجلس میں کبھی کوئی باطل تذکرہ نہیں سنا اور ان سے زیادہ کسی کا فتویٰ سنت نبوی کے مشابہ نہیں دیکھا۔

''دائرۂ معارف اسلامیہ'' میں علامہ محمد حسین الذہبیؒ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ علم و فضل کے اعتبار سے جس بلند مقام پر فائز تھے اس کے یہ پانچ اسباب تھے:

۱- رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ اسے کتاب و حکمت کا علم، دین کی سمجھ اور تاویل قرآن کا فہم عطا کر۔

۲- خانوادۂ نبوت میں تربیت ہوئی۔

۳- کبار صحابہؓ کی صحبت میسر آئی۔

۴- قوتِ حافظہ کے ساتھ لغت و ادب عرب کا حفظ ہونا۔ (انہوں نے عمر بن ابی ربیعہ کے ۸۰ اشعار صرف ایک مرتبہ سن کر یاد کر لیے تھے)۔

۵- اجتہاد کے مرتبہ کا حاصل ہونا۔

حضرت ابن عباسؓ دینی علوم کے علاوہ دوسرے تمام مروّجہ علوم میں بھی درجۂ تبحّر رکھتے تھے۔ وہ جملہ علوم و معارف کے جامع تھے۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور فرائض کے ساتھ ادب و انشاء، زبان و لغت، سیرت و مغازی، انساب، شعر و شاعری اور حساب وغیرہ میں بھی

یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ محدثین کرامؒ اورارباب ِسیَر نے ان کی قرآن فہمی کے بے شمار واقعات بیان کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی تمام آیات کی جزئیات تک سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ جب قرآن مجید کی کسی آیت کی تحقیق کرنا چاہتے تو صحابۂ کرامؓ سے اس کے بارے میں پوچھتے لیکن جب انہیں تسلّی بخش جواب نہ ملتا تو وہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف رجوع فرمایا کرتے اوران کی تفسیر پراعتماد کرتے۔ ابن عباسؓ کا قاعدہ تھا کہ قرآن مجید کے غریب الفاظ کے سمجھنے کے لیے قدیم عرب شعرا کے کلام کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔ گو بعض دیگر صحابہ کا بھی یہ دستور تھا لیکن ابنِ عباسؓ اس خصوصیت میں ممتاز تھے۔

تمام اہل سیر اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کو قرآن حکیم کی تفسیر وتاویل میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ اسی طرح آیاتِ قرآنی کی شانِ نزول اور ناسخ ومنسوخ کے علم میں ان کو جو تبحرّ حاصل تھا اس کی ہمسری بہت کم صحابہؓ کرسکتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کی طرف تفسیر کی ایک کتاب منسوب کی جاتی ہے، جس کا نام ہے ''تنویر المقباس من تفسیر ابن عباسؓ'' اس کو ''القاموس المحیط'' کے مؤلف ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (المتوفی ۸۱۷ھ) نے جمع کیا ہے اور یہ مصر میں کئی بار چھپ چکی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کو حدیث سے بھی شغف تھا، عہدِ رسالت میں گو وہ کمسن تھے لیکن حافظہ نہایت قوی پایا تھا۔ حضورؐ سے جو کچھ سنتے تھے اسے یاد کرلیتے تھے۔ آپؐ کے وصال کے بعد انہوں نے کبار صحابہؓ کی صحبت اختیار کی اوران کی احادیث سننے اور یاد کرنے کا خاص اہتمام کیا وہ ہر وقت حدیثِ رسول اکرم ﷺ کی تلاش وجستجو میں رہتے تھے۔ جہاں کہیں سراغ ملتا کہ فلاں صاحب کے پاس کوئی حدیث ہے تو خود چل کر ان کے پاس جاتے اور وہ حدیث حاصل کرتے۔

حضرت ابوسلمہؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ جس شخص کے متعلق مجھے معلوم ہوتا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سنی ہے تو میں خود اس کے مکان پر جاکر حاصل کرتا حالانکہ اگر میں چاہتا تو راوی کو اپنے یہاں بلوا سکتا تھا۔

حضرت ابورافعؓ رسول اکرم ﷺ کے غلام رہ چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کاتب کو ساتھ لے کر ان کے پاس جاتے اور حضورؐ کے روزانہ معمولات کے بارے میں دریافت کرتے۔ جو معلومات ان سے حاصل ہوتیں انہیں کاتب سے لکھواتے جاتے۔ اس تجسس کی وجہ سے ان کو

ہزار ہا احادیث از بر یاد ہوگئی تھیں لیکن وہ روایت حدیث میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے یہاں تک کہ وہ دور بھی آیا جب انہوں نے حدیث بیان کرنا بالکل ترک کر دیا۔ فرماتے تھے کہ جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب دیا بس حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیں اس وقت سے ہم نے روایت ہی کرنا چھوڑ دیا۔ اس احتیاط کے باوجود ان سے دو ہزار چھ سو ساٹھ (۲۶۶۰) احادیث مروی ہیں اور ان کا شمار راویانِ حدیث کے طبقۂ اول میں ہوتا ہے۔ کثیر الروایۃ صحابۂ کرامؓ میں حضرت ابو ہریرہؓ کے بعد انہی کا نام آتا ہے۔ ان کے راویانِ حدیث اور شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ چند کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت مسورؓ بن مخرمہ، حضرت ابوالطفیلؓ، حضرت کثیر بن عباسؓ (بھائی)، محمدؒ بن عبداللہؒ (بیٹے) علیؒ بن عبداللہؒ (بیٹے) محمدؒ بن علیؒ (پوتے) عبداللہؒ بن عبید اللہؒ (بھتیجے) حضرت سعیدؒ بن مسیبؒ، حضرت ابوسلمہؒ بن عبدالرحمنؒ، حضرت قاسمؒ بن محمد، حضرت عطاءؒ، حضرت سعیدؒ بن جبیر، حضرت عکرمہؒ، حضرت طاؤسؒ، حضرت سلیمان بن یسارؒ، حضرت عامر الشعبیؒ، حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہؒ، حضرت عمرو بن میمونؒ، حضرت نافع بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت یزید بن اصمؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت ابوالعالیہؒ، حضرت عمرو بن دینارؒ، حضرت عمار بن ابی عمارؒ، حضرت یحییٰ ابن یعمرؒ، حضرت عبداللہ بن شدادؒ، حضرت کریبؒ، حضرت ابورجاء عطاردیؒ۔

حضرت ابن عباسؓ کو فقہ اور اجتہاد میں بھی نہایت بلند مقام حاصل تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ ''امام ابوبکر محمد بن موسیٰؒ نے (جو خلیفہ مامون الرشید عباسی کے پڑپوتے تھے) ابن عباسؓ کے فتاویٰ بیس جلدوں میں جمع کیے تھے۔'' اس سے حضرت ابن عباسؓ کے تفقہ فی الدین کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ ''وہ فرائض اور حساب میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے۔''

شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہہ لیتے تھے۔ ابن رشیقؒ نے ''کتاب العمدۃ'' میں ان کے چند اشعار بطور نمونہ درج کیے ہیں۔ سخن فہمی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کو جاہلی شعرا کے ہزاروں اچھے اشعار از بر تھے۔ زبان و لغت اور انساب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ غرض ان کی ذات جامع العلوم کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہایت شیریں زبان تھے۔

گفتگو میں ادب کی چاشنی اور غضب کی فصاحت و بلاغت ہوتی تھی۔ تقریر نہایت مؤثر اور دلآویز ہوتی تھی۔ شقیق تابعیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے حج کے موقعے پر خطبہ دیا اور اس میں سورۂ نور کی تفسیر ایسے اچھوتے انداز میں بیان کی کہ اس سے پہلے نہ میرے کانوں نے سنی تھی نہ آنکھوں نے دیکھی تھی۔ اگر اس کو فارس اور روم سن لیتے تو پھر ان کو کوئی چیز حلقہ بگوش اسلام ہونے سے نہ روک سکتی۔ ابن ابی شیبہؒ کی روایت میں اتنا اور اضافہ ہے کہ ایک شخص بولا کہ ابن عباسؓ کی خوش بیانی اور مٹھاس پر میرا دل چاہتا تھا کہ ان کا سر چوم لوں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے علم کی بے اندازہ دولت کو اپنے تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ تمام عمر اس کو مخلوقِ خدا میں بے دریغ لٹاتے رہے۔ ان کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا، جس سے ہزاروں طالبانِ علم مسلسل فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ ''مستدرک حاکم'' میں ابوصالح تابعیؒ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے مکان کے سامنے لوگوں کی اتنی بڑی بھیڑ دیکھی کہ ان کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے آمد و رفت کا راستہ رک گیا تھا۔ میں نے اس اژدہام کی اطلاع حضرت ابن عباسؓ کو دی تو انہوں نے وضو کے لیے پانی طلب کیا۔ وضو کے بعد مجھ سے فرمایا کہ قرآن کریم کی تفسیر یا اس کے رموز و معارف کے بارے میں جو لوگ سوال کرنا چاہتے ہوں، ان کو اندر بلا لو۔ میں نے آواز دی تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر اور ملحقہ حجرے بھر گئے۔ ابن عباسؓ نے فرداً فرداً ہر شخص کے سوال کا جواب دیا اور سب کو مطمئن کر کے رخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا، فقہ حدیث اور حرام و حلال کے سائلوں کو بلاؤ، میں نے انہیں بلایا تو ان سے بھی سارا گھر بھر گیا۔ ابن عباسؓ نے ان کو بھی تسلی بخش جواب دے کر رخصت کیا۔ پھر فرمایا، اب فرائض وغیرہ کے سائلوں کو بلاؤ۔ ان کے جم غفیر سے بھی گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ ابن عباسؓ نے ان کے سوالات بھی حل کیے۔ آخر میں عربی زبان، ادب و انشاء اور شعر و سخن کے سائلوں کو طلب کیا۔ ان کی کثرت تعداد کا بھی وہی حال تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان کے سوالات سے زیادہ جوابات دیے اور سب کی تشفی کر دی۔ ابوصالح کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی اتنی بڑی مجلس کبھی نہ دیکھی تھی۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے کوئی شخص علم کے کسی بھی شعبہ کے متعلق کوئی سوال کرتا تو اس کو اس کا جواب ضرور ملتا۔

حضرت ابن عباسؓ بعض اوقات علمی مذاکروں کے لیے خاص دن مقرر کر دیتے تھے۔ کسی دن تفسیر کا درس دیتے تھے۔ کسی دن حدیث اور فقہ کا، کسی دن تاویل قرآن پر روشنی ڈالتے تھے، کسی دن ایام عرب کی داستانیں بیان کرتے اور کسی دن مغازی کے واقعات سناتے۔ کسی دن زبان وادب اور لغت کے نکات بیان کرتے۔ کسی دن شعر وسخن سے مجلس کو آراستہ کرتے اور کسی دن انساب کا تذکرہ کرتے۔ غرض ان کی مجالس اور حلقۂ درس میں علوم ومعارف کے چشمے ابلتے رہتے تھے۔

درس کے حلقوں کے علاوہ وہ کبھی کبھی نماز کے بعد اپنے خطبات کے ذریعے بھی لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن شقیقؒ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ نے عصر کی نماز کے بعد ہمارے سامنے تقریر شروع کی، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور تارے نکل آئے۔ لوگ نماز نماز کی آوازیں بلند کرنے لگے۔ بنو تمیم کے ایک شخص نے تو مسلسل نماز نماز پکارنا شروع کر دیا۔ اس پر ابن عباسؓ کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا، تیری ماں مرے، تو مجھ کو سنت کی تعلیم دیتا ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپؐ (کبھی کبھی) ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں ملا کر پڑھا کرتے تھے۔

راوی (عبداللہ بن شقیقؒ) کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی۔ میں نے جا کر حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا تو انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی تصدیق کی اور فرمایا کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے۔

قیام کے علاوہ سفر میں بھی حضرت ابن عباسؓ کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا۔ مکہ معظمہ سے باہر قیام ہوتا اور حج کے لیے مکہ آتے تو طالبانِ علم ان کے فیضان سے بہرہ یاب ہونے کے لیے ٹوٹ پڑتے۔

مکہ میں مستقل قیام کے دوران میں مدینہ منورہ جاتے تو وہاں بھی ان کی قیام گاہ ہر وقت شائقین علم سے بھری رہتی۔ بصرہ، کوفہ، دمشق، طائف جہاں بھی جاتے لوگ ان کے خوان علم سے ریزہ چینی کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو غیر زبان والے لوگ بھی مسائل کی تحقیق یا کسب علم کے لیے ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ انہوں نے ان لوگوں کی سہولت کے لیے کچھ ترجمان مقرر کر دیے جو عربی بھی جانتے تھے اور ان لوگوں کی زبان بھی۔

حضرت ابن عباسؓ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ لوگ تقدیر جیسے نازک اور دقیق مسئلہ پر بحث مباحثہ کریں کیونکہ خود سرورِ عالم ﷺ نے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع فرمایا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ تقدیر الٰہی پر ایمان رکھنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اس میں موشگافیاں کرنے سے گمراہی کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کو اطلاع ملی کہ ایک شخص تقدیر کا منکر ہے۔ اس زمانے میں وہ نابینا ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں سے فرمایا، مجھے اس شخص کے پاس لے چلو۔ لوگوں نے پوچھا، آپ اس کے پاس جا کر کیا کریں گے؟ فرمایا، اگر ہو سکا تو اس کی ناک کاٹ ڈالوں گا اور اگر گردن پر ہاتھ پڑ گیا تو اسے توڑ دوں گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپؐ فرماتے تھے" میں بنوفہر کی عورتوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ کعبہ کا طواف کر رہی ہیں اور سب کی سب اعمال شرک میں مبتلا ہیں۔" تقدیر کا انکار اس اُمت کے شرک میں مبتلا ہونے کی پہلی علامت ہے۔ مجھے اپنے خالق کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ایسے لوگوں کا فساد یہیں تک محدود نہ رہے گا بلکہ جس طرح انہوں نے شر کی تقدیر سے انکار کیا ہے اسی طرح خدا کی خیر کی تقدیر سے بھی منکر ہو جائیں گے۔

۸

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نہایت شریف الطبع اور منکسر المزاج تھے۔ اصحابِ فضل و کمال کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جس زمانے میں بصرہ کے والی تھے، حضرت ابوایوب انصاریؓ ان کے پاس تشریف لے گئے اور اپنی احتیاج کا ذکر کیا تو حضرت ابن عباسؓ نے دل کھول کر ان کی مدد کی کیونکہ ہجرت کے بعد وہ سرورِ عالم ﷺ کے میزبان بنے تھے۔ حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے چالیس ہزار درہم اور بیس خادموں کے علاوہ گھر کا سارا اثاثہ ان کے حوالے کر دیا۔ (سیر اعلام النبلاء)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ بصرہ تشریف لے گئے تو حضرت ابن عباسؓ نے ان کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے اور کہا میں چاہتا ہوں کہ جس طرح آپ نے رسول اللہ ﷺ کی اقامت کے لیے اپنا گھر خالی کر دیا تھا، میں بھی آپ کے لیے اپنا گھر خالی کر دوں۔ پھر انہوں نے اپنے تمام اہل و عیال کو دوسرے مکان میں منتقل کر دیا اور مکان مع اس تمام ساز و سامان کے جو گھر میں موجود تھا، حضرت ابوایوبؓ کی نذر کر دیا۔ (سیر انصار جلد اوّل)

ایک مرتبہ حضرت زیدؓ بن ثابت انصاری سوار ہوئے تو حضرت ابن عباسؓ نے پاس ادب کے طور پر ان کی رکاب تھام لی۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے فرمایا:

''اے رسول اللہ ﷺ کے ابن عم! ایسا نہ کیجیے یہ مناسب نہیں ہے۔''

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ''ہمیں اپنے علماء کا اسی طرح ادب و احترام کرنا چاہیے۔''

(حضرت زیدؓ بن ثابت بھی بہت بڑے عالم تھے اور مقری، فرضی، کاتب الوحی، اور حبر الاُمّت کے القاب سے مشہور تھے۔)

حضرت زیدؓ بن ثابت نے ان کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا:

''ہمیں بھی اپنے نبی ﷺ کے اہل بیت کا اسی طرح ادب کرنا چاہیے۔''

(مستدرک حاکم)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد ایک دفعہ ایک انصاری صاحب رسولؐ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا لیکن آپؐ کے اصحاب ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں چلو ان سے علم حاصل کریں۔

انصاری صاحب رسولؐ نے کہا ''ابن عباس! مجھ کو تم پر حیرت ہوتی ہے، تم جانتے ہو کہ لوگ خود تمہارے علم کے محتاج ہیں پھر تم دوسروں کے پاس جاتے ہو؟''

حضرت ابن عباسؓ نے یہ جواب سن کر ان کو چھوڑ دیا اور اپنا معمول بنا لیا کہ تنہا ہر ایسے صاحبؓ رسولؐ کے پاس پہنچ جاتے، جن کے بارے میں انہیں اطلاع ملتی کہ انہوں نے سرورِ عالم ﷺ سے کوئی حدیث سنی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ ان کے دروازے پر دستک دیتے وہ باہر نکلتے تو ان سے پوچھتے، کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سنی ہے وہ کہتے، اے ابن عم رسولؐ،

آپ نے یہاں تشریف لانے کی تکلیف کیوں فرمائی، کسی دوسرے کو بھیج دیا ہوتا، حضرت ابن عباسؓ فرماتے، نہیں یہ میرا فرض تھا۔

اس مقصد کے لیے وہ ان اصحاب کے پاس بھی بلاجھجک چلے جاتے تھے، جن سے ان کا مقام ومرتبہ کہیں بلند تھا اور جو ان کے ایک اشارے پر خود دوڑ کر ان کے پاس چلے آتے۔

حدیث کے علاوہ دوسرے علوم کی تحصیل کے لیے بھی دوسروں کے پاس جانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ حضرت ابوقیس صرمہؓ بن ابی انس انصاری مدینہ کے نہایت بلند پایہ شاعر تھے اور بہت اچھے اخلاقی شعر کہا کرتے تھے۔ ابن اثیرؒ نے ''اُسدالغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ان کے ہاں جایا کرتے تھے اور ان سے شعر حاصل کرتے تھے۔

۹

حضرت ابن عباسؓ کو سرورِ عالم ﷺ سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ عہدِ رسالت میں ان کو اکثر حضورؐ کی خدمت گزاری کی سعادت نصیب ہوتی رہتی تھی۔ وہ نہایت مستعدی سے حضورؐ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے اور بعض اوقات آپؐ کے حکم کے بغیر بھی ایسے کام کر دیتے تھے۔ جن سے حضورؐ خوش ہوتے تھے اور ان کو دعائیں دیتے تھے۔ اس قسم کے چند واقعات کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

حضورؐ کے وصال کے بعد آپؐ سے محبت اور عقیدت کی یہی کیفیت رہی۔ مسند احمدؒ میں حضرت سعیدؒ بن جبیر سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا، ''پنجشنبہ کا دن، کون پنجشنبہ'' اتنا کہنے پائے تھے کہ ان پر رقت طاری ہوگئی اور زاروقطار رونے لگے اس قدر روئے کہ زمین پر سامنے پڑے ہوئے کنکر گیلے ہوگئے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو ہم (حاضرین) نے پوچھا، ابوالعباس پنجشنبہ کے دن میں کیا خاص بات تھی؟ فرمایا، اس روز رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت میں شدت ہوگئی تھی۔

حدیث بیان کرتے وقت اس کا پورا پورا لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی غلط روایت حضورؐ کی جانب منسوب نہ ہونے پائے۔ جہاں اس قسم کا ذرّہ برابر بھی اندیشہ ہوتا وہ بیان نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ غلط باتیں حضورؐ سے منسوب کرتے ہیں تو فرمایا، تم کو قَالَ

رسول اللہ ﷺ کہتے وقت یہ خوف نہیں معلوم ہوتا کہ تم پر عذاب نازل ہو جائے یا زمین شق ہو جائے اور تم اس میں سما جاؤ۔

حضورؐ کا اس قدر پاسِ ادب تھا کہ فتویٰ دیتے تو آپؐ کا اسم گرامی نہ لیتے تھے تا کہ آپؐ کی طرف نسبت کرنے کی ذمہ داری نہ اٹھانا پڑے۔

مسند دارمی میں ہے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس حدیثیں بیان کرنا شروع کر دی ہیں تو انہوں نے روایت کرنا ہی چھوڑ دیا۔

اُمّہات المؤمنینؓ کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ ان کی خالہ تھیں ان کی خدمت میں اکثر جایا کرتے تھے، ان سے حدیثیں سنتے تھے اور وہ کوئی حکم دیتیں تو اس کو بجالاتے تھے۔ حضرت میمونہؓ نے ۵۱ھ میں وفات پائی تو حضرت ابن عباسؓ ہی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو ابن عباسؓ نے فرمایا، یہ رسول اللہ ﷺ کی حرم محترم ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، ادب کے ساتھ آہستہ لے چلو۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہمیشہ احترام و ادب ملحوظ رہا لیکن ایک دفعہ وہ بعض وجوہ کی بنا پر ان سے ناراض ہو گئیں۔ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئیں اور حضرت ابن عباسؓ کو ان کی شدید علالت کی خبر ہوئی تو وہ فوراً ان کے درِ دولت پر پہنچے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی، اُمّ المؤمنین نے پہلے تو اجازت دینے میں تامل کیا لیکن جب ان کے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمٰن نے عرض کی:

"اماں عبداللہ بن عباسؓ آپ کے سعادت مند بیٹے آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی خدمت میں باریاب ہونے کی اجازت چاہتے ہیں، ان کو اجازت دیجیے۔"

تو اُمّ المؤمنینؓ نے فرمایا: "خیر اگر تم چاہتے ہو تو بلا لو۔"

حضرت ابن عباسؓ نے اندر آ کر سلام کیا، اُمّ المؤمنینؓ کے قریب بیٹھ گئے اور کہا۔

"آپ کو بشارت ہو۔"

اُمّ المؤمنینؓ نے بھی جواب میں یہی کلماتِ خیر دہرائے۔ پھر حضرت ابن عباسؓ نے عرض کیا:

"اب آپ کے اور رسول اللہ ﷺ اور دوسرے (مرحوم) اعزہ و اقارب کے مابین وہی

پردہ ہے، جو جسم اور روح کے درمیان حائل ہے۔ اس کے دور ہوتے ہی آپ کی ان سب سے ملاقات ہوجائے گی۔"

پھر انہوں نے اُمُّ المؤمنینؓ کے فضائل بیان کرنا شروع کر دیے اور عرض کیا:

"آپ رسول اللہ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ تھیں اور حضورؐ ہمیشہ پاکیزہ ہی شے کو محبوب رکھتے تھے۔"

اس طرح انہوں نے اُمّ المؤمنینؓ کو ان کے سفرِ آخرت کرنے سے پہلے راضی کرلیا۔

سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہماری تاریخ کی متاعِ گراں بہا ہیں۔ ان کے سرچشمۂ فضل وکمال سے فیوض و برکات کے جو چشمے جاری ہوئے وہ آج بھی جاری ہیں اور ہر شخص بقدر ظرف ان سے سیراب ہوسکتا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابوہریرہ دَوسیؓ

①

حِبرُ الاُمّت حضرت زیدؓ بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں مسجد نبوی میں دُعا اور ذکر خدا میں مشغول تھا۔ میرے ساتھ دو اور آدمی بھی ذکر الٰہی کر رہے تھے۔ ان میں ایک شخص یمن کے قبیلہ دَوس سے تعلق رکھتا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ ہم لوگ خاموش ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا، اپنا کام جاری رکھو۔ اس ارشاد پر میں اور دوسرا شخص دَوسی نوجوان کے قبل بآوازِ بلند دعا کرنے لگے۔ حضورؐ ہمارے ہر جملے پر آمین کہتے جاتے تھے۔ ہم دونوں دُعا مانگ چکے تو اس دَوسی نوجوان نے دستِ دعا اٹھائے اور بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض پیرا ہوا:

''بارِ الٰہا جو کچھ میرے ساتھی مجھ سے پہلے مانگ چکے ہیں، وہ مجھے بھی عطا کر۔ اس کے علاوہ ایسا علم عطا کر جو کبھی فراموش نہ ہو۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے آمین کہا۔ اس کے بعد میں اور میرے دوسرے ساتھی نے عرض کی:

''یا رسول اللہ ہم کو بھی ایسا علم عطا ہو جو کبھی نہ بھولے۔''

حضورؐ نے فرمایا:

''وہ تو اس دَوسی نوجوان کے حصہ میں آچکا۔''

قبیلہ دَوس کے یہ خوش بخت نوجوان، جن کو سید الاوّلین والآخرین ﷺ کے ارشاد کے مطابق بارگاہِ ایزدی سے کبھی فراموش نہ ہونے والا علم بطور خاص عطا ہوا، سیدنا حضرت ابوہریرہؓ تھے۔

۲

سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ ان بزرگ صحابہؓ میں سے ہیں، جنھوں نے اپنے وطن سے مدینہ منورہ آنے کے بعد بارگاہِ رسالت میں حاضر رہنے کو سارے جہان کی عزّتوں اور سربلندیوں پر فوقیت دی اور نبوت کے سرچشمۂ علم سے اس طرح سیراب ہوئے کہ خود جوئے علم بن گئے، ایسی جوئے علم جس سے لاکھوں بندگانِ خدا نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت حدیث کے اعتبار سے ان سات اساطین امت میں سرفہرست ہیں، جن سے ہزار سے زیادہ احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے جب کہ چھ دوسرے کثیر الروایۃ بزرگوں کے اسماء گرامی اور ان سے مروی احادیث کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۲۲۶۰
اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ	۲۲۱۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۶۳۰
حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ	۱۵۴۰
حضرت انسؓ بن مالک انصاری	۱۲۸۶
حضرت ابو سعید خُدریؓ	۱۱۷۰

ایک دفعہ بعض لوگوں نے حضرت ابو ہریرہؓ پر اعتراض کیا کہ آپ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں حالانکہ مہاجرین وانصار ان حدیثوں کو نہیں بیان کرتے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

''میرے بھائی مہاجرین تجارت میں اور میرے بھائی انصار کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے لیکن میں پیٹ پالنے کے لیے ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اس بنا پر جب وہ لوگ غائب ہوتے تو میں آپؐ کی خدمت میں موجود رہتا

تھا۔ میں فقرائے صُفّہ کی جماعت کا ایک فرد تھا۔ جب یہ لوگ بھول جاتے تھے تو میں یاد کر لیتا تھا۔ (صحیح بخاری)

شروع شروع میں حضوؐر کے بعض ارشادات حضرت ابو ہریرہؓ کے ذہن سے محو ہو جاتے تھے۔ یہ بات ان کے لیے سوہانِ روح تھی۔ ایک دن بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کی:

''یارسول اللہ میں آپ کے بعض ارشادات بھول جاتا ہوں۔''

حضوؐر نے فرمایا: ''چادر پھیلاؤ۔''

انہوں نے چادر پھیلا دی۔ آپؐ نے اس میں اپنے دست مبارک ڈالے پھر فرمایا، اس کو سینہ سے لگا لو۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے تعمیل ارشاد کی۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ اس واقعے کے بعد میں حضوؐر کا کوئی ارشاد کبھی نہ بھولا۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم)

(۳)

حضرت ابو ہریرہؓ کا خاندانی نام عبد شمس تھا۔ سرورِ عالم ﷺ نے ان کا اسلامی نام باختلافِ روایت عبدالرحمٰن یا عمیر رکھا لیکن تاریخ میں انہوں نے اپنی کنیت ابو ہریرہؓ سے شہرت پائی۔ ان کا تعلق قبیلہ دَوس (ازد کی ایک شاخ) سے تھا جو یمن میں آباد تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابو ہریرہؓ عبدالرحمٰن (عمیر) بن عامر بن عبد ذی الشریٰ بن طریف بن غیاث بن ہنیہ بن سعد بن ثعلبہ بن سلیم بن فہم بن غنم بن دوس۔

حضرت ابو ہریرہؓ اپنی کنیت کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک بلی (ہرہ) پال رکھی تھی۔ رات کو اسے ایک درخت پر رکھ دیتا تھا اور صبح کو جب اپنی بکریاں چرانے جاتا تو اس بلّی کو ساتھ لے لیتا اور اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ لوگوں نے بلی سے میرا غیر معمولی لگاؤ دیکھ کر مجھ کو ابو ہریرہ کہنا شروع کر دیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کی یہ کنیت کس نے تجویز کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ مجھے ایک بلی مل گئی تھی، جس کو میں اپنی آستین میں لیے پھرتا تھا۔ اسی وقت سے مجھے ابو ہریرہؓ کہا جانے لگا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ ان کو ''ابوہر'' یا ''ابوہریرہ'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے اور نہایت عسرت و افلاس کے عالم میں پرورش پائی۔ وہ روزانہ اپنے گھر کی بکریاں جنگل لے جاتے اور شام تک انہیں چراتے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے حالات بدلنے لگے یہاں تک کہ وہ ایک غلام رکھنے کے قابل ہوگئے۔ ان کے آغوشِ اسلام میں آنے سے پہلے کے حالات بہت کم معلوم ہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں انہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور شعر بھی کہنے لگے تھے۔ بعثت نبوی کے بعد قبیلہ دوس کے ایک سعید الفطرت رئیس طفیلؓ بن عمرو مکہ گئے اور وہاں سے مشرف بہ اسلام ہوکر واپس آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنی قوم کو بھی دعوت توحید دی لیکن سوائے چار آدمیوں کے کسی نے اُن کی آواز پر کان نہ دھرے۔ یہ چار افراد حضرت طفیلؓ کے والد، والدہ، اہلیہ اور حضرت ابوہریرہؓ تھے۔ کئی ماہ کی شبانہ روز مساعی کے باوجود جب دوس کے دوسرے لوگ اسلام کی طرف مائل نہ ہوئے تو حضرت طفیلؓ شکستہ دلی کے عالم میں پھر مکہ گئے اور بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوکر عرض کی:

> یارسول اللہ میری قوم بڑی ناہنجار ہے میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ قبولِ حق پر آمادہ نہیں ہوئی آپ اس بدبخت قوم کے لیے بددعا فرمایئے۔'' رحمت عالم ﷺ نے بددعا کی بجائے دُعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوسا (اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت عطا فرما)

پھر حضورؐ نے حضرت طفیلؓ کو ہدایت کی کہ واپس جاکر تبلیغ جاری رکھو۔ اب جو حضرت طفیلؓ اپنے قبیلے میں واپس گئے اور تبلیغ شروع کی تو لوگوں نے ان کی باتیں بڑے دھیان سے سنیں اور رفتہ رفتہ اسلام کی طرف راغب ہونے لگے اور پھر حضورؐ کی دُعا کا یہ اثر ہوا کہ چند سال کے اندر اندر دَوس کے بہت سے گھرانے مشرف بہ ایمان ہوگئے۔ اس دوران میں حضورؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے اور بدر، اُحد اور خندق کے معرکے بھی گزر گئے۔ اوائل ۷ ہجری میں حضرت طفیلؓ اپنے قبیلہ کے اَسّی گھرانوں کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچے۔ اس قافلے میں

حضرت ابوہریرہؓ بھی اپنی والدہ کے ساتھ شامل تھے۔ حضورؐ اس وقت غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تھے اور وہیں تشریف فرما تھے۔ حضرت طفیلؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور قافلے میں شریک دوسرے تمام مردوں کے ساتھ مدینہ سے خیبر پہنچے۔ راستے میں حضرت ابوہریرہؓ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ یہ شعر پڑھتے رہے:

یا لیلة من طولها وعنائها
علیٰ انها من دار الکفر نجّت

(ہائے، رات کی درازی اور مشقت کتنی بُری ہے تاہم اس نے مجھے دارالکفر سے نجات بخشی)

حضرت ابوہریرہؓ نے وطن سے چلتے وقت ایک غلام کو بھی ساتھ لے لیا تھا راستے میں جو کہیں گم ہوگیا۔ حضرت ابوہریرہؓ خیبر پہنچ کر حضورؐ کی زیارت اور بیعت سے مشرف ہوئے تو اتفاق سے ان کا غلام وہیں پہنچ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

''ابوہریرہ تمہارا غلام آ گیا۔''

حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ میں اسے اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔''

بیعت کے بعد حضرت ابوہریرہؓ رحمت دوعالم ﷺ کے دامنِ اقدس سے ایسے وابستہ ہوئے کہ آخری دم تک اسے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں حضرت ابوہریرہؓ کی زبانی یہ روایت درج کی ہے کہ ''سرورِعالم ﷺ خیبر تشریف لے گئے تھے۔ میں اسی زمانے میں مدینہ آیا۔ نماز فجر سباعؓ بن عرفطہ غفاری کی اقتدا میں پڑھی جن کو حضورؐ مدینہ میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ سباعؓ نے پہلی رکعت میں سورۂ مریم اور دوسری میں وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ (کم تولنے والوں کے لیے خرابی ہے) پڑھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا، فلاں ازدی شخص کا ستیاناس اس نے دو ترازو بنا رکھے تھے۔ ایک کے ساتھ کم تول کر دوسروں کو دیتا اور دوسری ترازو کے ساتھ لوگوں سے زیادہ لیا کرتا تھا۔''

نمازِ فجر کے بعد حضرت ابوہریرہؓ خیبر کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر حضورؐ کی

خدمت میں حاضر ہوئے، اپنے اسلام کا ذکر کیا اور آپؐ کے سامنے اپنا توشہ پیش کیا جو آپؐ نے بخوشی قبول فرمالیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے دَوسی مہاجرین کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے دَوسی مجاہدین کو خیبر پر یلغار کرنے والی فوج کے میمنہ پر مقرر فرمایا۔ سرورِ عالم ﷺ غزوۂ خیبر سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو حضرت ابوہریرہؓ بھی آپؐ کے ساتھ واپس آئے اور مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

(۴)

مدینہ منورہ آنے کے بعد سے سرورِ عالم ﷺ کے وصال تک کا زمانہ (۷ھ تا ۱۱ھ) حضرت ابوہریرہؓ کی تمام زندگی کا حاصل تھا۔ اس زمانے کا بیشتر حصہ انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کی بابرکت صحبت میں گزارا۔ انہوں نے ایک تو اپنی مسکینی کی بنا پر اور دوسرے فیضانِ نبوی سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کی خاطر اصحاب صُفّہؓ کی مقدس جماعت میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ سفر ہو یا حضر، خلوت ہو یا جلوت، رات ہو یا دن، حج ہو یا غزوہ وہ ہر موقع پر بارگاہِ رسالت میں حاضر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ حضورؐ کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کرتے رہیں اور نبوت کے سرچشمہ علوم و معارف سے سیراب ہوتے رہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا:

''یارسول اللہ آپ کا مشاہدۂ جمال میری روح کی تسکین و راحت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔''

فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ ابوہریرہؓ ہم سب سے زیادہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر رہتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت طلحہؓ (صاحب اُحد) سے کسی شخص نے کہا: ''ابو محمد ہم نہیں جانتے کہ یہ یمنی (ابوہریرہ) ارشاداتِ نبوی کا بڑا حافظ ہے یا آپ لوگ۔''

حضرت طلحہؓ نے فرمایا:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوہریرہؓ نے لسانِ رسالت سے بہت سی ایسی باتیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگ گھربار، اہل و عیال اور مال و

جائداد والے تھے ان کی نگہداشت کے بعد صبح وشام کو جو وقت ملتا تھا، بارگاہِ رسالت میں گزارتے تھے۔ ابوہریرہ مسکین تھے، مال ومتاع اور بیوی بچوں کے جھنجٹ سے آزاد تھے اس لیے حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، اسی لیے ان کو ہم سب سے زیادہ حضورؐ کے ارشادات سننے کا موقع ملا۔ ہم میں سے کسی نے ان پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ حضورؐ سے سنے بغیر کوئی حدیث بیان کرتے ہیں۔''

حضرت ابوہریرہؓ کو بارگاہِ نبوی میں اتنا تقرب حاصل ہوگیا تھا کہ دوسرے صحابۂ کرام جو سوالات حضورؐ سے پوچھنے میں جھجک محسوس کرتے تھے حضرت ابوہریرہؓ بڑی بے تکلفی سے وہ سوالات آپؐ سے پوچھ لیتے تھے۔

''مستدرک حاکم''میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے سوالات پوچھنے میں بہت جری تھے۔ وہ آپؐ سے ایسے ایسے سوالات کرتے تھے جو ہم لوگ نہیں کرسکتے تھے۔

خود ذات رسالت مآب ﷺ کو حضرت ابوہریرہؓ کے اشتیاق حدیث کا اعتراف تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضورؐ سے پوچھا: ''یارسول اللہ قیامت کے دن کون خوش نصیب آپ کی شفاعت کا زیادہ مستحق ہوگا۔''

حضورؐ نے فرمایا: ''تمہاری حرص علی الحدیث دیکھ کر میرا پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی اور نہ پوچھے گا۔''

دن رات حضورؐ کے فیض صحبت سے متمتع ہونے کی بنا پر حضرت ابوہریرہؓ کے سینے میں اس قدر احادیث کا ذخیرہ محفوظ ہوگیا تھا کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے:

''ابوہریرہؓ علم کا ظرف ہے۔'' (صحیح بخاری، کتاب العلم)

تحصیل علم کے بے پناہ شوق نے حضرت ابوہریرہؓ کو فکر معاش سے بے نیاز کردیا تھا۔ انہوں نے بارگاہِ نبوی میں ہر وقت کی حاضری کی خاطر بھوک پیاس اور فقر و فاقہ کی مصیبتیں برداشت کیں۔ کئی کئی دن تک بھوکے رہے، پھٹے پرانے کپڑے پہنے مگر ان کی طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنی معیشت کے لیے حضور ﷺ کی صحبت ترک کردیں۔ علم کی خاطر بھوک اور ننگ کی

تکلیفیں برداشت کرنا اور فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں اور نہ یہ ہر شخص کے بس کی بات ہے۔ یہ حضرت ابو ہریرہؓ ہی کا دل گردہ تھا کہ انہوں نے بارگاہِ نبوی سے تحصیل علم کو دنیا کی ہر شے پر ترجیح دی۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک بار سرکار دو عالم ﷺ کے پاس مال غنیمت آیا۔ حضورؐ نے از راہِ شفقت حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا، کیوں ابو ہریرہ تمہیں بھی کچھ خواہش ہے؟

انہوں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ میری خواہش تو یہی ہے کہ میں آپؐ سے علم سیکھتا رہوں، مال میرے کس کام کا ہے۔''

ابن سعدؒ نے ''طبقات'' میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

> ''میرا حال یہ تھا کہ جب میرے پیٹ میں کچھ پڑ جاتا تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا (تاکہ آپؐ کے ارشادات سے مستفیض ہوسکوں) یہی سبب تھا کہ نہ کبھی خمیری روٹی کھائی نہ عمدہ لباس پہنا اور نہ کوئی خادم یا خادمہ میسر آئی (کیونکہ یہ چیزیں کچھ کمانے کی متقاضی تھیں) جب بھوک ستاتی تو کسی صاحب سے قرآن کی کوئی آیت پڑھنے اور اس کی تفسیر بیان کرنے کی درخواست کرتا دراں حالے کہ وہ آیت مجھے خود یاد ہوتی۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ شاید اس طرح وہ صاحب مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں اور مجھے کھانا کھلا دیں۔ میں ان ستر اصحاب صفہ میں شامل تھا جن میں سے کسی کے پاس اوڑھنے کے لیے چادر تک نہ ہوتی تھی بس ایک دھاری دار کپڑا یا کمبل ہوتا تھا جس کو وہ اپنی گردن میں باندھ لیتا تھا۔ جب بھوک ستاتی تو گھر سے نکل کر مسجد میں آ جاتا۔''

حافظ ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں حضرت ابو ہریرہؓ کے فقر و افلاس اور حسن طلب کے بارے میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ انہیں کئی دن تک کچھ کھانے کو میسر نہ آیا۔ بھوک سے بے تاب ہو کر باہر نکلے اور راہ گزر عام پر کہنی سے زمین پر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ادھر سے گزرے۔ جی تو چاہا کہ ان سے کہیں، کچھ کھلائیے بھوک سے بیتاب ہوں، مگر حوصلہ نہ پڑا۔ البتہ حسن طلب کے طور پر قرآن حکیم کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی

جس میں غریبوں اور مسکینوں کی اعانت پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس آیت کا مفہوم بتا کر یوں ہی گزر گئے۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ گزرے۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا۔ آپؐ نے ان کے چہرے سے اندازہ فرمالیا کہ سخت بھوک میں مبتلا ہیں۔ آپؐ ان کو اپنے ساتھ گھر لے گئے، وہاں دودھ سے بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ رکھا تھا جو کسی نے ہدیۃً بھیجا تھا۔ حضورؐ نے حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا، جاؤ اور سب اہل صفہ کو بلالاؤ۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔ پھر حضور نے حضرت ابوہریرہؓ کو حکم دیا کہ یہ دودھ سب کو دو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہر شخص نے خوب سیر ہوکر دودھ پیا۔ جو بچ گیا انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ تم پیو، انہوں نے پیا۔ حضورؐ نے پھر فرمایا، پیو، انہوں نے پھر پیا۔ آپؐ برابر فرماتے رہے کہ پیو اور وہ پیتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے عرض کیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اب میرے پیٹ میں مزید گنجائش نہیں ہے۔ اب باقی دودھ حضورؐ نے لے لیا اور خود نوش فرمایا۔

اربابِ سیر نے حضرت ابوہریرہؓ سے متعلق اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات بیان کیے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذی استطاعت صحابہ کرام حضرت ابوہریرہؓ اور دوسرے اصحاب صفہ کی خبر گیری فرماتے رہتے تھے اور سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کو ان کا خیال رہتا تھا لیکن یہاں تو یہ کیفیت تھی کہ خود آقائے دوجہاںؐ بھی بھوک کی تکلیف سے نہیں بچے تھے۔ آپؐ کے پاس کبھی ہوتا اور کبھی نہ ہوتا۔ جب ہوتا سب کو تقسیم کر دیتے اور جب نہ ہوتا اس وقت حضرت ابوہریرہؓ جیسے عشاق علم کو البتہ تکلیف برداشت کرنی پڑتی۔

۵

حضرت ابوہریرہؓ وطن سے چلتے وقت اپنی والدہ کو بھی ساتھ لیتے آئے تھے۔ ان کا نام بہ اختلافِ روایت میمونہ یا اُمیمہ تھا۔ وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور بڑے مشکل حالات میں حضرت ابوہریرہؓ کی پرورش کی تھی اس لیے حضرت ابوہریرہؓ ان کے بے حد اطاعت گزار تھے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ حضرت ابوہریرہؓ تو مدینہ آنے سے پہلے ہی سعادت اندوز اسلام

ہو گئے لیکن ان کی والدہ (اُمِّ ابی ہریرہؓ) مدینہ آنے کے بعد بھی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ ماں کے شرک کی وجہ سے دل ہی دل میں کڑھتے رہتے لیکن جب بھی ماں کو توحید کی دعوت دیتے وہ اسے ٹھکرا دیتیں۔ ایک دن تو وہ دعوتِ اسلام کے جواب میں حضورؐ کی شان میں کچھ ناروا الفاظ کہہ بیٹھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، واقعہ بیان کیا اور عرض کی:

''یارسول اللہ میری ماں کے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔''

حضورؐ نے اسی وقت دعا کی ''الٰہی ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ خوش خوش گھر واپس آئے۔ دیکھا کہ کواڑ بند ہیں اور ماں غسل کر رہی ہیں۔ غسل سے فارغ ہو کر کواڑ کھولے اور بولیں:

''اے فرزند گواہ رہنا کہ میں اللہ اور اس کے سچے رسولؐ پر صدق دل سے ایمان لاتی ہوں۔''

حضرت ابو ہریرہؓ فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی:

''یارسول اللہ بشارت ہو آپؐ کی دعا قبول ہوئی اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی۔''

حضورؐ یہ خبر سن کر بہت مسرور ہوئے۔

اب حضرت ابو ہریرہؓ نے گزارش کی ''یا رسول اللہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ سب مومنوں کے دل میں میری اور میری والدہ کی محبت پیدا کر دے۔''

حضورؐ نے دعا فرمائی، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ خود حضرت ابو ہریرہؓ کے قول کے مطابق جو مؤمن آدمی ان کے بارے میں سنتا، ان سے محبت کرنے لگتا۔ (البدایہ والنہایہ۔ حافظ ابن کثیر)

حضرت ابو ہریرہؓ اپنی والدہ کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب وہ گھر آتے تو کہتے: ''السّلام علیک یا امتاہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ''

وہ جواب میں کہتیں: ''وعلیک السلام یا بُنَیَّ ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ''

پھر حضرت ابو ہریرہؓ کہتے: ''اللہ تعالیٰ آپ پر اسی طرح رحم (رحمت) کرے جس طرح آپ نے بچپن میں مجھ پر رحم کیا اور میری پرورش کی۔''

وہ جواب دیتیں: ''اے بیٹے اللہ تعالیٰ تم پر بھی اسی طرح رحمت نازل فرمائے، جس طرح تم نے جوان ہو کر میری خدمت کی۔''

حضرت ابو ہریرہؓ کو والدہ سے جس قدر تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ وہ چند دوسرے اصحابِ صُفّہ کے ساتھ بھوک سے پریشان ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔

حضورؐ نے پوچھا: ''اس وقت کیسے آئے؟''

انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ بھوک کھینچ لائی ہے۔''

حضورؐ نے کھجوروں کا ایک طباق منگوایا اور ہر شخص کو دو دو کھجوریں دے کر فرمایا: ''یہ دو کھجوریں کھاؤ اور اس کے بعد پانی پیو۔ یہی دو کھجوریں تمہیں آج کے لیے کافی ہوں گی۔''

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک کھجور کھالی اور دوسری اپنے دامن میں اٹھا کر رکھ لی۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا ''ابو ہریرہ تم نے یہ کھجور کس لیے دامن میں رکھ لی؟''

انہوں نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ اپنی والدہ کے لیے۔''

ارشاد ہوا، ''تم یہ کھجور کھالو ہم تمہاری والدہ کے لیے بھی تم کو دو کھجوریں دیں گے۔''

انہوں نے تعمیل ارشاد کی اور حضورؐ نے انہیں دو کھجوریں اور عطا کیں تا کہ اپنی والدہ کی خدمت میں پیش کریں۔

حضرت ابو ہریرہؓ زندگی بھر والدہ کے خدمت گزار رہے اور جب تک وہ حیات رہیں ان کی تنہائی کے خیال سے فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے بھی (تنہا) نہ گئے۔

(٦)

حضرت ابو ہریرہؓ آستانۂ نبوی کے ایک درویش طالب علم ہی نہیں تھے بلکہ ایک مرد مجاہد بھی تھے۔ غزوۂ خیبر کے بعد انہوں نے فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک (جیش عسرۃ) میں بھی سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

بعض موقعوں پر حضورؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو کسی خاص مہم کی انجام دہی پر بھی مامور فرمایا۔ مسند احمد میں حضرت سلیمان بن یسارؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی زبانی یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک لشکر کے ساتھ بھیجا اور دو (دشمن اسلام) قریشیوں کا نام لے کر فرمایا کہ اگر وہ مل جائیں تو ان کو نذرِ آتش کر دو لیکن جب ہم چلنے لگے تو فرمایا، میں نے تمہیں فلاں فلاں کو جلانے کا حکم دیا تھا مگر آگ کا عذاب خاصۂ خداوندی ہے اگر وہ مل جائیں تو ان کو جلاؤ نہیں (تلوار سے) قتل کر دو۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک اور موقع پر حضورؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک خاص مہم سپرد کی۔ جب وہ چلنے لگے تو حضورؐ نے بہ نفس نفیس انہیں الوداع کہا اور فرمایا، میں تجھے خدا کی امانت میں دیتا ہوں، جس کی امانت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

۹ ہجری میں تبوک سے واپسی پر حضورؐ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی امارت میں حج کے لیے مکہ بھیجا۔ آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اس قافلے کا نقیب بنایا اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کو منادی اور معلم مقرر فرمایا۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال (۱۱ھ) کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتاً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ صدیق اکبرؓ نے بے مثال عزم و ثبات کے ساتھ اس فتنہ کے خلاف جہاد کیا اور چند ماہ کے اندر اندر اس کا قلع قمع کر دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے صدیق اکبرؓ کی معیت میں فتنۂ ارتداد کے خلاف پر جوش حصہ لیا۔ مسند احمد بن حنبلؒ میں خود ان سے روایت ہے کہ:

> ''جب فتنۂ رِدّہ بپا ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا، آپ مرتدین سے لڑنا چاہتے ہیں حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فلاں فلاں بات سنی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، میں نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق نہیں کروں گا اور جو شخص ان میں تفریق کرے گا، اس سے لڑوں گا۔ پس ہم نے حضرت ابو بکرؓ کی معیت میں مرتدین (منکرین زکوٰۃ) کے خلاف جہاد کیا اور اس میں بھلائی پائی۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا والی مقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ عہدِ رسالت میں بھی حضرت علاءؓ بن عبداللہ حضرمی کے ساتھ بحرین جا چکے تھے اور وہاں کے لوگوں کو دینی احکام و مسائل سے آگاہ کیا تھا۔ منصب ولایت پر تقرر سے حضرت ابو ہریرہؓ کے فقر و افلاس کا دور ختم ہو گیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بحرین سے واپس آئے تو ان کے پاس دس ہزار روپے (درہم یا دینار) تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنے عمّال پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تو حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ تم نے اتنی رقم کہاں سے لی؟

انہوں نے کہا، میرے پاس کچھ گھوڑیاں تھیں ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے، کچھ غلاموں کی کمائی سے اور کچھ تنخواہوں سے جو پے درپے میرے پاس جمع ہوتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے تحقیقات کرائی تو جو کچھ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا تھا بالکل درست نکلا۔ انہوں نے اب حضرت ابو ہریرہؓ کو دوبارہ بحرین کی امارت پر بھیجنا چاہا لیکن انہوں نے یہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، تم کو امارت ناپسند ہے حالانکہ یوسف علیہ السلام نے جو تم سے بہتر تھے، اس کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کی ''امیر المؤمنین، یوسف علیہ السلام نبی ابن نبی تھے اور میں بے چارہ امیمہ کا بیٹا ہوں۔ میں ان پانچ باتوں سے ڈرتا ہوں اور اسی وجہ سے منصب امارت پر فائز ہونا پسند نہیں کرتا۔

ایک یہ کہ بغیر علم کے کچھ کہوں۔

دوسری یہ کہ حجت شرعی کے بغیر کوئی فیصلہ کروں۔

تیسری یہ کہ مارا جاؤں۔

چوتھی یہ کہ میری بے عزّتی کی جائے۔

پانچویں یہ کہ میرا مال چھینا جائے۔

حافظ ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں اس سے مختلف واقعہ بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں

کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے چار لاکھ (درہم یا دینار) بحرین کا لگان جمع کر کے حضرت عمرؓ کو دیا۔ انہوں نے پوچھا، تم نے کسی پر ظلم تو نہیں کیا؟

حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا: ''نہیں''

پھر حضرت عمرؓ نے سوال کیا ''تم اپنے لیے وہاں سے کیا لائے؟''

عرض کیا: ''بیس ہزار''

حضرت عمر نے پوچھا: ''یہ مال تم نے کیسے حاصل کیا؟''

انہوں نے جواب دیا: ''تجارت کے ذریعے''

امیر المؤمنینؓ نے فرمایا: ''اپنا راس المال رکھ لو اور باقی رقم بیت المال میں جمع کرادو۔''

ابن عساکرؒ نے ''تاریخ دمشق'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت ابو ہریرہؓ جنگ یرموک میں شریک ہوئے تھے۔''

جنگ یرموک عہد فاروقی کی نہایت خونریز لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی فتح نے مسیحی شام کی قسمت کا قریب قریب فیصلہ کر دیا۔ اس معرکے میں کئی موقعوں پر رومیوں نے مسلمانوں پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ اگر حضرت ابو ہریرہؓ اور ان جیسے دوسرے بہادر انہیں سنبھال نہ لیتے تو ان کے قدم اکھڑ گئے ہوتے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر جب رومی میسرے نے اسلامی میمنے پر قیامت خیز حملہ کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ کے قبیلہ ازد نے بڑی ثابت قدمی سے اس حملے کو روکا۔ حضرت جندبؓ بن عمرو ازدی نے اپنے جھنڈے کو زور سے ہلا کر بلند آواز سے کہا:

> اے قوم ازد تم میں سے کوئی ہمیشہ زندہ نہ رہے گا، نہ اس وقت تک اپنے کو معصیت اور خواری سے بچا سکے گا جب تک وہ پوری استقامت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ نہ کرے گا۔ کان کھول کر سن لو کہ مرنے والے کے لیے ذلت ہے۔''

اس موقعے پر حضرت ابو ہریرہؓ بھی آگے بڑھے اور اپنے قبیلے کو للکار کر کہا:

> ''بہادرو! حورانِ بہشتی تمہاری منتظر ہیں ان سے ملنے کے لیے اپنے کو آراستہ کرلو۔ اللہ کا تقرب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ اللہ کے نزدیک نیکی کی اس سے زیادہ پسندیدہ جگہ کوئی نہیں ہے جہاں تم اس وقت کھڑے ہو۔''

حضرت ابوہریرہؓ کی آواز پر قبیلہ ازد کے بہادر ان کے گرد جمع ہو گئے اور پھر سب نے مل کر اس زور کا جوابی حملہ کیا کہ رومیوں کی صفیں ابتر ہو گئیں۔ (یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قبیلہ دَوس، قبیلہ ازد ہی کی ایک شاخ تھا اس لیے حضرت ابوہریرہؓ کو دَوسی کہہ لیا جائے یا ازدی، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا)

ارباب سیر نے تصریح تو نہیں کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے شام کے کئی اور معرکوں میں بھی دادِ شجاعت دی۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے آخر عہد خلافت میں جب آذربائیجان پر فوج کشی ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ربیعہ ترکوں کے مقابلہ پر مامور ہوئے۔ اس فوج کشی میں حضرت ابوہریرہؓ بھی مجاہدانہ شریک تھے لیکن ابھی یہ مہم ناتمام تھی کہ حضرت عمرؓ نے شہادت پائی اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ مسند نشین خلافت ہوئے۔ ان کے زمانے میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ربیعہ نے بلنجر پر حملہ کیا لیکن لڑائی میں شہید ہو گئے۔ انِ کی شہادت کے بعد ان کے بھائی سلمان بن ربیعہؒ ان کے قائم مقام ہوئے۔ حضرت ابوہریرہؓ ان کے ساتھ بلنجر سے جیلان ہوتے ہوئے جرجان گئے اور ان شہروں کی تسخیر کے لیے جو معرکے پیش آئے ان میں سرفروشانہ حصہ لیا۔

۷

حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے نصف اوّل میں مشرقی ممالک کے جہاد میں حصہ لینے کے بعد حضرت ابوہریرہؓ مدینہ منورہ واپس آ گئے اور خاموشی سے حدیث کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ جب حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف شورش برپا ہوئی اور باغیوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت ابوہریرہؓ نے بڑے پُرجوش طریقے سے لوگوں کو امیر المومنینؓ کی امداد و حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ان صحابۂ کرامؓ میں شامل تھے، جو حضرت عثمانؓ کے دفاع کے لیے آئے تھے اور ان کے گھر میں موجود تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ تم لوگ میرے بعد فتنہ اور اختلاف میں مبتلا

ہو گے۔لوگوں نے پوچھا، یارسول اللہ اس دورِ فتن میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔آپؐ نے فرمایا، تم کو امین اور اس کے حامیوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔"

اس سے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی طرف اشارہ تھا۔

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ نیک نفسی کے درجۂ کمال پر تھے۔انہوں نے اس آڑے وقت میں بھی اپنے حامیوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی۔تاہم بقول ابنِ سعدؒ وابن اثیرؒ امیر المؤمنینؓ کے بعض حامیوں نے باغیوں کو پیچھے دھکیلنے کے لیے تلوار سے کام لے ہی لیا۔ان میں حضرت ابوہریرہؓ بھی شامل تھے۔لیکن تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔کچھ باغی پچھلی طرف سے دیوار پھلانگ کر اندر گھس آئے اور ضعیف العمر امیر المؤمنینؓ کو نہایت بیدردی سے اس حالت میں شہید کر ڈالا کہ وہ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔حضرت ابوہریرہؓ کو اس سانحۂ جانگداز سے سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے دل برداشتہ ہو کر عزلت گزینی اختیار کر لی۔حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے عہدِ خلافت میں جو لڑائیاں پیش آئیں۔(جنگ جمل و جنگ صفین) وہ ان سے یکسر کنارہ کش رہے۔فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ میرے بعد بہت سے فتنے برپا ہوں گے ان میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے اور کھڑا رہنے والا چلنے والے سے افضل ہے۔جو شخص ان فتنوں کی طرف جھانکے گا، فتنے اس کی طرف جھانکیں گے۔جس شخص کو ان فتنوں سے محفوظ رہنے کی کوئی جگہ مل جائے تو وہ اس میں پناہ لے۔ (مسند احمدؒ)

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں حضرت ابوہریرہؓ نے بعض موقعوں پر اہل مدینہ کو نماز پڑھائی۔

۴۰ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے شہادت پائی اور حضرت حسنؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔وہ چند ماہ بعد امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تو حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کر لی۔امیر معاویہؓ نے مختلف صوبوں میں اپنے والی مقرر کیے تو مروان بن الحکم کو مدینہ منورہ کا والی مقرر کیا۔وہ جب کبھی مدینہ منورہ سے باہر جاتا تو حضرت ابوہریرہؓ کو اپنا نائب یا قائم مقام مقرر کر دیتا تھا۔

طبری کا بیان ہے کہ مروان اپنے زمانۂ امارت میں ۵۴ ہجری اور ۵۵ ہجری میں دو

مرتبہ حج کے لیے مکہ معظّمہ گیا اس نے ایک دفعہ یا دونوں مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشیں مقرر کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ اور حافظ ذہبیؒ کا بیان مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ جب مروان والی مدینہ سے ناراض ہو جاتے تو اسے معزول کر دیتے اور اس کی جگہ حضرت ابوہریرہؓ کو مدینہ کا والی مقرر کر دیتے اور جب حضرت ابوہریرہؓ سے کبیدہ خاطر ہو جاتے تو ان کی جگہ مروان کو مدینہ کا والی بنا دیتے۔ (مسند احمد و سیر اعلام النبلاء)

بہر صورت حضرت ابوہریرہؓ نے بعض موقعوں پر امارتِ مدینہ کے فرائض ضرور انجام دیے۔ (بہ عہد خلافت امیر معاویہؓ)

۸

۵۸ ہجری میں حضرت ابوہریرہؓ سخت بیمار ہو گئے یہاں تک کہ جانبری کی اُمید نہ رہی۔ لوگ عیادت کو آتے تو وہ اس حالت میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے تاہم دنیا سے دل سرد ہو چکا تھا۔ حضرت ابوسلمہؒ بن عبدالرحمٰنؒ عیادت کے لیے آئے اور ان کی صحت کے لیے دعا کی تو وہ بولے:

''اے اللہ! اب مجھے دنیا میں نہ لوٹا۔''

دو دفعہ یہ کلمات دہرائے۔ پھر حضرت ابوسلمہؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''ابوسلمہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ زمانہ دور نہیں جب لوگ موت کو سرخ سونے کے ذخیرہ سے زیادہ محبوب سمجھیں گے۔ تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ جب آدمی کسی مسلمان کی قبر پر گزرے گا تو تمنا کرے گا کہ اے کاش بجائے اس کے میں اس قبر میں مدفون ہوتا۔''

مرض الموت میں ایک دن رونے لگے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا:

> ''میں اس دنیا کی دلفریبیوں کے چھوٹ جانے پر نہیں روتا میں تو اس لیے روتا ہوں کہ سفر طویل ہے اور زادِ راہ کم۔ میں اس وقت جنت و دوزخ کے نشیب و فراز میں ہوں، معلوم نہیں کس راستہ پر جانا پڑے۔''

مروان بن الحکم عیادت کے لیے آیا اور ان کی شفایابی کی دعا کی تو فرمایا:

''اے اللہ میں تیری ملاقات چاہتا ہوں تو بھی میری ملاقات پسند کر۔''

جب آخری وقت آیا تو وصیت کی:

''میری قبر پر خیمہ نہ لگانا، جنازہ کے پیچھے آگ لے کر نہ چلنا اور جنازہ لے جانے میں جلدی کرنا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب مومن کو چار پائی پر رکھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو اور جب کافر یا فاجر کو چار پائی پر رکھا جاتا ہے تو کہتا ہے مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔''

اس کے بعد انہوں نے پیک اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت وہ عمر کی ۷۸ منزلیں طے کر چکے تھے۔ ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ کا سال وفات ۵۷ ہجری بیان کیا گیا ہے لیکن واقدیؒ، ابوعبیدؒ اور بعض دوسرے اہل سیر کے قول کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی اور اُمّ المؤمنین نے رمضان المبارک ۵۸ ہجری میں وفات پائی تھی۔ اس قول کی روشنی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی تاریخ وفات رمضان ۵۸ ہجری کے بعد تسلیم کرنی پڑے گی۔ حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ کا سال وفات ۵۹ ہجری ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی نماز جنازہ اس وقت کے امیر مدینہ ولید بن عتبہ نے پڑھائی۔ اکابر صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ جنازہ میں شریک تھے۔ حضرت ابن عمرؓ جنازہ کے آگے آگے چل رہے تھے اور حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے دعائے مغفرت کرتے جاتے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے صاحبزادوں نے چار پائی کو کندھا دے کر جنت البقیع پہنچایا اور اسلام کے اس رجل عظیم کو فخ مہاجرین میں سپرد خاک کر دیا۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ولید بن عتبہ نے امیر معاویہؓ کو حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات کی اطلاع دی تو انہوں نے ولید کو لکھا کہ ابو ہریرہؓ کے پسماندگان کو دس ہزار درہم دے دو اور ان سے اچھا برتاؤ کرو کیونکہ ابو ہریرہؓ حامیانِ عثمانؓ میں سے تھے اور محاصرہ کے وقت ان کے گھر میں موجود تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور چار بچے چھوڑے۔ (انہوں نے سرورِ

عالم ﷺ کے وصال کے بعد شادی کرلی تھی) بچوں میں تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ صاجزادوں کے نام المحرّر، عبدالرحمٰن اور بلال تھے۔ صاجزادی کا نام معلوم نہیں البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ رئیس التابعین حضرت سعیدؒ بن مسیّبؒ سے بیاہی گئی تھیں۔ بڑے صاجزادے المحرّر نے اپنے والد نیز حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

(۹)

حضرت ابو ہریرہؓ علم و فضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کے ارشادات کا اتنا بڑا ذخیرہ اُمت کو بہم پہنچایا ہے کہ ان کے اس بارِ احسان سے یہ امت کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ ان سے مروی ۵۳۷۴ احادیث میں ۳۲۵ متفق علیہ ہیں، ۷۹ میں بخاری اور ۹۳ مسلم منفرد ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے کثیر تعداد میں براہِ راست احادیث روایت کیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے متعدد صحابۂ کرامؓ سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔ ان میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور مندرجہ ذیل اکابر صحابہ شامل ہیں:

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ بن خطاب، حضرت اُبی بن کعب انصاری، حضرت اُسامہؓ بن زید حب النبیؐ، حضرت فضلؓ بن عباسؓ۔

خود حضرت ابو ہریرہؓ سے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہؓ نے احادیث روایت کی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت ابورافعؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت واثلہؓ بن الاسقع، حضرت ابوایوبؓ انصاری، حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت زیدؓ بن ثابت۔

ان کے علاوہ تابعین عظام کی ایک کثیر تعداد نے ان سے روایت کی ہے۔ ان میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

سعیدؒ بن مسیّبؒ، ابوادریس خولانیؒ، ابوعثمان نہدیؒ، ابوزرعہؒ، ابوسلمہؒ بن عبدالرحمٰنؒ بن عوف، حسن بصریؒ، محمدؒ بن سیرین، سلیمان بن یسارؒ، طاؤسؒ، مجاہدؒ، عطاءؒ، عامر شعبیؒ، عکرمہؒ، عروہؒ

بن زبیرؓ، نافع بن جبیرؒ، قبیصہ بن ذویبؒ، حفصؒ بن عاصمؒ بن عمر فاروقؓ، اعرجؒ، اور عامرؒ بن سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہم۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کے رواۃِ حدیث کی تعداد آٹھ سو سے بھی زیادہ، ان میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اور تابعین شامل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ابوہریرہؓ ہم سب سے زیادہ حدیث جانتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے سوال کیا گیا کہ آپ خود صحابی ہیں اور ابوہریرہؓ سے روایت کر رہے ہیں براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے کیوں روایت نہیں کرتے؟ انہوں نے فرمایا، ابوہریرہؓ نے جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا، ہم وہ نہ سن سکے۔ مجھے یہ بات پسند ہے کہ جو حدیث میں نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنی وہ آپؐ کے بجائے ابوہریرہؓ سے روایت کروں۔

والی مدینہ مروان بن الحکم، حضرت ابوہریرہؓ کی جلالت قدر کا قائل تھا اور ان کا بہت احترام کرتا تھا لیکن کبھی کبھی غصہ میں آکر ان سے الجھ پڑتا تھا اور اس کا سبب یہ ہوتا تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ اس کو کوئی ناروا کام کرتا دیکھتے تو برملا ٹوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مروان نے کسی بات پر برہم ہو کر ان سے کہا:

> لوگ کہتے ہیں کہ آپ بہت زیادہ حدیثیں روایت کرتے ہیں حالانکہ آپ رسول اللہ ﷺ کے وصال سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے مدینہ آئے۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا:

> میں جب مدینہ آیا حضورؐ خیبر میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت میری عمر تیس برس سے کچھ اوپر تھی۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد میں سایہ کی طرح آپؐ کے ساتھ رہا۔ آپؐ کی معیت میں ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں میں جاتا تھا، آپؐ کی خدمت کرتا تھا، آپؐ کی ہم رکابی میں غزوات میں شریک ہوتا تھا، حج میں بھی آپؐ کے ساتھ ہوتا تھا اس لیے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ حدیثیں جانتا ہوں۔ خدا کی قسم جن لوگوں کو مجھ سے پہلے آپؐ کا شرف صحبت حاصل تھا وہ بھی بارگاہِ رسالت میں میری حاضر باشی کا اعتراف کرتے تھے اور مجھ سے حدیثیں پوچھتے تھے۔ ان میں

حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔''

ان کا جواب سن کر مروان خاموش ہو گیا۔

امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ کا امتحان لینا چاہا۔ اس نے ایک کاتب کو چھپا کر بٹھا دیا اور حضرت ابو ہریرہؓ کو بلا کر کسی خاص موضوع پر حدیثیں پوچھنا شروع کیں۔ وہ بیان کرتے جاتے تھے اور کاتب ان سے در پردہ لکھتا جا تا تھا۔ دوسرے سال اس نے پھر اسی طریقہ سے حدیثیں پوچھیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے بلا کم و کاست اسی طرح احادیث بیان کیں جس طرح پچھلے سال بیان کر چکے تھے۔ یاں تک کہ ترتیب میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کے سوا کوئی شخص مجھ سے زیادہ حدیثیں نہیں جانتا اور عبداللہؓ بھی اس لیے زیادہ حدیثیں جانتے ہیں کہ وہ حضورؐ کے ارشادات کو لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ یہ صحیح بخاری (کتاب العلم) کی روایت ہے۔

''مستدرکِ حاکم'' کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ بھی حدیثیں لکھ لیتے تھے اس طرح انہوں نے ایک کتاب مدوّن کر لی تھی۔ شارحین حدیث نے ان دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضورؐ کے وصال کے بعد اپنے حافظہ میں محفوظ تمام حدیثوں کو لکھ کر ایک کتاب میں جمع کر دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص جن کو حضرت ابو ہریرہؓ اپنے سے زیادہ عالم حدیث سمجھتے تھے۔ ان سے صرف سات سو احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کثرتِ روایت کے باوجود حدیثوں کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے حضورؐ پر افترا باندھا اس نے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنا لیا۔ ابن عساکرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا معمول تھا کہ بازار میں سے گزرتے تو لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے، لوگو! جو شخص مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے جو نہیں پہچانتا وہ پہچان لے کہ میں ابو ہریرہؓ ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔

حضرت ابو ہریرہؓ صرف عالم حدیث ہی نہ تھے بلکہ فقہ اور اجتہاد میں بھی ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان کا شمار مدینہ منورہ کے فقہاء میں ہوتا تھا اور وہ دوسرے فقہاء صحابہ کی طرح فتویٰ دیا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی مادری زبان عربی تھی۔ اس کے علاوہ وہ فارسی بھی جانتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ ان کو توراۃ کے مسائل پر بھی عبور حاصل تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جس فیاضی کے ساتھ علم کی دولت عطا کی تھی، وہ زندگی کے آخری سانس تک اسی فیاضی کے ساتھ اس دولت کو عامۃ المسلمین میں لٹاتے رہے۔ وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جہاں بھی کچھ مسلمان مل جاتے ان تک ارشادات نبوی پہنچاتے رہتے تھے۔ ''مستدرک حاکم'' میں ہے کہ وہ ہر جمعہ کو نماز سے پہلے اس وقت تک حدیثیں بیان کرتے رہتے جب تک امام اپنے حجرہ سے باہر نہ آتا۔

(۱۰)

حضرت ابو ہریرہؓ کے گلشن اخلاق میں علم کی تحصیل اور اشاعت کا شوق، حبّ رسول، اتباعِ سنت، شغف عبادت، حق گوئی و بے باکی، سادگی، فیاضی اور سیر چشمی سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ انہوں نے حصول علم کی خاطر جس طرح مشقتیں برداشت کیں اور دن رات ایک کر دیے، تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ پھر اس علم کو انہوں نے اپنے تک محدود نہ رکھا بلکہ زندگی بھر نہایت ذوق و شوق سے اس کی اشاعت کرتے رہے۔

سرورِ عالم ﷺ سے عقیدت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت بارگاہِ رسالتؐ میں گزارتے تھے اور حضورؐ کی زیارت، معیت اور خدمت کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ وہ ہر اس شخص سے بھی محبت کرتے تھے جو حضورؐ کو عزیز ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے ان کے سامنے اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو اپنی گود میں بٹھا کر فرمایا، ''الٰہی میں اس کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اس کو محبوب رکھ اور اس کے محبوب رکھنے والے کو بھی محبوب رکھ'' اس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ جب بھی حضرت حسنؓ کو دیکھتے تھے تو فرطِ محبت سے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

''مسند احمد بن حنبلؒ''، میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت حسنؓ سے ملے تو ان

سے کہا، ذرا اپنے جسم سے کپڑا اہٹایئے تاکہ میں اس حصہ پر بوسہ دوں جس پر حضورؐ بوسہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے کپڑا اہٹا دیا اور حضرت ابو ہریرہؓ نے ان کی ناف کو چوم لیا۔

اتباع سنت کی یہ کیفیت تھی کہ ہر کام میں سرور عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھتے تھے۔ عبادات میں بھی آپؐ کے نقش قدم پر چلتے تھے اور معاملات میں بھی لفظ بہ لفظ آپؐ کے ارشادات کی تعمیل اور آپؐ کے طرزِ عمل کا اتباع کرتے تھے ساتھ ہی لوگوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ کسی کو خلافِ سنت کام کرتا دیکھتے تو فوراً ٹوک دیتے اور جو کچھ اس بارے میں حضورؐ سے سنا ہوتا وہ سنا دیتے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد عمدہ غذا سے صرف اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ آپؐ نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ایک دفعہ ان کے سامنے بکری کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا، انہوں نے یہ کہہ کر اس کے کھانے سے معذرت کر دی کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور آپؐ نے کبھی سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہ کھائی۔

عبادت اور ذکر الٰہی سے خاص شغف تھا۔ رات کو اُٹھ کر خود بھی عبادت کرتے تھے اور گھر والوں کو بھی شب بیدار بناتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں ابوعثمان نہدیؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں سات دن حضرت ابو ہریرہؓ کا مہمان رہا حضرت ابو ہریرہؓ، ان کی اہلیہ اور ان کا غلام رات کو باری باری جاگ کر عبادت کیا کرتے تھے۔

رمضان کے روزوں کے علاوہ ہر مہینہ کے شروع یا آخر میں تین روزے پابندی سے رکھتے تھے۔ اکثر تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے تھے۔ ایک تھیلی میں کنکریاں اور گٹھلیاں بھری رہتی تھیں جن پر تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ جب تھیلی ختم ہو جاتی تو پھر بھروا لیتے۔ حضرت عکرمہؒ (مشہور تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ ہر روز بارہ ہزار تسبیحیں کرتے تھے۔ بعض اوقات رات کو زور زور سے تکبیریں کہا کرتے تھے۔ ایک دن مضارب بن جزو رات کو باہر نکلے (یا دورانِ سفر میں) انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی تکبیریں سنیں تو ان کے پاس جا کر پوچھا، اس وقت آپ کیوں تکبیریں پکار رہے ہیں؟

کہنے لگے، خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ ایک وہ وقت تھا جب میں بسرہ بنت غزوان کے پاس پیٹ کی روٹی پر ملازم تھا۔ پھر وہ دن آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو میرے عقد میں دے دیا۔

مسند احمدؒ میں ہے کہ وہ ارکانِ عبادت کو پورے شرائط کے ساتھ ادا کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

حق بات کہنے میں حضرت ابوہریرہؓ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے امیر مدینہ مروان بن الحکم کے زیر تعمیر مکان میں تصویریں آویزاں دیکھیں۔ فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو میری مخلوق جیسی مخلوق بناتا ہے۔ ذرا ایک چیونٹی تو پیدا کر کے دکھائے (یا ذرہ برابر غلہ یا جو تو پیدا کر کے دکھائے)

صحیح مسلم میں ہے کہ مروان کے زمانۂ امارت میں (غلہ، کھجور وغیرہ کی خرید فروخت کے سلسلہ میں) ہنڈی کا رواج چل پڑا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کو معلوم ہوا تو وہ فوراً مروان کے پاس گئے اور اس سے کہا، تم نے سود حلال کر دیا۔ اس نے کہا، معاذ اللہ میں ایسا کیوں کرنے لگا۔ انہوں نے فرمایا، تم نے ہنڈی کو رائج کیا حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اشیائے خوراک کی فروخت کی اس وقت تک ممانعت فرمائی جب تک خریدار ان کو ناپ تول نہ لے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد سن کر مروان نے اس طریقے کو منسوخ کر دیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی کا پہلا دور سخت تنگدستی اور افلاس کا تھا۔ دوسرا دور آسودہ حالی اور تموّل کا تھا۔ پہلے دور میں انہوں نے سخت مصیبتیں برداشت کیں لیکن صبر اور قناعت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا، جو کچھ کھانے کو مل جاتا اسی پر قناعت کر لیتے جب کچھ بھی نہ ملتا تو فاقہ کرتے یا روزہ رکھ لیتے۔ ایک دن اُن کے پاس پندرہ کھجوریں تھیں، انہوں نے پانچ کھجوروں سے روزہ افطار کیا، پانچ سحری کے وقت کھالیں اور پانچ روزہ افطار کرنے کے لیے باقی رکھ لیں۔

ان کے داماد حضرت سعیدؒ بن مسیّبؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ گھر آتے اور اہل خانہ سے پوچھتے کہ کھانے کے لیے کوئی چیز موجود ہے؟ اگر اہل خانہ نفی میں جواب دیتے تو وہ فرماتے، میں نے روزہ رکھ لیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُنہیں آسودہ حال کیا تو بہترین ریشمی کپڑے پر تھوکتے۔ (یا بروایت دیگر کتان کے کپڑے پہن کر ان سے ناک صاف کرتے) اور فرماتے، ابوہریرہ آج تو ریشمی کپڑوں پر تھوک رہا ہے (یا کتان سے ناک صاف کر رہا ہے) ایک زمانہ وہ تھا جب تو

حضرت عائشہ صدیقہؓ اور منبر نبوی کے درمیان غش کھا کر گر پڑتا تھا لوگ تیری گردن پر پاؤں رکھ کر کہتے کہ ابوہریرہ کو جنون ہو گیا ہے حالانکہ تیری یہ حالت بھوک کی وجہ سے ہوتی تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ فطرتاً نہایت سادہ مزاج تھے۔ آسودہ حال ہو کر بھی اپنی سادہ وضع قائم رکھی۔ امارتِ مدینہ کے زمانے میں ان کی سادگی کی یہ کیفیت تھی کہ شہر سے نکلتے تو گدھا سواری میں ہوتا اس پر نمدے کا پالان کسا ہوتا تھا اور اس کی لگام کھجور کی چھال کی ہوتی تھی۔ جب کوئی سواری کے راستے میں آ جاتا تو ہنس کر کہتے راستہ چھوڑ دو، امیر کی سواری آ رہی ہے۔

اسی زمانے میں خود لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر گھر لے جاتے تھے۔ ایک دن اسی حالت میں بازار سے گزر رہے تھے کہ راستے میں ثعلبہ بن ابی مالک القرظی ملے، ان سے کہنے لگے، ابو مالک اپنے امیر کے لیے راستہ کھلا کر دو۔ انہوں نے کہا، اللہ آپ پر رحم فرمائے راستہ تو کافی معلوم ہوا ہے۔ فرمایا، تمہارا امیر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے ہے اس کے لیے راستہ کھلا کر دو۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت ابوہریرہؓ خوفِ آخرت سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ ایک دفعہ شقیا اصبحیؒ مدینہ آئے اس وقت حضرت ابوہریرہؓ کچھ لوگوں کے سامنے حدیث بیان کر رہے تھے۔ شقیاؒ بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جب وہ حدیث سنا چکے اور لوگ چلے گئے تو شقیاؒ نے عرض کی، ''اے صاحب رسول مجھے کوئی ایسی حدیث سنائیے جس کو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا ہو اور سمجھا ہو۔'' حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا، ایسی ہی حدیث بیان کروں گا، یہ کہا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہوش میں آئے تو کہا، میں تم کو ایسی حدیث سناؤں گا جو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت بیان فرمائی تھی جب میرے سوا کوئی شخص آپ کی خدمت میں حاضر نہ تھا۔ یہ کہہ کر پھر چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑے۔ ہوش آیا تو پہلی بات کا اعادہ کر کے تیسری مرتبہ بے ہوش ہو کر منہ کے بل گر پڑے۔ شقیاؒ نے انہیں سنبھالا اور منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اب ہوش آیا تو کہا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے تین آدمی پیش کیے جائیں گے۔ ایک عالم قرآن، دوسرا میدان جہاد میں لڑ کر مارا جانے والا اور تیسرا دولت مند۔ اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا، کیا میں نے تجھے قرآن کی تعلیم نہیں دی تھی؟ وہ کہے گا، ہاں خدایا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا تو نے اس پر عمل کیا؟ وہ کہے گا، دن رات اس کی تلاوت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ

فرمائے گا، تو جھوٹا ہے۔ تلاوت میرے لیے نہیں بلکہ اس لیے کرتا تھا کہ لوگ تجھ کو قاری کہیں اور یہ خطاب تو نے حاصل کر لیا، پھر اللہ تعالیٰ میدانِ جہاد کے مقتول سے سوال کرے گا کہ تو کیوں قتل ہوا؟ وہ کہے گا، تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا، میں نے جہاد کیا اور مارا گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو جھوٹ کہتا ہے تو نے میری راہ میں جہاد نہیں کیا بلکہ اس لیے لڑا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں اور یہ خطاب تو لوگوں سے پا چکا۔ پھر دولت مند سے سوال کرے گا کیا میں نے تجھے مال و دولت عطا کر کے لوگوں کی احتیاج سے بے نیاز نہیں کر دیا تھا؟ وہ کہے گا، ''بے شک خدایا'' اللہ تعالیٰ پوچھے گا تو نے یہ دولت کیسے صرف کی؟ وہ کہے گا، میں صلۂ رحمی کرتا تھا، صدقہ دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو جھوٹا ہے۔ صدقہ وخیرات سے تیرا مقصد یہ تھا کہ لوگ تجھ کو فیاض اور سخی کہیں اور لوگوں نے تجھے ایسا کہا۔ یہ حدیث بیان کر کے رسول اللہ ﷺ نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا، ابوہریرہ سب سے پہلے ان تینوں کے لیے جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔

فیاضی اور سیر چشمی بھی حضرت ابوہریرہؓ کا خاص وصف تھا۔ اپنا مال بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے اور صدقہ وخیرات کرنے میں روحانی مسرت محسوس کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مروان نے انہیں سو دینار بھیجے، انہوں نے یہ سب کے سب صدقہ کر دیے۔ اگلے دن مروان نے یہ دینار واپس مانگ بھیجے کہ یہ کسی اور کے لیے تھے آپ کو غلطی سے چلے گئے۔ انہوں نے کہلا بھیجا، وہ دینار میں نے کسی کو دے دیے انہیں میری تنخواہ سے وضع کر لینا۔ مروان کا مقصد صرف ان کو آزمانا تھا۔ مہمان نوازی میں بھی وہ آپ اپنی مثال تھے۔ بعض لوگ ان کے پاس آ کر کئی کئی ہفتے قیام کرتے تھے اور وہ ان کی نہایت کشادہ دلی سے خاطر مدارات کرتے تھے۔

اربابِ سیر نے حضرت ابوہریرہؓ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

گندمی رنگ، چوڑی چکلی چھاتی، سر پر زلفیں، دانت چمکدار، آگے کے دو دانت کشادہ۔ بالوں میں باختلافِ روایت زرد یا سرخ خضاب کرتے تھے۔

سیدنا حضرت ابوہریرہؓ سے مروی چند احادیث بغرض افادہ وتبرک یہاں درج کی جاتی ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

☆ اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور چہروں کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر تو تمہارے دلوں پر ہے۔ (مسلم)

☆ بہادر وہ نہیں جو کُشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ اصل بہادر تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (بخاری)

☆ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور اس کی غیرت یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا بندہ اس کے حرام کیے ہوئے کاموں کو کرے۔ (بخاری)

☆ جب تو صدقہ وخیرات کرے تو ایسی حالت ہو کہ تندرست ہو اور تجھے خود بھی مال کی ضرورت ہو ایسے صدقہ کا تو بہت ثواب ہے لیکن ایسی حالت میں کہ تو مرنے لگا ہے اور تو کہتا ہے کہ میرے مرنے پر اتنا فلاں کو دینا اور اتنا فلاں کو۔ تو ایسے صدقہ کا وہ ثواب نہیں کیونکہ اب تو نہ دے گا تب بھی مرنے کے بعد تیرا مال وارثوں ہی کو لینا ہے۔ تیرے پاس سے تو بہر حال اب اس مال کو چلے جانا ہے۔ (بخاری)

☆ ایک شخص سفر کر رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگی۔ اس کو ایک باؤلی ملی وہ اس میں اتر گیا اور پانی پی کر باہر آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کی شدت میں گیلی مٹی چاٹ رہا ہے اور اس کو پیاس سے وہی تکلیف ہے جیسی خود اس کو پانی پینے سے پہلے تھی۔ یہ دیکھ کر وہ شخص پانی میں اترا اور اپنا موزہ پانی سے بھر کر منہ میں پکڑے ہوئے ہاتھوں کے ذریعہ باؤلی سے چڑھا اور وہ پانی کتے کو پلایا۔ اللہ کو اس کی یہ نیکی پسند آئی اور اس کے طفیل اللہ نے اس کے گناہ معاف کر دیے۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ، کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے پر بھی ثواب ملتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں ہر ذی روح کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ (بخاری)

☆ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ (مسلم)

☆ جب کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے کیوں کہ لوگوں میں کمزور، بوڑھے اور بیمار بھی ہوتے ہیں اور جب اکیلا پڑھے تو جتنی لمبی چاہے پڑھے۔ (بخاری)

☆ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ تو اس کی خیانت کرے، نہ اس کے آگے جھوٹ بولے، نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے اور ہر مسلمان کا خون، عزّت اور مال

دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ لوگو تقویٰ تو دل کا کام ہے۔ یاد رکھو کہ انسان کے لیے یہی بڑی بدی ہے کہ وہ دوسرے بھائی سے حقارت سے پیش آئے۔ (مسلم)

☆ لوگو پناہ مانگو مصیبتوں، بدبختیوں، بری قسمت اور دشمنوں کو ہنسی کا موقع ملنے سے۔ (بخاری)

☆ لوگو حسد سے بچو کیوں کہ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے جیسا کہ آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے۔ (بخاری)

☆ دو باتیں لوگوں میں جاہلیت کی باتوں میں سے ہیں ایک کسی کو حسب نسب پر طعن دینا دوسرے مردے پر نوحہ کرنا۔ (مسلم)

☆ جھوٹی قسم سے مال تو فروخت ہو جاتا ہے مگر تاجر کی کمائی میں برکت نہیں رہتی۔ (بخاری)

☆ بڑا بدقسمت وہ شخص ہے کہ اس کے پاس میرا ذکر کیا جائے اور وہ میرے حق میں دعائے خیر نہ کرے (یعنی مجھ پر درود نہ بھیجے) (مسلم)

☆ جب کوئی شخص اپنے بستر پر جانے لگے تو اسے چاہیے کہ اپنے کپڑے کے دامن سے بستر جھاڑے کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ کیا کچھ (کیڑا مکوڑا) اس کے خالی بستر پر پڑا ہے۔ پھر کہے اے میرے رب تیرا نام لے کر میں اپنا پہلو بستر پر رکھتا ہوں اور تیرے فضل ہی سے میں سو کر اٹھوں گا۔ اے اللہ اگر تو نے (سوتے میں) میری روح قبض کر لی تو اس جسم پر رحم فرمائیو اور اگر میری روح قبض نہیں کرنی تو پھر (جاگنے کے بعد) اس کی حفاظت کیجیو جیسا کہ تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔ (بخاری)

☆ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین قسم کے کاموں کے، ایک تو صدقہ جس کا فیض جاری ہو، دوسرے اس کا علم جس سے دوسرے نفع پائیں اور تیسرے نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کرے۔ (مسلم)

☆ ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اپنے کارندوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی

شخص تنگ دست ہوتو اس سے درگزر کیا کروتا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہم سے درگزر کرے جب وہ فوت ہواتو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے درگزر فرمایا۔ (مسلم)

☆ دشمن سے مٹھ بھیڑ کی کبھی آرزو نہ کیا کرو مگر ہاں جب مٹھ بھیڑ ہو جائے تو خوب صبر سے لڑو۔ (بخاری)

☆ جو عورت اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے خاوند یا محرم رشتہ دار کے بغیر ایک دن اور رات کا سفر بھی کرے۔ (بخاری)

☆ دو آدمیوں کا کھانا تین کو اور تین کا چار کو کافی ہو جاتا ہے۔ (بخاری)

☆ تم میں سے کسی کو دعوت پر بلایا جائے تو قبول کرلو، اگر روزہ رکھا ہوا ہے تو وہاں دعا ہی کرلو اور اگر روزہ نہیں ہے تو کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ (مسلم)

☆ جب نماز (جماعت) کھڑی ہو جائے تو تم لوگ دوڑ کر نہ آیا کرو بلکہ چل کر آیا کرو اور وقار و سکینت کو لازم پکڑو۔ جو حصہ نماز کا پالو وہ امام کے ساتھ پڑھ لو اور جو چھوٹ جائے وہ بعد میں پورا کرو۔ (بخاری)

☆ تم میں سے کوئی شخص کبھی موت کی آرزو نہ کرے کیوں کہ اگر وہ شخص نیک ہے تو (زندہ رہنے کی صورت میں) امید ہے کہ اور زیادہ نیکیوں کی توفیق مل جائے اور اگر برا ہے تو ممکن ہے کہ توبہ کا موقع میسر آجائے۔ (بخاری)

☆ صدقہ کرنے سے کبھی مال و دولت میں کمی نہیں آتی اور جو لوگوں کے قصور معاف کرے تو معاف کرنا کبھی موجب ذلت نہیں بلکہ ایسے شخص کی اللہ تعالیٰ عزّت بڑھائے گا۔ اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی خاطر خاکساری اختیار کی، اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند فرمائے گا۔ (مسلم)

☆ جو شخص مال جمع کرنے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے وہ گویا لوگوں سے آگ کا انگارہ مانگتا ہے، اب خواہ کم ملے یا زیادہ۔ (مسلم)

☆ دولت مندی زیادہ مال و دولت کا نام نہیں بلکہ دولت مندی تو دل کی دولت مندی ہے۔ (بخاری)

☆ اپنے سے کم درجے والوں کی حالت کا مشاہدہ کیا کرو اور اپنے سے بڑے مرتبے

والوں کی حالت کو زیادہ مت دیکھو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو انعامات تم پر اللہ کے ہیں، ان کی بے قدری نہ کرسکو گے۔ (مسلم)

☆ جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے ہمسایہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ دے اور جس کا اللہ اور قیامت پر ایمان ہے اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے اور جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی باتیں کرے ورنہ خاموش رہے۔ (بخاری)

☆ جو شخص بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری میں رہتا ہے اس کو وہی درجہ ملے گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو، ساری ساری رات تہجد پڑھنے والے کو اور ساری عمر روزہ رکھنے والے کو ملتا ہے۔ (بخاری)

☆ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر یہ پانچ حق ہیں: (۱) سلام کا جواب دینا (۲) بیمار پرسی کرنا (۳) جنازہ کے ساتھ جانا (۴) دعوت قبول کرنا (۵) چھینک مارے تو یَرْحَمُکَ اللّٰہ کہنا۔ (بخاری)

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت شقران صالحؓ

حضرت شقران صالحؓ کی جلالتِ قدر کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ فخرِ موجودات سرورِ کائنات رحمتِ دو عالم علیہ وسلم کے غلام تھے۔ نام صالح تھا اور شقران لقب تھا۔ والد کا نام عدی تھا اور آبائی وطن حبش تھا۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے ''الاِصابہ'' میں لکھا ہے کہ وہ پہلے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے غلام تھے۔ بعد میں انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے انہیں اپنی خدمت گزاری کے لیے پسند فرمایا اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو قیمت دے کر خرید لیا لیکن یہ روایت مستند نہیں کیونکہ حضورؐ کا کسی غلام کو قیمتاً خریدنا کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہوتا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت شقران صالحؓ حضورؐ کو میراثِ پدر میں ملے تھے۔ لیکن اس روایت کی اسناد بھی زیادہ قوی نہیں۔ صحیح یہی ہے کہ انہیں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضورؐ کی نذر کیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے انہیں فوراً آزاد کر دیا اور ایک دوسرے قول کے مطابق غزوۂ بدر کے بعد آزاد کیا۔ بہر صورت انہوں نے ہر حال میں حضورؐ کی خدمت میں رہنا پسند کیا اور آپؐ کے وصال تک شمعِ رسالت کے پروانے بنے رہے۔

سرورِ عالم علیہ وسلم نے بطورِ خاص حضرت شقران صالحؓ کے ذمہ یہ خدمت کی کہ وہ غزوات میں مالِ غنیمت اور قیدیوں کی نگرانی کیا کریں۔ غزوۂ بدر میں انہوں نے قیدیوں کی نگرانی نہایت نرمی اور ملاطفت سے کی۔ ان قیدیوں نے خوش ہو کر ان کو اس قدر معاوضہ دیا کہ بقول ابنِ سعدؒ انہیں مالِ غنیمت سے حصہ لینے کی احتیاج ہی نہ رہی بلکہ جن کو حصہ ملا وہ ان سب سے زیادہ نفع میں رہے، انہوں نے جس حسن وخوبی سے اپنا فرض انجام دیا، حضورؐ نے اس پر اظہارِ خوشنودی فرمایا۔

غزوۂ بنو مصطلق میں سرورِ عالم ﷺ نے انہیں شکست خوردہ دشمن کا سامانِ جنگ، مال و اسباب و مویشی وغیرہ جمع کرنے اور ان کی دیکھ بھال پر مامور فرمایا۔ یہ خدمت بھی انہوں نے بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے انجام دی۔

حضرت شقران صالحؒ کو سرورِ کائنات ﷺ سے نہایت محبت اور عقیدت تھی اور وہ آپؐ کے ہر حکم کی جلد از جلد تعمیل کرنے میں اپنی جان لڑا دیتے تھے۔ حضورؐ انہیں اپنے کسی ذاتی کام کے لیے حکم دیتے یا کوئی دینی خدمت ان کے سپرد فرماتے، وہ اسے نہایت مستعدی اور دیانتداری کے ساتھ انجام دینا اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے، یہی سبب تھا کہ حضورؐ انہیں بہت عزیز جانتے تھے اور اپنا نہایت قابل اعتماد جاں نثار سمجھتے تھے یہاں تک کہ آپؐ نے اپنے وصال سے پہلے خاص طور سے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ سب سے بڑی سعادت جو حضرت شقران صالحؓ کو نصیب ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ سرورِ عالم ﷺ کی تجہیز و تکفین میں اہلِ بیت اور چند دوسرے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ شریک تھے۔ بقول حافظ ابن حجرؒ جس وقت حضورؐ کا جسدِ اطہر قبر میں رکھا گیا تو حضرت شقران صالحؓ بھی اس وقت موجود تھے اور انہوں نے حضورؐ کی چادر مبارک اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت شقران صالحؓ کہاں رہے اور کب تک حیات رہے، اربابِ سیر ان سوالوں کا کوئی یقینی جواب نہیں دیتے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اخیر دم تک مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اور بعض کہتے ہیں کہ بصرہ چلے گئے جہاں انہوں نے اپنا ذاتی مکان بنوالیا تھا۔ مقام وفات اور سالِ وفات کے بارے میں بھی سب خاموش ہیں البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک وہ زندہ تھے۔ حضرت شقران صالحؓ سے کچھ احادیث بھی مروی ہیں۔ بقول حافظ ابن حجرؒ عبید اللہ بن ابو رافعؓ نے ان سے روایت کی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ثوبانؓ ـــ مولیٰ رسول اللہ ﷺ

۱

ایک دن سرورِ عالم ﷺ مدینہ منورہ میں کسی جگہ تشریف فرما تھے کہ ایک یہودی عالم نے آ کر کہا ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُحَمَّدُ'' حضورؐ کے ایک جاں نثار کو جو اس وقت بارگاہِ نبوی میں حاضر تھے، یہودی عالم کے اندازِ تخاطب پر سخت غصہ آیا۔ انہوں نے اس کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے سنبھل کر وجہ پوچھی تو حضورؐ کے وہ جاں نثار کڑک کر بولے ''تو نے یا رسول اللہ کیوں نہ کہا؟'' وہ بولا، اس میں کیا گناہ تھا کہ میں نے اُن کا خاندانی نام لیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے بڑی نرمی سے فرمایا ''ہاں میرا خاندانی نام مُحَمَّدؐ ہے۔''

سید الانبیاء ﷺ کے یہ جاں نثار جن کو آپؐ سے محمدؐ اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ کسی شخص کے منہ سے ''اے اللہ کے رسول'' کی بجائے ''اے محمدؐ'' سننا بھی گوارا نہ تھا، حضرت ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہ ﷺ تھے۔

۲

سیدنا حضرت ابو عبداللہ ثوبانؓ کے حسب ونسب کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہے کہ ان کے والد کا نام بجد دیا جحد رتھا اور وہ یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان تخت وتاج اور طبل وعلم کا مالک رہا تھا معلوم نہیں کیا افتاد پڑی کہ حضرت ثوبانؓ کو غیروں کی غلامی اختیار کرنی پڑی۔ اسی حالت میں وہ بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچ گئے۔ حضورؐ نے ان کے چہرے

پر شرافت و نجابت کے آثار دیکھے تو آپؐ کا دریائے کرم جوش میں آ گیا، آپؐ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا اور فرمایا:

''اگر چاہو تو اپنے خاندان میں چلے جاؤ اور اگر میرے ساتھ رہنا پسند کرو تو میرے گھر والوں میں تمہارا شمار ہو گا۔''

ثوبانؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید عطا کی تھی۔ انہوں نے اپنے خاندان اور وطن پر بارگاہِ نبوی کو ترجیح دی اور عرض کی، ''یا رسول اللہ میں آپؐ کی خدمت میں رہوں گا۔'' اور پھر وہ خلوت و جلوت اور سفر و حضر ہر حالت میں ہمیشہ سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ رہے۔ اگرچہ حضورؐ نے ان کو آزاد کر دیا تھا لیکن انہوں نے برضا و رغبت آپؐ کی غلامی اختیار کر لی اور یوں زندگی بھر دنیا اور آخرت کی سعادتیں سمیٹتے رہے۔

حضرت ثوبانؓ نہ صرف حضورؐ کے ہر حکم کی تعمیل نہایت مستعدی سے کرتے تھے بلکہ آپؐ کے ہر ارشاد کو بھی حرزِ جان بنا لیتے تھے اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی اس پر عمل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ مسند ابوداؤد میں خود ان سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس بات کا عہد کرے (اور اسے پورا بھی کرے) کہ وہ کبھی لوگوں سے سوال نہ کرے گا، میں اس کے لیے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ میں کبھی کسی انسان سے کچھ نہ مانگوں گا۔''

اربابِ سیر کا بیان ہے کہ حضرت ثوبانؓ نے زندگی بھر اپنے اس عہد کی شدت سے پابندی کی یہاں تک کہ اگر سواری کی حالت میں کوڑا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر جاتا تھا تو خود سواری سے اتر کر اسے اٹھاتے تھے اور کسی دوسرے کو اس کام کے لیے ہرگز نہ کہتے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ''الاصابہ'' میں اس سے ملتی جلتی روایت اس طرح بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ اکرم ﷺ نے اہل بیت کے لیے دعا کی۔ اس وقت حضرت ثوبانؓ بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے۔ انہوں نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ، کیا میں بھی اہلِ بیت میں سے ہوں۔'' ارشاد ہو، ''ہاں جب تک تم کسی امیر کے پاس سائل بن کر نہ جاؤ یا کسی دروازے کی چوکھٹ پر نہ جاؤ۔''

حضرت ثوبانؓ نے اس کے بعد عمر بھر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔

۴۳

حضرت ثوبانؓ جس دن سے سرکارِ دو عالم ﷺ کے دامن رحمت سے وابستہ ہوئے آپؐ کے وصال تک برابر آپؐ کی خدمت کرتے رہے۔ اس کے بعد (غالباً عہدِ فاروقی میں) وہ شام چلے گئے اور رملہ میں سکونت اختیار کرلی۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر کی مہم پر مامور فرمایا تو حضرت ثوبانؓ مصر جانے والے مجاہدین میں شامل ہوگئے اور وہاں کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ مصر سے واپس آ کر حمص میں گھر بنا لیا اور وہیں مستقل اقامت اختیار کرلی۔

حضرت ثوبانؓ اپنے آپ کو سید المرسلین والانبیا ﷺ کا غلام کہلانے میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی حضورؐ سے ان کی غلامی کی نسبت کا احترام اور لحاظ کریں۔ مسند احمدؒ بن حنبل میں ہے کہ ایک دفعہ حمص کے زمانۂ قیام میں علیل ہوگئے۔ اس وقت عبداللہ بن قرط ازدی حمص کے والی (گورنر) تھے۔ وہ کسی وجہ سے ان کی عیادت کے لیے نہ آئے۔ حضرت ثوبانؓ نے ان کی بے رُخی کو بہت محسوس کیا اور ان کو یہ خط لکھوایا۔ ''اگر موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا غلام تمہارے یہاں ہوتا تو کیا تم اس کی عیادت کے لیے نہ آتے؟'' یہ خط عبداللہ بن قرط کو ملا تو ان کو اپنی غفلت پر بہت ندامت ہوئی اور وہ اس کی تلافی کے لیے اس سرعت اور بدحواسی کے ساتھ گھر سے نکلے کہ لوگ سمجھے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہے۔ پھر انہوں نے حضرت ثوبانؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی کوتاہی پر معذرت کی اور دیر تک ان کے پاس بیٹھ کر مزاج پرسی کرتے رہے۔

''مستدرک حاکم'' کے مطابق حضرت ثوبانؓ نے ۵۴ ہجری میں (بعہد خلافت امیر معاویہؓ) حمص میں وفات پائی۔

حضرت ثوبانؓ کو بارگاہِ رسالتؐ میں جو غیر معمولی درجۂ تقرب حاصل تھا اس کی بنا پر وہ معدنِ فضل و کمال بن گئے تھے۔ ان سے ایک سو ستائیس احادیث مروی ہیں۔ ان کے رواۃِ حدیث اور تلامذہ میں معدان بن طلحہؒ، ابو ادریس خولانیؒ، راشد بن سعدؒ، عبدالرحمٰن بن غنمؒ، ابو عامر الالہانیؒ

اور جبیر بن نفیرؒ جیسے اکابر علماء شامل ہیں۔ ان کے بعض معاصرین کسی دوسرے صحابی سے کوئی حدیث سنتے تو اس کی تصدیق حضرت ثوبانؓ سے بھی کرا لیتے۔

مسند ابوداؤد میں ہے کہ معدان بن طلحہؒ نے (جو حضرت ثوبانؓ کے شاگرد اور بلند پایہ محدث تھے) ایک مرتبہ فقیہ الامت حضرت ابوالدردا انصاریؓ سے ایک حدیث سنی پھر حضرت ثوبانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس کی تصدیق کی۔

حضرت ثوبانؓ کو اشاعت حدیث میں بھی بڑا اہتمام تھا اور وہ بڑے لطف وانبساط کے ساتھ اپنے آقا و مولا ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت ثوبانؓ ان اصحاب میں ہیں، جنہوں نے حدیثیں محفوظ کیں اور ان کی اشاعت بھی کی۔'' شائقینِ حدیث اصرار کر کے ان سے حدیثیں سنا کرتے تھے۔

حضرت ثوبانؓ سے مروی چند احادیث بطور تبرک درج ذیل ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ جب نماز کا سلام پھیر کر ایک جانب بیٹھتے تو تین مرتبہ استغفار پڑھتے اور پھر یہ کہتے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَ الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔ (صحیح مسلم)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو بہشت کی میوہ خوری میں رہتا ہے (بہشت کی میوہ خوری کا اہل ہو جاتا ہے) جب تک وہ عیادت سے واپس نہ آئے۔ (صحیح مسلم)

(۳) (ایک دفعہ) ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں شریک ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگ سواریوں پر بیٹھے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا، تم کو شرم نہیں آتی کہ خدا کے فرشتے تو پیدل چل رہے ہیں اور تم جانوروں کی پشتوں پر سوار ہو۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

(۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان اللہ کے لیے ایک سجدہ کرتا ہے اللہ اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور اس کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے۔ (مسند احمد بن حنبل)

(۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو (نیک بندہ) اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی تلاش میں رہتا ہے اور ہمیشہ اسی حال میں رہتا ہے پس اللہ تعالیٰ جبرئیل سے فرماتا ہے کہ میرا فلاں بندہ میری رضامندی کی تلاش میں رہتا ہے۔ جان لو کہ میری رحمت اس کے لیے ہو چکی۔ پھر جبرئیل کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت فلاں شخص پر ہے۔ پھر یہی بات عرش کو اٹھانے والے فرشتے کہتے ہیں اور وہ فرشتے بھی کہتے ہیں جو ان کے قریب ہیں یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں کے فرشتے یہی کہتے ہیں۔ پھر رحمت اس شخص کے لیے زمین پر اترتی ہے۔ (مسند احمد بن حنبل)

(۶) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان صبح و شام ان کلمات کو تین مرتبہ کہے تو اللہ تعالیٰ لازماً اس مسلمان کو قیامت کے دن خوش کر دے گا۔

رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا

(میں اللہ کی ربوبیت اور اسلام کے دین اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر دل سے راضی ہو گیا۔) (مسند احمد و جامع ترمذی)

(۷) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، صحیح راستہ پر جمے رہو مگر اس کا حق ادا نہیں کر سکتے اور خوب سمجھ لو کہ تمہارے دین میں سب سے افضل عمل نماز ہے اور وضو کی نگرانی بجز مومن کامل کے اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ (مؤطا امام مالکؒ، مسند احمد، مسند دارمی)

(۸) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے تمام روئے زمین کو سکیڑ دیا تو میں نے مشرق و مغرب پر نظر ڈالی۔ یقیناً میری امت اس حصہ زمین کے گوشوں تک پہنچے گی (قابض ہوگی) جو مجھے سکیڑ کر دکھا دیا گیا ہے۔ مجھے دو خزانے بھی مرحمت فرمائے گئے، ایک سرخ اور ایک سفید (سونا اور چاندی) اور میں نے اپنی امت کے لیے یہ دعا کی کہ اس کو عام قحط میں مبتلا کر کے ہلاک نہ کیا جائے اور یہ بھی کہ کسی غیر دشمن کو ان پر اس طرح مسلط نہ کیا جائے کہ وہ ان کی نسل کو تباہ کر ڈالے۔ میرے پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا، اے محمدؐ جب میں کسی

بات کا فیصلہ کر چکتا ہوں تو وہ اٹل ہوتا ہے تمہاری امت کے بارے میں یہ بات تو میں نے منظور کی کہ ان کو عام قحط سے ہلاک نہ کروں گا اور ان پر کسی غیر دشمن کو اس طرح مسلط نہیں کروں گا کہ وہ ان کا تخم مٹاڈالے اس وقت تک کہ وہ خود ہی ایک دوسرے کو ہلاک کرنے اور قید کرنے کے درپے نہ ہو جائیں۔ (صحیح مسلم)

(۹) جب یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّھَبَ والفِضَّةَ (جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں) اس وقت ہم لوگ کسی سفر میں رسول اللہ کے ہم رکاب تھے۔ بعض اصحاب نے کہا کہ یہ آیت صرف سونے چاندی کے بارے میں نازل ہوئی ہے کاش ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ کون سا مال بہتر ہے (سونے چاندی) کے سوا جن کا حکم اس آیت سے معلوم ہو گیا ہے) تو اسی کو جمع کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا، بہترین مال اللہ کا ذکر کرنے والی زبان ہے اور اللہ کا شکر کرنے والا دل ہے اور وہ مومن بیوی ہے، جو شوہر کے دین و ایمان کی مددگار ہے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

حضرت یسار نوبیؓ

حضرت یسار نوبیؓ کے شرف و مجد کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ سرورِ کائنات رحمتِ دوعالم علیہ وسلم کے غلام (مولیٰ) تھے۔ ارباب سیر نے اتنا تو لکھا ہے کہ وہ نوبہ (سوڈان) کے رہنے والے تھے لیکن یہ تصریح نہیں کی کہ وہ کب مدینہ منورہ آئے اور کب شرف ایمان سے بہرہ ور ہو کر سرورِ عالم علیہ وسلم کے دامن رحمت سے وابستہ ہوئے۔ ان کے حسب ونسب کی تفصیل بھی کسی کتاب میں نہیں ہے البتہ بعض روایات سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے اور عبادت الٰہی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ نماز کے تمام ارکان کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا کرتے تھے۔ ایک دن سرور عالم علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضورؐ کو ان کے نماز پڑھنے کا انداز اس قدر پسند آیا کہ آپؐ نے انہیں اسی وقت آزاد کر دیا لیکن حضرت یسارؓ کو حضورؐ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ وہ آپؐ کی غلامی پر ہزار آزادیاں قربان کر سکتے تھے۔ انہوں نے عرض کیا:

> ''یارسول اللہ مجھے اپنے شرف غلامی سے محروم نہ فرمائیے۔ میں اپنی تمام زندگی آپؐ کی خدمت گزاری میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔''

ان کا جذبۂ اخلاص دیکھ کر حضورؐ نے ان کو یہ خدمت تفویض کی کہ وہ آپؐ کے (صدقہ کے) اونٹ چرایا کریں۔ چنانچہ وہ قبا سے متصل ایک چراگاہ (ناحیۂ ذی الحدر) میں چلے گئے اور بڑے ذوق وشوق سے فرمانِ نبوی کی تعمیل میں مشغول رہنے لگے۔

۶ ہجری میں قبیلہ عُکل اور عُرینہ کے آٹھ آدمی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور

اسلام قبول کیا۔ ایک روایت کے مطابق ان لوگوں کو عظم طحال (تلی بڑھ جانے) کا عارضہ تھا اور وہ اپنے وطن ہی سے بیمار آئے تھے۔

ایک دوسرے قول کے مطابق ان کو مدینہ منورہ کی آب وہوا موافق نہ آئی اور ان کے پیٹ پھول گئے۔ حضورؐ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ تم ناحیہ ذی الجدر جاؤ وہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے اور ہمارے اونٹ اونٹنیاں بھی ہیں ان کا دودھ خوب پیو، ان شاء اللہ تمہاری صحت بحال ہو جائے گی۔

وہ لوگ وہاں چلے گئے۔ حضرت یسارؓ نے ان کو اپنے آقا و مولاؐ کے مہمان جان کر بڑے خلوص اور محبت سے ان کی میزبانی کی۔ وہ لوگ چند دن میں تندرست وتوانا ہو گئے۔ اب بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، سرور عالم ﷺ اور حضرت یسارؓ کے ممنون احسان ہوتے، انہوں نے اپنی بدطینتی کی بنا پر ارتداد اور دغا بازی پر کمر باندھی۔ ایک دن علی الصباح پندرہ اونٹ ہانک کر لے چلے۔ حضرت یسارؓ نے ان کی یہ حرکت دیکھی تو انہیں اونٹ لے جانے سے منع کیا۔ جب وہ باز نہ آئے تو ان کے پیچھے دوڑے اور مزاحمت کرنے لگے۔ ان غداروں نے حضرت یسارؓ کو گرفتار کر لیا۔ پھر بڑی بے رحمی سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے۔ اس صدمہ سے حضرت یسارؓ شہید ہو گئے۔

سرور عالم ﷺ کو اس واردات کی خبر ہوئی تو آپؐ کو سخت دکھ ہوا۔ آپؐ نے حضرت کُرزؓ بن جابر فہری کو بیس سوار دے کر ان بدسرشت لٹیروں کے تعاقب میں روانہ فرمایا۔ اثنائے راہ میں حضرت کرزؓ کو ایک عورت ملی، جو اونٹ کا شانہ اٹھائے ہوئے تھی۔ حضرت کرزؓ نے اس سے پوچھا، تم کو یہ کہاں سے ملا؟ اس نے کہا، میں ادھر آ رہی تھی کہ ایک جگہ چند آدمی ملے جو ایک اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت بنا رہے تھے اس میں سے یہ شانہ انہوں نے مجھے دے دیا۔ یہ لوگ اگلے پڑاؤ میں مقیم ہیں۔ حضرت کرزؓ نے برق رفتاری سے اُس طرف رُخ کیا اور ان لوگوں کو گرفتار کر کے ان کی مشکیں باندھ لیں پھر انہیں اور بقیہ چودہ اونٹوں کے ساتھ لے کر واپس آئے۔ حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو انہوں نے یسارؓ کے ساتھ کیا۔ چنانچہ ان سب کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئیں، پھر انہیں حرہ میں ڈال دیا گیا جہاں وہ سب تڑپ تڑپ کر واصل جہنم ہوئے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآنِ حکیم کی یہ آیت ان ہی کے بارے میں نازل ہوئی:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ (المائدہ:۳۳)

یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں (مراد اس سے رہزنی اور ڈکیتی ہے) ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا زمین پر سے نکال دیے جائیں۔

حضرت مُعَیقِیب بن ابی فاطمۃ الدوسیؓ
خاتم بردارِ رسول اللہ ﷺ

(۱)

بعثت نبویؐ کے ابتدائی زمانے میں اللہ کے جن سعید الفطرت بندوں نے کسی تامل کے بغیر دعوتِ توحید پر لبیک کہا اور راہِ حق میں ہر قسم کے مصائب و آلام خندہ پیشانی سے برداشت کیے اللہ تعالیٰ نے انہیں السّابِقُونَ الْاَوَّلُوْن کا لقب دے کر کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت سے نوازا۔ قبولِ حق میں سبقت کرنے والے ان نفوسِ قدسی کا درجہ ان تمام اصحاب سے بلند ہے، جو ان کے بعد شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں جہاں مکہ کے چند نیک فطرت اصحاب تھے وہاں کچھ ایسے غریب الدیار لوگ بھی تھے جو کسی مجبوری یا ضرورت (غلامی یا تلاشِ روزگار) کے باعث مکہ میں آ بسے تھے۔ مُعَیقِیب بن ابی فاطمہؓ ایک ایسے ہی جوان صالح تھے، جو رہنے والے تو یمن کے تھے اور قبیلہ ازد کی ایک شاخ بنودوس سے تعلق رکھتے تھے لیکن تلاش روزگار کے سلسلے میں بنو عبد شمس کے حلیف بن کر مکہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ تمام ارباب سیر کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ حضرت معیقیبؓ دعوت توحید (بعثت نبوی) کے بالکل ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن قبول اسلام کے بعد غزوۂ خیبر (اوائل ۷ ہجری) تک ان کی زندگی کہاں اور کیسے گزری، اس کے بارے میں اہل سیر میں بہت اختلاف ہے۔ اتنے عظیم المرتبت صاحب رسول جو نہ صرف سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت کے ایک معزز رکن تھے بلکہ جن کو خاتم بردارِ رسول اللہ ﷺ ہونے کا مہتم بالشان شرف بھی حاصل ہوا، ان کے

بارے میں اہل سیر کے مختلف بیانات فی الواقع تعجب خیز ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ چودہ صدیوں کے بعد ان کی چھان پھٹک کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص روایت پر انحصار کرنے کی بجائے ہر قسم کی روایات بیان کر دی جائیں۔

(۲)

حضرت معیقیبؓ کے سلسلۂ نسب کے بارے میں تمام کتب سیر خاموش ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ابی فاطمۃ الدوسی کے فرزند تھے۔ ظاہر ہے کہ ''ابی فاطمہ'' ان کے والد کی کنیت تھی اصل نام کسی نے بیان نہیں کیا۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ (اوائل بعثت میں) وہ مکہ میں اسلام لائے اور پھر اپنے وطن واپس چلے گئے لیکن حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ وہ مکہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور دوسری ہجرت حبشہ (۶ بعد بعثت) میں شریک ہوئے۔ جمہور اہل سیر نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے۔ قبول اسلام کے بعد حضرت معیقیبؓ بھی دوسرے اہل حق کی طرح مشرکین قریش کے ظلم وستم کا ہدف بن گئے۔ ۵ بعد بعثت میں حضورؐ کے ایماء پر مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت نے حبش کی طرف ہجرت کی۔ اگلے سال (۶ بعد بعثت میں) مظلوم اہل حق کا ایک بڑا قافلہ ہجرت کر کے حبش پہنچا حضرت معیقیبؓ بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ غزوہ بدر سے پہلے حبش سے واپس آ گئے اور بدر سے لے کر تبوک تک تمام غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا اور بیعت رضوان میں بھی شریک ہوئے لیکن ابن ہشام اور بہت سے دوسرے اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت معیقیبؓ مہاجرین حبشہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس وقت حبش سے مدینہ آئے جب حضورؐ غزوۂ خیبر میں مصروف تھے یہ اصحاب سالہا سال کی جدائی کے بعد اپنے آقا و مولا ﷺ کی زیارت کے لیے اس قدر بے تاب تھے کہ آپؐ کی مراجعت کا انتظار نہ کر سکے اور سیدھے خیبر پہنچ کر حضورؐ کی زیارت سے شاد کام ہوئے۔ حضورؐ نے نہایت مسرت سے ان کا استقبال کیا اور ہر ایک سے معانقہ و مصافحہ کیا اگرچہ خیبر اس وقت فتح ہو چکا تھا اور ان اصحاب کو غزوہ میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن حضورؐ نے سب کو مال غنیمت سے حصہ عطا فرمایا۔ حضورؐ نے مدینہ منورہ کو مراجعت فرمائی تو حضرت معیقیبؓ بھی آپؐ کے ساتھ مدینہ آ گئے اور یہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

۳

خیبر کے بعد فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات پیش آئے۔ حضرت معیقیبؓ ان سب میں شریک ہوئے۔ حجۃ الوداع میں بھی حضورؐ کے ہم رکاب تھے۔ مدینہ منورہ میں حضرت معیقیبؓ کو جو خاص شرف حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ سرورِ عالم ﷺ نے اپنی مہر مبارک ان کی تحویل و حفاظت میں دے دی۔ یہ مہر مبارک چاندی کی انگشتری کی صورت میں تھی اس میں حبشی نگینہ تھا جس پر ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ کندہ تھے۔ آپؐ نے اسے مکاتیب وفرامین پر ثبت کرنے کے لیے بنوایا تھا۔ اسے آپؐ کبھی کبھی بائیں ہاتھ کی انگشت مبارک میں پہنتے تھے لیکن اکثر یہ حضرت معیقیبؓ کی تحویل میں رہتی تھی۔ اس طرح وہ خاتم بردارِ رسول اللہ ﷺ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ یہ ایک منفرد اور بہت بڑا اعزاز تھا اور اس حقیقت کا مظہر تھا کہ سرورِ کونین ﷺ کے نزدیک وہ ایک امین اور نہایت ذمہ دار آدمی تھے۔ اسی بنا پر تمام صحابہٴ کرامؓ حضرت معیقیبؓ کی بے حد تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

سرور عالم ﷺ کے کئی کاتب تھے۔ ان میں سے بعض وحی کی کتابت کرتے تھے۔ بعض امرا وسلاطین کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ بعض اموالِ صدقات کا حساب رکھتے تھے۔ حضرت معیقیبؓ ان معدودے چند صحابہ میں سے تھے، جو نوشت وخواند میں پوری مہارت رکھتے تھے اس لیے مستقل کاتبان وحی کی غیر موجودگی میں بعض موقعوں پر انہیں بھی کتابت وحی کا شرف حاصل ہوا۔

سرور عالم ﷺ کے وصال کے بعد خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی حضرت معیقیبؓ کا اعزاز واکرام برقرار رکھا اور انہیں مالی امور کا نگران بنایا اور ان سے کتابت کا کام بھی لیا۔

حضرت عمر فاروقؓ بھی حضرت معیقیبؓ کا بہت احترام اور لحاظ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں ''بیت المال قائم کیا تو حضرت عبداللہؓ بن ارقم کو اس کا افسر اور نگران مقرر کیا اور حضرت معیقیبؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عبید القاری کو ان کا نائب بنایا۔ علامہ شبلی نعمانی ''الفاروق'' میں رقم طراز ہیں:

''(حضرت عمرؓ نے) عبداللہؓ بن ارقم کو جو نہایت معزز صحابی تھے اور لکھنے پڑھنے میں

کمال رکھتے تھے، خزانہ کا افسر مقرر کیا۔ اس کے ساتھ لائق لوگ ان کے ماتحت مقرر کیے گئے جن میں عبدالرحمٰنؓ بن عبید القاری بھی تھے۔ معیقیبؓ کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے انگشتری بردار تھے اوراس کی وجہ سے ان کی دیانت اور امانت ہر طرح پر قطعی اور مسلم الثبوت تھی۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت معیقیبؓ کو حضرت زیدؓ بن ثابت کا مددگار بھی فرمایا تھا، جو عہدۂ کتابت پر فائز تھے۔ گویا حضرت معیقیبؓ افسر خزانہ اور افسر کتابت دونوں کی نیابت کا فرض انجام دیتے تھے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو حضرت معیقیبؓ سے بے انتہا محبت تھی۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ان کے عہد خلافت میں حضرت معیقیبؓ جذام کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کے علاج پر خاص توجہ دی۔ اس دور کے نامور اطبا کو بلا کر ان کے علاج پر مامور کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر دو یمنی طبیبوں کے علاج سے اتنا ہوا کہ مرض بالکل تو رفع نہ ہوا لیکن آیندہ بڑھنے سے رُک گیا۔ عام طور پر لوگ اس قسم کے مریض کے ساتھ ملنے جلنے اور کھانے پینے سے احتراز کرتے ہیں لیکن حضرت عمر فاروقؓ ان کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتے اور فرماتے کہ یہ برتاؤ صرف تمہارے ساتھ مخصوص ہے۔

مسند ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی جائداد وقف کی تو اس وقف نامہ کی کتابت حضرت معیقیبؓ ہی نے کی۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ بھی اپنے پیشروؤں کی طرح حضرت معیقیب کی تکریم و تعظیم کرتے رہے۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت معیقیبؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے آخر میں وفات پائی۔

ان کی اولاد میں صرف ایک صاحب زادے محمدؓ بن معیقیبؓ کا پتہ چلتا ہے۔ بقول حافظ ابن حجرؒ انہوں نے اپنے والد گرامی سے روایت بھی کی ہے۔

حضرت معیقیبؓ سے مروی چند احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں دو متفق علیہ ہیں اور ایک میں امام مسلمؒ منفرد ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ذکوان بن جُندُب اسلمیؓ

(صاحب البُدُن رسول اللہ ﷺ)

①

حضرت ذکوان بن جندب اسلمیؓ کا شماران صحابہٴ کرامؓ میں ہوتا ہے، جن پر سرورِ کائنات فخرِ موجودات محبوبِ کبریا ﷺ کو بے حد اعتماد تھا، اور آپؐ نے ان کو ایک نہایت اہم خدمت سپرد کررکھی تھی۔ یہ خدمت تھی قربانی کے جانوروں کی نگرانی۔ ایسے جانوروں کو عربی زبان سے ''بُدن'' کہا جاتا ہے اسی لیے حضرت ذکوانؓ ''صاحب البدن رسول اللہ ﷺ'' کے لقب سے مشہور تھے۔ ''ناجیہ'' ان کا خطاب تھا اور لوگ عام طور پر ان کو ''ذکوانؓ بن جندب'' کے بجائے ''ناجیہ بن جندبؓ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کا تعلق بنو اسلم بن افصیٰ سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

> ذکوان (ناجیہؓ) بن جندب بن عمیر بن یعمر بن دارم بن عمرو بن واثلہ بن سہم بن مازن بن سلامان بن اسلم بن افصیٰ۔

حضرت ذکوانؓ کے جذبۂ فدویت اور اخلاص فی الدین کو پیش نظر رکھا جائے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ عہدِ رسالت سے متعلق چند واقعات کے سوا اہل سیر نے ان کی زندگی کے دوسرے حالات بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی (ہوسکتا ہے کہ ان واقعات کے علاوہ انہیں مزید حالات دستیاب ہی نہ ہوئے ہوں) بہرصورت جو بھی معلوم ہے وہ بھی ان کے مرتبہ و مقام کا تعین کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۲)

حضرت ذکوانؓ کب سعادت اندوز اسلام ہوئے؟ اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ بات ثابت ہے کہ وہ ذیقعدہ ۶ ہجری سے پہلے شرف اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ ان کا قبیلہ مرالظہران اور اس کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد وہ اپنے صحرائی وطن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے۔ ذیقعدہ ۶ ہجری میں سرور عالم ﷺ نے چودہ سو جاں نثاروں کے ہمراہ خانۂ کعبہ کی زیارت اور طواف کے لیے مکہ کا عزم فرمایا۔ ان جاں نثاروں میں حضرت ذکوانؓ بن جندب بھی شامل تھے اور بقول ابن سعد حضورؐ نے انہیں قربانی کے جانوروں کی نگرانی پر مامور فرمایا تھا قریش مکہ کو کسی ذریعے سے مسلمانوں کے عزم مکہ کا علم ہو گیا۔ انہوں نے اس بات کو اپنی غیرت کے منافی سمجھا کہ علمبرداران توحید ان کی رضامندی کے بغیر مکہ میں داخل ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی مزاحمت کرنے کا تہیہ کر لیا اور اس مقصد کے لیے خالدؓ بن ولید کو (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) مسلح جنگجوؤں کا ایک دستہ دے کر مکہ سے روانہ کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ بنوخزاعہ کے سردار بدیلؓ بن ورقاء (جو اگرچہ اس وقت مشرف بہ اسلام) نہیں ہوئے تھے لیکن مسلمانوں کے خیر خواہ تھے) راستے میں سرور عالم ﷺ سے ملے اور آپؐ کو مشرکین قریش کے ارادہ کی اطلاع دی اور یہ بھی بتایا کہ مشرکین کی ایک جمعیت خالد بن ولید کی قیادت میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے مکہ سے چل پڑی ہے۔ حضورؐ کا ارادہ قریش مکہ سے لڑنے کا نہ تھا اس لیے آپؐ نے اپنے ہم رکاب صحابہؓ سے پوچھا:

> ''کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو مکہ جانے والے تمام راستوں سے واقف ہو اور ہم کو قریش کا راستہ بچا کر دوسرے راستہ سے نکال لے جائے۔ (مطلب یہ کہ لڑائی پر آمادہ قریش کی جمعیت سے مسلمانوں کا سامنا نہ ہو)۔''

حضورؐ کا ارشاد سن کر حضرت ذکوانؓ بن جندب کھڑے ہو گئے اور عرض کیا:

> ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان یہ خدمت میں انجام دوں گا۔''

چنانچہ وہ قریش کا راستہ کاٹ کر ایک دوسرے راستے سے مسلمانوں کو لے گئے اور کسی

رکاوٹ کے بغیر انہیں حدیبیہ پہنچا دیا، جہاں حضورؐ نے مسلمانوں کو خیمہ زن ہونے کا حکم دیا۔ صحیح بخاری میں حضرت براءؓ بن عازب سے روایت ہے کہ حدیبیہ میں ایک کنواں تھا، مسلمانوں نے اس کا سارا پانی نکال لیا اور وہ خشک ہوگیا۔ حضورؐ کو اطلاع دی گئی تو آپ اس کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ تھوڑا سا پانی منگایا اور کلی کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ ذرا سی دیر میں کنوئیں میں وافر پانی ہوگیا، جو سب نے پیا اور اپنے اونٹوں کو بھی پلایا۔

صحیح بخاری ہی میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ حدیبیہ میں پانی کی قلت کی وجہ سے ہم پیاسے ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ ایک چھوٹے سے برتن سے وضو کر رہے تھے۔ لوگ گھبرائے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ہمارے پاس پانی ختم ہوگیا سوائے اس کے جو آپ کے سامنے (برتن میں) ہے۔ حضورؐ نے اس برتن میں اپنا دست مبارک رکھا تو پانی آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے چشمے کی طرح جاری ہوگیا جو سب نے پیا اور اس سے وضو کیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حدیبیہ میں جا بجا خشک گڑھے تھے صحابہؓ نے حضورؐ سے پانی کی شکایت کی تو آپؐ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر حضرت ذکوانؓ کو دیا کہ اس کو جا کر کسی گڑھے میں گاڑ دو۔ انہوں نے ایک گڑھے کے درمیان گاڑ دیا۔ اس کی برکت سے خشک گڑھے میں پانی کا چشمہ ابلنے لگا۔

قیام حدیبیہ ہی کے دوران میں ایک دن حضرت ذکوانؓ بن جندب نے بارگاہ رسالت میں عرض کی: ''یارسول اللہ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں قربانی کے جانوروں کو حرم میں لے جا کر ذبح کر دوں۔''

حضورؐ نے فرمایا، ''مشرکین قریش تو مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے لڑنے مرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اس صورت حال میں تم کس طرح جانور حرم میں لے جا کر ذبح کر سکتے ہو۔''

انہوں نے عرض کیا، ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں جانوروں کو ایسے راستے سے حرم تک لے جاؤں گا کہ قریش کو اس کا پتہ تک نہ چلے گا۔''

حضورؐ نے فرمایا ''اچھا تو جانور لے جاؤ۔''

حافظ ابن حجرؒ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ذکوانؓ کمال ہوشیاری اور رازداری سے جانوروں کو حرم میں لے گئے اور وہاں انہیں ذبح کر کے واپس آئے۔

حدیبیہ میں ''بیعت رضوان'' کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا تو حضرت ذکوانؓ نے بھی بڑے ذوق وشوق سے حضورؐ کے دست مبارک پر لڑنے مرنے کی بیعت کی۔ اس طرح وہ اُن خوش بخت اصحاب میں شامل ہو گئے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب بیعت کرنے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے)

صلح حدیبیہ کے بعد غزوۂ خیبر پیش آیا۔ اس میں وہ تمام صحابہ شریک تھے، جو حدیبیہ میں آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ حضرت ذکوانؓ بن جندب بھی ان میں شامل تھے۔

(۲)

صلح نامۂ حدیبیہ میں طے پایا تھا کہ مسلمان اگلے سال (کسی ہتھیار کے بغیر) مکہ آ کر عمرہ ادا کر سکیں گے۔ چنانچہ ذیقعدہ ۷ ہجری میں سرور عالم ﷺ مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ عمرہ کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ تاریخ میں یہ عمرہ ''عمرۃ القضاء'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس موقع پر بھی حضرت ذکوانؓ بن جندب کو قربانی کے جانوروں کو لے جانے اور ان کی نگرانی کی خدمت سپرد ہوئی۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے بڑے قافلے سے پہلے اپنے قبیلے کے چار نوجوانوں کو ساتھ لے کر قربانی کے جانوروں کو مکہ معظّمہ لے گئے۔ حضورؐ نے مکہ معظّمہ میں نزول اجلال فرمایا تو حضرت ذکوانؓ سمیت سب اہل حق نے نہایت ذوق وشوق سے عمرہ ادا کیا اور حسب وعدہ تین دن کے بعد مکہ معظّمہ سے مراجعت کی۔

رمضان المبارک ۸ ہجری میں رحمت عالم ﷺ نے مکہ معظّمہ پر پرچم اسلام بلند کیا اور بیت اللہ شریف کو بتوں سے پاک کر دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار جاں نثار حضورؐ کے ہم رکاب تھے۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ حضرت ذکوانؓ بن جندب بھی ان نفوس قدسی میں شامل تھے اور غزوۂ حنین (شوال ۸ ہجری) میں بھی وہ حضورؐ کے ہم رکاب تھے۔

ذیقعدہ ۱۰ ہجری میں سرور کائنات ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ اس موقعے پر بھی رسول اللہ ﷺ نے اپنے جانوروں پر حضرت ذکوانؓ کو نگراں مقرر فرمایا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے ساتھ (حجۃ الوداع کے موقع پر) سولہ اونٹ مکہ کو روانہ فرمائے اور اس کو ان اونٹوں کا نگہبان مقرر کیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، یا رسول اللہ اگر ان اونٹوں میں سے کوئی کسی بیماری یا تھکاوٹ کی وجہ سے چل نہ سکے تو میں کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا، اس کو ذبح کر لے اور اس کے خون میں ان جوتیوں کو جو اس کے گلے میں پڑی ہیں، ڈبو کر اس کے کوہان پر نشان لگا دے اور اس کا گوشت نہ تو کھا اور نہ تیرے ساتھی۔

اس روایت میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ نے اونٹوں کے نگہبان کا نام نہیں لیا لیکن مؤطا امام مالک، مسند ابوداؤد، مسند دارمی اور جامع ترمذی کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نگہبان حضرت ذکوانؓ (ناجیۃ الاسلمی) ہی تھے۔ یہ حدیث خود حضرت ذکوانؓ بن جندب (ناجیۃ الخزاعی یا ناجیۃ الاسلمی) سے مروی ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ قربانی کے جانوروں میں سے جو جانور مرنے کے قریب ہوں میں ان کو کیا کروں آپؐ نے فرمایا، ان کو ذبح کرے اور ان کے خون میں اُن کو ڈبو کر جو ان کی گردن میں ہیں، ان کی گردن پر نشان لگا دے اور پھر ان کو لوگوں میں چھوڑ دے تاکہ وہ ان کو کھائیں۔

سرور عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ذکوانؓ طویل عرصہ تک حیات رہے لیکن ان کے کسی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

———

حضرت عتبہ بن اُسَید ثقفیؓ

۱

بعثت نبویؐ کے ابتدائی زمانے میں جن سعید الفطرت انسانوں نے دعوتِ حق پر لبیک کہا، وہ مشرکین قریش کے قہر وغضب کا نشانہ بن گئے لیکن اللہ کے ان پاکباز بندوں کو کسی قسم کا خوف، دباؤ اور جور وستم راہِ حق سے منحرف نہ کر سکا اور وہ سالہا سال تک طرح طرح کے مصائب و آلام نہایت صبر و استقامت کے ساتھ جھیلتے رہے۔ حضرت عتبہ بن اُسیدؓ بھی ان بلاکشان اسلام کی مقدس جماعت کا ایک فرد تھے۔ تاریخ میں وہ اپنی کنیت ''ابوبصیر'' سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق طائف میں آباد بنوثقیف کے جنگجو قبیلے سے تھا لیکن انہوں نے قریش سے قریبی تعلقات کی بنا پر مکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوبصیر عتبہؓ بن اسید بن جادیہ بن اسید بن عبداللہ بن ابی سلمہ بن عبداللہ بن غیرہ بن عوف بن ثقیف۔

ماں کا نام سالمہ تھا ان کا نسب نامہ یہ ہے:

سالمہ بنت عبد بن یزید بن ہاشم بن مطلب

حضرت عتبہؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرت سعید سے نوازا تھا۔ ان کے کانوں میں جونہی دعوت حق کی آواز پڑی وہ کسی تامل کے بغیر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ مشرکین مکہ کے نزدیک ان کی یہ ''حرکت'' ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے برافروختہ ہو کر نوجوان عتبہؓ کو قید محن میں ڈال دیا جہاں وہ طویل عرصے تک مصائب و آلام کی چکی میں پستے رہے۔

۶ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو عتبہؓ

ایک دن موقع پکر کفار کی قید سے بھاگ نکلے اور سیدھے رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں جا حاضر ہوئے۔

۲

صلح نامہ حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مسلمان مشرکین کے پاس سے بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس چلا جائے گا۔ اس کو آپؐ واپس کر دیں گے۔ مشرکین مکہ حضرت عتبہؓ کے فرار سے بہت سیخ پا ہوئے۔ جب انہوں نے سنا کہ وہ مدینہ پہنچ گئے ہیں تو فوراً دو آدمی حضورؐ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجے کہ آپ معاہدہ کے مطابق ہمارا آدمی واپس کر دیں۔

حضرت عتبہؓ کو مکہ واپس بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ پھر مشرکین کے پنجہ وستم میں گرفتار ہو جائیں لیکن رحمت عالم ﷺ عہد و پیمان کی پابندی کو ایمان کا حصہ قرار دیتے تھے اس لیے آپؐ نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا:

> ''ابو بصیر تمھیں معلوم ہے کہ صلح نامہ کی شرط کے مطابق میں تمھیں اپنے پاس نہیں روک سکتا۔ اگر روکوں تو یہ عہد شکنی ہوگی، جو ہمارے دین میں جائز نہیں اس لیے اس وقت تم واپس جاؤ، عنقریب اللہ تعالیٰ تمھاری اور دوسرے مظلوم مسلمانوں کی رہائی کی کوئی صورت پیدا کر دے گا۔''

حضرت عتبہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ آپ مجھے پھر مشرکین کے پاس بھیجتے ہیں کہ وہ مجھے راہِ حق سے برگشتہ کریں۔''

حضورؐ نے فرمایا ''ابو بصیر جاؤ اللہ تعالیٰ جلد ہی تمھاری اور دوسرے مسلمانوں کی گلو خلاصی کا کوئی سامان کر دے گا۔''

حضرت عتبہؓ ارشادِ نبویؐ کی تعمیل میں قریش کے آدمیوں کے ساتھ چل پڑے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر ان کے دونوں نگران کھجوریں کھانے کے لیے ٹھہر گئے۔ حضرت عتبہؓ نے ان میں سے ایک سے کہا:

''جانِ برادر تمھاری یہ تلوار بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔''

تلوار کا مالک اپنی تلوار کی تعریف سن کر بہت خوش ہوا اور کہا ''بے شک یہ تلوار بہت اچھی ہے، میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔''

حضرت عتبہؓ نے کہا، ''ذرا دکھانا تو۔''

اُس نے جھٹ تلوار نیام سے کھینچی اور حضرت عتبہؓ کے ہاتھ میں دے دی۔ عتبہؓ حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں قریش کے آدمیوں کے ساتھ آ تو گئے تھے لیکن انہوں نے سالہا سال تک کفار کے پنجۂ ستم میں رہ کر جو سختیاں جھیلی تھیں ان کے پیشِ نظر وہ کسی قیمت پر بھی اپنے آپ کو دوبارہ ان کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے چنانچہ تلوار ہاتھ میں آتے ہی انہوں نے اس کے مالک کا سر اڑا دیا۔ دوسرا خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا اور مدینہ جا کر مسجد نبوی میں پہنچا جہاں سرورِ عالمؐ رونق افروز تھے۔ حضورؐ نے اس کو بدحواس دیکھ کر پوچھا "تم پریشان کیوں ہو اور واپس کیسے آ گئے؟" اس نے سارا واقعہ بیان کیا، اتنے میں حضرت عتبہؓ بھی بارگاہِ رسالتؐ میں آ پہنچے۔ انہوں نے عرض کیا:

> "یا رسول اللہ آپ نے معاہدہ کی شرط پوری کر دی اور اپنی ذمے داری سے سبک دوش ہو گئے۔ اللہ نے مجھے ہمت دی کہ میں آزاد ہو گیا۔"

قریش کے آدمی کو قتل کر کے حضرت عتبہؓ کا اس طرح واپس آنا قریش کو مشتعل کرنے کا باعث ہو سکتا تھا اس لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

> "یہ شخص (عتبہ) بھی جنگ کے شعلے بھڑکانے کا آلہ ہے اگر اس کو چند مددگار اور ساتھی مل جائیں۔"

حضرت عتبہؓ نے سرورِ عالم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سنے تو انہیں یقین ہو گیا کہ مدینہ میں میرا رہنا ممکن نہیں۔ چپکے سے وہاں سے کھسک گئے اور ساحلی مقامات کا رُخ کیا۔

۳

حضرت ابوبصیر عتبہؓ نے ایک ساحلی مقام "عیص" کو اپنا مستقر بنا لیا۔ اس کے قریب ہی وہ راستہ تھا، جس پر سے قریش کے تجارتی قافلے شام آتے جاتے تھے۔ چند دن بعد اسی قسم کے ایک اور ستم رسیدہ صحابی حضرت ابوجندلؓ بن سہیل بھی مشرکین مکہ کی قید سے فرار ہو کر عیص پہنچ گئے۔ اب دوسرے بلاکشانِ اسلام کے لیے بھی راستہ کھل گیا۔ جسے موقع ملتا، قریش مکہ کے پنجۂ ستم سے بھاگ کر سیدھا عیص پہنچ جاتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت عتبہؓ کے پاس مسلمانوں کی خاصی جماعت ہو گئی۔ اب انہوں نے مشرکین مکہ سے انتقام لینے کی ایک عجیب تجویز سوچی۔ قریش کا کوئی تجارتی قافلہ ادھر سے گزرتا تو یہ لوگ اس پر حملہ کر کے تباہی مچا دیتے۔ مشرکین قریش حضرت عتبہؓ کے ان چھاپوں سے سخت پریشان ہوئے کیونکہ ان کی تجارت معرض خطر میں پڑ گئی تھی۔ آخر انہوں نے عاجز آ کر رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آئندہ

جو مسلمان بھاگ جائے گا، وہ آزاد ہے آپ اسے واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے صلۂ رحمی کا واسطہ دے کر آپؐ سے درخواست کی کہ عیص میں مقیم مسلمانوں کو روکیے کہ وہ ہمارے تجارتی قافلوں پر حملے نہ کریں۔

حضورؐ نے قریش کی استدعا قبول فرمالی اور عیص میں مقیم آزاد مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ ابوبصیر عتبہؓ اور جندلؓ مدینہ آجائیں اور باقی لوگ منتشر ہو کر اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس موقعے پر قرآنِ پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَهُوَ الَّذِىْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ (سورۂ فتح: ۲۴)

(اللہ وہ ہے جس نے مکہ کی وادی میں دشمنوں کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے قابو پانے کے بعد)[1]

جب حضورؐ کا فرمان مبارک حضرت عتبہؓ کو ملا تو وہ بستر مرگ پر پڑے تھے۔ نامۂ اقدس ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگے اور پڑھتے پڑھتے ہی اس کو سر آنکھوں پر رکھے ہوئے پیک اجل کو لبیک کہا۔

حضرت ابوجندلؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور عیص ہی میں سپرد خاک کر کے قریب ہی یادگار کے طور پر ایک مسجد بنادی۔ اس کے بعد حضرت ابوجندلؓ تو مدینہ منورہ آگئے اور دوسرے مسلمان اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

حضرت ابوبُصَیر عتبہؓ کی گھریلو زندگی کے بارے میں کتبِ سیر خاموش ہیں البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور ایک بہادر اور صاحب تدبیر شخص تھے۔ حضورؐ کے مکتوبِ مبارک سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے ان کی آزادانہ روش کو معاف فرما دیا تھا اسی لیے ان کو اپنے پاس مدینہ منورہ بلا بھیجا تھا اگر اُن کی زندگی وفا کرتی تو حضرت ابوجندلؓ کی طرح بعد کے غزوات میں وہ بھی حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کرتے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

(۱) ایک دوسری روایت کے مطابق یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں نے حدیبیہ میں اَسی مشرکوں کو گرفتار کیا جو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ رحمتِ دوعالم ﷺ نے رحم کھا کر ان سب کو رہا کر دیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ

①

۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہوا تو صحابہ کرامؓ پر قیامت بیت گئی۔ دنیا ان کے لیے اندھیر ہوگئی اور وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے۔ لیکن رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ نمازِ جنازہ پڑھ کر سینے پر پتھر رکھا اور بادیدۂ گریاں محبوب کبریا ﷺ کے جسد اطہر کو لحد میں اتار دیا۔ اس وقت بھورے بالوں والے ایک بلند قامت اور قوی الجثہ صاحب رسولؐ کی بے تابی کا عجیب عالم تھا۔ اپنے آقا و مولا ﷺ سے جدا ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور بار بار بے چینی سے اپنے ہاتھ مل رہے تھے۔ یکایک ان کی انگلی سے انگوٹھی نکل کر قبر مبارک میں گر گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ قریب ہی کھڑے تھے، انہوں نے کہا، قبر میں اتر کر اپنی انگوٹھی نکال لو۔ وہ صاحب قبر میں اترے، اپنے محبوب آقا ﷺ کے قدم مبارک کو ہاتھ لگایا اور پھر لوگوں سے کہا، مٹی گراؤ۔ جب تھوڑی سی مٹی ڈالی جا چکی تو وہ آنکھوں سے سیل اشک بہاتے بادل ناخواستہ قبر مبارک سے باہر آئے۔ یہ صاحب رسول جن کو ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے سب سے آخر میں جدا ہونے کا شرف حاصل ہوا، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ تھے۔

②

حضرت ابو عبداللہ مغیرہ بن شعبہؓ کا شمار اپنے دَور کے نامور سیاسی مدبرین میں ہوتا ہے۔ وہ طائف میں آباد مشہور قبیلہ ''بنو ثقیف'' کے چشم و چراغ تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

مغیرہؓ بن شُعبہ بن ابی عامر بن مسعود بن معتب بن مالک بن کعب بن عمرو بن عوف بن قیس۔

بعض روایتوں میں ان کی کنیت ابوعبداللہ کے علاوہ ابوعیسیٰ بھی بیان کی گئی ہے۔

بنوثقیف بڑے متمرد اور جنگجو لوگ تھے اور سرسبز و شاداب زمینوں باغوں اور دولت کی ریل پیل نے ان کا دماغ آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ ۱۰ نبوت میں رحمت عالم ﷺ ان کو دعوت توحید دینے طائف تشریف لے گئے تو ان لوگوں نے عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپؐ سے ایسا ناروا سلوک کیا کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ ان لوگوں کو اجتماعی طور پر ۹ ہجری سے پہلے قبول اسلام کی توفیق نصیب نہ ہوئی، البتہ بعض اِکا دُکا سعید الفطرت ثقفی اس سے پہلے ہی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوگئے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ایسے ہی خوش بخت ثقیفوں میں شامل تھے۔

حافظ ابن عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ۵ ہجری میں مشرف بہ ایمان ہوئے اور اسی سال وطن سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ آ گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے زمانۂ جاہلیت میں چند آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا اگرچہ بنوثقیف کے ممتاز رئیس عروہؓ بن مسعود نے ان کی طرف سے دِیَت ادا کر دی لیکن وہ وطن میں نہ ٹھہرے، بھاگ کر چھپتے چھپاتے مدینہ منورہ آ گئے اور حضورؐ کی بیعت اور شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے بعد یہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت مغیرہؓ اپنے وقت کا بیشتر حصہ بارگاہِ رسالت میں گزارتے تھے اور فیضان نبوی سے خوب خوب بہرہ یاب ہوتے تھے۔ ان کو حضورؐ سے بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ ہر وقت آپؐ کی خدمت پر کمربستہ رہتے تھے۔ حضورؐ کوئی حکم دیتے تو لپک کر اس کی تعمیل کرتے، آپؐ کے لیے وضو کا پانی لا دیتے، آپؐ کے کاشانۂ اقدس کی حفاظت کا فرض انجام دیتے۔ آپؐ کے اونٹ جنگل میں چرانے کے لیے لے جاتے۔ چونکہ پڑھے لکھے آدمی تھے اس لیے بعض اوقات کتابت وحی کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی۔

ذیقعدہ ۶ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے عمرہ کے ارادہ سے مکہ کا عزم فرمایا اس موقع پر چودہ سو صحابۂ کرامؓ کو آپؐ کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ اس میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ بھی شامل تھے۔ اثنائے راہ میں جب حضورؐ کو اطلاع ملی کہ مشرکین مکہ مسلمانوں کی مزاحمت کرنا چاہتے ہیں

اور انہوں نے ایک فوجی دستہ مسلمانوں کو روکنے کے لیے روانہ کر دیا ہے تو آپؐ معروف راستے کو چھوڑ کر ایک اور راستے سے حدیبیہ پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے کیونکہ آپؐ کا ارادہ لڑنے کا نہ تھا۔ حدیبیہ سے حضورؐ نے ایک سفیر قریش کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اس کے جواب میں قریش نے عروہؓ بن مسعود ثقفی کو حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ عروہؓ نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ اگرچہ طائف کے رہنے والے تھے لیکن قریش مکہ بھی ان کو بہت مانتے تھے اور اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ عروہؓ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر گفتگو کا آغاز کیا تو عرب کے عام رواج کے مطابق بار بار حضورؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ اس وقت حضرت مغیرہؓ بن شعبہ چہرے پر ڈھاٹا باندھے (یا سر پر خود رکھے) اور ہتھیار سجائے حضورؐ کی پشت مبارک کی جانب کھڑے تھے۔ ان کو عروہؓ کا اندازِ تخاطب سخت ناگوار گزرا۔ بار بار اپنی تلوار کے قبضہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ آخر پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور کڑک کر بولے:

"تجھے معلوم نہیں کس سے بات کر رہا ہے، خبردار اب ہاتھ آگے نہ بڑھانا۔"

عروہؓ نے ان کی آواز پہچان لی اور بولے، "او دغاباز کیا تو میرے احسان کو بھول گیا۔" یہ اس واقعے کی طرف اشارہ تھا، جس میں عروہؓ نے حضرت مغیرہؓ کی طرف سے خون بہا ادا کیا تھا۔

حضرت مغیرہؓ نے کہا، "کچھ بھی ہو تم اپنا ہاتھ پیچھے رکھو۔"

عروہ قریش کے پاس واپس گئے تو ان کو جمع کر کے اس طرح خطاب کیا:

> "اے برادرانِ قریش! میں دنیا کے بڑے بڑے فرماں رواؤں (قیصرِ روم، کسریٰ ایران، نجاشیِ حبشہ) کے درباروں میں گیا ہوں۔ لیکن محمد (ﷺ) کے ساتھی جس طرح ان کے والہ و شیدا ہیں اور جس قدر ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، میں نے کسی بادشاہ کے دربار میں عقیدت اور وارفتگی کا یہ منظر نہیں دیکھا۔ محمد (ﷺ) تھوکتے ہیں تو یہ لوگ اُن کے لعاب کو اپنے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اپنے جسم اور چہرے پر مل لیتے ہیں۔ محمد (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ مستعمل پانی کے ایک ایک قطرے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپس میں لڑ مریں گے۔ محمد (ﷺ) کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کی تعمیل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ اُن کے سامنے کوئی شخص بلند آواز سے گفتگو نہیں کرتا اور نہ اُن کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتا ہے۔ میری مانو تو محمد (ﷺ) سے صلح کر لو۔"

قریش عروہؓ کی باتوں سے متاثر تو ہوئے لیکن صلح پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب حضورؐ نے

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ قریش نے ان کو مکہ میں روک لیا۔ جب وہ واپس نہ آئے تو مسلمانوں میں مشہور ہو گیا کہ عثمانؓ کو مشرکین قریش نے شہید کر دیا ہے۔ اس سے مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔ یہ فرما کر آپ ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اسی کا نام بیعت رضوان ہے یعنی خدا کی خوشنودی کی بیعت، کیوں کہ اس بیعت میں شریک ہونے والے صحابہ کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ سورۂ فتح میں انہی نفوس قدسی کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ

تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب وہ اس درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو بھی بیعت رضوان کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس اعتبار سے وہ ''اصحاب الشجرہ'' کی عظیم المرتبت جماعت میں شامل ہیں۔ ان اصحاب نے جس جوشِ ایمان اور جذبۂ فدویت کا مظاہرہ کیا، قریش کو اس کا علم ہوا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو واپس بھیج دیا اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ صلح نامہ حدیبیہ معرضِ تحریر میں آیا اور مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح مبین کی بشارت پا کر حدیبیہ سے مراجعت کی۔

(۳)

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت مغیرہؓ نے غزوۂ خیبر، فتح مکہ، غزوۂ تبوک اور کئی دوسرے غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ شعبان یا رمضان ۹ ہجری میں اہل طائف نے اپنے چند ذی اثر اور زیرک آدمیوں کا ایک وفد عبد یالیل کی سرکردگی میں مدینہ منورہ روانہ کیا۔ جب یہ وفد مدینہ منورہ کے قریب مقام ''ذی حرض'' میں پہنچا تو ان کی ملاقات حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے ہوئی جو وہاں اونٹ چرا رہے تھے۔ انہیں اپنے ثقفی بھائی بند کے آنے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو اس قدر خوش ہوئے کہ حضورؐ کو اطلاع دینے کے لیے مدینہ منورہ کی طرف دوڑ پڑے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ مل گئے۔ انہوں نے پوچھا، خیر تو ہے، اس

طرح بے تحاشا کیوں بھاگ رہے ہو؟ حضرت مغیرہؓ نے وفد ثقیف کی آمد کی خبر سنائی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں قسم دے کر کہا کہ یہ خوش خبری مجھ کو پہنچانے دو۔

حضرت مغیرہؓ کو صدیق اکبرؓ کا بے حد پاس ولحاظ تھا، ان کی بات مان گئے اور راستے ہی سے وفد کے پاس لوٹ گئے۔

سیدنا صدیق اکبرؓ نے سرور عالم ﷺ کو وفد ثقیف کی آمد کی اطلاع دی تو آپؐ کو بھی بہت مسرت ہوئی۔ اسی اثنا میں حضرت مغیرہؓ بھی ارکان وفد کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں پہنچ گئے۔ حضرت مغیرہؓ نے ان لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ دربارِ نبوتؐ پہنچ کر اس طریقہ سے سلام کرنا لیکن ان لوگوں کے رگ وریشے میں جاہلیت رچی ہوئی تھی انہوں نے اپنے جاہلانہ دستور کے مطابق حضورؐ کو سلام کیا تاہم حضورؐ نے ان کے طرزِ عمل کو نظر انداز کر دیا۔ اس موقع پر حضرت مغیرہؓ نے عرض کیا:

> ''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، یہ میری قوم کے لوگ ہیں اگر اجازت ہو تو ان کو اپنا مہمان بناؤں اور ان کی خاطر مدارات کروں۔''

حضورؐ نے فرمایا:

> ''میں منع نہیں کرتا کہ تم اپنی قوم کی عزّت کرو لیکن ان کو ایسی جگہ اتارو جہاں قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑتی رہے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھ سکیں۔''

چنانچہ حضورؐ کے ایماء پر وفد ثقیف کو مسجد نبویؐ کے صحن میں خیمہ نصب کر کے ٹھہرایا گیا۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں ارکان وفد نے قرآن سنا اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھا تو بہت متاثر ہوئے۔ سرور عالم ﷺ بھی ہر روز نمازِ عشاء کے بعد ان کے پاس تشریف لے جاتے اور دیر تک گفتگو فرماتے رہتے۔ بالآخر اہل وفد چند شرائط پر قبول حق کے لیے تیار ہو گئے لیکن اپنے معبود بت ''لات'' کے بارے میں ان کے دلوں میں سخت خوف بیٹھا ہوا تھا۔

قبولِ اسلام کے شرائط طے ہو جانے کے بعد انہوں نے حضورؐ سے پوچھا:

> ''ہمارے بت لات کے بارے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''اسے توڑ دیا جائے گا۔''

حضورؐ کا ارشاد سن کر ان لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا، بولے اگر لات کو آپؐ کے ارادے کا علم ہو گیا تو وہ ہمیں تباہ و برباد کر دے گا۔"

حضرت عمر فاروقؓ بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ ان لوگوں کو ملامت کرنے لگے کہ تم ایک بے جان پتھر سے اتنا ڈرتے ہو؟

اہل وفد نے برہم ہو کر کہا:

"عمر تم نہ بولو، ہم تمہارے پاس نہیں آئے۔" یہ کہہ کر حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا:

"ہم میں تو اتنی ہمت نہیں کہ لات کو ہاتھ لگائیں، آپ جو چاہیں کریں۔"

حضورؐ نے متبسم ہو کر فرمایا:

"اچھا تو یہ بت شکنی ہمارے ذمہ رہی تم لوگ یہ کام نہ کرنا۔"

اس کے بعد سب اہل وفد مشرف بہ اسلام ہو گئے اور اپنے وطن کو مراجعت کی۔ وفد ثقیف کی واپسی کے چند دن بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت ابوسفیانؓ بن حرب (اور ایک روایت کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید کو بھی) طائف روانہ کیا کہ لات اور اس کے معبد کو برباد کر دیں۔ وفد کی واپسی پر بیشتر بنوثقیف اور ان کے احلاف حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کے دل سے "لات" کی ہیبت نہ گئی تھی۔ علامہ طبری کا بیان ہے کہ بنوثقیف کی عورتوں کے دلوں سے کفر و شرک کا زنگ دور ہونے میں کافی وقت لگا۔ وہ لات کو بہت مانتی تھیں، اس پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں اور اس سے مرادیں مانگا کرتی تھیں۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے طائف پہنچ کر "بت کدۂ لات" کو گرانے کا آغاز کیا تو ثقفی عورتیں روتی پیٹتی سر برہنہ گھروں سے نکل آئیں اور یہ شعر پڑھ پڑھ کر اپنے مردوں کو ملامت کرنے لگیں:

الا ابکین دفاع

اسلمها الرضاع

الم یحسنوا المضاع

یعنی "ان لوگوں پر روؤ کہ بزدلوں نے اپنے بتوں کو دشمنوں کے حوالے کر دیا اور ان سے معرکہ آرا نہ ہوئے۔"

حضرت مغیرہؓ نے ان کے شور و شیون کی کچھ پروا نہ کی، پہلے لات کے بت کو توڑا، پھر بت کدہ کی دیواروں پر چڑھ گئے اور انہیں گرانا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھیوں نے بھی ان کی مدد

کی اور سب نے مل کر نہ صرف عمارت کا ایک ایک پتھر گرا دیا بلکہ ان کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ بت کدہ کی بربادی کے بعد اہل طائف کے دلوں سے خوف دور ہوگیا اور ان میں توحید کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ اب وہ اسلام کے بازوئے شمشیر زن بن گئے۔ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کا موقع آیا تو تمام بنوثقیف بڑے ذوق وشوق سے حج میں شریک ہوئے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو بھی اس موقع پر حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد آپؐ کی قبر مبارک میں حضرت مغیرہؓ کی انگوٹھی گرنے کا واقعہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ بعض اہل سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے اپنی انگوٹھی عمداً قبر مبارک میں گرائی تھی تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سب سے آخر میں جدا ہونے والے شخص کی حیثیت سے یاد کیے جائیں چنانچہ بقول ابن سعدؒ وہ ہمیشہ لوگوں کے سامنے بدیں الفاظ فخر کا اظہار کیا کرتے تھے کہ میں تم سب میں رسول اللہ ﷺ سے آخری جدا ہونے والا شخص ہوں۔

(۴)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے جمہور مسلمینِ کی طرح خوشدلی سے ان کی بیعت کرلی۔ عہد صدیقی کے اوائل میں فتنۂ ارتداد نے زور پکڑا تو حضرت مغیرہؓ نے مرتدین کے خلاف جہاد میں پُر جوش حصہ لیا۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ حضرت مغیرہؓ یمامہ کے مرتدوں کی سرکوبی میں پیش پیش رہے اور اسی وقت مدینہ واپس آئے جب مرتدین کا پوری طرح قلع قمع ہوگیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ مسند نشین خلافت ہوئے انہوں نے صدیق اکبرؓ کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھایا اور ایران وشام کے خلاف جنگی سرگرمیوں کو تیز کردیا۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اسی زمانے میں عراقِ عرب کی مہم پر جانے والے مجاہدین میں شامل ہوگئے۔

رمضان ۱۴ ہجری میں مسلمانوں نے بویب کے مقام پر ایرانیوں کو عبرتناک شکست دی۔ اس شکست نے مجوسی ایران کی غیرت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور متحد ہوکر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ عراق عرب کے جن علاقوں پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا تھا وہاں بھی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان حالات کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے عراق عرب کی اسلامی فوجوں کے سپہ سالار حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ کو حکم بھیجا کہ ساری فوجوں کو سمیٹ کر سرحد عرب

کی طرف ہٹ آؤ۔ ساتھ ہی انہوں نے سارے عرب میں جہاد کی منادی کرادی۔ تھوڑے ہی عرصے میں مدینہ منورہ میں ہر طرف جوش جہاد سے سرشار مجاہدین کا سیلاب اُمڈ آیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو عراق عرب کی مہم کا سپہ سالار مقرر کیا اور مناسب ہدایات دے کر مدینہ منورہ سے روانہ کر دیا۔ شراف کے مقام پر حضرت مثنیٰؓ کی ماتحت فوج بھی ان کے ساتھ آ کر مل گئی۔ (اس وقت حضرت مثنیٰؓ معرکۂ جسر میں کھائے ہوئے زخموں کی وجہ سے وفات پا چکے تھے) اسی مقام پر حضرت سعدؓ کو حضرت عمر فاروقؓ کا خط ملا، جس میں انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ شراف سے آگے بڑھ کر قادسیہ میں قیام کرو جو ایران کا دروازہ ہے۔ یہ خط ملتے ہی حضرت سعدؓ شراف سے چل کر قادسیہ میں جا خیمہ زن ہوئے۔ دوسری طرف ایرانی فرماں روا یزدجرد نے ایک نامور ایرانی جرنیل رستم بن فرخ زاد کو ایک جرار لشکر دے کر مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کا حکم دیا۔ رستم ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس ساٹھ ہزار ایرانی جنگجوؤں کے ساتھ مدائن سے چلا اور مدائن سے متصل ساباط کی فوجی چھاؤنی میں پڑاؤ ڈالا۔ قیام ساباط کے دوران میں اس نے ایران کے تمام علاقوں میں ہرکارے دوڑا دیے جہاں سے امدادی فوجوں کا تانتا بندھ گیا۔ ابھی وہ ساباط ہی میں مقیم تھا کہ حضرت سعدؓ نے امیر المومنینؓ کے حکم کے مطابق چودہ آدمیوں پر مشتمل ایک سفارت براہِ راست یزدجرد کے پاس مدائن بھیجی۔ اس سفارت کے ایک رکن حضرت مغیرہؓ بن شعبہ بھی تھے۔ حضرت مغیرہؓ سمیت اس وفد کے تمام ارکان وجاہت، شجاعت اور تقریر و گفتگو میں چوٹی کے لوگ تھے۔ اس وفد سفارت نے کسریٰ کے دربار میں پہنچ کر بڑی عمدگی سے گفتگو کی اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ یزدجرد مسلمانوں کی باتیں سن کر آپے سے باہر ہو گیا اور سفرا کو نہایت درشتی سے نکال دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک کے سر پر مٹی کی ایک ٹوکری اٹھوائی اور کہا کہ تم ہمارا ملک فتح کرنے آئے ہو لیکن تمہیں یہاں سے اس مٹی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اسلامی سفارت کے مدائن سے جاتے ہی یزدجرد نے رستم کو حکم بھیجا کہ ساباط سے چل کر قادسیہ پہنچو اور مسلمانوں کو کچل ڈالو۔

رستم نے ایک لاکھ اسی ہزار فوج اور تین سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ ساباط سے قادسیہ کی طرف کوچ کیا اور نہایت سست روی سے چلتے ہوئے قادسیہ کے سامنے عتیق کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ وہ ایک جہاندیدہ اور دور اندیش جرنیل تھا اور عربوں کی شجاعت اور پامردی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مسلمانوں سے صلح کی کوئی صورت نکل آئے اور وہ لڑائی کے بغیر

ہی واپس چلے جائیں۔ چنانچہ اس نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو پیغام بھیجا کہ اپنا کوئی معتمد میرے پاس صلح کی گفتگو کے لیے بھیجو۔ حضرت سعدؓ نے پہلے حضرت ربعی بن عامرؓ اور پھر حضرت حذیفہؓ بن محصن کو سفیر بنا کر رستم کے پاس بھیجا لیکن ان دونوں سفارتوں کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ تیسری مرتبہ حضرت سعدؓ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ رستم نے نہایت اہتمام سے دربار سجایا۔ دور دور تک بیش بہا قالینوں کا فرش بچھوایا، راستے کے دونوں طرف نہایت اعلیٰ وردیوں میں ملبوس فوج کے دستے کھڑے کر دیے اور خود امرا کے درمیان زنگار تاج سر پر رکھ کر سونے کے تخت پر بیٹھا۔ حضرت مغیرہؓ معمولی لباس پہنے بڑی بے نیازی سے رستم کے دربار میں داخل ہوئے اور سیدھے رستم کے تخت پر اس کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ اس پر سارا دربار برہم ہو گیا اور چوبداروں نے آگے بڑھ کر حضرت مغیرہؓ کو تخت سے اتار دیا۔ حضرت مغیرہؓ نے فرمایا کہ میں نے تو سنا تھا کہ اہل ایران بڑے مہذب اور ذی شعور لوگ ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک شخص کو خدا بنا کر تخت پر بٹھا دیتے ہیں اور پھر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم عربوں میں یہ دستور نہیں ہے۔ تم نے خود مجھے یہاں مہمان بنا کر بلایا ہے اس لیے میرے ساتھ تمہارا یہ سلوک کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اگر تمہارے یہی اعمال و اخلاق ہیں تو سمجھ لو کہ تمہارے آخری دن آ گئے ہیں۔

رستم حضرت مغیرہؓ کی باتیں سن کر بہت نادم ہوا اور کہا، میں نے تمہیں اپنے پاس سے اٹھانے کا حکم نہیں دیا تھا، یہ ملازموں کی غلطی تھی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی بوسیدہ تلوار اور ذرا ذرا سے تیروں کے ساتھ ہمارا کیا مقابلہ کرو گے؟

حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا ''بے شک میری تلوار بوسیدہ ہے لیکن اس کی دھار کی تیزی پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ رہے تیر تو سمجھ لو کہ شعلۂ آتش خواہ چھوٹا سا ہو پھر بھی آگ ہے اور اس کی خاصیت جلانا ہے۔''

اس نوک جھوک کے بعد رستم نے معاملے کی بات شروع کی اور اپنی سلطنت کی شان و شوکت اور بے پناہ عسکری قوت کا ذکر کر کے کہا کہ تم لوگ اب بھی واپس چلے جاؤ تو ہم تمہارا تعاقب نہیں کریں گے بلکہ تمہارے سپہ سالار اور فوج کے دوسرے تمام افسروں اور سپاہیوں کو ان کے حسب مرتبہ انعام دیا جائے گا۔

حضرت مغیرہؓ نے نہایت جوش سے جوابی تقریر کی اور آخر میں تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ

کر کہا، اگر تم دین حق قبول نہیں کرتے تو جزیہ دینا قبول کرو ورنہ تلوار ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

رستم حضرت مغیرہؓ کا جواب سن کر آگ بگولا ہو گیا اور اس نے للکار کر کہا:

''آفتاب کی قسم اب ہرگز تم سے صلح نہ ہو گی، کل تم سب کو ہلاک کر دوں گا۔''

حضرت مغیرہؓ نے کہا: ''بہت اچھا جو اللہ چاہے گا۔''

اس کے بعد وہ لشکر میں واپس آ گئے اور حضرت سعدؓ کو رستم کے عزائم سے مطلع کیا۔ انہوں نے اسی وقت مجاہدین کو جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔ دوسرے دن مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان قادسیہ کی خونریز لڑائی کا آغاز ہو گیا جو تین دن تک جاری رہی اور ایرانیوں کی عبرت ناک شکست پر منتج ہوئی۔

۵

قادسیہ کے بعد حضرت مغیرہؓ نے عراق عرب کے کئی اور معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ ۱۵ ہجری میں نوتعمیر شہر بصرہ کے گورنر حضرت عتبہؓ بن عزوان نے وفات پائی تو امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت مغیرہؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا۔ اپنی امارتِ بصرہ کے دوران میں انہوں نے کئی شاندار کارنامے سر انجام دیے۔ میسان اور اس کے ملحقہ علاقوں کو بزورِ شمشیر مسخر کیا، پھر ایک دفتر قائم کیا جہاں سے سپاہیوں کو تنخواہیں اور وظیفہ خواروں اور وثیقہ پانے والوں کو وظیفے اور وثیقے ملتے تھے اور ان کا باقاعدہ رجسٹروں میں اندراج ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ایک خاتون اُمِّ جمیل حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے پاس وقتاً فوقتاً آتی تھی۔ اس کا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا اور اس کا خاوند جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ شوہر کی شہادت کے بعد وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو کر بصرہ کے بڑے گھروں میں مدد کے لیے آتی جاتی تھی۔ حضرت مغیرہؓ کے پاس بھی اس کی آمد و رفت اسی غرض سے تھی لیکن بعض لوگوں نے ان کو اُمِّ جمیل سے متہم کر دیا اور حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ان کے خلاف شکایت کی۔ یہ شکایت ملنے پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بلایا اور ان سے فرمایا، میں تمہیں مغیرہ بن شعبہ کی جگہ بصرہ کا گورنر بناتا ہوں، میرا یہ خط مغیرہ کو دو اور بلا تاخیر انہیں مدینہ بھیج دو۔

اس خط میں حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت مغیرہؓ کو لکھا تھا:

''مجھے ایک بُری خبر ملی ہے۔ میں ابوموسیٰ کو بصرہ کا گورنر بنا کر بھیج رہا ہوں۔ انہیں حکومت کا چارج دے کر فوراً مدینہ پہنچو۔''

حضرت مغیرہؓ نے امیر المؤمنینؓ کے حکم کی تعمیل کی اور بصرہ کی زمام حکومت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے سپرد کر کے مدینہ منورہ آ گئے۔ امیر المؤمنینؓ نے ان پر لگائی گئی تہمت کی تحقیق کی تو شہادت سے ان پر یہ الزام ثابت نہ ہوسکا۔ امیر المؤمنینؓ کو ان کی بریت سے بڑی خوشی ہوئی لیکن انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو دوبارہ بصرہ کی امارت پر بھیجنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ عرصہ بعد انہیں حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کی جگہ کوفہ کا والی بنا دیا۔ یہ ۲۱ ہجری کا واقعہ ہے۔ جنگ نہاوند بھی اسی سال پیش آئی تھی۔ اہل سیر نے اس جنگ میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی شرکت کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ یہ جنگ فی الحقیقت یزدجرد کی آخری کوشش تھی جو اس نے مسلمانوں کو ایران سے نکالنے کے لیے کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک آزمودہ کار ایرانی جرنیل مردان شاہ کی قیادت میں ڈیڑھ لاکھ فوج میدانِ جنگ میں جھونک دی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ایرانیوں کے اس جم غفیر کی اطلاع ملی تو انہوں نے خود ایرانیوں کے مقابلے پر جانا چاہا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مشورہ دیا کہ آپ کا مدینہ منورہ چھوڑنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کسی دوسرے افسر کی قیادت میں فوج روانہ کریں اور امرائے یمن، شام، کوفہ و بصرہ کے نام فرمان جاری کریں کہ وہ اپنی اپنی جمعیت (اپنی فوجوں کا کم از کم ایک ثلث) لے کر نہاوند کی طرف بڑھیں جہاں ایرانی لشکر نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ امیر المؤمنینؓ نے یہ مشورہ مان لیا اور حضرت نعمانؓ بن مقرن کو سپہ سالار مقرر کر کے نہاوند کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ علامہ بلاذریؒ نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ اس موقعے پر انہوں نے یہ ہدایت بھی کی کہ اگر لڑائی میں نعمانؓ بن مقرن شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ لشکر کی قیادت سنبھالیں گے۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو جریرؓ بن عبداللہ بجلی امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مغیرہؓ بن شعبہ سپہ سالار ہوں گے۔

اسلامی لشکر نے نہاوند سے چند میل دور اسپدہان کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اسی جگہ حضرت نعمانؓ بن مقرن کو مردان شاہ کا پیغام ملا کہ ہمارے ساتھ گفتگو کے لیے سفارت بھیجو۔ حضرت نعمانؓ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو سفیر بنا کر بھیجا کیونکہ اس سے پہلے وہ قادسیہ میں یہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دے چکے تھے۔ مردان شاہ نے ان کے آنے سے پہلے بڑی شان و شوکت سے دربار سجایا، خود تاج پہن کر طلائی تخت پر بیٹھا اور اس کے دائیں بائیں ملک ملک کے

امیر اور شہزادے پر تکلف لباس اور ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہن کر بیٹھے۔ ان کے پیچھے دُور دُور تک مسلح سپاہیوں کی صفیں کھڑی ہوگئیں، جن کی چمک دار برہنہ تلواروں سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ حضرت مغیرہؓ نہایت سادہ کپڑوں میں ملبوس سیدھے دربار میں گھستے ہوئے چلے گئے۔ راستہ میں درباریوں نے روکنا چاہا تو انہوں نے کہا، سفیروں سے ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ درباری راستے سے ہٹ گئے اور وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر مردان شاہ کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔

مردان شاہ نے مترجم کے ذریعے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا کہ تم عرب ہو اور عربوں سے زیادہ بھوکی ننگی، بدبخت اور ناپاک قوم روئے زمین پر نہیں ہے۔ یہ قدر انداز جو میرے تخت کے اردگرد کھڑے ہیں کب کا تمہارا فیصلہ کر دیتے لیکن تم لوگ اس قدر ذلیل ہو کہ میں نے ان کے تیر بھی تمہارے ناپاک خون میں آلودہ کرنا گوارا نہ کیے۔ اب بھی اگر تم یہاں سے واپس چلے جاؤ تو میں تم کو معاف کر دوں گا ورنہ تمہیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

حضرت مغیرہؓ مردان شاہ کی متکبرانہ تقریر سے مطلق مرعوب نہ ہوئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ بے شک ایک زمانہ میں ہم لوگ ایسے ہی ذلیل وحقیر تھے جیسا کہ تم نے بیان کیا لیکن نبیِ آخر الزمانؐ نے ہم میں مبعوث ہو کر ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی اور ہماری کایا پلٹ دی۔ اب ہر طرف ہمارے لیے میدان صاف ہے۔ ہم تمہارا ملک اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک میدانِ جنگ میں ہماری لاشیں نہ بچھ جائیں۔ غرض سفارت بے نتیجہ رہی اور فریقین میں خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ ایک روایت کے مطابق اس جنگ میں حضرت مغیرہؓ اسلامی لشکر کے میسرہ کے افسر تھے۔ اگرچہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت نعمانؓ بن مقرن لڑائی میں شہید ہوگئے لیکن مسلمانوں کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی اور انہوں نے ایرانیوں کو کمر توڑ شکست دی۔ اس لڑائی کے بعد ایرانیوں نے پھر کبھی زور نہیں پکڑا اس لیے عربوں نے اس فتح کا نام ''فتح الفتوح'' رکھا۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام ابولؤلؤ فیروز، جس کے ہاتھ سے حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت لکھی تھی اسی لڑائی میں گرفتار ہوا تھا۔ حضرت مغیرہؓ نے کچھ عرصہ بعد اسے دو درہم یومیہ خراج کی شرط پر آزاد کر دیا تھا۔ نہاوند کے بعد ایران پر عام لشکر کشی ہوئی۔ علامہ بلاذریؒ کے بیان کے مطابق ہمدان کی تسخیر کا کام حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے سپرد ہوا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ہمدان کا محاصرہ کر لیا۔ اہل ہمدان جلد ہی ہمت ہار بیٹھے اور صلح کی درخواست کی جو حضرت مغیرہؓ

نے منظور کر لی (بعض دوسرے مؤرّخین نے لکھا ہے کہ ہمدان حضرت نعیمؓ بن مقرن کے ہاتھ پر فتح ہوا۔)

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ۲۱ ہجری میں حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے کوفہ پہنچ کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں تو امیر المؤمنینؓ نے انہیں خط لکھا کہ شہر کے شاعروں کو بلا کر ان سے عہد جاہلی اور دور اسلام کا کلام سنو اور مجھے اس کی کیفیت لکھ بھیجو۔ یہ خط موصول ہونے پر حضرت مغیرہؓ نے تمام شاعروں کو جمع کیا۔ جب مشہور شاعر لبیدؓ بن ربیعہ کو اپنا کلام سنانے کے لیے کہا تو انہوں نے کہا، جب سے اللہ نے مجھے بقرہ اور آلِ عمران کی سورتیں عطا کی ہیں شعر و شاعری سے مجھے کوئی شغف نہیں رہا۔ اس کے بعد حضرت مغیرہ نے ایک دوسرے شاعر اغلب عجلی کو اپنا کلام سنانے کے لیے کہا تو اس نے کہا، رجز کے شعر سناؤں یا قصیدہ کے؟ میرے پاس ہر قسم کے اشعار موجود ہیں۔ دونوں شاعروں کے جواب سے حضرت عمر فاروقؓ کو مطلع کیا گیا تو انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو لکھا ''اغلب کی تنخواہ سے پانچ سو درہم کم کر کے لبیدؓ کی تنخواہ میں بڑھا دو۔'' اغلب کو امیر المؤمنین کے اس حکم سے سخت تکلیف ہوئی اور اس نے دربارِ خلافت میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ آپ نے تعمیل حکم کا خوب صلہ دیا کہ میری تنخواہ ہی کم کر ڈالی۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی اور حضرت مغیرہؓ کو لکھا کہ اغلب کی تنخواہ بحال کر دو البتہ لبیدؓ کی تنخواہ میں جو اضافہ کیا ہے اسے برقرار رکھو۔

(۶)

مؤرخین نے عام طور پر یہی لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو پہلے بصرہ اور پھر کوفہ کا والی بنایا تھا اور اس منصب پر وہ ان کی شہادت تک فائز تھے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک دفعہ انہیں بحرین کا گورنر بھی بنایا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ اہل بحرین بعض وجوہ کی بنا پر ان سے برگشتہ ہو گئے اور دربارِ خلافت میں ان کی شکایت کی۔ وہاں کے ایک زمین دار نے ایک لاکھ کی رقم جمع کر کے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ مغیرہؓ نے یہ رقم سرکاری محاصل سے خورد برد کر کے ہماری تحویل میں دی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت مغیرہؓ کو معزول کر دیا اور مدینہ منورہ بلا کر ان سے باز پرس کی۔ اہل بحرین نے حضرت

مغیرہؓ پر جو تہمت لگائی تھی وہ بالکل من گھڑت تھی لیکن انہوں نے ان کے خلاف کئی جھوٹے گواہ پیش کر دیے۔ حضرت مغیرہؓ بہت ذہین وفطین آدمی تھے وہ اپنے خلاف کی گئی سازش کی تہہ تک پہنچ گئے اور فوراً کہا، میں نے دو لاکھ جمع کیے تھے، ایک لاکھ اس زمین دار نے ہضم کر لیے۔ یہ سن کر زمین دار کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے حلف اٹھا کر اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے سارے معاملے کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حضرت مغیرہؓ کو بدنام کرنے کے لیے کیا گیا تھا اور ان کا دامن بالکل پاک وصاف ہے تاہم انہوں نے حضرت مغیرہؓ سے پوچھا کہ تم نے دو لاکھ کے غبن کا اقرار کیوں کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا، امیر المؤمنین ان لوگوں نے مجھ پر ناحق جھوٹی تہمت لگائی تھی۔ ان کے جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کے لیے میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

محرم ۲۴ ہجری کے آغاز میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے ابولؤلؤ فیروز کے لگائے ہوئے زخموں سے شہادت پائی اور حضرت عثمان ذوالنورین مسند نشین خلافت ہوئے۔ اس وقت حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کوفہ کے گورنر تھے۔ امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ نے ملکی نظم ونسق میں اس وقت کے حالات کے مطابق تبدیلیاں کیں اور مختلف صوبوں کے نئے گورنر مقرر کیے تو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتح عراق عرب (یکے از اصحاب عشرہ مبشرہ) کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ بعض ارباب سیر نے لکھا ہے کہ معزولی کے بعد حضرت مغیرہؓ ارمینیہ چلے گئے اور کچھ مدت وہاں گزار۔ نے کے بعد مدینہ منورہ واپس آئے۔ ارباب سیر نے یہ تصریح نہیں کی کہ حضرت مغیرہؓ ارمینیہ کس غرض سے گئے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فوج میں شامل ہو کر ارمینیہ گئے جو حضرت عثمانؓ نے اہل ارمینیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے خراج ادا کرنا بند کر دیا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو ارمینیہ کی مہم کا امیر بنایا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ حضرت مغیرہؓ بھی جہاد کے لیے ارمینیہ گئے اور مہم میں کامیابی کے بعد مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ اس کے بعد وہ حضرت عثمانؓ کے پورے عہد خلافت میں گوشہ نشین رہے، لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ مسجد میں گزارتے تھے۔ ۳۵ ہجری کے اواخر میں مفسدہ پردازوں نے امیر المؤمنین

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے مکان کا محاصرہ کرلیا اور اس میں بڑی سختی برتی۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اگرچہ دل و جان سے امیر المؤمنینؓ کے حامی تھے لیکن عملاً کچھ کرنے سے مجبور تھے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ اثنائے محاصرہ میں وہ ایک دن امیر المؤمنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''امیر المؤمنین آپ جمہور کے امام برحق ہیں اور آپ کو اس مشکل صورت حال کا سامنا ہے۔ میں اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تین باتیں پیش کرتا ہوں، ان میں سے ایک کو اختیار کیجیے، محاصرہ کرنے والوں سے جنگ کیجیے آپ کے حامیوں اور جاں نثاروں کی ایک طاقتور جماعت یہاں موجود ہے آپ ان کو لے کر نکلیے اور باغیوں کو بزور نکال باہر کیجیے۔ آپ حق پر ہیں اور محاصرین باطل پر۔ عام لوگ حق کا ساتھ دیں گے۔

اگر یہ منظور نہیں تو مکان کی دیوار توڑ کر دوسرا دروازہ نکلوایئے اور اس میں سے باہر نکل جایئے وہاں اونٹ آپ کو تیار ملیں گے ان پر بیٹھ کر مکہ معظمہ چلے جایئے وہاں یہ لوگ نہ لڑسکیں گے کہ آخر یہ حرم الٰہی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ شام چلے جایئے وہاں کے لوگ وفادار ہیں اور معاویہؓ موجود ہیں۔''

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

میں باہر نکل کر جنگ نہیں کرنا چاہتا اس سے امت میں خونریزی کی بنیاد پڑے گی اور میں اس کی بنیاد نہیں قائم کرنا چاہتا۔ اگر مکہ معظّمہ چلا جاؤں تو بھی اس کی امید نہیں کہ یہ لوگ حرم کعبہ کی توہین نہ کریں اور خونریزی سے باز آ جائیں اور میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق وہ شخص نہیں بننا چاہتا جو مکہ معظّمہ کی بے حرمتی کا باعث ہوگا۔ شام جانے میں مجھے یہ عذر ہے کہ میں دار الہجرۃ اور رسول اللہ ﷺ کے جوار کو چھوڑنا گوارا نہیں کرسکتا۔''

پاک نفس امیر المؤمنینؓ کا جواب سن کر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ خاموش ہو گئے لیکن افسوس کہ بدبخت باغیوں نے امیر المؤمنینؓ کی پاک نفسی اور خیر خواہیِ امت کی قدر نہ کی اور ۱۸ ذوالحج ۳۵ ہجری کو دیوار پھلانگ کر انہیں نہایت بے دردی سے شہید کر دیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۸

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سریرآرائے خلافت ہوئے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ شروع شروع میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے حامی اور طرفدار تھے۔ وہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت اخلاص کے ساتھ مشورہ دیا:

''اے امیر المؤمنین آپ کی اطاعت اور خیر خواہی مجھ پر فرض ہے اور آپ ہی لوگوں میں صاحب خیر وصلاح رہ گئے ہیں۔ حال سے مستقبل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آج کا کھونا کل کا کھونا ہے۔ معاویہؓ، عبداللہ بن عامرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دوسرے عمال کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھیے یہاں تک کہ آپ کو ان کی بیعت واطاعت حاصل ہوجائے تو پھر آپ جسے چاہیں معزول کردیں اور جسے چاہیں برقرار رکھیں۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت مغیرہؓ کا مشورہ قبول نہ کیا اور فرمایا:

''میں دین کے معاملے میں کسی مداہنت کا قائل نہیں۔''

اس پر حضرت مغیرہؓ نے کہا، ''اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو جسے چاہے معزول کردیجیے لیکن معاویہؓ کو شام کی امارت پر برقرار رکھیے کیونکہ وہ جری آدمی ہے اور اہل شام اس کی بات مانتے ہیں۔ اس کے برقرار رکھنے میں آپ کے پاس یہ دلیل ہوگی کہ عمرؓ بن خطاب نے اس کو شام کا والی بنایا تھا۔''

حضرت علیؓ نے فرمایا، ''نہیں، خدا کی قسم میں معاویہ کو دو دن بھی نہ رہنے دوں گا۔''

حضرت مغیرہؓ امیر المؤمنینؓ کا جواب سن کر خاموشی سے چلے گئے۔ ایک روایت کے مطابق دوسرے دن انہوں نے حضرت علیؓ کے رجحان کے مطابق اپنی رائے ظاہر کی لیکن ذاتی طور پر ان کو وہی بات پسند تھی، جس کا اظہار انہوں نے پہلے دن امیر المؤمنینؓ کے سامنے کیا تھا چونکہ ان کو حضرت علیؓ کی حکمت عملی سے اتفاق نہ تھا اس لیے خاموشی سے مکہ معظّمہ چلے گئے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے طائف جا کر مقیم ہوگئے۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا عہد خلافت (۳۵ ہجری تا ۴۰ ہجری) بالکل الگ تھلگ رہ کر گزارا۔ نہ کسی فریق کی طرف سے جنگ جمل میں شریک ہوئے اور نہ جنگ صفین میں۔

ابوحنیفہ دینوری نے ''الاخبار الطّوال'' میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان معاہدۂ تحکیم طے پایا اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (حضرت علیؓ کے حکم) اور حضرت عمروؓ بن العاص (امیر معاویہؓ کے حکم) دومۃ الجندل میں یکجا ہوئے تو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ طائف سے دومۃ الجندل پہنچے اور حکموں کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ جب فیصلے میں دیر ہوئی تو وہ دومۃ الجندل سے دمشق گئے اور امیر معاویہؓ سے ملاقات کی۔ امیر معاویہؓ نے ان سے کہا، آپ اپنی رائے کے مطابق مجھے مشورہ دیں۔

حضرت مغیرہؓ نے کہا۔ ''اگر میں آپ کو مشورہ دینے والا ہوتا تو آپ کے ہمراہ ہو کر جنگ کیوں نہ کرتا البتہ دونوں حکموں کا جو حال ہے وہ آپ جاننا چاہیں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔''

امیر معاویہؓ نے کہا، ''ضرور بتایئے۔''

حضرت مغیرہؓ بولے: ''میں ابوموسیٰ اشعریؓ سے تخلیہ میں ملا اور ان سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو غیر جانبدار رہا اور خونریزی سے متنفر ہونے کے باعث گھر میں بیٹھا رہا۔''

انہوں نے جواب دیا، ''ایسے اشخاص بہترین انسان ہیں ان کی پیٹھ پر اپنے بھائیوں کے خون کا بوجھ نہیں اور ان کے پیٹ اپنے بھائیوں کے اموال سے گراں بار نہیں۔''

پھر میں عمروؓ بن العاص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، جو ان لڑائیوں سے کنارہ کش رہا۔''

انہوں نے جواب دیا: ''ایسے افراد بدترین انسان ہیں نہ حق کے حامی نہ باطل کے حریف۔''

میرا خیال تو یہ ہے کہ ابوموسیٰؓ اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) کو خلافت سے دستبردار ہونے کے لیے کہیں گے اور کسی ایسے شخص کو خلافت کے لیے نامزد کریں گے، جو ان جنگوں میں شریک نہ تھا۔ شاید وہ عبداللہ بن عمرؓ کو نامزد کر دیں۔ رہے عمروؓ بن العاص تو ہوسکتا کہ وہ اپنے آپ کو یا اپنے بیٹے عبداللہؓ کو خلافت کا حقدار قرار دیں۔

امیر معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کی باتوں کا خاص اثر لیا اور ان کی اصابت رائے کے قائل

ہوگئے لیکن وہ ایک بردبار اور صاحب تدبیر شخص تھے اس موقع پر انہوں نے معاہدۂ تحکیم میں کوئی تبدیلی کرنا مناسب نہ سمجھا اور حضرت عمروؓ بن العاص کو حسب معاہدہ اپنا حکم بنائے رکھا۔ افسوس کہ تحکیم کا کوئی تسلی بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا اور حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی باہمی آویزش بدستور جاری رہی۔ ۴۰ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں جام شہادت پیا۔ ان کے بعد سیدنا حضرت حسنؓ مسند خلافت پر بیٹھے لیکن چھ ماہ کے بعد حالات سے مجبور ہو کر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اس طرح ۴۱ ہجری میں امیر معاویہؓ تمام عالم اسلام کے بلاشرکت غیرے فرمانروا ہو گئے۔

(۹)

حضرت امیر معاویہؓ بڑے مردم شناس اور دوراندیش حکمراں تھے۔ مسند خلافت پر بیٹھ کر انہیں مختلف صوبوں کے لیے بااثر اور صاحب تدبیر حکام کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے ایسے اصحاب کو منتخب کیا جو فہم و فراست اور تدبیر و سیاست کے اعتبار سے اپنا جواب تھے۔ ان کو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی صلاحیتوں کا بخوبی علم تھا۔ اس لیے انہیں کوفہ کے اہم صوبہ کا گورنر مقرر کیا۔ امارت کوفہ پر فائز ہو کر حضرت مغیرہؓ نے اپنی ذمہ داریوں کو نہایت حسن و خوبی سے پورا کیا اور اپنے ناخن تدبیر سے کئی اہم گتھیوں کو سلجھایا۔ سب سے پہلے انہیں شبیب بن بجرہ خارجی کے فتنہ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو شہید کرنے کی سازش میں شریک تھا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد وہ امیر معاویہؓ کے پاس گیا اور کہا کہ میں نے اور ابن ملجم نے مل کر حضرت علیؓ کو قتل کیا ہے اس لیے میں انعام و اکرام کا مستحق ہوں۔ امیر معاویہؓ اس کی بات سن کر گھر چلے گئے اور قبیلہ اشجع کو کہلا بھیجا کہ شبیب کو فوراً شہر سے نکال دو ورنہ تمہاری خیر نہیں ہے۔ (اس وقت امیر معاویہؓ کوفہ میں مقیم تھے)۔ شبیب کے کانوں میں امیر معاویہؓ کے حکم کی بھنک پڑ گئی اور وہ روپوش ہو گیا۔ اب اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو اپنی قیام گاہ سے نکلتا اور جو سامنے آتا اسے قتل کر کے بھاگ جاتا۔ حضرت مغیرہؓ نے امارتِ کوفہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہی خالد بن عرفطہ کو سواروں کا ایک دستہ دے کر شبیب کی سرکوبی پر مامور کیا۔ خالد شبیب اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے زبردست مقابلہ کیا لیکن ایک ایک کر کے سب مارے گئے۔

امارت کوفہ کے دوران میں حضرت مغیرہؓ کا ایک بڑا کارنامہ زیاد بن ابیہ کو امیر معاویہؓ کے حلقۂ اطاعت میں لانا ہے۔ زیاد کا شمار مدبرین عرب میں ہوتا تھا۔ وہ امیر معاویہؓ کا سخت مخالف تھا اور حضرت علیؓ کی طرف سے فارس کا والی تھا۔ سیدنا حضرت حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد گو امیر معاویہؓ سارے عالم اسلام کے خلیفہ ہو گئے تھے لیکن زیاد نے ان کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے بسبن ارطاۃ کو اس کے مطیع کرنے پر مامور کیا، لیکن اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب امیر معاویہؓ اس کی طرف سے بہت فکرمند ہو گئے۔ ایک دفعہ حضرت مغیرہؓ ان سے ملنے دمشق آئے تو امیر معاویہؓ نے زیاد کی طرف سے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔

حضرت مغیرہؓ نے کہا، زیاد کو ہموار کرنے کا کام مجھ پر چھوڑ دیجیے۔

اس کے بعد وہ زیاد کے پاس گئے اور اس کو سمجھایا کہ حضرت حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد تمام عالم اسلام نے امیر معاویہؓ کی خلافت تسلیم کر لی ہے۔ اب تمہارا ان کے حلقۂ اطاعت سے باہر رہنا کسی صورت میں قرین مصلحت نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم ان سے مصالحت کر لو وہ یقیناً تمہارے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں گے۔

زیاد نے حضرت مغیرہؓ کا مشورہ قبول کر لیا اور ان سے کہا کہ امیر معاویہؓ اس کو تحریری امن نامہ بھیج دیں تو وہ اُن کے پاس حاضر ہو جائے گا۔ حضرت مغیرہؓ نے امیر معاویہؓ کے پاس جا کر زیاد سے اپنی ملاقات کا حال بتایا۔ انہوں نے فوراً اس کو امان نامہ لکھ کر بھیج دیا۔ زیاد یہ امان نامہ ملتے ہی امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان کی بیعت کر لی۔ پھر ان سے کوفہ میں رہنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دے دی مگر حضرت مغیرہؓ کو لکھ بھیجا کہ زیاد اور حضرت علیؓ کے دوسرے حامیوں حجر بن عدی سلیمانؓ بن صرد الخزاعی، شیث بن ربعی وغیرہ کی نگرانی رکھیں۔ یہ واقعہ ۴۲ ہجری کا ہے۔

حضرت مغیرہؓ ۴۱ ہجری میں کوفہ کے امیر ہو کر آئے تو اہل کوفہ تین گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔

۱- حامیان بنوامیہ : یہ لوگ صدق دل سے امیر معاویہؓ کے وفادار تھے۔

۲- شیعان علیؓ : یہ لوگ خلافت کا حق حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے لیے مخصوص سمجھتے تھے۔ حضرت معاویہؓ تو ان کے نزدیک جائز

خلیفہ نہیں تھے لیکن مصلحت وقت کے تحت انہوں نے گردن اطاعت خم کر لی تھی۔

۳-خوارج : یہ لوگ بنی امیہ اور شیعان علیؓ دونوں کے مخالف تھے اور ان کو دین سے خارج سمجھتے تھے۔

حضرت مغیرہؓ نے کوفہ پہنچ کر رفق و ملاطفت کی حکمت عملی اختیار کی۔ وہ کسی شخص سے اس کے عقیدے یا سیاسی خیالات اور رجحان کی بنا پر کوئی تعرض نہ کرتے تھے البتہ کوئی شخص امن و امان میں خلل ڈالنے کی کوشش کرتا تو اس کو روکنے کی پوری کوشش کرتے۔ لوگ ان سے آ کر کہتے کہ فلاں شخص خارجی عقیدہ رکھتا ہے یا شیعی خیال کا ہے تو وہ جواب دیتے ''یہ تقدیر الٰہی ہے کہ اس کے بندوں کے خیالات میں اختلاف ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات کا خود فیصلہ کرے گا۔''

حضرت مغیرہؓ کی نرم اور مرنجاں مرنج روش کے باوجود خوارج چین سے نہ بیٹھے اور انہوں نے ۴۳ ہجری میں مستورد بن علقمہ کی سرکردگی میں بڑا سخت فتنہ برپا کیا۔ مؤرّخین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ حیان بن ظبیان کے مکان پر جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ عید الفطر (۴۳ ہجری) کے دن حکومت کے خلاف لڑائی کا آغاز کیا جائے۔ حضرت مغیرہؓ کو ان کے منصوبے کا علم ہوا تو ان کے حکم سے حیان بن ظبیان کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مستورد اور اس کے کچھ ساتھی بچ کر نکل گئے اور باقی گرفتار ہو گئے۔

مستورد نے کوفہ سے نکل کر اپنے حامیوں کو جمع کیا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ حضرت مغیرہؓ نے اہل کوفہ کو جمع کر کے خوارج کے خلاف پُر زور تقریر کی اور ان سے اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے مدد چاہی۔ پھر انہوں نے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ شیعان علیؓ خوارج کا قلع قمع کرنے میں سب سے زیادہ سرگرم ہو گئے اور انہوں نے متعدد معرکوں کے بعد مستورد اور اس کے بیشتر ساتھیوں کو ہلاک کر کے اس فتنے کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

حضرت حجرؓ بن عدی کوفہ کے بااثر حامیان علیؓ میں سے تھے۔ ان کی بے باکانہ روش حضرت مغیرہؓ کے لیے پریشانی کا باعث تو بنی لیکن انہوں نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا۔ ایک دن وہ خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حجرؓ بن عدی دورانِ خطبہ میں کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند کہا:

''اے شخص تو نے ہمارے وظیفے بند کر دیے ہیں۔ تجھے اس کا حق نہ تھا تو ہمارے وظیفے جاری کر اور علیؓ کے خلاف کوئی بات نہ کر۔''

اس پر دو تہائی نمازی کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، حجر نے ٹھیک کہا، ہمارے وظیفے جاری کرو۔

حضرت مغیرہؓ خاموشی سے منبر سے اتر آئے۔ ان کا یہ طرزِ عمل ان کے ساتھیوں کو پسند نہ آیا۔ انہوں نے ان سے کہا کہ آپ کی نرمی سے حجرؓ بن عدی بہت دلیر ہو گئے ہیں۔ اس قسم کی نرمی سے حکومت کا رعب زائل ہو جائے گا۔ امیر المؤمنین کو آپ کی حد سے زیادہ کریمانہ روش کا علم ہوا تو وہ بھی اسے ناپسند کریں گے۔

حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا۔ ''تم سمجھتے نہیں، میں نے تو حجر کو قتل کر دیا ہے۔ میری نرمی سے وہ حکومت کی مخالفت پر جری ہو گئے ہیں۔ میرے بعد جو امیر آئے گا اس کے زمانے میں بھی وہ یہی رویہ اختیار کریں گے اور وہ ان کو قتل کرائے بغیر نہ چھوڑے گا۔ میں اپنے ہاتھ حجر اور ان کے ساتھیوں کے خون سے آلودہ کر کے انہیں سعید اور اپنے آپ کو شقی نہیں بنانا چاہتا۔''

اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ کوفہ میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ حضرت مغیرہؓ بھی اس میں مبتلا ہوئے اور پیک اجل کو لبیک کہا (۵۰ ہجری)۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین بیٹے چھوڑے عروہؒ حمزہؒ اور عقارؒ۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں ان کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

سر بڑا، لمبے بازو، سینہ اور شانے کشادہ۔ لب پیوستہ، بال بھورے

۱۰

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا شمار ان اصحابؓ رسول اللہ ﷺ میں ہوتا ہے، جن کی ذہانت و فطانت اور تدبیر و سیاست کا سبھی موافق و مخالف اربابِ سیر و تاریخ نے اعتراف کیا ہے۔ عقل و دانش کے اعتبار سے وہ دُھاۃِ عرب کی صف کے آدمی تھے اور اپنے غیر معمولی دل و دماغ کی بدولت ''مغیرۃ الرائے'' کے نام سے مشہور تھے۔

''مستدرک حاکم'' میں ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو

سلجھانے میں وہ بڑی صلاحیت رکھتے تھے۔ جب کسی معاملے میں کوئی رائے قائم کرتے تو وہی درست ثابت ہوتی۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں قبیصہ بن جابر کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں طویل مدت تک مغیرہؓ کے ساتھ رہا میں نے ان کو اتنا زیرک اور صاحب تدبیر پایا کہ اگر کسی شہر کے اس قسم کے آٹھ دروازے ہوتے کہ ان میں کسی ایک دروازے سے بھی ہنرمندی اور ہوشیاری کے بغیر گزرنا محال ہوتا تو مغیرہؓ آٹھوں دروازوں سے نکل جاتے۔

بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ اپنی امارتِ کوفہ کے دوران میں وہ ایک مرتبہ دمشق گئے تو امیر معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں جو اختلاف اور خون خرابے ہوئے ان سے کوئی ناواقف نہیں ہے۔ اب مناسب یہ ہے کہ آپ اپنے فرزند یزید کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین نامزد کر دیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو وہ مسلمانوں کے لیے پشت و پناہ ثابت ہو اور امر خلافت میں اختلاف اور فساد و خونریزی کا امکان نہ رہے۔

امیر معاویہؓ نے اس وقت تو یہ مشورہ قبول کرنے میں تامل کیا لیکن چند سال بعد (جب مغیرہؓ وفات پا چکے تھے) انہوں نے اسی کے مطابق عمل کیا۔

بعض مؤرخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امیر معاویہؓ حضرت مغیرہؓ کو بعض وجوہ کی بنا پر کوفہ کی امارت سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ حضرت مغیرہؓ کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے معزولی سے بچنے کے لیے دمشق جا کر حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا اور ساتھ ہی اہل کوفہ کو اس کے حق میں ہموار کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ بلاشبہ یہ اس معاملے کا تاریک پہلو ہے لیکن اس کا روشن پہلو بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضرت مغیرہؓ نیک نیتی سے سمجھتے تھے کہ اس وقت عالم اسلام کا اتحاد دمشق کی مرکزی قوت کو برقرار رکھنے ہی سے قائم رہ سکتا ہے اگر امیر معاویہؓ یکا یک وفات پا جائیں تو ان کی جانشینی کے سوال پر جھگڑے اور خونریزی کا قوی امکان ہے، جس سے مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ ہو سکتی ہے۔ بہر صورت انہوں نے اپنی صوابدید کے مطابق نیک نیتی سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ یہ مشورہ غلط تھا یا صحیح یہ ایک الگ بحث ہے اور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

حضرت مغیرہؓ نو سال تک کوفہ کے والی رہے اس دوران میں انہوں نے ہمیشہ نرمی اور

صلح و آشتی کا طرز عمل اختیار کیا۔ خوارج کے خلاف صرف اسی وقت ہتھیار اٹھائے جب انہوں نے امن وامان کو درہم برہم کیا۔

حضرت حجرؓ بن عدی علانیہ حکومت کے مخالف تھےلیکن ان کی مخالفت صرف باتوں تک محدود تھی اس لیے حضرت مغیرہؓ نے ان پر کوئی سختی نہ کی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ تاہم انہوں نے حضرت حجرؓ کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد کوفہ بھی زیاد والیِ بصرہ کے ماتحت کر دیا گیا تو زیاد نے حضرت حجرؓ بن عدی کو گرفتار کر کے دمشق بھیج دیا جہاں انہیں قتل کرا دیا گیا۔

اپنی امارت کوفہ کے زمانے میں حضرت مغیرہؓ خود کہا کرتے تھے کہ میں اہل کوفہ کے خون سے ہاتھ رنگ کر انہیں سعید اور اپنی ذات کو شقی نہیں بنانا چاہتا۔ میں نکوکار کو اچھا بدلہ دوں گا اور غلط کار سے درگزر کروں گا۔ اچھی بات کرنے والے کی تعریف کروں گا اور نادان کو سمجھاؤں گا یہاں تک کہ قضا کا تیر میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے۔ اہل کوفہ کو میرے بعد جب کسی دوسرے حاکم سے واسطہ پڑے گا تو میں ان کو بہت یاد آؤں گا۔

کوفہ کے ایک شیخ نے ان کی وفات کے بعد کہا، خدا کی قسم ہم نے انہیں آزمایا تو انہیں بہترین امیر پایا، وہ نکوکار کے مداح، خطا کار کو معاف کرنے والے اور عذر خواہ کے عذر کو قبول کر لینے والے تھے۔

امام شعبیؒ فرماتے تھے کہ مغیرہؓ بن شعبہ کے بعد ان جیسا کوئی والی نہ آیا وہ سلف صالحین کا بقیہ تھے۔

۱۱

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ صرف ایک مجاہد اور مدبر ہی نہیں تھے بلکہ علم وفضل کے اعتبار سے بھی بڑے بلند رتبہ پر فائز تھے ان سے ۱۳۳/ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ۹ متفق علیہ ہیں۔ ایک میں بخاری اور ۲ میں مسلم منفرد ہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں فرزندوں کے علاوہ حضرت مسورؓ بن مخرمہ، قیس بن ابی حازمؒ، عروہؒ بن زبیرؒ اور مسروق بن اجدعؒ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے مروی چند احادیث بطور تبرک یہاں درج کی جاتی ہیں:

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا ہے، ماؤں کی نافرمانی کرنا، واجب الاداحقوق کو ادا نہ کرنا، جو اپنا حق نہ ہو لوگوں سے طلب کرنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑنا اور ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے فضول گفتگو کرنا اور بہت سوال کرنا اور مال ضائع کرنا۔ (صحیح بخاری)

☆ رسول اللہ ﷺ نے رات کو اس قدر طویل قیام کیا کہ آپؐ کے پاؤں پر ورم ہوگیا۔ صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جب کہ آپ کی اگلی پچھلی سب تقصیریں معاف ہوگئی ہیں۔ (آپؐ کی اللہ تعالیٰ نے مغفرت کردی ہے) آپؐ نے فرمایا، کیا میں زیادہ شکرگزار بندہ نہ بنوں۔ (صحیحین)

☆ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خاص اس دن جس دن آپؐ کے صاحب زادے ابراہیمؑ کا انتقال ہوا، سورج کو گہن لگا تو بعض لوگوں نے کہا کہ سورج کو یہ گہن ابراہیمؑ کے انتقال کر جانے کی وجہ سے لگا ہے۔ رسول اللہ ﷺ (کے سمع اقدس تک یہ بات پہنچی تو آپؐ) نے فرمایا، سورج اور چاند کو گہن کسی کی موت وحیات کی وجہ سے نہیں لگتا (بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کی نشانیوں میں سے ہے) پس جب تم ایسا دیکھو تو اللہ کے حضور میں نماز پڑھو اور اس سے خوب دعا کرو۔ (صحیحین)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن صراط (پل) پر اہل ایمان کا شعار (ان کا امتیازی وظیفہ) یہ دعائیہ کلمہ ہوگا رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (اے ہمارے پروردگار ہمیں سلامت رکھ اور سلامتی کے ساتھ پار لگا) (ترمذی)

☆ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو یوں فرماتے

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ط اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَاالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔

کوئی خدا نہیں مگر اللہ وہی اکیلا خدا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے ساری خوبیاں ہیں اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ اے اللہ اگر تو عنایت کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور تو روکنا چاہے تو کوئی کچھ نہیں دے سکتا

اور تیرے مقابلہ میں کسی مرتبہ اور منصب والے کو اس کا مرتبہ اور منصب کوئی فائدہ نہیں دے سکتا) (صحیحین)

☆ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ تبوک میں شرکت کی۔ ایک روز آپؐ فجر سے پہلے رفع حاجت کے لیے گئے۔ میں آپؐ کے لیے پانی کی چھاگل لے گیا۔ جب آپؐ واپس آئے تو میں نے آپؐ کے ہاتھوں پر چھاگل سے پانی ڈالنا شروع کیا۔ پس آپؐ نے دونوں ہاتھوں اور منہ کو دھویا۔ اس وقت آپؐ صوف کا جبہ پہنے ہوئے تھے۔ آپؐ نے جبہ کی آستینوں کو چڑھا کر ہاتھوں کو نکالنا چاہا لیکن آستینیں تنگ تھیں پس آپؐ نے جبہ کے اندر سے ہاتھ نکال لیے اور جبہ کو مونڈھوں پر ڈال لیا اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھویا پھر آپؐ نے پیشانی پر اور عمامہ پر مسح کیا۔ پس میں نے آپؐ کے پاؤں سے موزے نکالنے کا ارادہ کیا تا کہ آپؐ پاؤں کو دھوئیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ موزوں کو چھوڑ و کیونکہ میں نے ان کو پاکیزگی کی حالت میں (پاؤں دھوکر) پہنا ہے۔ پس آپؐ نے دونوں موزوں پر مسح کیا۔ پھر آپؐ سوار ہوئے اور میں بھی سوار ہوا۔ ہم اپنی قوم (مجاہدین) میں پہنچے تو وہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف ان کو نماز پڑھا رہے تھے اور ایک رکعت وہ پڑھا چکے تھے۔ ان کو جب رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو انہوں نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا لیکن آپؐ نے ان کو (اپنی جگہ قائم رہنے کا) اشارہ کیا۔ پس آپؐ نے ان کے پیچھے ایک رکعت نماز پڑھی پھر جب انہوں نے سلام پھیرا تو آپؐ کھڑے ہو گئے اور میں بھی آپؐ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور جو رکعت رہ گئی تھی ہم نے اس کو پورا کیا۔ (صحیح مسلم)

☆ قبولِ اسلام سے پہلے میں ایک دفعہ قبیلہ بنو مالک کے ساتھ مقوقس (شاہ مصر) کے پاس گیا۔ اس نے ہم سے پوچھا، کیا تم نے محمد (ﷺ) کی باتوں پر عمل کیا۔ ہم نے کہا، ہم میں سے تو کسی نے ان کی بات نہیں مانی۔ اس نے کہا ''کیوں؟''

ہم نے کہا۔ ''اس لیے کہ وہ ایک ایسا انوکھا دین لے کر آئے ہیں، جس کو نہ ہمارے بڑوں نے مانا نہ ملک اس کو مانتا ہے اور ہم تو اپنے بڑوں ہی کے دین پر قائم ہیں۔''

اس نے پوچھا کہ اچھا تو اس کی قوم کے لوگوں نے کیا کیا؟

ہم نے کہا۔ ''نوجوانوں نے تو اس کو مان لیا ہے، جو مخالف تھے انہوں نے آپؐ سے جنگ کی۔ نتیجہ میں کبھی ان کو شکست ہوئی کبھی آپؐ کو۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ وہ کن باتوں کی دعوت دیتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''اس کی کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، جس کا کوئی شریک نہیں اور جن بتوں کی ہمارے بزرگ عبادت کرتے آئے ہیں ان کو فوراً چھوڑ دیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔''

اس نے کہا۔ ''نماز اور زکوٰۃ کیا چیز ہے؟ کیا اس کا کوئی وقت مقرر ہے، جس کو لوگ جانتے ہوں اور کوئی مقرر عدد بھی ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''وہ دن رات میں پانچ نمازیں پڑھتے ہیں اور ان کا الگ الگ وقت مقرر ہے۔'' پھر ہم نے زکوٰۃ وصدقہ کی تفصیل بتائی۔

مقوقس نے پوچھا۔ ''یہ زکوٰۃ وصدقہ لوگوں سے وصول کر کے وہ کہاں خرچ کرتے ہیں؟''

ہم نے کہا۔ ''جن کے مالداروں سے وصول کرتے ہیں انہی کے فقیروں پر تقسیم کر دیتے ہیں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور عہد پورا کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ زنا اور شراب کو حرام قرار دیتے ہیں اور بجز اللہ کے نام کے کسی اور کے نام کا ذبیحہ نہیں کھاتے۔

یہ سن کر مقوقس نے کہا ''خوب سن لو کہ یہ اللہ کے برحق نبی ہیں، جن کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اگر وہ مصر اور روم کے پاس بھی پہنچیں گے تو لوگ ان کا اتباع کریں گے کیونکہ عیسیٰؑ بن مریمؑ بھی ان کے اتباع کا حکم دے گئے ہیں اور جو جو باتیں تم لوگ بیان کر رہے ہو ان ہی سب باتوں کو لے کر پہلے انبیاءؑ بھی مبعوث ہوئے ہیں۔ یقین رکھو کہ نتیجہ ان ہی کے موافق نکلے گا یہاں تک کہ کسی کو یہ طاقت نہ ہوگی کہ ان کا مقابلہ کر سکے۔ خشکی وتری کے آخری حصوں تک ان کا غلبہ ہو جائے گا۔'' مگر یہ سب کچھ سن سنا کر ہم نے کہا:

''اگر سب لوگ بھی ان کے ساتھی ہو جائیں ہم پھر بھی ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔''

یہ سن کر مقوقس نے ناگواری سے سر ہلایا اور کہا، تم لوگ بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ اس کے بعد اُس نے پوچھا:

''اپنی قوم میں اس کا خاندان کیسا ہے؟''

ہم نے جواب دیا۔ ''سب سے بہتر''

اس نے کہا: ''اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے خاندان بھی بہترین تھے۔''

پھر اس نے پوچھا: ''اس کی راست گوئی کی کیا کیفیت ہے؟''

ہم نے جواب دیا'' وہ اپنی راست گوئی کی وجہ سے اپنی قوم میں'' امین'' کے لقب سے مشہور ہے۔''

اس نے کہا'' اب تم ہی غور کرلو کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ جو شخص باہمی معاملات میں راستباز ہو وہ اللہ کی ذات پر جھوٹ بول سکتا ہے۔''

پھر اس نے پوچھا: ''یثرب کے یہودیوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کیونکہ وہ لوگ توریت کے ماننے اور جاننے والے ہیں۔''

ہم نے کہا۔'' انہوں نے تو اس کی مخالفت کی ہے اور اس وجہ سے انہوں نے سزا بھی پائی ہے۔ بعض قتل کیے گئے ہیں اور بعض کو یثرب سے نکال دیا گیا ہے۔''

مقوقس نے کہا۔'' یہ لوگ تو ہمیشہ سے بڑے حاسد ہیں انہوں نے اس پر بھی حسد کیا ہے ورنہ یہ لوگ اس کی صداقت کو پہچانتے ہیں۔''

ہم مقوقس سے ایسی باتیں سن کر دربار سے اٹھے تو ہمارے حوصلے محمد (ﷺ) کے سامنے پست ہو گئے اور ہم نے دل میں کہا کیا غضب ہے کہ شاہانِ عجم تو اس کے ساتھ نسب اور رشتے کا دور کا تعلق بھی نہ رکھتے ہوئے اس کی تصدیق کریں اور اس سے خوف کھائیں اور ہم اس کے عزیز واقارب اور پڑوسی ہوتے ہوئے بھی اس کا دین قبول نہ کریں۔ بالخصوص جب کہ وہ خدا کا داعی بن کر ہمارے گھروں میں خود آیا ہے۔

اس واقعے کے بعد میں اسکندریہ گیا اور ایک ایک گرجے میں جا کر وہاں کے پادریوں سے خواہ وہ مصری تھے یا رومی، ان علامات کی تحقیق کی جو یہ لوگ محمد (ﷺ) کے متعلق کتب سابقہ میں دیکھتے چلے آئے تھے ان میں ایک مصری پادری تھا جو کنیسہ یوحنّس میں سب سے بڑا سردار سمجھا جاتا تھا میں نے اس سے بڑھ کر کوئی عابد و زاہد شخص نہیں دیکھا لوگ اپنے مریضوں کو لے کر اس کے پاس آیا کرتے تھے اور وہ ان کی صحت کے لیے دعا کیا کرتا تھا، میں اس کی خدمت میں پہنچا اور اس سے پوچھا، کیا انبیاء (علیہم السلام) میں کوئی ایسا نبی رہ گیا ہے، جس کی آمد ابھی باقی

ہو۔ وہ بولا، ہاں ایک نبی باقی ہے اور وہی آخری نبی ہے اس کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان اور کوئی نبی نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کا اتباع کرنے کا ہم کو حکم دیا ہے۔ وہ ایسا نبی ہے، جس نے کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی، عرب کا رہنے والا ہے۔ نام اس کا احمدؐ ہے، نہ حد سے زیادہ دراز قامت نہ کوتاہ قامت اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ہیں نہ چونے جیسا سفید رنگ نہ بالکل گندم گوں، زلفیں رکھنے والا، موٹا جھوٹا سادہ لباس پہننے والا، بچا کھچا کھا لینے والا، جہاد کے لیے تیار، اپنے مقابل دشمن کی پروانہ کرنے والا، جنگ میں خود شریک ہونے والا، اس کے ساتھی سو جان سے اس پر قربان، اپنی اولاد اور والدین سے زیادہ اس پر شفیق۔ ایک حرم سے نکل کر دوسرے حرم کی طرف ہجرت کرنے والا، جس میں زمین کا ایک حصہ شوء اور دوسرے میں کھجور کے باغ اور حضرت ابراہیمؑ کے دین پر اس کا دین۔ پنڈلیوں تک تہہ بند باندھنے والا، اپنے ہاتھ پیر اور چہرے کو دھونے والا اور ایک ایسی خصوصیت کا مالک، جو اس سے قبل انبیاء علیہم السلام میں نہ تھی یعنی ہر نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہو کر آیا اور وہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوگا۔ تمام زمین اس کے لیے مسجد اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دی جائے گی یعنی جس جگہ بھی نماز کا وقت ہو جائے گا اسی جگہ (اگر پانی نہ ہو تو) تیمّم کر کے نماز ادا کر لے گا اس سے قبل انبیاء پر اس بارے میں تنگی تھی وہ گرجوں اور دوسری عبادت گاہوں کے سوا کسی اور جگہ نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے اس قسم کی باتیں اس پادری کی زبانی اور دوسروں کی زبانی بھی سنیں تو مجھے اسلام کی حقانیت پر یقین آ گیا۔ میں مدینہ منورہ جا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو گیا۔ حضورؐ کی خدمت میں تمام واقعات بیان کیے تو آپؐ کو بہت پسند آئے اور آپؐ نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ دوسرے لوگوں کو بھی ان سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ میں اس حدیث کو (وقتاً فوقتاً) صحابہؓ کرام کے سامنے بیان کرتا تھا۔''

(ترجمان السنہ جلد سوم مولانا بدر عالم میرٹھی بحوالہ محمد بن عمر الواقدی)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ہشام بن عاص سہمیؓ

۱

بنو سہم کا رئیس عاص بن وائل (بن ہاشم بن سعید بن سہم بن عمرو بن ہصین بن کعب بن لُؤی) اپنے مال و دولت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے قریش مکہ میں ممتاز مقام رکھتا تھا اور پھر فصل مقدمات کا عہدہ بھی اسی کے پاس تھا، جس نے اس کا دماغ آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ بظاہر تو یہ شخص بڑا زیرک اور معاملہ فہم معلوم ہوتا تھا لیکن جب سرورِ عالم ﷺ نے اہل مکہ کو توحید کی دعوت دی تو اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ خود قبولِ حق سے انکار کر دیا بلکہ دوسروں کو بھی دعوتِ حق قبول کرنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ یہی وہ بد باطن تھا، جس نے قرآنی آیات کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا، یوم آخرت اور جزا و سزا کا مذاق اڑایا اور خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ پر بدیں الفاظ ابتر ہونے کی پھبتی کسی:

''اجی انہیں چھوڑو، وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں۔ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ مرجائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا۔''

عاص بن وائل کی بدبختی کہ وہ اخیر دم تک ہدایت سے محروم رہا لیکن خالق حقیقی کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ اسی بدنصیب کے دو فرزندوں ہشامؓ اور عمروؓ نے نہ صرف قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا بلکہ لسانِ رسالت سے مؤمن کا خطاب بھی حاصل کیا۔

۲

حضرت ابومعیط ہشامؓ اپنے بھائی عمرو بن العاصؓ سے عمر میں چھوٹے تھے مگر ان کا نصیبہ بڑے بھائی سے زیادہ یاور تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ تو غزوۂ احزاب ۵ ہجری کے بعد ایمان لائے لیکن حضرت ہشامؓ نے ہر قسم کے خطرات کے علی الرَّغم بعثت نبوی کے بالکل ابتدائی

زمانے میں دعوتِ توحید پر لبیک کہا اور یوں اس مقدس جماعت کے رکن بن گئے، جسے اللہ تعالیٰ نے السابقون الاوّلون کہہ کر کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت دی ہے۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت ہشامؓ بن عاص ان ۱۳۳ نفوسِ قدسی میں سے تھے، جو دعوت توحید کے ابتدائی تین سالوں کے اندر سعادت اندوز اسلام ہوئے۔ یہ تین سال رازدارانہ تبلیغ کے تھے اس لیے مشرکین نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہ کیا البتہ بعثت نبوی کے اڑھائی سال بعد مشرکین کے ایک گروہ نے چند مسلمانوں کو ایک سنسان گھاٹی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو انہوں نے دوسرے مشرکین کو اہل حق کے خلاف مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ حالات کوئی سنگین صورت اختیار کرتے، سرور عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ دارِ ارقم میں منتقل ہو گئے۔ چوتھے سال نبوت کے آغاز میں فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْن (احکام الٰہی برملا سنایئے اور مشرکین کی مخالفت کی پروانہ کیجیے) کا حکم خداوندی نازل ہوا تو حضورؐ نے دعوتِ توحید کو آشکار کر دیا اور علانیہ لوگوں کو حق کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرکین کے قہر و غضب کا آتش فشاں پوری قوت سے پھٹ پڑا اور انہوں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ حضرت ہشامؓ کو بھی ان کے والدین اور دوسرے اہل خاندان نے نشانۂ ستم بنالیا۔ وہ کئی سال تک طرح طرح کی سختیاں جھیلتے رہے لیکن انہوں نے جادۂ حق سے ہٹنے کا کبھی تصور بھی نہ کیا۔ جب مسلمانوں پر کفار کے مظالم نا قابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو حضورؐ نے انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ ۵ بعدِ بعثت میں اہل حق کا ایک مختصر قافلہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ ۵ بعدِ بعثت میں ایک بڑا قافلہ عازم حبشہ ہوا، حضرت ہشامؓ بھی اس میں شامل ہو کر حبش چلے گئے۔ مہاجرین حبشہ کی ایک جماعت تو حضرت جعفر طیارؓ بن ابی طالب کے ساتھ بارہ تیرہ برس تک حبشہ ہی میں رہی اور غزوۂ خیبر (اوائل ۷ ہجری) کے موقع پر واپس آئی لیکن اس کے علاوہ دوسرے بہت سے مہاجرین حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے مکہ واپس آ گئے۔ حضرت ہشامؓ بھی واپس آنے والے اصحاب میں شامل تھے۔ حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ کو ہجرت مدینہ کا اذن دیا تو حضرت ہشامؓ بھی مدینہ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ اہل خاندان کو معلوم ہوا تو انہوں نے قید کر دیا اور سخت نگرانی کرنے لگے یہاں تک کہ پانچ چھ سال گزر گئے۔ اس اثناء میں حضورؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور بدر، اُحد اور احزاب کے معرکہ

بھی گزر گئے۔غزوۂ احزاب کے بعد ایک دن حضرت ہشامؓ موقع پا کر قید خانے سے بھاگ نکلے اور چھپتے چھپاتے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

(۳)

حضرت ہشامؓ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے تو حضورؐ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ مدینہ آنے کے بعد جتنے غزوات پیش آئے، حضرت ہشامؓ نے ان سب میں رسولِ کرم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت و بسالت کی دھاک بٹھادی۔سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد عہدِ صدیقی میں قیصرِ روم سے معرکہ آرئیوں کا آغاز ہوا تو حضرت ہشامؓ جوشِ جہاد سے بے تاب ہو گئے اور شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔رومیوں نے دو تین معرکوں میں شکست کھائی تو قیصرِ روم نے تذارق اور قبقلاء دو نامور رومی جرنیلوں کو ایک زبردست لشکر دے کر مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجا۔اس لشکر نے اجنادین کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔اس وقت اسلامی فوجیں شام کے مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی تھیں وہ سب سمٹ سمٹا کر اجنادین پہنچ گئیں اور رومی لشکر کے مقابل خیمہ زن ہوئیں۔ ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳ ہجری کے دن رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی۔اس معرکے میں حضرت ہشامؓ اس شان سے لڑے کہ سرفروشی اور جانبازی کا حق ادا کر دیا۔ ایک موقعے پر مسلمانوں میں کچھ کمزوری کے آثار پیدا ہوئے تو جوشِ ایمان سے سرشار حضرت ہشامؓ نے اپنے سر سے خود اتار کر دور پھینک دیا اور للکار کر بولے: ''مسلمانو! یہ غیر مختون ہماری تلواروں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے، جو میں کرتا ہوں وہی تم کرو۔'' یہ کہہ کر مردانہ وار تلوار چلاتے ہوئے رومیوں کی صفوں میں گھس گئے اور مارتے کاٹتے ان کے قلب لشکر کی طرف بڑھنے لگے! اس وقت ان کی زبان پر یہ رجز جاری تھا:

> ''مسلمانو! میں عاص بن وائل کا بیٹا ہشام ہوں۔آؤ میرے ساتھ آؤ کہ جنت تمہاری منتظر ہے میرے ساتھ نہیں آتے تو گویا تم جنت سے بھاگتے ہو۔''

اسی طرح دادِ شجاعت دے رہے تھے کہ رومیوں نے ہر طرف سے نرغہ کر کے تلواروں کا مینہ برسا دیا۔یوں وہ جامِ شہادت پی کر جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔حضرت ہشامؓ اور ان جیسے دوسرے مجاہدین کی سرفروشی اور پامردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کو عبرتناک شکست ہوئی۔حضرت

ہشامؓ کی شہادت کا واقعہ جو اوپر بیان ہوا ہے، امام حاکمؒ، ابن اثیرؒ، اور بلاذریؒ کی روایات کے مطابق ہے۔ مؤرّخ ابن ہشامؒ کا بیان ہے کہ حضرت ہشامؓ دادِ شجاعت دیتے ہوئے ایک تنگ گھاٹی کے اندر شہید ہو کر گر پڑے۔ اس گھاٹی میں سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ گھاٹی کی دوسری طرف چند مسلمان رومیوں کے ایک جم غفیر سے لڑ رہے تھے اور اس طرف کے مسلمان اُن کی مدد کو پہنچنا چاہتے تھے لیکن حضرت ہشامؓ کی لاش پر سے گزرے بغیر گھاٹی کے اُس پار جانا ممکن نہ تھا۔ حضرت ہشامؓ کے بڑے بھائی حضرت عمرؓو بن العاص اتفاق سے اسی طرف آ نکلے، انہوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے میرے بھائی کو شہادت سے سرفراز کیا ہے اور اس کی روح کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ یہاں تو صرف اس کا جسم ہے اس لیے تم لوگ اس کی لاش پر سے گزر جاؤ۔''

یہ کہہ کر انہوں نے خود گھوڑا بڑھایا ساتھ ہی ان کے پیچھے دوسرے مجاہدین بھی چل پڑے۔ اس طرح حضرت ہشامؓ کا جسد خاکی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لڑائی ختم ہوئی تو حضرت عمرؓو بن العاص نے بھائی کی لاش کے ٹکڑوں کو بورے میں بھر کر سپرد خاک کیا۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ہشامؓ کی شہادت کی خبر سنی تو ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

اللہ تعالیٰ ہشامؓ کو اپنی رحمت سے نوازے وہ اسلام کے بہترین مددگار تھے۔''

اس واقعے کے چند سال بعد مکہ معظّمہ کی ایک مجلس میں یہ بحث چھڑ گئی کہ ہشام افضل تھے یا عمرؓو بن العاص۔ اس موقع پر حضرت عمرؓو بن العاص بھی موجود تھے انہوں نے فرمایا، میں تم کو ایک واقعہ سناتا ہوں اس سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم میں سے کس کو فضیلت حاصل ہے۔ میں اور ہشامؓ دونوں...... (۱) کی جنگ میں شریک تھے اس سے پہلی رات کو ہم دونوں شہادت کے لیے دعا کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو ہشام کی دعا قبول ہو گئی اور میں شرفِ شہادت سے محروم رہا۔ اب تم سمجھ لو کہ اللہ نے کس کو فضیلت عطا کی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

(۱) اس روایت میں اجنادین کے بجائے یرموک ہے۔ یہ رواں کا سہو ہے۔ جنگ یرموک، جنگ اجنادین کے بعد ہوئی، حضرت ہشام جنگ اجنادین میں شہید ہوئے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ ـــ سیف اللہ

۱

سیدنا حضرت خالد بن ولیدؓ، اسلام کے وہ عظیم سپہ سالار اور تاریخ ساز فاتح ہیں، جن کے ولولہ انگیز کارناموں اور راہِ حق میں جاں سپاری کا حال پڑھ کر ہر مسلمان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور خون گرم ہو جاتا ہے۔

خالدؓ وہی تو ہیں:

جن کے لیے سرورِ کائنات فخرِ موجودات رحمتِ دوعالم ﷺ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ انہیں شرفِ اسلام سے بہرہ ور کر دے۔

خالدؓ وہی تو ہیں کہ:

جب وہ حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت عثمان بن طلحہؓ کی معیت میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور سید کونین ﷺ کی بیعت کا شرف حاصل کیا تو آپ ﷺ نے وفورِ مسرت میں صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

رُمَتْكُمْ مَكَّةُ بِأَفْلَاذِ كَبِدِهَا

مکہ نے اپنے جگر گوشے تمہاری جانب پھینک دیے ہیں۔

خالدؓ وہی تو ہیں:

جن کو بارگاہِ رسالت سے ''سیف اللہ'' کا مہتم بالشان لقب مرحمت ہوا اور جن کے

بارے میں سید الانبیاء والمرسلین ﷺ نے فرمایا:

"خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، جسے اُس نے کفار کے خلاف میان سے نکالا ہے۔"

حضرتؓ خالد بن ولید سیف اللہ ہماری تاریخ کے وہ بطل جلیل ہیں، جن کی بے مثال شجاعت اور محیر العقول عسکری مہارت وصلاحیت کا دنیا کے تمام سوانح نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ اگرچہ صحرائے عرب کے یہ جیالے فرزند فنونِ حرب کی کسی باقاعدہ درس گاہ کے تربیت یافتہ نہ تھے لیکن میدانِ جنگ میں ان کی شہسواری، مہارت، قیادت، شجاعت، فراست اور صف آرائی کا حال پڑھ کر لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا جرنیل اور فاتح عسکری قابلیت میں ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ایک مصری مؤرّخ عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب "عبقریۃ خالدؓ" میں حضرت خالدؓ بن ولید کی شخصیت کے عسکری پہلو کا تجزیہ کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "عسکری قائدانہ اوصاف میں سے کوئی وصف ایسا نہ ہوگا جو خالدؓ میں نہ ہو۔ وہ شجاعت، جواں مردی، حاضر دماغی، پھرتی اور دشمن پر بے پناہ ضرب لگانے میں لاثانی تھے اور دم کے دم میں جنگ کا پانسا پلٹا دینا ان کے لیے ایک کھیل تھا۔"

لاریب خالدؓ سیف اللہ ہماری تاریخ کی متاعِ گراں بہا ہیں، جن پر ہم بجاطور پر ناز کرسکتے ہیں اور دشمنانِ حق کے مقابلے میں ان کی سرفروشی اور جانبازی کو اپنے لیے نمونہ بنا سکتے ہیں۔

۲

حضرت خالدؓ بن ولید کا تعلق قریش کے خاندان "بنومخزوم" سے تھا، جو زمانۂ جاہلیت سے معزز چلا آتا تھا۔ قریش نے مکہ میں جو شہری ریاست قائم کی تھی اس کی عسکری قیادت بنومخزوم کے ہاتھ میں تھی۔ لشکری قیادت کے دو منصب "القُبّہ" (قریش میں دستور تھا کہ لڑائی کی تیاری کے وقت ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں ہر شخص بقدرِ استطاعت سامانِ حرب لاکر جمع کرتا تھا) اور "الاِعَنَّہ" (شہسوار فوجی دستہ) اسی خاندان میں تھے۔ یہ قبیلہ اپنے تمول، شرافت، شجاعت اور جنگ آزمائی کے اعتبار سے قریش میں خاص مقام رکھتا تھا۔ حضرت خالدؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

خالدؓ بن ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر (بروایت دیگر عمرو) بن مخزوم بن یقظہ بن مرّہ بن کعب بن لوّیٔ القرشی۔

ان کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت (یعنی مرّہ بن کعب) میں رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔

والدہ کا نام لبابۃ الصغریٰ تھا جو حارث بن حزن ہلالی کی بیٹی تھیں۔

لبابۃ الصغریٰ اُمُّ المؤمنین حضرت میمونہؓ بنت حارث اور حضرت اُمُّ الفضل لبابۃ الکبریٰؓ زوجۂ حضرت عباسؓ بن عبدالمطّلب کی بہن تھیں۔ اس نسبت سے سرورِ عالم ﷺ اور حضرت عباسؓ، حضرت خالدؓ کے خالو ہوتے تھے۔

لبابۃ الصغریٰ کے اسلام لانے کے بارے میں مؤرّخین میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ اسلام لے آئیں تھیں، ان کے بیان کی بنیاد یہ ہے کہ لبابۃ الصغریٰ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت تک زندہ رہیں۔ لیکن دوسرے ان کے اسلام لانے کو تسلیم نہیں کرتے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت خالدؓ بن ولید کی مشہور کنیت ابوسلیمان تھی۔ بعض نے ایک دوسری کنیت ابوالولید بھی بیان کی ہے۔

حضرت خالدؓ کا والد ولید بنو مخزوم کا سردار تھا اور قریش کے نہایت متمول اور بااثر رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ ان ''بڑے'' آدمیوں میں سے تھا، جن کے بارے میں قریش کہا کرتے تھے کہ قرآن ان پر کیوں نہ اترا جیسا کہ سورہ الزُّخرف میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ
(آیت: ۳۱)

کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا۔

مفسرین نے قریتین سے مراد مکہ معظّمہ اور طائف کے شہر لیے ہیں۔ قریش کے نزدیک ولید بن مغیرہ اور طائف کے عروہ بن مسعود ثقفی ایسے ''بڑے'' آدمی تھے کہ آسمان سے وحی کا نزول ہونا ہی تھا تو وہ رسولِ اکرم ﷺ سے بڑھ کر (نعوذ باللہ) اس بات کے مستحق تھے کہ قرآن ان پر نازل ہوتا۔

ولید بن مغیرہ فی الحقیقت نہ صرف مال و جائداد کے اعتبار سے بلکہ فہم و ذکا، جود وسخا، کثرتِ اولاد اور طلاقت لسانی کے لحاظ سے بھی قریش میں منفرد حیثیت رکھتا تھا اور العدل (انصاف پسند) اور الوحید (یکتا) کے القاب سے مشہور تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے حضورؐ کی بعثت سے پہلے مے نوشی بالکل ترک کر دی تھی۔ وہ حج کے دنوں میں منیٰ میں تمام حاجیوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا اور کسی دوسرے کو منیٰ میں کھانا پکانے کے لیے آگ جلانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ ایک سال اکیلے خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھایا کرتا تھا اور دوسرے سال تمام قریش مل کر غلاف چڑھاتے تھے۔ مال و دولت کی وہ فراوانی تھی کہ کم از کم بارہ ہزار دینار ہر وقت اس کے پاس رہتے تھے۔ مکہ اور طائف میں اس کے بے شمار باغات تھے، جن کا پھل سال بھر ختم نہ ہوتا تھا۔ اس کے دس (بروایت دیگر چودہ یا آٹھ) بیٹے تھے جو مجلسوں میں اس کے ساتھ حاضر رہتے تھے۔ خالدؓ بن ولید جیسے لائق فرزند بھی ان میں شامل تھے) اس بنا پر وہ طاقت اور رسوخ کے اعتبار سے تمام سردارانِ قریش میں امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عبدالمطلب کے بعد جن لوگوں نے قریش کی سیادت کا دعویٰ کیا ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کے پختہ عزم اور حوصلے کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ جب قریش نے (بعثت نبوی سے پانچ سال قبل) کعبہ کو ڈھا کر نئے سرے سے تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو کوئی شخص اس کے کسی حصے کو گرانے کے لیے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ آخر ولید بن مغیرہ نے کدال ہاتھ میں لی اور یہ کہہ کر عمارت گرانی شروع کر دی

''اے کعبے والے ہم جو کچھ کرنے لگے ہیں اس میں کسی برے ارادے کو دخل نہیں ہمارا ارادہ نیک ہے۔''

ولید کعبہ کی اس قدر تعظیم کرتا تھا کہ کبھی اس میں جوتیاں پہن کر داخل نہیں ہوتا تھا۔ اہل سیر نے ولید بن مغیرہ کے جو اوصاف و خصائل بیان کیے ہیں ان کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اسلام قبول کرتا اور قرآن حکیم کی تصدیق کرنے میں پیش پیش ہوتا لیکن بدقسمتی سے خاندانی غرور اور جاہ و حشم اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔ وہ اپنی ریاست و وجاہت کو برقرار رکھنے کے لیے نہ صرف خود اسلام سے محروم رہا بلکہ اس کو پھیلنے سے بھی روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

سرورِ عالم ﷺ نے دعوتِ توحید کا آغاز فرمایا تو مشرکین قریش زیرِ پا ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ اور آپؐ کے نام لیواؤں کو ستانے اور دعوتِ حق کے راستے میں روڑے اٹکانے پر کمر

باندھ لی۔اس کام میں ابوجہل، ابولہب، عاص بن وائل، اُمیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط اور ولید بن مغیرہ وغیرہ پیش پیش تھے۔انہوں نے حضورؐ کو تبلیغ حق سے باز رکھنے کے لیے بڑا زور لگایا لیکن آپ نے ان کی کچھ پروانہ کی اور برابر تبلیغ حق کا فریضہ ادا فرماتے رہے۔

اربابِ سیر کا بیان ہے کہ مشرکین قریش کے کئی وفد مختلف موقعوں پر جناب ابوطالب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے (محمد ﷺ) کو تبلیغ حق سے روکیں یا ان کی حمایت سے دستکش ہوجائیں۔ان وفدوں میں ولید بن مغیرہ بھی شامل تھا۔اس نے تو یہاں تک کیا کہ اپنے ایک بیٹے عمارہ (حضرت خالدؓ کے بھائی) کو مشرکین کے حوالے کردیا کہ وہ اسے ابوطالب کے حوالے کرکے اس کے بدلے میں محمد ﷺ کو مانگ لیں۔چنانچہ مشرکین کا ایک وفد جناب ابوطالب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ:

> ''اے ابوطالب! یہ عمارہ بن ولید قریش کا نہایت خوبصورت اور صاحب فہم وتمیز نوجوان ہے تم اسے اپنا بیٹا بنالو اور اس کے بدلے اپنے بھتیجے محمد (ﷺ) کو ہمارے حوالے کردو، جس نے تمہارے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمہاری قوم میں پھوٹ ڈال دی اور ہم سب کو احمق قرار دیا، ہم ایک آدمی دے کر دوسرا لیتے ہیں تا کہ اسے قتل کرڈالیں۔''

جناب ابوطالب نے ان کی پیشکش کو حقارت سے ٹھکرادیا اور کسی قیمت پر حضورؐ کی حمایت سے دست کش ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مشرکین قریش کے وفود رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست بھی ملے اور آپؐ سے کہا کہ اگر آپؐ کو مال درکار ہے تو ہم آپ کو اتنا مال دے دیں گے کہ آپؐ مکہ کے سب سے مالدار آدمی بن جائیں گے۔اگر آپ بادشاہ یا سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم آپؐ کو اپنا سردار اور بادشاہ بنانے پر تیار ہیں۔اگر آپؐ شادی کرنا چاہیں تو جس عورت کو آپ پسند کریں اس سے آپؐ کی شادی کیے دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپؐ ہمارے معبودوں کی برائی کرنا چھوڑ دیں۔اگر یہ آپؐ کو منظور نہیں تو پھر ہماری تجویز یہ ہے کہ ایک سال ہم آپؐ کے دین میں داخل ہوجائیں اور ایک سال آپؐ ہمارے دین میں داخل ہوجائیں۔

سرورِ عالم ﷺ نے ان کی کوئی بات قبول نہ کی اور فرمایا، میں جو چیز تمہارے پاس لایا

ہوں وہ اس لیے نہیں لایا کہ تم سے مال طلب کروں یا تم میں شرف حاصل کروں یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں بلکہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر اپنی کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر اور نذیر بنوں۔ چنانچہ میں نے اپنے رب کا پیغام تم تک پہنچا دیا اب اگر تم اس کو قبول کرلو تو دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو گے۔ اگر اسے رد کرتے ہو تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے۔

بعض روایات میں ہے کہ ولید بن مغیرہ دل میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا اور اس نے ایک دو موقعوں پر اس کا دبی زبان سے اظہار بھی کیا لیکن ابوجہل نے اس کو سعادت ایمانی حاصل کرنے سے باز رکھا۔ ابن اسحاقؒ، حاکمؒ اور بیہقیؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ سرداران قریش نے (حج سے پہلے) ایک اجتماع میں طے کیا کہ جب تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے مکہ میں آئیں تو ان کو حضورؐ سے بدگمان اور متنفر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس موقعے پر ولید بن مغیرہ نے ان سے کہا کہ اگر ہم نے محمد ﷺ کے بارے میں مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو وہ ان پر یقین نہیں کریں گے اس لیے ضروری ہے کہ سوچ سمجھ کر کوئی ایک بات طے کرلو، جس کو سب لوگ بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگ بولے، ہم محمد (ﷺ) کو کاہن کہیں گے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے جس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں، قرآن کو ان سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے کہا، ہم انہیں مجنون کہیں گے۔ ولید نے کہا، واللہ وہ مجنون بھی نہیں ہیں بھلا کوئی مجنون بھی ایسا کلام پیش کرسکتا ہے جو محمد (ﷺ) پیش کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ بولے، ہم انہیں شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا، وہ شاعر بھی نہیں ہیں، ہم شاعری کی ساری اصناف سے واقف ہیں، ان کے کلام پر شاعری کا اطلاق نہیں ہوتا۔

لوگ بولے، اچھا تو پھر ان کو ساحر کہیں گے۔

ولید نے اس سے بھی اتفاق نہ کیا اور کہا، ہم ان میں سے جو بات بھی کریں گے لوگ اس کو باور نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ٹہنیاں بڑی ثمر دار ہیں۔

اس پر ابو جہل نے جھلاّ کر کہا، اے ابا عبد شمس (ولید کی کنیت) پھر تم ہی وہ بات بتاؤ، جو ہم حاجیوں کے سامنے جا کر کہیں۔

ولید دیر تک سوچتا رہا اور پھر کہا، قریب ترین جو بات کہی جا سکتی ہے وہ ہے کہ ہم حاجیوں سے کہیں، یہ شخص جادوگر ہے اور اس کے کلام سے میاں بیوی، باپ بیٹے اور بھائی بھائی کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ولید کی بات پر سب کا اتفاق ہو گیا اور مشرکین نے حضورؐ کے خلاف اپنی مہم کی بنیاد اسی بکواس پر رکھی۔

ولید بن مغیرہ کے اس کردار پر سورۂ مدثر میں یہ تبصرہ کیا گیا ہے:

"(اے پیغمبرؐ) مجھے اس شخص سے سمجھ لینے دو۔ جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا اور پھر اس کو مالِ کثیر عنایت کیا اور (ہر وقت اس کے ساتھ) حاضر رہنے والے بیٹے دیے اور اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان (لازمۂ ریاست) مہیا کر دیا۔ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اس کو اور زیادہ دوں سو ہرگز ایسا نہ ہوگا یہ میری آیتوں کا دشمن رہا ہے (بلکہ) میں (تو عنقریب) اسے ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی۔ خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی، ہاں خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی پھر لوگوں کی طرف دیکھا پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا، پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا تو یہ کہ یہ قرآن کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔" (سورہ مدثر: ۱۱-۲۵)

بعض مفسرین کے نزدیک قرآنِ حکیم کی کچھ اور آیات بھی خاص ولید بن مغیرہ کے کردار کے بارے میں نازل ہوئیں۔

ولید بن مغیرہ حالت کفر ہی میں ہجرت نبوی کے تین ماہ بعد پچانوے سال کی عمر میں فوت ہوا۔

۳

حضرت خالدؓ بن ولید کی تاریخ ولادت کا کسی کتاب سے پتہ نہیں چلتا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت ان کی عمر چوبیس یا پچیس برس کی تھی کیونکہ اکثر مؤرخین نے ۲۱ ہجری یا ۲۲ ہجری میں ان کی عمر ساٹھ برس بیان کی ہے۔ ابن عساکر کا بیان ہے کہ وہ حضرت عمر

فاروقؓ کے ہم عمر تھے اور بچپن میں ایک دفعہ انہوں نے کشتی لڑتے ہوئے حضرت عمرؓ کی پنڈلی توڑ ڈالی تھی، جو کافی علاج معالجے کے بعد ٹھیک ہوئی تھی۔ اس حساب سے وہ بعثت نبوی سے تقریباً ۲۷ برس پہلے اور ہجرت نبوی سے تقریباً ۴۰ برس پہلے پیدا ہوئے اور ۲۱-۲۲ ہجری میں ان کی عمر ساٹھ برس سے اوپر تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت خالدؓ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے۔ باپ رئیس الرؤسا تھا، اس کے پاس مال و دولت، غلام، اونٹ، گھوڑے، مکانات اور باغات ہر شے کی فراوانی تھی اس لیے حضرت خالدؓ نے بڑے ناز ونعمت کے ساتھ پرورش پائی۔ جوان ہوئے تو فکر معاش سے بے نیاز تھے۔ قدرت نے انہیں سیف اللہ بننے کے لیے پیدا کیا تھا اس لیے عیش و عشرت میں مبتلا نہیں ہوئے اور ایسے مشاغل اختیار کیے جو صحت مندی، قوت، جرأت، ہمت، دلیری، محنت اور جفاکشی کے متقاضی تھے۔ ان مشاغل کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مُصارَعَۃ یعنی کُشتی لڑنا۔ حضرت خالدؓ خوب کسرت کیا کرتے تھے اور اپنے ہم عمر نوجوانوں سے کشتی کے مقابلے کیا کرتے تھے۔

(۲) گھوڑے سدھانا۔ ان کی نگہداشت کرنا، گھڑ دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لینا اور (ایک اچھا شہسوار بننے کے لیے) زیادہ سے زیادہ گھوڑے کی سواری کرنا۔

(۳) جنگی کیمپ (القبہ) کے انتظام میں حصہ لینا۔

(۴) فنونِ سپہ گری سیکھنا (شمشیر زنی، نیزہ بازی، قدر اندازی وغیرہ)

یہ عسکری تربیت انہوں نے کسی درس گاہ میں نہیں بلکہ کھلے میدانوں اور سنگلاخ گھاٹیوں میں حاصل کی۔ آزمودہ کار بڑے بوڑھوں کی رہنمائی اور قوم کی عسکری روایات ان کی استاد تھیں۔

فطری طور پر بھی نہایت ذہین وفطین، پھرتیلے، شجاع اور نڈر تھے۔ نگاہیں عقاب کی تھیں اور دل شیر کا۔ کسی مشکل اور خطرے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مبدءِ فیض نے انہیں جنگی دل ودماغ عطا کیا تھا، خاندانی روایات نے ان کی فطری صلاحیتوں کو اور بھی چمکا دیا اور وہ ایسے زبردست جنگی ماہر اور عظیم سپہ سالار بنے کہ تاریخ عالم میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر لی۔ والد کی وفات کے بعد القبہ اور الاعنّۃ کی ذمے داری اور قیادت انہی کے سپرد ہوئی اور اسے انہوں نے

نہایت عمدگی سے انجام دیا۔ والد نے بہت بڑی جائداد چھوڑی تھی اس لیے انہیں اور ان کے بھائیوں کو روزی کمانے کے لیے تگ و دو کی ضرورت نہیں پڑی۔ تجارتی کاروبار بھی وہ اپنے ملازموں کے ذریعے کرتے تھے۔ قریش کے بہت سے رؤسا اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ دور دراز (شام مصر وغیرہ) کا سفر کرتے رہتے تھے لیکن حضرت خالدؓ کو تجارت کے سلسلے میں مکہ سے باہر نکلنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی۔

سرور عالم ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو حضرت خالدؓ کے ایک سعادت مند بھائی ولیدؓ بن ولید نے اس پر اوائل بعثت میں (یا بروایت دیگر غزوۂ بدر کے فوراً بعد) لبیک کہا لیکن حضرت خالدؓ نے اپنے والد کی پیروی اختیار کی اور دوسرے مشرکین کے ساتھ مل کر اسلام کی مخالفت پر کمر باندھی تاہم انہوں نے حضورؐ کو ستانے کے لیے کوئی کمینہ اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت کبھی نہ کی۔ حضورؐ کی ہجرت الیٰ المدینہ اور والد کی وفات کے بعد بھی وہ سات سال سے زیادہ عرصہ تک مشرکین کا ساتھ دیتے رہے۔ غزوۂ بدر (۲ ہجری) میں مشرکین کے لشکر میں شامل تھے لیکن کوئی کارنامہ دکھانے کا موقع نہ ملا۔ غزوۂ اُحد (۳ ہجری) میں مکہ کے شہسوار دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ کوہِ اُحد کے درہ عینین پر حضورؐ نے پچاس تیر انداز اس غرض سے متعین فرمائے تھے کہ کفار اس درّے میں سے گزر کر مسلمانوں پر عقب سے حملہ نہ کر سکیں۔ لڑائی کے پہلے دور میں کفار کو شکست ہوئی اور درّہ پر متعین بیشتر تیر اندازوں نے (حضورؐ کی ہدایت کے خلاف) اپنی جگہ چھوڑ دی تو خالدؓ کی عقابی نگاہوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو بھانپ لیا اور اپنے دستہ کو ساتھ لے کر اس درّہ کے راستے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

غزوۂ احزاب (۵ ہجری) میں خالد مکہ کے ان شہسواروں میں سے تھے، جو سارا دن خندق کے کنارے کنارے گشت کرتے رہتے تھے کہ اگر خندق کا کوئی حصہ کمزور ہو یا مسلمان غافل ہوں تو وہ خندق عبور کر کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر سکیں لیکن مسلمانوں کی مستعدی نے ان کو اس کا موقع نہ دیا۔ جب دو تین ہفتوں کے بعد کفار کے لشکر میں عام بھگدڑ مچی تو انہوں نے خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص سے کہا کہ وہ ان کے عقب کی حفاظت کریں۔ چنانچہ وہ دونوں دو سو سواروں کے ساتھ بطور ساقہ لشکر کفار کے پیچھے پیچھے رہے تاکہ مسلمان حملہ کریں تو ان کا مقابلہ کر سکیں۔

۶ ہجری میں سرور عالم ﷺ نے چودہ سو صحابہؓ کے ہمراہ کعبہ کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ سے مکہ کا عزم فرمایا۔ کفار کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے مسلمانوں کی مزاحمت کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ انہوں نے خالدؓ بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ مسلمانوں کو روکنے (یا مزید تحقیق) کے لیے مکہ سے روانہ کیا۔ وہ کراغ الغمیم کے مقام پر پہنچے تو حضورؐ کو ان کی نقل وحرکت کی اطلاع مل گئی۔ چونکہ آپؐ کا ارادہ لڑنے کا نہ تھا اس لیے راستہ تبدیل کر کے حدیبیہ پہنچ گئے اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔

صلح حدیبیہ کے اگلے سال (۷ ہجری میں) جب معاہدے کے مطابق سرور عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ عمرۃ القضا کرنے کے لیے مکہ میں داخل ہوئے تو خالدؓ بن ولید مکہ کے بیشتر لوگوں کے ساتھ شہر سے باہر نکل گئے کیونکہ وہ مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے کا منظر دیکھنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ مکہ میں سہ روزہ قیام کے دوران میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت خالدؓ کے حقیقی بھائی ولیدؓ بن ولید سے (جو بڑے مخلص مسلمان تھے) فرمایا۔ ''افسوس خالد میرے پاس نہیں آیا اگر وہ آتا تو ہم اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے۔ خالد جیسے شخص کو تو اسلام سے دور نہیں رہنا چاہیے۔'' ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے حضرت خالدؓ کے قبول اسلام کے لیے دعا بھی فرمائی۔

حضرت ولیدؓ اپنے بھائی کے سچے خیر خواہ تھے انہوں نے مدینہ واپس جا کر حضرت خالدؓ کو یہ خط لکھا:

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مجھے تعجب ہے کہ تم اسلام کے اس قدر خلاف کیوں ہو حالانکہ تم جیسا دانا اور زیرک شخص اسلام کی حقانیت سے بے خبر نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے تمہارے بارے میں دریافت کیا کہ خالد کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ خالد کو اللہ ہی لائے تو لائے۔ آپؐ نے فرمایا، خالد جیسا (زیرک) آدمی اسلام کی حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر کفار سے نبرد آزما ہوتا تو یہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہوتا، اے بھائی تم بہت عرصہ تک گمراہ رہ چکے ہو۔ اب حق کو پہچانو اور اسلام کا دامن تھام لو۔''

اس خط نے حضرت خالدؓ کو اسلام کی طرف مائل کر دیا اور وہ چند دن کے بعد آستانۂ رسالت پر حاضر ہو کر مشرف بہ ایمان ہو گئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے خود اپنے قبول اسلام کی سرگزشت اس طرح بیان کی ہے:

''ولید کے خط نے میرے دل پر پڑے ہوئے ظلمت کے پردے چاک کر دیے اور میں اسلام کی طرف راغب ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا اس نے مجھے بے حد مسرور کیا اور میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ میں نے انہی ایام میں ایک خواب دیکھا کہ میں ایک تنگ اور ویران جگہ سے نکل کر ایک وسیع شاداب اور پر بہار میدان میں آ گیا ہوں۔ (یہ خواب دیکھنے کے بعد) جب میں مدینہ جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو پہلے صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابوجہل سے ملا اور ان سے کہا کہ محمد (ﷺ) کو عرب اور عجم پر غلبہ حاصل ہو رہا ہے، اگر ہم بھی اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیں تو جو مرتبہ اور مقام ان کو ملنے والا ہے ہم بھی اس میں حصہ دار بن جائیں گے۔ ان دونوں نے میری بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر میں اپنے دوست عثمان بن طلحہ سے ملا اور اس سے کہا، عثمان ہمارا حال اس لومڑی کی طرح ہے جو اپنے بھٹ میں چھپی بیٹھی ہے، اگر اس بھٹ میں پانی چھوڑ دیا جائے تو وہ بھٹ سے نکلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ہمیں نظر آ رہا ہے کہ مسلمان ہم پر غالب آ جائیں گے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ یہ وقت آنے سے پہلے ہم حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں۔

میں نے یہ باتیں عثمان سے بڑے تذبذب کے بعد کہی تھیں کیونکہ اس کا باپ اور چار بھائی جنگ اُحد میں مارے جا چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی صفوان اور عکرمہ کی طرح میری بات نہیں مانے گا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب عثمان نے بلا تامل میری تجویز مان لی۔ اگلے دن ہم دونوں علی الصباح عازم مدینہ ہو گئے۔ ''ہدۃ'' کے مقام پر ہماری ملاقات عمرو بن العاص سے ہوئی، جو حبشہ سے آ رہے تھے انہوں نے مجھ سے کہا، ابوسلیمان کدھر کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا، خدا کی قسم خوب پانسہ پڑا، مجھے یقین ہو گیا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور میں اسلام قبول کرنے کے لیے ان کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ چنانچہ ہم اکٹھے مدینہ پہنچے، رسول اللہ ﷺ کو ہمارے آنے کی خبر ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں سے فرمایا، مکہ نے اپنے جگر

کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دیے ہیں۔ میں نے نئے کپڑے پہنے اور کاشانۂ رسالت کی طرف روانہ ہوا، راستے میں مجھ کو میرا بھائی (ولید) ملا۔ اس نے کہا، جلدی چلو رسول اللہ ﷺ تمہارے آنے سے بہت خوش ہیں اور تمہارا انتظار فرما رہے ہیں۔ چنانچہ ہم سب عجلت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ہمیں دیکھا تو متبسم ہو گئے۔ میں نے قریب پہنچ کر سلام کیا، آپؐ نے بڑی گرم جوشی سے جواب دیا۔ میں نے عرض کیا، میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت نصیب کی۔ مجھے یہی امید تھی کہ تمہاری فراست ایک دن ضرور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے گی۔

میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول، مجھ سے کئی بار آپؐ کے خلاف لڑنے کا گناہ سرزد ہو چکا ہے آپؐ اللہ سے میرے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا، اسلام اپنے سے پہلے تمام گناہوں کو کالعدم کر دیتا ہے۔ میں نے (حیرت سے) کہا، واقعی یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا، ہاں۔

اس کے بعد آپؐ نے دعا کی، الٰہی خالد سے ماضی میں تیرے دین کی مخالفت کرنے میں جو لغزشیں سرزد ہوئیں ان کو معاف فرما۔

میرے بعد عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ نے بھی رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی۔''

حضرت خالدؓ بن ولید نے قبولِ اسلام کے بعد مدینہ منورہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اس طرح انہیں ہجرت کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔ یہ واقعہ فتح مکہ سے چھ ماہ پہلے کا ہے۔ حضرت خالدؓ فرماتے ہیں کہ جب میں شرف ایمان سے بہرہ ور ہو چکا تو حضورؐ نے سکونت کے لیے مجھے ایک مکان عنایت فرمایا۔

(۴)

مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید اسلام کے بازوئے شمشیر زن بن گئے اور انہوں نے اپنی شمشیرِ خاراشگاف سے ہر میدان میں طاغوتی قوتوں کو خاک نامرادی چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ سب سے پہلا معرکہ جس میں حضرت خالدؓ کی تلوار کفار کے خلاف بے نیام

ہوئی، غزوۂ مؤتہ تھا، جو ان کے قبول اسلام کے دو ماہ بعد پیش آیا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد سرور عالم ﷺ نے سلاطین و امرا کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ایک تبلیغی خط حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی کے ہاتھ بصریٰ کے حکمران کے پاس بھی بھیجا۔ حضرت حارثؓ مؤتہ کے مقام پر پہنچے تو بلقاء کے رئیس شرحبیل بن عمرو غسانی نے انہیں شہید کر ڈالا۔ حضورؐ نے ان کا انتقام لینے کے لیے جمادی الاولیٰ ۸ ہجری میں تین ہزار فوج حضرت زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں روانہ فرمائی اور اس کو رخصت کرتے وقت ہدایت فرمائی کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب سپہ سالار ہوں گے، وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ انصاری امیر لشکر ہوں گے۔

حضرت خالدؓ بن ولید اس لشکر میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ حاکم بصریٰ کو مسلمانوں کی آمد کا پتہ چلا تو اس نے مقابلے کے لیے اپنے حلیف قبائل کو ساتھ ملا کر ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا۔ اتفاق سے قیصرِ روم بھی اسی علاقے میں مواب کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوا تھا۔ اس نے ہزاروں رومی جنگجو حاکم بصریٰ کی مدد کے لیے بھیج دیے۔ اس طرح دشمن کی تعداد ڈیڑھ دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں اور دشمن کی فوج میں ایک اور ساٹھ (بروایت دیگر ایک اور تراسی) کی نسبت تھی لیکن اس کے باوجود مسلمان اللہ کے بھروسے پر اس طاغوتی قوت سے ٹکرا گئے۔

مؤتہ کے میدان میں فریقین کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی، جس میں حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ یکے بعد دیگرے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اب حضرت خالدؓ بن ولید نے فوج کی کمان سنبھالی اور اپنی بے مثال شجاعت اور عسکری قابلیت کی بدولت مسلمانوں کو دشمن کی زد سے نکال لائے۔ اگرچہ دشمن کی کثیر تعداد اور ساز و سامان کی بنا پر (اور اس وجہ سے بھی کہ مسلمان اپنے مرکز سے بہت دور تھے) اس کو زیر نہ کیا جا سکا لیکن تین ہزار کی مختصر فوج کا دشمن کے ٹڈی دل سے بچ جانا بھی فی الحقیقت مسلمانوں کی کامیابی تھی۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے دشمن کے بے شمار آدمی ہلاک کر کے اس کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا)۔ اس خونریز معرکے میں مسلمانوں کے صرف بارہ آدمی شہید ہوئے جب کہ دشمن کے سینکڑوں آدمی کھیت رہے۔

تمام اربابِ سیر و مغازی نے یہ روایت تواتر کے ساتھ نقل کی ہے کہ جس وقت مسلمان

مؤتہ کے میدان میں موت اور زندگی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ سرور عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کی ایک جماعت کے درمیان مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ یکا یک آپؐ نے فرمایا:

''زیدؓ نے نشان لیا اور وہ شہید ہو گئے۔ اب جعفرؓ نے علم سنبھالا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب عبداللہ بن رواحہؓ نے نشان لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب اس شخص نے علم ہاتھ میں لیا ہے، جو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔''

ایک اور روایت میں حضورؐ سے یہ الفاظ منسوب ہیں:

''اُن (زیدؓ، جعفرؓ اور عبداللہؓ) کے بعد خالدؓ بن ولید نے علم سنبھالا۔ اے اللہ وہ تیری تلواروں میں سے ایک تلوار ہے اس کی مدد فرما۔''

اس دن سے حضرت خالدؓ کا لقب سیف اللہ (اللہ کی تلوار) پڑ گیا۔

حضرت خالدؓ کا بیان ہے کہ غزوۂ مؤتہ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں، صرف ایک یمنی تلوار باقی رہ گئی۔

غزوۂ مؤتہ کے وقت میدان جنگ کا نقشہ حضورؐ کے سامنے کر دیا گیا تھا یا آپؐ کو وحی کے ذریعے تمام حالات کی اطلاع دی گئی تھی، صورت واقعہ کچھ بھی ہو اس بات پر سب اہل سیر کا اتفاق ہے کہ مجاہدین کے مدینہ واپس آنے سے کافی دن پہلے حضورؐ نے حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر صحابہؓ کو دے دی تھی اور حضرت خالد بن ولید کی غیر معمولی کارکردگی کا تذکرہ بھی کر دیا تھا اس واقعے کو حضورؐ کے معجزات میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵

رمضان المبارک ۸ ہجری میں حضرت خالدؓ بن ولید کو اُن دس ہزار قدسیوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، جو فتح مکہ کے موقع پر سرور عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے اور جن کا ذکر صدیوں پہلے توریت (کتاب استثنا) میں یوں کیا گیا تھا۔

''خداوند سینا سے آیا، شعیر سے ان پر آشکارا ہوا اور کوہِ فاران سے ان پر جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں، ان کے لیے آتشیں (نورانی) شریعت تھی۔''

سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ سے چلتے وقت حضرت خالدؓ کو لشکر اسلام کے میمنہ کا افسر مقرر فرمایا۔ اس میں سُلیم، مزینہ، اسلم، غفار، جہینہ وغیرہ عرب قبائل شامل تھے۔ حضورؐ حرم مقدس میں خونریزی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے آپؐ نے اپنے تمام جاں نثاروں کو حکم دیا تھا کہ جب تک کفار ان کی مزاحمت نہ کریں وہ کسی پر تلوار نہ اٹھائیں۔ مشرکین مکہ کو اجتماعی طور پر تو مسلمانوں کی مزاحمت کرنے کی ہمت نہ پڑی البتہ عکرمہ بن ابوجہل اور صفوان بن امیہ نے قبیلہ بنی بکر اور احابیش کے کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے اس دستے پر حملہ کر دیا (اس پر تیر برسانے شروع کر دیے) جو حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں مکہ کے بالائی حصہ کی جانب سے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ حضرت خالدؓ اور ان کے ساتھیوں کو مجبوراً تلوار بے نیام کرنی پڑی۔ انہوں نے مشرکین کی بری طرح پٹائی کی، یہاں تک کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس جھڑپ میں ان کے اٹھائیس آدمی مارے گئے (ان میں سے ۲۴ قریش سے تھے اور چار قبیلہ ہذیل کے) اور مسلمانوں کے دو (یا بروایت دیگر تین) آدمی شہید ہوئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ شہادت پانے والے دو مسلمان حضرت کُرز بن جابر فہریؓ اور حبیش الاشعرؓ حضرت خالدؓ کے دستے سے بچھڑ کر کسی دوسرے راستے پر جا پڑے تھے مشرکین نے انہیں تنہا پا کر شہید کر ڈالا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت خالدؓ سے باز پرس کی۔ انہوں نے عرض کی، ''یا رسول اللہ پہلے ان لوگوں نے ہم پر حملہ کیا ہم نے اپنی مدافعت کے لیے اس کا جواب دیا۔''

حضورؐ نے فرمایا ''خیر جو اللہ کی مرضی۔''

فتح مکہ کے پانچ دن بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت خالدؓ کو تیس سوار دے کر وادیِ نخلہ میں قریش کے ایک بڑے بُت ''العُزّیٰ'' کو مسمار کرنے کے لیے بھیجا۔ قریش کنانہ اور مضر وغیرہ قبائل اس بت کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ عزّیٰ کے معبد کا انتظام بنوشیبان کے سپرد تھا اور یہ مکہ سے دس میل دور ایک باغ (بستانِ عامر) میں واقع تھا۔ اس باغ کی نسبت سے یہ وادی نخلہ کے نام سے مشہور تھی۔ حضرت خالدؓ نے ۲۵ رمضان ۸ ہجری کو وہاں پہنچ کر عزّیٰ (اور اس کے معبد) کو منہدم کر دیا۔ وہاں سے مکہ واپس آئے تو حضورؐ نے تین سو پچاس صحابہؓ کے ساتھ دعوتِ اسلام کی غرض سے بنو جذیمہ کی طرف بھیجا۔ یہ بنو کنانہ کی ایک شاخ تھے جو یلملم کی جانب

مکہ سے ایک دن کی مسافت پر آباد تھے۔ حضرت خالدؓ نے حضورؐ کی ہدایت کے مطابق ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ یہ لوگ پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے لیکن ان میں سے کچھ آدمی ناواقفیت کی وجہ سے صحیح الفاظ میں اپنے اسلام کا اظہار نہ کر سکے اور اَسْلَمْنَا (ہم اسلام لائے) کے بجائے ''صبانا'' (یعنی ہم نے دین تبدیل کر لیا ہے) کہا۔ اس سے فی الحقیقت ان کی مراد یہ تھی کہ ہم نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر نیا دین (اسلام) قبول کر لیا ہے۔ چونکہ مشرکین قریش مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے اس لیے بنوجَذیمہ کے ان لوگوں نے بھی اپنے اسلام کا اظہار اپنے آپ کو ''صابی'' کہہ کر کیا۔ حضرت خالدؓ نے سمجھا کہ یہ اپنے بے دین ہونے کا اظہار کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کو قتل کرا دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت خالدؓ نے بنوجذیمہ کے تمام لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیا اور پھر ان کے قتل کا حکم دیا لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوقتادہؓ اور بہت سے دوسرے صحابہؓ نے اپنے قیدی چھوڑ دیے البتہ بنوسلیم نے اپنے قیدیوں کو قتل کر ڈالا۔

سرورِ عالم ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپؐ کو بہت افسوس ہوا اور آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر فرمایا، ''اے اللہ، خالدؓ بن ولید نے جو کچھ کیا ہے میں اس سے بری ہوں۔'' پھر آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو ان سب کی دیت (خون بہا) دے کر بھیجا۔ وہ بنوجذیمہ کے پاس گئے اور جتنے لوگ قتل ہوئے تھے ان سب کا خون بہا ادا کیا حتیٰ کہ اگر کسی کا کتا بھی مارا گیا تھا تو اس کا بھی معاوضہ دیا۔ اس کے بعد جتنا مال بچ رہا وہ ویسے ہی (تالیفِ قلب کے طور پر) ان لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

سریۂ بنوجذیمہ کے بعد شوال ۸ ہجری میں غزوۂ حنین پیش آیا۔ اس میں حضرت خالدؓ بن ولید لشکرِ اسلام کے مقدمۃ الجیش کی قیادت کر رہے تھے، جو بنوسلیم کے سوسواروں پر مشتمل تھا۔ بنوہوازن نے اپنی کمین گاہوں سے مسلمانوں پر اس شدت سے تیر برسائے کہ ان میں انتشار پھیل گیا لیکن جلد ہی سنبھل کر انہوں نے اس زور کا جوابی حملہ کیا کہ بنوہوازن اور ان کے ساتھیوں کو شکست فاش ہوئی۔ حضرت خالدؓ بن ولید اس لڑائی میں سربکف ہو کر لڑے اور کئی زخم کھائے۔ لڑائی ختم ہوئی تو سرورِ عالم ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ان کے زخموں پر دَم کیا اور وہ جلد شفایاب ہو گئے۔

ابن برہان الدین حلبیؒ نے ''السیرۃ الحلبیہ'' میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے حضرت خالدؓ کے ساتھیوں کو ان کی تیمارداری کے بارے میں مختلف ہدایات دیں۔

غزوۂ حنین کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا تو اس موقع پر بھی آپؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو اسلامی لشکر کے مقدمۃ الجیش کا افسر بنایا۔ اثنائے محاصرہ میں حضرت خالدؓ نے کئی بار محصور مشرکین کو دعوتِ مبارزت دی لیکن کسی کو ان کے مقابلے پر آنے کی ہمت نہ پڑی۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد حضورؐ نے بعض وجوہ کی بنا پر محاصرہ اٹھالیا۔

۹ ہجری کے اوائل میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ بنو مصطلق، جو دو سال پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، مرتد ہو گئے ہیں اور لڑنے پر تیار ہیں۔ حضورؐ نے ان کی تادیب کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید کو روانہ کیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ ان پر حملہ کرنے سے پہلے اس بات کی اچھی طرح چھان بین کر لیں کہ وہ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں اگر معلوم ہو کہ نماز پڑھتے ہیں تو پھر ان کو نہ چھیڑا جائے۔ حضرت خالدؓ اپنی جمعیت کے ساتھ بنو مصطلق کی بستی کے قریب پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے چند آدمی بنو مصطلق کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجے۔ ان لوگوں نے واپس آ کر خبر دی کہ تمام قبیلہ اسلام پر قائم ہے۔ یہ لوگ باقاعدہ اذانیں دیتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ صبح کے وقت حضرت خالدؓ بستی میں داخل ہوئے تو بنو مصطلق نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور بہت خاطر مدارات کی۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا اور واپس آ کر حضورؐ کو تمام حالات کی اطلاع دی۔

رجب ۹ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ رومیوں کے امکانی حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیس ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ تبوک تشریف لے گئے۔ اس طویل پر صعوبت سفر میں حضرت خالدؓ بن ولید بھی آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ تبوک پہنچ کر آپؐ نے کسی رومی لشکر کو وہاں موجود نہ پایا تاہم آپؐ نے احتیاطاً بیس دن تبوک میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں حضورؐ نے اردگرد کے عیسائی رئیسوں کو مطیع بنانے پر توجہ کی۔ یہ لوگ قیصرِ روم کے باجگزار تھے اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں رومیوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ایلہ اور اذرح کے رئیسوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اطاعت قبول کر لی۔ صرف دومۃ الجندل کا رئیس اکیدر بن عبدالملک نصرانی باقی رہ گیا۔ حضورؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو چار سو سے کچھ زیادہ آدمی دے کر اس کو مطیع بنانے پر مامور فرمایا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کو چار سو سے کچھ زیادہ آدمی دے کر اس کو مطیع بنانے پر مامور فرمایا۔ حضرت خالدؓ دومۃ الجندل کے قریب پہنچے تو اکیدر اپنے بھائی حسان اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ شکار پر نکلا ہوا تھا۔ جنگل ہی میں ان لوگوں کی مڈبھیڑ حضرت خالدؓ سے ہوگئی۔ حسان لڑائی میں مارا گیا اور اکیدر کو حضرت خالدؓ نے گرفتار کرلیا۔ باقی لوگوں نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی۔ اکیدر نے پیش کش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر جزیہ دینا قبول کرلے گا اور آپؐ کی خدمت میں دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے پیش کرے گا۔ حضرت خالدؓ نے یہ پیش کش قبول کرلی۔ چنانچہ اکیدر اور اس کا دوسرا بھائی مصاد یہ چیزیں لے کر تبوک پہنچے جہاں حضورؐ ابھی تک قیام پذیر تھے۔ حضرت خالدؓ نے اکیدر کو آپؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے اطاعت قبول کرلی اور ہدیہ پیش کیا۔ حضورؐ نے جزیہ قبول فرما کر اس کو جان و مال کا تحریری امان نامہ عطا فرمایا۔ اس طرح وہ دومۃ الجندل کی حکومت پر اسلامی مملکت کے ایک باجگزار رئیس کی حیثیت سے بحال ہوگیا۔

۱۰ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو چار سو سوار دے کر دعوتِ اسلام کے لیے بنو عبدالمدان کی طرف نجران بھیجا۔ یہ قبیلہ بنو حارث بن کعب کی ایک شاخ تھا۔ حضرت خالدؓ مدینہ سے چلنے لگے تو حضورؐ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ ان لوگوں کو تین بار اسلام کی دعوت دینا اگر وہ لوگ اسلام قبول کرلیں تو وہاں کچھ عرصہ مقیم رہ کر ان کو احکامِ اسلام کی تعلیم دینا اور اگر وہ سرکشی اختیار کریں تو پھر تم کو لڑنے کا اختیار ہے۔ حضرت خالدؓ نے نجران پہنچ کر بنو عبدالمدان کو دعوت اسلام دی تو انہوں نے اسے بخوشی قبول کیا اور ان کے ہاتھ پر مشرف بہ ایمان ہوگئے۔ حضورؐ کے حکم کے مطابق حضرت خالدؓ وہیں ٹھہر گئے اور ان کو قرآن و سنت اور احکام و مسائل کی تعلیم دینے میں مشغول ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے ایک خط میں تمام حالات حضورؐ کو لکھ بھیجے۔ آپؐ نے جواب میں لکھا کہ بنو عبدالمدان (بنو حارث) کا ایک وفد ساتھ لے کر مدینہ آؤ۔ چنانچہ حضرت خالدؓ ان لوگوں کا ایک وفد ساتھ لے کر مدینہ پہنچے اور اس وفد کو حضورؐ کی خدمت میں حاضر کیا۔ یہ لوگ حضورؐ کی زیارت اور بیعت کا شرف حاصل کرکے وطن واپس گئے۔

ابن جریر طبریؒ کا بیان ہے کہ ۱۰ ہجری میں رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو تبلیغِ اسلام کے لیے یمن بھیجا۔ وہ وہاں چھ ماہ تک مقیم رہ کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے

لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا، اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو روانہ کیا۔ ان کی تبلیغ سے یمن کے اکثر لوگ تھوڑے ہی دنوں میں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

ابن سعدؒ اور ابن ہشامؒ نے اس واقعے کو اور انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی امارت میں ایک سریہ یمن بھیجا۔ دوسری جانب سے حضرت خالدؓ بن ولید کو بھی ایک لشکر دے کر بھیجا اور فرمایا کہ جب تم علیؓ سے ملو تو سارے (متحدہ) لشکر کے امیر علیؓ ہوں گے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تمہاری طرف سے حملہ کرنے میں پہل نہ ہو ہاں اگر اہل یمن تم پر حملہ کریں تو تم اپنی مدافعت کر سکتے ہو۔ حضرت علیؓ اور حضرت خالدؓ یمن پہنچے تو دعوتِ اسلام کے جواب میں اہلِ یمن نے مسلمانوں پر پتھر اور تیر برسائے۔ اہل حق نے ایک ہی جھڑپ میں ان کو پسپا کر دیا لیکن ان پر کوئی سختی نہیں کی اور دوبارہ ان کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس مرتبہ وہ برضا و رغبت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

مصری مؤرّخ ابوزید شلبی نے اپنی کتاب ''خالدؓ سیف اللہ'' میں طبری کی روایت پر تنقید کی ہے اور اس کو عقل اور تاریخ دونوں لحاظ سے ناقابل قبول قرار دیا ہے۔

اسی سال (۱۰ ہجری) میں حضرت خالدؓ کو حجۃ الوداع میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔

مخدوم محمد ہاشم سندھیؒ نے اپنی کتاب ''بذل القوۃ'' میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے ۱۱ ہجری میں بھی (اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے) حضرت خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں ایک سریہ بنو خثعم کی طرف بھیجا۔ یہ لوگ اسلام کا اظہار کرنے کی بجائے سجدے میں گر گئے۔ حضرت خالدؓ (اُن کا مطلب نہیں سمجھ پائے اس لیے) ان (میں سے بعض) کو قتل کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے مقتولوں کی نصف دیت ادا فرمائی۔

(۶)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند نشین خلافت ہوئے تو جھوٹے مدعیان نبوت کے پیروؤں اور مرتدین نے سارے عرب میں شورش برپا کر دی ان میں تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو کسی مدعیِ نبوت کے معتقد ہو کر اسلام سے بالکل پھر گئے تھے،

دوسرے وہ جو نماز اور زکوٰۃ میں کمی اور معافی کے طالب تھے، تیسرے وہ جو صرف زکوٰۃ کے انکاری تھے اور اس کو خراج سمجھ کر اپنی آزادی کے خلاف تصور کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں گروہوں کے خلاف جہاد کے لیے حضرت ابوبکر صدّیقؓ کا سینہ کشادہ کر دیا۔ فی الحقیقت ایسے پُرآشوب اور انتہائی نازک حالات میں صدّیق اکبرؓ جیسے کامل الایمان صاحبِ عزیمت واستقامت اور نڈر شخص ہی کی ضرورت تھی انہوں نے کسی قیمت پر بھی مرتدین کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ بعض صحابۂ کرامؓ نے صورتِ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ان کو تیسرے گروہ (زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں) کے ساتھ نرمی کا مشورہ دیا لیکن انہوں نے فرمایا:

> ''(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد) وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دین کمال کو پہنچ چکا، کیا میری زندگی میں اس کی قطع و برید کی جائے گی؟ خدا کی قسم اگر (فرض زکوٰۃ میں سے) ایک رسی کا ٹکڑا دینے سے بھی جو لوگ انکار کریں گے، میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔''

اور پھر واقعی انہوں نے جو فرمایا تھا اسے کر دکھایا۔ اُن کی قوتِ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ ان نازک حالات میں بھی حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کو سات سو صحابہؓ کی معیت میں سرحد شام کی طرف (رومیوں سے غزوۂ مؤتہ کا بدلہ لینے کے لیے) روانہ کر دیا۔ جب اُن کو مشورہ دیا گیا کہ موجودہ حالات میں صحابہؓ کی اتنی تعداد کو مدینہ منورہ سے باہر بھیجنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے تو انہوں نے فرمایا:

> ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مجھ کو یہ بھی گمان ہوتا کہ درندے مجھ کو اٹھا کر لے جائیں گے تو بھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اُسامہ کا لشکر ضرور بھیجتا۔ اگر بستیوں میں میرے سوا ایک متنفس بھی باقی نہ رہتا تو بھی جیش اسامہ کو روانگی کا حکم ضرور دیتا۔''

جیش اسامہؓ کی روانگی کے بعد بنو اسد، فزارہ، غطفان، ثعلبہ، مرّہ، عبس، کنانہ اور ذبیان کے مرتد قبائل نے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے ایک حصے نے ابرق میں پڑاؤ ڈالا اور دوسرے نے ذوالقصہ میں۔ یہ دونوں مقام مدینہ کے نواح میں تھے۔ مرتدین نے ذوالقصہ سے ایک وفد حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی خدمت میں زکوٰۃ سے معافی کے لیے بھیجا لیکن

خلیفۃؓ الرسولؐ نے اس کو صاف جواب دے دیا وفد کی واپسی کے تیسرے دن مرتدین نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے اہل مدینہ کی ایک جمعیت کو ساتھ لے ان کا بڑے عزم وثبات کے ساتھ مقابلہ کیا اور انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مسلمان ان کا تعاقب کرتے ہوئے ذی حسیٰ تک چلے گئے جہاں مرتدین اپنے بہت سے آدمیوں کو چھوڑ آئے تھے۔ ان لوگوں نے مشکوں میں ہوا بھر رکھی تھی۔ تعاقب کرنے والے شتر سوار مسلمان پہنچے تو انہوں نے مشکیں اونٹوں کے سامنے لڑھکا دیں اور ساتھ ہی اچھل کود کر دف باجے ڈھول وغیرہ بجانے لگے، اس سے اونٹ بھڑک اٹھے اور پیچھے کو بھاگے۔ مرتدین نے سمجھا کہ مسلمان بھاگ گئے۔ انہوں نے ذی حسیٰ کی پشت پر ذوالقصہ میں مقیم اپنے ساتھیوں کو بھی آگے بلالیا اور پھر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے پر تولنے لگے۔ اُدھر حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے شتر سواروں کے مدینہ واپس آتے ہی دوسرے حملے کا انتظام کیا اور راتوں رات کوچ کر کے علی الصباح مرتدین پر چھاپہ جا مارا۔ سردارِ لشکر حبال (جو طلیحہ مدعی نبوت کا بھائی تھا) مارا گیا اور باقی لشکر بدحواس ہو کر بھاگ اٹھا۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے ذوالقصہ تک ان کا تعاقب کیا اور پھر حضرت نعمانؓ بن مقرنؓ کو کچھ فوج کے ساتھ وہاں چھوڑ کر مدینہ واپس آ گئے۔ ان کی واپسی کے بعد مرتدین بنو ذبیان اور عبس نے موقع پا کر بہت سے مسلمانوں کو نہایت سفاکی سے شہید کر ڈالا۔ (ایک روایت میں ہے کہ ان ظالموں نے مسلمانوں کے اعضا کاٹے اور ان کو زندہ آگ میں جلایا) حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو ان مظالم کی خبر ہوئی تو انہوں نے قسم کھا کر فرمایا کہ جب تک مرتدین سے مسلمانوں کا انتقام نہ لے لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ اسی اثنا میں حضرت اسامہ بن زیدؓ اپنی مہم میں کامیاب ہو کر مدینہ واپس آ گئے۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے ان کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا اور خود ایک لشکر کے ساتھ مرتدین کے مقابلہ کے لیے نکلے۔ ابرق کے مقام پر عبس، ذبیان بکر اور ثعلبہ کے مرتدین ان کے مقابل ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کو شکست فاش دی اور ابرق سے بھگا دیا۔ خلیفۃؓ الرسول کے حکم کے مطابق ابرق کو (جو بنو ذبیان کا مسکن تھا) مجاہدین کے گھوڑوں کی چراگاہ بنا دیا گیا۔

مدینہ واپس آ کر حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے عرب کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مرتدین کے مکمل استیصال کے لیے عام فوج کشی کی تیاری کی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے

گیارہ لشکر مرتب فرمائے اور ان میں سے ہر لشکر کو مختلف علاقوں کے مرتدوں اور باغیوں کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔ حضرت خالدؓ بن ولید بھی ایک لشکر کے امیر مقرر ہوئے اور ان کو طلیحہ بن خویلد اسدی اور اس کے بعد مالک بن نویرہ بطاحی کی سرکوبی پر مامور کیا گیا۔(۱) حضرت خالدؓ اپنے لشکر کے ساتھ بزاخہ کی طرف بڑھے جو طلیحہ بن خویلد کا مستقر تھا۔ یہ شخص بنو اسد بن خزیمہ میں سے تھا اور شجاعان عرب میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے عہد رسالت میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن حجۃ الوداع کے بعد اس کے دماغ میں فتور پیدا ہوا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ بنو اسد اور بعض دوسرے قبائل کے بہت سے لوگ اس کے معتقد بن گئے۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے حضرت ضرارؓ بن اَزْوَر کو طلیحہ کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔ حضرت ضرارؓ نے ''واردات'' کے مقام پر طلیحہ کو شکست فاش دی۔ دورانِ جنگ میں ایک موقع پر طلیحہ حضرت ضرارؓ کے سامنے آ گیا۔ انہوں نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن وہ بچ گیا۔ اس پر اس کے معتقدین میں (شکست کھانے کے باوجود) مشہور ہو گیا کہ طلیحہ

---

(۱) دوسرے دس لشکروں کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ حضرت عِکرمہؓ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذّاب کی سرکوبی پر

۲۔ حضرت شُرحبیلؓ بن حسنہؓ کو حضرت عکرمہؓ کی امداد اور اس کے بعد کندہ اور حضرموت کے مرتدوں کی سرکوبی پر۔

۳۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو مرتدین قضاعہ کی سرکوبی پر۔

۴۔ حضرت خالد بن سعیدؓ کو سرحد شام کے مرتدوں کی سرکوبی پر۔

۵۔ حضرت حذیفہؓ بن محصن کو مرتدین دبا کی سرکوبی پر۔

۶۔ حضرت طریفہؓ بن حاجز کو بنو سلیم اور بنو ہوازن کے مرتدین کی سرکوبی پر۔

۷۔ حضرت سویدؓ بن مقرّن کو اہلِ تہامہ (یمن) کی سرکوبی پر۔

۸۔ حضرت علاءؓ حضرمی کو بحرین کے مرتدوں کی سرکوبی پر۔

۹۔ حضرت عرفجہؓ بن ہرثمہ کو مرتدین مہرہ کی سرکوبی پر۔

۱۰۔ حضرت مہاجرؓ بن امیّہ کو اسود عنسی کے پیروؤں کی سرکوبی پر مامور کیا گیا۔

ان لشکروں کی روانگی سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قاصدوں کے ذریعے ایک اعلان تمام مرتدوں کے پاس بھیج دیا، جس میں ان سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ سرکشی سے باز آ جائیں اور احکام اسلام کی پابندی اختیار کریں تو ان سے کوئی تعرّض نہیں کیا جائے گا ہر سپہ سالار کو بھی چلتے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک فرمان دیا جس میں ان کو مختلف ہدایات دی گئی تھیں مثلاً خدا سے ڈرتے رہو، گناہوں سے بچو، نیک کام کرو، جہاں پہنچو اذان دو۔ جواب میں اگر وہاں کے لوگ بھی اذان دیں تو ان پر حملہ نہ کرو۔ خلاصہ یہ کہ بغیر اتمام حجت کسی پر ہتھیار نہ اٹھاؤ۔

کے جسم پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔ اُدھر سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہو گیا اور حضرت ضرارؓ بن ازور مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ ان کی واپسی کے بعد طلیحہ کا زور پھر بڑھ گیا اور اسد، عبس، غطفان، ذبیان اور طے کے قبائل اس کے ساتھ ہو گئے، البتہ طے کے سردار حضرت عدیؓ بن حاتم اسلام پر قائم رہے۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے قبیلے کی گمراہی سے آگاہ کیا تو انہوں نے حضرت خالدؓ کی روانگی سے پہلے حضرت عدیؓ کو ان کے قبیلے میں بھیج دیا کہ وہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو سمجھا بجھا کر اسلام میں واپس لانے کی کوشش کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ خالدؓ ان کو تباہ و برباد کر دیں۔

حضرت عدیؓ نے اپنے قبیلے میں پہنچ کر سب لوگوں کو جمع کیا اور ان کو فہمائش کی کہ اسلامی لشکر یہاں آیا ہی چاہتا ہے بہتر یہ ہے کہ تم اس کی آمد سے پہلے اسلام میں واپس آ جاؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ان لوگوں نے کچھ ردّ و قدح کے بعد حضرت عدیؓ کی بات مان لی اور وعدۂ اطاعت کے ساتھ ان سے درخواست کی کہ ہم کو تین دن کی مہلت دی جائے تا کہ ہم اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو جو طلیحہ کے لشکر میں شامل ہیں، واپس لے آئیں ورنہ اس وقت ہمارے اعلان اطاعت کی مصیبت اُن پر پڑے گی، طلیحہ ان کو مروا ڈالے گا یا قید میں ڈال دے گا۔ حضرت عدیؓ ان کے کہنے کے مطابق حضرت خالدؓ کے پاس گئے اور ان کو تین دن تک بنو طے کی طرف آنے سے روک دیا۔ اس اثنا میں قبیلہ طے کے آدمی اپنے ساتھیوں کو طلیحہ کے لشکر سے کوئی حیلہ بنا کر واپس لے آئے اور پھر سب دوبارہ مسلمان ہو کر حضرت خالدؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے قبیلہ جدیلہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عدیؓ نے ان سے کہا، قبیلہ طے ایک پرندہ کی مانند ہے، جس کا ایک بازو (پر) جدیلہ ہے۔ آپ ذرا توقف کریں تا کہ میں ان کو بھی دوبارہ اسلام میں واپس لانے کی کوشش کروں، جس طرح قبیلہ طے کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے شاید ان کو بھی دے دے۔ حضرت خالدؓ نے حضرت عدیؓ کی درخواست بہ خوشی منظور کر لی۔ چنانچہ حضرت عدیؓ قبیلہ جدیلہ کے پاس گئے اور اپنی سعی بلیغ سے ان لوگوں کو بھی دوبارہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح ان کے ایک ہزار سوار اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے حضرت عکاشہؓ بن محصن اور حضرت ثابتؓ بن اقرم

انصاری کو دشمن کی ٹوہ لینے کے لیے بزاخہ کی طرف بھیجا۔ اتفاق سے ان کو طلیحہ کا ایک بھائی مل گیا انہوں نے اس کو قتل کر ڈالا (بعض روایتوں میں اس کا نام حبال بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کچھ دوسری روایتوں کے مطابق حبال اس وقت قتل ہوا جب مرتدین نے اس کی قیادت میں مدینہ منورہ پر حملہ کیا)۔ طلیحہ کو معلوم ہوا تو وہ اپنے دوسرے بھائی سلمہ کو لے کر نکلا۔ سلمہ نے حضرت ثابتؓ کو اور طلیحہ نے حضرت عکاشہؓ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت خالدؓ پیش قدمی کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو ان دونوں کی لاشیں دیکھ کر قبیلہ طے میں واپس آ گئے کیوں کہ طلیحہ کے حالات معلوم کیے بغیر اس پر کاری ضرب نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ چند دن وہاں قیام کے بعد انہوں نے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر لیا اور قبیلہ طے سے مزید مدد مانگی۔ انہوں نے کہا کہ بنو قیس کے مقابلے میں تو ہم آپ کو مزید مدد دے سکتے ہیں لیکن بنو اسد سے آپ خود نبٹیں کیوں کہ وہ ہمارے حلیف ہیں۔

حضرت عدیؓ بن حاتم کو اپنے قبیلے کی یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے کہا، خدا کی قسم میں تو بنو اسد کے خلاف جہاد کرنے سے باز نہ رہوں گا جب وہ اسلام کے دشمن ہو گئے تو ہمارے حلیف کہاں رہے؟

حضرت خالدؓ لوگوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے حضرت عدیؓ سے کہا، بنو قیس اور بنو اسد کسی سے بھی لڑنا جہاد ہی ہے اس لیے تم اپنی قوم کی رائے کی مخالفت نہ کرو اور جس سے وہ خوشی کے ساتھ لڑنا چاہیں اسی کے مقابلے پر جاؤ۔

اب حضرت خالدؓ طلیحہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے بزاخہ کی طرف بڑھے۔ طلیحہ کے لشکر میں عیینہ بن حصن فزاری بھی بنو فزارہ کے سات سو مرتدین کے ساتھ شریک تھا۔ حضرت خالدؓ بزاخہ پہنچے تو عیینہ بن حصن اپنے قبیلے کے ساتھ ان کے مقابل ہوا اور فریقین میں گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ طلیحہ ایک طرف (لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے) وحی کے انتظار کے حیلہ سے چادر اوڑھ کر بیٹھ گیا۔ جب عیینہ نے اپنے لشکر میں کمزوری کے آثار پائے تو دوڑ کر طلیحہ کے پاس آیا اور پوچھا:

''جبریلؑ آئے یا نہیں؟''

اس نے کہا ''نہیں''

عیینہ یہ سن کر پھر لڑنے چلا گیا۔ جب مسلمانوں کا دباؤ اور بڑھ گیا تو دوبارہ طلیحہ کے

پاس آیا اور پوچھا، جبریلؑ آئے؟ طلیحہ نے کہا، ابھی تک نہیں آئے۔ عیینہ نے کہا، ہماری مصیبت انتہا کو پہنچ گئی، آخر جبریلؑ کب تک آئیں گے؟ یہ کہہ کر پھر میدانِ جنگ میں چلا گیا۔ اب مرتدین پر حضرت خالدؓ کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ان کو اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی۔ عیینہ تیسری مرتبہ دوڑا دوڑا طلیحہ کے پاس آیا اور پوچھا، اب بھی جبریلؑ آئے یا نہیں؟ طلیحہ نے کہا، ہاں آئے تھے۔

عیینہ نے کہا، کیا وحی لائے؟

طلیحہ نے کہا، وحی لائے کہ

"ان لک رحاکرحاہ وحدیثاً لا تنساء"

(یعنی تیرے پاس بھی اسی قسم کی چکی ہے جیسی کہ مسلمانوں کے پاس ہے اور تیرا ذکر بھی ایسا ہے جسے تو کبھی نہیں بھولے گا۔ بالفاظ دیگر تمہیں بھی ویسا ہی معرکہ درپیش ہے جیسا مسلمانوں کو اور اس لڑائی کے واقعات تمہیں کبھی نہیں بھولیں گے۔)

عیینہ یہ سن کر غضب ناک ہو گیا اور کہا:

"قد علم اللہ سیکون حدیثا لا تنساء"

(بے شک اللہ جان گیا کہ عنقریب ایسی بات ہونے والی ہے، جس کو تو کبھی نہ بھولے گا)۔

یہ کہہ کر وہ میدان جنگ میں آیا اور چلّا کر کہا:

"اے بنی فزارہ، خدا کی قسم طلیحہ نبی نہیں بلکہ محض ایک جھوٹا آدمی ہے۔ میں جا رہا ہوں تم بھی لڑائی سے ہاتھ کھینچ لو اور اپنے قبیلے میں واپس جاؤ۔"

بنو فزارہ یہ آواز سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ باقی لوگوں میں سے کچھ شکست کھا کر بھاگے اور کچھ مسلمان ہو گئے۔ طلیحہ نے پہلے سے گھوڑا تیار کر رکھا تھا اس پر اپنی بیوی کے ساتھ سوار ہو کر بھاگا اور اپنے پیروؤں سے کہتا گیا کہ تم میں سے جو بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر فرار ہو سکے وہ فرار ہو جائے۔ اس طرح دم کے دم میں میدان صاف ہو گیا۔ طلیحہ نے بنو کلب میں جا کر پناہ لی۔ بعد میں طلیحہ نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا اور حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ایرانیوں

کے خلاف متعدد لڑائیوں میں سرفروشانہ حصہ لے کر اپنی لغزش کی تلافی کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے ہی کسی معرکے میں وہ نہایت بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

(ح)

بزاخہ سے طلیحہ کا فرار بڑے دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا اور متعدد قبائل (بنو عامر بن صعصعہ، بنو سلیم، بنو ہوازن، بنو کعب وغیرہ) ارتداد سے توبہ کر کے دوبارہ اسلام کے دست و بازو بن گئے۔ درحقیقت ان قبائل کی نظریں طلیحہ کے انجام پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اس انتظار میں تھے کہ کون سا فریق غالب آتا ہے۔ طلیحہ کی شکست سے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور انہوں نے حضرت خالدؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت کا اظہار کیا اور اس حلفیہ عہد پر ان کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم نماز پڑھیں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ انہی امور پر ہم اپنے اہل و عیال کی طرف سے بھی بیعت کرتے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے بیعت لے کر ان سب کو امن دے دیا۔

اسد، غطفان اور ان کے حامی قبائل کو توبہ کرنے پر حضرت خالدؓ نے اس شرط پر معافی دی کہ وہ اپنے اُن لوگوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں، جنہوں نے ارتداد کی حالت میں بہت سے مسلمانوں کو نہایت سفاکی سے شہید کر ڈالا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ حضرت خالدؓ کے سامنے حاضر کیے گئے۔ انہوں نے ان کو قتل کرا ڈالا، البتہ ان کے دو سرداروں قرۃ بن ہبیرہ اور عیینہ بن حصن فزاری کو گرفتار کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے ان کو بھی قتل کرا دیا اور بعض کے مطابق ان کو معافی دے دی۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے بزاخہ میں ایک ماہ قیام کیا۔ اس عرصے میں وہ امن و امان قائم کرنے اور زکوٰۃ جمع کرنے میں مصروف رہے۔ اسی دوران میں ان کو اطلاع ملی کہ بنو فزارہ کی ایک عورت اُمِّ زمل سلمیٰ بنتِ مالک بن حذیفہ ایک جمعیت کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کر رہی ہے۔ یہ عورت عہد رسالتؐ میں گرفتار ہو کر مدینہ آئی تھی اور اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سفارش پر آزاد کر دی گئی تھی۔ وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں واپس گئی اور وہاں جا کر مرتد ہو گئی۔ طلیحہ کے شکست خوردہ لشکر کے کچھ لوگوں نے اس کے پاس جا کر پناہ لی۔ مرتدین

کا ایک گروہ پہلے ہی اس کے ساتھ تھا۔ اس طرح ایک بڑا لشکر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا۔ حضرت خالدؓ اس کی سرکوبی کے لیے حوأب کی طرف بڑھے جہاں اُمِّ زمل مقیم تھی۔ وہ خود اونٹ پر سوار ہو کر مقابلہ کے لیے نکلی۔ مرتدین نے اس کے اونٹ کے گرد جمع ہو کر سخت مقابلہ کیا۔ اُمِّ زمل بھی بڑی بہادری سے لڑی اور اس کے جوش دلانے پر لاتعداد مرتدین نے پروانہ وار اس پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ بالآخر مسلمانوں نے اونٹ کی کونچیں کاٹ کر اسے زمین پر گرا دیا اور اُمِّ زمل کو قتل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام مرتدین بھاگ کھڑے ہوئے۔

طلیحہ اور اُمِّ زمل کی سرکوبی کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید، مالک بن نویرۃ الیربوعی سے نبٹنے کے لیے بطاح کی طرف بڑھے۔ مالک بن نویرہ بنو تمیم کی شاخ بنو ثعلبہ بن یربوع کا سردار تھا۔ اس نے عہدِ رسالت میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضورؐ نے بنو تمیم کی مختلف شاخوں کے امیر مقرر فرمائے تو مالک بن نویرہ کو بنو ثعلبہ بن یربوع کا امیر مقرر فرمایا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد فتنۂ ارتداد نے زور پکڑا تو مالک بن نویرہ نے عجیب رویہ اختیار کیا۔ وہ نہ بالکل مرتد تھا اور نہ پکا مسلمان۔ اس کی روش دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ مسلمان کامیاب ہوں تو مسلمان ہی رہے اور مرتدین کو کامیابی ہو تو مرتد ہو جائے۔ اس کے خلاف کارروائی کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ اس نے زکوٰۃ نہیں بھیجی تھی حالاں کہ بنو تمیم کی دوسری شاخوں کے سرداروں زبرقانؓ بن بدر، صفوان بن صفوان اور وکیع بن مالک وغیرہ نے زکوٰۃ کی رقمیں بارگاہِ خلافت میں ارسال کر دی تھیں۔ مالک بن نویرہ نے چند دن پہلے نبوت کی ایک جھوٹی دعویدار سجاح کا ساتھ دیا تھا اور مرتدین کی آمد و رفت بھی اس کے پاس رہتی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ اس نے رحرحان کے چشمے کے قریب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ زکوٰۃ کے اونٹوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹ لیا تھا۔ حملے کے وقت وہ پکار پکار کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا:

''یہ اونٹ تمہارا مال ہیں انہیں لوٹ لو اور کچھ پروا نہ کرو کہ کل کیا ہوگا۔''

جب سجاح، مسیلمہ کذّاب سے الگ ہو کر اپنے قبیلے میں واپس چلی گئی اور بنو تمیم کے بیشتر لوگ توبہ کر کے پھر مسلمان ہو گئے تو مالک بن نویرہ بہت گھبرایا اور مرتدین کو جو اس کے ہاں جمع رہتے تھے اپنے ہاں آنے جانے سے منع کر دیا۔ حضرت خالدؓ نے بطاح پہنچ کر مجاہدین کی ایک جماعت علاقے کے مختلف دیہات کی طرف بھیجی اور اس کو ہدایت کی کہ جس بستی میں پہنچو

وہاں پہلے اذان دینا اگر جواب میں اس بستی کے لوگ بھی اذان دیں تو ان سے کوئی تعرض نہ کرنا اور اگر کوئی جواب نہ دیں اور تمہارے مزاحم ہوں تو ان سے جنگ کرنا۔ جب یہ جماعت گشت کرتی ہوئی مالک بن نویرہ کی بستی کے قریب پہنچی اور اذان دی تو بستی کے ردعمل کے بارے میں مجاہدین میں اختلاف پیدا ہو گیا کچھ اصحاب کہتے تھے کہ جواب میں ہم نے بستی سے اذان کی آواز سنی ہے۔ بعض دوسروں کا بیان تھا کہ بستی والوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ وہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے حضرت خالدؓ کے سامنے لائے اور تمام واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ فی الحال ان کو زیرِ حراست رکھو۔ کل صبح ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ رات کو سخت سردی تھی۔ حضرت خالدؓ نے قیدیوں کے بارے میں حکم دیا:

دافئوا أسراکُمْ

(اپنے قیدیوں کو حرارت پہنچاؤ)

بعض عرب قبائل کی زبان میں ان الفاظ کے یہ معنی بھی ہو سکتے تھے کہ اپنے قیدیوں کو قتل کر دو۔ مشہور صحابی حضرت ضرارؓ بن ازور نے یہی سمجھا اور مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا۔ حضرت خالدؓ نے سنا تو کہا ''اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔''

ایک اور روایت کے مطابق مالک بن نویرہ کا قتل حضرت خالدؓ سے بدکلامی اور شانِ رسالت میں گستاخانہ گفتگو کے نتیجے میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت خالدؓ سے گفتگو کرتے وقت سرورِ عالم ﷺ کے بارے میں بار بار ''صاحِبُکَ'' (تمہارے صاحب) کے الفاظ دہرائے یعنی، تمہارے صاحب یہ کہتے تھے، تمہارے صاحب نے تمہیں یہی حکم دیا ہے وغیرہ۔ حضرت خالدؓ کو اس پر بڑا غصہ آیا اور انہوں نے فرمایا: ''کیا رسول اللہ ﷺ تمہارے صاحب نہیں؟

اس کے بعد دونوں میں بڑی تلخ اور تیز گفتگو ہوئی۔ مالک بن نویرہ کے اندازِ گفتگو سے حضرت خالدؓ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت سے انکاری اور اسلام سے منحرف ہو چکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو قتل کرا دیا۔

حضرت ابوقتادہ انصاریؓ بھی حضرت خالدؓ کے لشکر میں شامل تھے ان کو مالک بن نویرہ کا قتل ناگوار گزرا کیوں کہ ان کے خیال میں مالک کی بستی سے اذان کی آواز آئی تھی اس لیے اس کا

قتل جائز نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خفا ہو کر مدینہ منورہ چلے آئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حضرت خالدؓ کی شکایت کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ کو مدینہ منورہ بلا کر باز پرس کی۔ انہوں نے سارا واقعہ بلاکم و کاست عرض کر دیا۔ خلیفۃؓ الرسولؐ نے ان کا عذر قبول فرما لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے حضرت ابوقتادہؓ کے موقف کی تائید کی اور حضرت خالدؓ کو معزول کرنے اور ان سے قصاص لینے پر اصرار کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ فرما کر معاملہ ختم کر دیا کہ "**لا اشیم سیفاً سله الیه علی الکٰفرین**" (جس تلوار کو اللہ نے کفار پر کھینچا ہو میں اس کو نیام میں نہیں کر سکتا۔) البتہ انہوں نے مالک بن نویرہ کے وارثوں کو بیت المال سے ان کا خون بہا ادا کر دیا۔ گویا حضرت خالدؓ سے اس معاملہ میں اگر کوئی زیادتی ہوئی بھی تھی تو وہ ان کی اجتہادی غلطی تھی اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں بری الذمہ قرار دیا۔

۸

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فتنۂ رِدّہ کے سلسلے میں حضرت خالدؓ بن ولید کو جو کام سونپا تھا جب وہ اسے کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے تو دربارِ خلافت سے حکم ملا کہ اب مسیلمہ کذّاب کی سرکوبی بھی تمہارے ذمہ ہے۔

مسیلمہ بن حبیب کا تعلق یمامہ (نجد) کے قبیلہ بنو حنیفہ سے تھا۔ عہدِ رسالت کے اواخر میں وہ بنوحنیفہ کے وفد کے ساتھ مدینہ منورہ آیا اور سرورِ عالم ﷺ سے ملاقات کے دوران میں کہا کہ اگر آپ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیں تو میں ابھی آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔

حضورؐ کے دستِ مبارک میں ایک چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس کو اٹھا کر فرمایا:

> "جانشینی تو بڑی چیز ہے، میں تو تمہیں یہ چھڑی دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ اللہ نے تیرے لیے جو مقدر کر رکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ مسیلمہ مسلمان ہو گیا لیکن اپنے قبیلہ میں واپس جا کر مرتد ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں بھی نبی ہوں اور محمد ﷺ نے اپنی نبوت میں مجھے حصہ دار بنا لیا ہے۔ اسی دروغ گوئی کی وجہ سے وہ کذّاب کہلاتا ہے۔ یمامہ سے اس نے حضورؐ کی خدمت میں یہ خط لکھا:

> "مسیلمہ رسول خدا کی طرف محمدؐ رسول خدا کی طرف السلام علیک۔

میں آپ کے کام میں شریک ہوا۔ نصف ملک میرا اور نصف قریش کا لیکن قریش ایک زیادتی پسند قوم ہے۔''

حضورؐ نے اس کو یہ جواب بھیجا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد رسول اللہ کا خط مسیلمہ کذّاب کے نام

''جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو اس کے بعد تجھ کو معلوم ہو کہ ملک اللہ کا ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بنا دے اور آخرت کی بھلائی پرہیزگاروں کے لیے ہے۔''

یہ خط بھیجنے کے جلد ہی بعد سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہو گیا۔ اب مسیلمہ نے بڑے زور شور سے اپنی نبوت کا پرچار شروع کر دیا۔ شرفائے بنو حنیفہ میں سے ایک شخص نہار الرجال ایاس بن عفوۃ تھا۔ وہ قبول اسلام کے بعد یمامہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلا گیا تھا اور حضورؐ کی خدمت اقدس میں قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کر کے حضورؐ کی طرف سے اہل یمامہ کا معلّم مقرر ہوا تھا۔ یہ بد بخت یمامہ پہنچ کر مسیلمہ سے مل گیا اور علی الاعلان شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے خود سنا ہے کہ مسیلمہ میری نبوت میں شریک ہے۔ اس سے ہزاروں لوگ گمراہ ہو گئے اور مسیلمہ کے دعویٰ کو تسلیم کر لیا۔ مسیلمہ نے بہت سی مسجّع مہمل عبارتیں تصنیف کی تھیں جو لوگوں کو سناتا اور کہتا کہ یہ وحی ہے۔ اپنی شعبدہ بازی کے زور سے بعض عجیب باتیں بھی ظاہر کرتا تھا اور ان کو اپنا معجزہ بتاتا تھا۔ شراب اور بدکاری کو حلال قرار دیتا تھا۔ اس طرح مسیلمہ کی قوت روز بروز بڑھتی گئی۔ بارگاہِ خلافت سے دو لشکر مسیلمہ کی سرکوبی پر مامور ہوئے تھے۔ ایک حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کی قیادت میں اور دوسرا حضرت شُرَحبیلؓ بن حسنہؓ کی سرکردگی میں۔ ان دونوں لشکروں نے مل کر مسیلمہ پر حملہ کرنے کی بجائے الگ الگ اس سے مقابلہ کیا اور ہزیمت اٹھائی۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو ان کی ناکامی کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت عکرمہؓ اور حضرت شُرَحبیلؓ کو دوسری مہموں پر مامور فرمایا اور حضرت خالدؓ کو حکم دیا کہ وہ مسیلمہ کا مقابلہ کریں۔ ساتھ ہی ان کی مدد کے لیے مہاجرین اور انصار پر مشتمل تازہ دم جمعیت روانہ کی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید مالک بن نویرہ کے قتل کے سلسلہ میں جواب دہی کر کے مدینہ منورہ سے چلنے لگے تو

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں مسیلمہ سے لڑنے کے لیے یمامہ جانے کا حکم دیا اور مہاجرین و انصار کی ایک جمعیت ان کے ساتھ کر دی۔ مہاجرین کے امیر حضرت زیدؓ بن خطاب (حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی) اور انصار کے امیر حضرت ثابتؓ بن قیس انصاری تھے۔ حضرت خالدؓ یمامہ پہنچے تو مسیلمہ کے جھنڈے تلے چالیس ہزار آدمی جمع ہو چکے تھے۔ اس نے حضرت خالدؓ کی آمد کی خبر سنی تو آگے بڑھ کر عقرباء (یمامہ کی ایک بستی) کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ حضرت خالدؓ بھی اپنے لشکر کے ساتھ وہیں پہنچ گئے۔ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو سب سے پہلے نہار الرجال ایاس بن عنفوۃ میدان میں نکلا اور مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔ حضرت زیدؓ بن خطّاب اس کے مقابلے پر گئے اور تھوڑی ہی دیر میں اس کو قتل کر ڈالا۔ اب عام لڑائی شروع ہوگئی۔ مسیلمہ کے بیٹے شُرحَبیل نے اپنے قبیلے کو خطاب کر کے کہا، اے بنو حنیفہ آج قومی غیرت وحمیت کا دن ہے سر بکف ہو کر لڑو، اگر مسلمان تم پر غالب آ گئے تو تمہارے اہل وعیال ان کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ اس لیے اپنے ننگ وناموس کی حفاظت کرو۔

شُرحَبیل کی للکار نے بنو حنیفہ کو شعلۂ جوالہ بنا دیا اور وہ اس تندی اور تیزی کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے کہ وہ ہزار جتن کے باوجود اپنی صفیں قائم نہ رکھ سکے اور پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

مؤرّخ طبری نے لکھا ہے **لم یلق المسلمون حرباً مثلها قط** یعنی مسلمانوں کو اس سے زیادہ سخت معرکہ کبھی پیش نہیں آیا۔ اس نازک موقع پر مسلمان افسروں نے محیّر العقول شجاعت، پامردی اور عزم واستقلال کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے بیشتر نے مردانہ وار دینِ حق پر اپنی جانیں قربان کر دیں[1] ان کو دیکھ کر مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے اور وہ تازہ جوش اور ولولے کے ساتھ مرتدین کا مقابلہ کرنے لگے۔ اس وقت حضرت خالدؓ نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ اس مقام تک پیچھے ہٹ گیا جہاں مسیلمہ کا مشہور سردار محکم

---

(۱) چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

حضرت عمار بن یاسرؓ کا ایک کان لڑائی میں شہید ہو گیا جو سامنے ہی زمین پر پھڑک رہا تھا لیکن وہ بے پروائی کے ساتھ حملے پر حملہ کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے قدم اکھڑتے دیکھے تو ایک بلند چٹان پر کھڑے ہو کر للکارے: ”اے مسلمانو! کیا جنت سے بھاگ رہے ہو۔“

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بن طفیل اپنے قبیلے کو لیے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو غیرت دلائی اور مسلمانوں پر بڑے زور کا جوابی حملہ کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اس پر تاک کر تیر چلایا جو اس کی گردن میں پیوست ہو گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس سے مسلمانوں کی ہمت اور بڑھی اور انہوں نے ہلّہ کر کے مرتدین کو بہت پیچھے دھکیل دیا۔ لڑائی کی اب یہ کیفیت تھی کہ دونوں فریق سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ کبھی ایک پیچھے ہٹ جاتا کبھی دوسرا۔ اس وقت حضرت خالدؓ نے حکم دیا کہ ہر قبیلہ الگ الگ ہو جائے اور اپنے اپنے نشان کے نیچے لڑے تا کہ معلوم ہو کہ ہماری کمزوری کس قبیلے کی وجہ سے ہے۔ اس تدبیر کا بہت اچھا نتیجہ نکلا۔ ہر قبیلہ اپنی غیرت وحمیت برقرار رکھنے کے لیے نہایت بے جگری سے لڑنے لگا لیکن مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں کے باوجود مسیلمہ ثابت قدم رہا۔ حضرت خالدؓ نے سمجھ لیا کہ جب تک مسیلمہ نہ مارا جائے گا، کامیابی مشکل ہے وہ دشمن کی صفوں کو چیرتے مسیلمہ کے

حضرت قیسؓ بن ثابت انصاری نے پکار کر کہا، اے گروہِ مسلمانان تم نے اپنے نفوس کو بری عادت سکھائی۔ اے اللہ میں اہل یمامہ کے معبود سے اور مسلمانوں کی پسپائی سے بریت کا اظہار کرتا ہوں، مسلمانو! دیکھو کہ حملہ یوں کیا کرتے ہیں۔

یہ کہہ کہ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک دشمن کے وار سے ان کا پاؤں کٹ گیا۔ وہی کٹا ہوا پاؤں لے کر اس زور سے مارا کہ اپنے حریف کو ہلاک کر ڈالا اور خود بھی شہید ہو گئے۔

حضرت زید بن خطّابؓ نے پیچھے ہٹتے ہوئے مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا:

''مسلمانو خیموں سے ہٹ کر کہاں جاؤ گے واللہ آج میں اس وقت تک نہیں بولوں گا جب تک دشمن کو شکست نہ دے دوں یا اللہ کے سامنے پہنچ کر اپنی معذرت نہ پیش کروں۔ اے لوگو! سختیاں برداشت کرو، ڈھالیں تھام لو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو، آگے بڑھو، مسلمانو تم خدا کی جماعت ہو اور تمہارے دشمن شیطانی لشکر۔ عزّت اللہ، اللہ کے رسولؐ اور اس کی جماعت کے لیے ہے۔ میری مثال کی پیروی کرو، جو میں کرتا ہوں وہی تم کرو۔'' یہ کہہ کر تلوار کھینچ کر دشمن پر جا پڑے اور شہادت پائی۔

حضرت ابو حذیفہؓ نے للکار کر کہا:

''یا اهل القرآن زینوا القرآن بالفعال''

(اے قرآن والو! اپنے عمل سے قرآن کی زینت بڑھاؤ۔)

یہ کہہ کر دشمن پر ہلّہ کیا اور شہید ہو گئے۔

مہاجرین کے علم بردار حضرت سالمؓ مولیٰ ابو حذیفہؓ ایک گڑھا کھود کر اس میں پاؤں جما کر کھڑے ہو گئے اور للکارے ''مسلمانو! رسول اللہ ﷺ کی ہم رکابی میں تو ہم اس طرح میدان نہیں چھوڑتے تھے۔'' اتنے میں مرتدوں کا ایک زبردست ریلا آیا۔ حضرت سالمؓ اس جوش سے لڑے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ ایک ہاتھ شہید ہو گیا تو دوسرے میں علم تھام لیا۔ دوسرا بھی کٹ گیا تو دست بریدہ بازوؤں کا حلقہ بنا کر علم کو سینے سے چمٹا لیا اور اسی حالت میں شہید ہو گئے۔

قریب پہنچ گئے اور اس کو مقابلہ کے لیے للکارا۔ اس نے ادھر دیکھا تو حضرت خالدؓ نے اس کے سامنے شرائطِ صلح پیش کرنی شروع کیں۔ مسیلمہ ہر شرط پر منہ اس طرح پھیر لیتا یا جھکا لیتا گویا وحی کا منتظر ہے۔ حضرت خالدؓ اسی حالت میں اس پر جھپٹ پڑے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو حملے کے لیے للکارا۔ مسیلمہ بدحواس ہو کر بھاگا اور اپنے باغ ''حدیقۃ الرحمٰن'' میں گھس گیا۔ اس کا لشکر بھی باغ میں داخل ہو گیا اور اس کی چار دیواری کا دروازہ بند کر لیا۔ مسلمانوں میں حضرت انسؓ بن مالک (خادم رسول اللہ ﷺ) کے بھائی حضرت براءؓ بن مالک بھی موجود تھے، ان کی عجیب عادت تھی، جب ان کو جوش آتا تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا، کئی آدمی ان کو دبا لیتے جب لرزہ ختم ہوتا تو وہ شیر کی طرح دشمن پر حملہ آور ہوتے۔ اس لڑائی میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوئی۔ دشمن کو مارتے کاٹتے آگے بڑھ رہے تھے کہ باغ کی چار دیواری ان کے راستے میں حائل ہو گئی۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا، مجھ کو اٹھا کر باغ کے اندر پھینک دو۔ مسلمانوں نے کہا، ایسا نہیں ہو سکتا اس طرح تو آپ دشمن کے قابو میں آ جائیں گے۔ حضرت براءؓ نے قسم دے کر کہا، مجھے باغ میں اتار دو۔ آخر مسلمانوں نے ان کو دیوار پر چڑھا دیا اور وہ باغ میں کود پڑے۔ بے شمار مرتد ان پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ لڑتے بھڑتے باغ کے پھاٹک تک پہنچ گئے اور اس کو کھول دیا۔ اسلامی لشکر جو باہر کھڑا تھا اندر داخل ہو گیا اور فریقین میں خوفناک جنگ ہونے لگی۔ حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کو للکار کر کہا، مسلمانو! ثابت قدم رہو بس تمہارے ایک اور ہلّے کی دیر ہے کہ دشمن تباہ ہو گیا۔ اس للکار پر مسلمانوں نے اس قیامت کا حملہ کیا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے۔ مسیلمہ بھاگنے لگا تو اس کے ساتھیوں نے کہا، تیرا وہ وعدہ کیا ہوا جو تیرا خدا تجھ سے کیا کرتا تھا۔ اس نے کہا یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے۔ اپنا ننگ و ناموس بچانا ہے تو بچا لو۔ اس وقت دو حربے اس پر ایک ساتھ پڑے۔ ایک وحشیؓ بن حرب نے پھینکا تھا اور دوسرا حضرت عبداللہؓ بن زید بن عاصم انصاری نے، جن کے بھائی حضرت حبیبؓ بن زید کو کچھ عرصہ پہلے مسیلمہ نے نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا تھا۔ یہ حربے پڑتے ہی مسیلمہ ہلاک ہو گیا اور مرتدین بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسیلمہ کذّاب کا قتل فی الحقیقت حروب ردّہ کا خاتمہ تھا۔ اس لڑائی میں جو ''جنگ یمامہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ مرتدین کے دس ہزار (بہ روایت دیگر اکیس ہزار) آدمی مارے گئے اور جس جگہ وہ قتل ہوئے اس

کا نام ''حدیقة الموت'' مشہور ہو گیا۔ مسلمان شہدا کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی ان میں تین سو مہاجرین وانصار تھے اور سات سو کلام اللہ کے حفّاظ تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک قاصد کو فتح کی خوش خبری دے کر مدینہ منورہ بھیجا، اس کے ساتھ بنو حنیفہ کا ایک وفد بھی تھا۔ حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے اس وفد کے اراکین سے فرمایا، افسوس تمہارے حال پر تم کس طرح مسیلمہ کذّاب کے فریب میں آ گئے؟ انہوں نے ندامت کا اظہار کیا اور معافی کی التجا کی۔ حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے فرمایا، آخر اس کی تعلیم کیا تھی؟

انہوں نے کہا، اس کی وحی کا نمونہ یہ ہے:

یا ضفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین۔
لنا نصف الارض ولقریش نصفٌ ولکنّ قریشاً قَومٌ یعتدون۔

(اے مینڈک تو پاک ہے پاک۔ نہ پانی پینے والوں کو روکتا ہے نہ پانی کو گدلا کرتا ہے۔ آدھا ملک ہمارا اور آدھا قریش کا، لیکن قریش تو ایک ظالم قوم ہے۔)

حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے یہ خرافات سن کر فرمایا:

''سبحان اللہ، تمہارے حال پر افسوس، یہ کلام جس میں مطلق شانِ ربّانی نہیں۔ تم کو کہاں کھینچ لے گیا۔''

یہ وفد مدینہ منورہ سے واپس جانے لگا تو حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے ان کو ہدایت کی کہ اب ہمیشہ اسلام پر قائم رہنا اور ایسے کام کرنا، جن سے خدا اور رسول راضی ہو جائیں۔

فتنۂ رِدّہ کے خاتمے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید یمامہ کی ایک وادی الوبر میں مقیم ہو گئے۔ وہیں چند دن کے بعد (۱۲ محرم ۱۲ ہجری کو) حضرت ابو بکر صدّیقؓ کا حکم ملا کہ مثنّیٰؓ بن حارثہ کی مدد کے لیے عراقِ عرب روانہ ہو جاؤ اور اُبُلّہ کی سرحد سے یلغار شروع کر دو۔

۹

حضرت ابو بکر صدّیقؓ عرب کے داخلی خلفشار (فتنۂ رِدّہ) پر قابو پا چکے تو انہوں نے فوراً اپنی توجہ ان دو زبردست بیرونی دشمنوں کی طرف مبذول کی جو اسلام کی تباہی کی فکر میں تھے یعنی

روم اور فارس (ایران)۔خلیفۃ الرسولؐ کے نزدیک اسلام کے ان بیرونی دشمنوں سے نبٹنا کس قدر اہمیت کا حامل تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ایک صحابی نے اپنے قبیلے کا کوئی معاملہ پیش کرنا چاہا تو انہوں نے غصہ ہو کر جواب دیا کہ میں تو ان دو شیروں کے زیر کرنے کی فکر میں ہوں، جو مسلمانوں کی تاک میں ہیں اور تم مجھے معمولی کاموں میں الجھاتے ہو۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب (مملکت اسلامیہ) کی شمالی سرحد اُس دور کی دو عظیم الشان سلطنتوں کی سرحدوں سے ملتی تھی۔عراق سے مشرق کی طرف کا علاقہ (شام) رومۃ الکبریٰ کی بازنطینی سلطنت کے زیر نگین تھا اور مغرب کی طرف کا علاقہ ایرانی شہنشاہیت کے زیر تسلّط تھا۔ عراق سے متصل علاقے میں آباد عرب قبائل ایرانی سلطنت کے باجگزار یا زیر اثر تھے اور شام سے ملحق علاقے میں بسنے والے عربی قبائل رومی حکومت کی اطاعت اور حمایت کا دم بھرتے تھے۔

ان دونوں سلطنتوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ عرب اپنی کوئی طاقتور اور ان کے اثر سے آزاد مملکت (حکومت) قائم کرلیں۔چنانچہ کسریٰ (شاہ ایران) اور قیصر (شاہ روم) دونوں کی آنکھوں میں عرب کی نوزائیدہ اسلامی مملکت خار کی طرح کھٹکتی تھی یہی سبب تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے خلاف معرکہ آرائی کا آغاز کیا۔

ایرانی حکومت کے باجگزار قبائل میں ایک قبیلہ ''بنوشیبان'' کا تھا۔ ۹ ہجری میں اس قبیلے نے اپنے ایک سردار مثنیٰؓ بن حارثہ شیبانی کی سرکردگی میں ایک وفد مدینہ بھیجا، جس نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کی۔ ۱۱ ہجری میں بحرین فتنۂ ارتداد کی لپیٹ میں آیا اور حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے حضرت علاء حضرمیؓ کو مرتدین بحرین کی سرکوبی کے لیے بھیجا تو جہاں ایرانی حکومت نے بحرین کے مرتدوں کی مدد کی وہاں ''بنوشیبان'' نے حضرت علاءؓ حضرمی کو بھرپور امداد دی۔ جب مرتدین کا پوری طرح استیصال ہوگیا اور اسلامی حکومت کا تسلّط پورے عرب پر بحال ہوگیا تو حضرت مثنیٰؓ نے اپنے قبیلے کو ساتھ لے کر ایرانی اقتدار کے خلاف زبردست جدوجہد شروع کردی۔اس جدوجہد کے کئی محرّکات تھے۔سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ایرانی حکّام اپنے زیر اثر عرب علاقوں کے باشندوں سے انسانیت سوز سلوک کرتے تھے۔ان کی فصلیں تیار ہوتیں تو ایرانی حکام آتے اور سارا غلّہ سمیٹ کرلے جاتے اور عربوں کو بخشش کے طور پر چند سکے دے جاتے۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ سلطنتِ ایران سیاسی خلفشار میں مبتلا ہوگئی تھی اور چار سال کے عرصے میں نو بادشاہ یکے بعد دیگرے تختِ ایران پر بیٹھ چکے تھے۔

تیسری چیز جس نے عربوں کو ایرانی ستم شعاروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حوصلہ بخشا، عرب میں ایک مضبوط (اسلامی) حکومت کو سخت پریشان کرتے رہے لیکن صدیوں پرانی ایک وسیع وعریض سلطنت کو چھاپہ مار جنگ کے ذریعے مغلوب کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے حضرت مثنیٰؓ نے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوکر ایران کے سیاسی خلفشار اور اپنی مہموں کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے اور درخواست کی کہ ان کی مدد کی جائے۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے ان کی باتیں بڑے غور اور ہمدردی کے ساتھ سنیں اور پھر اکابر صحابہؓ سے مشورہ کے بعد ان سے فرمایا کہ تم واپس جا کر بنوشیبان اور ان کے حلیف قبائل کو منظّم کرو، جلد ہی تمہیں کمک پہنچ جائے گی اس وقت تک تم ایرانیوں سے کسی بڑی جنگ میں الجھنے سے احتراز کرو۔ مثنیٰؓ کے جانے کے بعد حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو حکم بھیجا کہ مثنیٰؓ کی مدد کے لیے فوراً عراقِ عرب پہنچو اور اہلِ ایران کے خلاف مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔

حضرت خالدؓ رِدّہ کے سلسلے کی لڑائیوں سے تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے اور ان کے ماتحت لشکر کی تعداد بہت کم تھی کیوں کہ ایک ہزار آدمی جنگ یمامہ میں شہید ہو چکے تھے، ایک بڑی تعداد زخمیوں کی تھی اور بہت سے مسلمان اپنے قبائل میں واپس چلے گئے تھے۔ پھر خلیفۃ الرسولؐ کی یہ ہدایت بھی تھی کہ کسی ایسے آدمی کو لشکر میں شامل نہ کرو جو ایک دفعہ مرتد ہوکر دوبارہ مسلمان ہوا ہو۔ لیکن حضرت خالدؓ بڑے بلند حوصلہ جرنیل تھے اور خواہ حالات کیسے ہی کٹھن ہوں ان کی جبین ہمت پر شکن نہ آتی تھی۔ وہ صرف دو ہزار مجاہدین کے ساتھ اس مہم پر روانہ ہوگئے۔ راستے میں قبائل مضر و ربیعہ کے مزید آٹھ ہزار آدمی لشکر میں شامل کیے اور یوں وہ دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ عراق کی سرحد پر پہنچ گئے جہاں حضرت مثنیٰؓ نباج کے مقام پر آٹھ ہزار مجاہدین کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اس طرح اسلامی لشکر کی کل تعداد مل ملا کر اٹھارہ ہزار ہوگئی۔ اس سارے لشکر کی قیادت حضرت خالدؓ بن ولید نے سنبھال لی۔

عراقِ عرب کی ابتدائی لڑائیوں کی ترتیب کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت خالدؓ سب سے پہلے اُبُلّہ پہنچے جو ایران کی ایک اہم بندرگاہ تھی۔ وہاں عرب اور ہندوستان کے برّی اور بحری خطوط آ کر ملتے تھے اس لیے بڑی رونق رہتی تھی۔ اسی

مقام پر ایرانی افواج اور مجاہدین اسلام کے درمیان حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں پہلا معرکہ برپا ہوا، جس میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت خالدؓ بانقیا اور بارسوما (باروسما) کو مسخر کرتے ہوئے اُبُلّہ کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے انہوں نے وہاں کے حاکم ہُرمُز کو ایک خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ:

> ''اگر تم لوگ سلامتی چاہتے ہو تو اسلام قبول کرلو۔ اگر یہ منظور نہیں تو جزیہ دو اور مسلمانوں کی پناہ میں آجاؤ اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر جو نتیجہ ہوگا اس کے تم خود ذمہ دار ہوگے۔ میں ایک ایسی قوم اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں جو موت کو اتنا ہی پسند کرتی ہے جتنا تم زندگی کو پسند کرتے ہو۔''

ہرمز سلطنتِ ایران کے اوّل درجہ کے امرا میں سے تھا، جس کا نشان یہ تھا کہ وہ ایک لاکھ درہم کی قیمت کا تاج پہنتا تھا۔ وہ ایک انتہائی بدفطرت اور ظالم شخص تھا اور اپنے علاقے کے عربوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتا رہتا تھا اس لیے عرب اس سے سخت نفرت کرتے تھے یہاں تک کہ اگر انہیں کسی شخص کی خباثت کا ذکر کرنا ہوتا تو کہتے:

> ''فلاں شخص تو ہرمز سے بھی زیادہ شریر اور بدباطن ہے۔''

ہرمز کو حضرت خالدؓ کا خط ملا تو اس نے تمام حالات دربارِ ایران کو لکھ بھیجے اور خود ایک جرّار لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے بڑھا۔ ایرانیوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ ان کے کئی دستوں نے اپنے آپ کو آہنی زنجیروں سے ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ رکھا تھا تاکہ کچھ بھی ہو جائے وہ میدانِ جنگ سے پیچھے قدم نہ ہٹائیں۔ کاظمہ کے قریب حضرت خالدؓ دشمن کے مقابل ہوئے۔ ایرانیوں نے پانی پر قبضہ کرلیا تھا اس لیے مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ حضرت خالدؓ نے اپنے لشکر سے کہا، میری جان کی قسم پانی اس کا ہے، جو دونوں حریفوں میں زیادہ ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو۔

پھر انہوں نے حکم دیا کہ یہیں اترو اور لڑ کر پانی پر قبضہ کرلو۔ مسلمان یہ حکم سنتے ہی دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ مکّار ہرمز کو اس موقعے پر ایک چال سوجھی، اس نے چند سوار کمین گاہ میں چھپا دیے اور آگے بڑھ کر حضرت خالدؓ کو مقابلے کے لیے للکارا۔ دعوتِ مبارزت دینے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ جونہی خالدؓ اپنی صفوں سے نکل کر آگے آئیں کمین گاہ میں چھپے ہوئے سوار اُن پر جھپٹ

پڑیں اور قتل کر ڈالیں۔ حضرت خالدؓ ہرمز کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے تو ہرمز کے آدمی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ان کی طرف جھپٹے۔ حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی دشمن کی نقل وحرکت پر بڑی کڑی نظر رکھ رہے تھے انہوں نے حضرت خالدؓ کو خطرے میں دیکھا تو اپنی فوج کا ایک دستہ لے کر ایرانی سواروں کو گھیر لیا۔ ادھر حضرت خالدؓ نے ہرمز پر حملہ کر کے آناً فاناً اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے قتل سے ایرانیوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور وہ دیوانہ وار مسلمانوں پر پل پڑے۔ دیر تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی لیکن بالآخر سپہ سالار کی عدم موجودگی کے باعث ایرانیوں پر ہزیمت کے آثار نمودار ہونے لگے یہاں تک کہ ان کا میمنہ اور میسرہ بالکل برباد ہو گیا۔ باقی لشکر بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس لڑائی میں کثیر مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ایرانیوں نے جن زنجیروں سے اپنے آپ کو باندھ رکھا تھا وہ میدان جنگ سے جمع کی گئی تو ان کا وزن تقریباً ساڑھے سات من نکلا، اسی وجہ سے اس معرکے کو ''ذات السلاسل'' بھی کہا جاتا ہے۔ مالِ غنیمت کا جو حصہ مدینہ منورہ بھیجا گیا اس میں ایک ہاتھی بھی تھا۔ خلیفۃ الرسولؐ کے حکم سے اسے شہر میں پھرایا گیا۔ خواتین اسے دیکھتیں تو کہتیں:

امن خلق اللّٰہ مانریٰ

کیا جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے خدا کی مخلوق ہے؟

گشت کے بعد یہ ہاتھی واپس عراق بھیج دیا گیا۔ مالِ غنیمت میں ہرمز کا مرصّع تاج بھی تھا۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے یہ قیمتی تاج حضرت خالدؓ کو عطا فرمایا کیوں کہ انہوں نے ہی ہرمز کو قتل کیا تھا۔

اس لڑائی کو جنگِ کاظمہ اور ذات السلاسل کے علاوہ جنگِ حفیر بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ بعض مؤرّخین کے نزدیک یہ لڑائی حفیر کے قریب ہوئی جو بصرہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معرکہ حفیر اور کاظمہ کے درمیان کسی مقام پر پیش آیا ہو۔

(۱۰)

جنگِ کاظمہ کے بعد حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی کہ ایک بہت بڑے ایرانی لشکر نے مذار کے مقام پر پڑاؤ ڈالا ہے اور مسلمانوں پر حملے کے لیے پر تول رہا ہے۔ دراصل یہ لشکر شاہِ ایران

نے اپنے ایک جرنیل قارن بن قریانس کی سرکردگی میں ہرمز کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ قارن کو واسط اور بصرہ کے درمیان واقع مذار کے مقام پر ہرمز کے حشر کا علم ہوا تو اس نے مذار کے قریب نہرثنی کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ ہرمز کی شکست خوردہ فوج کے دو افسر قباذ اور انوشجان جو بچ کر نکل آئے تھے، قارن نے انہیں اپنی فوج کے میسرہ اور میمنہ کا افسر بنایا اور بڑے زور شور سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کی لیکن اس سے پہلے کہ قارن مسلمانوں پر حملہ آور ہوتا، حضرت خالدؓ خود پیش قدمی کر کے مذار پہنچ گئے اور ایرانیوں کے مقابل ہوئے۔ فریقین میں خونریز لڑائی ہوئی جس میں قارن، قباذ اور انوشجان سمیت تیس ہزار ایرانی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے ان میں کچھ نہرثنی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے اور دوسروں نے بڑی مشکل سے جانیں بچائیں۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو اتنا کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا کہ ایک ایک سوار کے حصے میں تیس تیس ہزار درہم آئے۔

جب اردشیر شاہِ ایران کو مذار میں ایرانیوں کی عبرت ناک شکست کی خبر ملی تو اس نے اپنے دو آزمودہ کار جرنیلوں اندرزغر اور بہمن کو یکے بعد دیگرے دو زبردست لشکر دے کر مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ دونوں لشکر ولجہ کے مقام پر ایک دوسرے سے مل گئے۔ حیرہ اور کسکر کے درمیان آباد عربی النسل عیسائیوں اور کسانوں کی ایک بڑی تعداد بھی ایرانیوں کی مدد کے لیے میدان میں آ گئی۔ اس طرح ولجہ میں ایک عظیم الشان لشکر جمع ہو گیا۔ حضرت خالدؓ کو ایرانیوں کے اس اجتماع کی خبر ملی تو انہوں نے سویدؓ بن مقرن کو چند دستوں کے ساتھ مذار میں چھوڑا اور خود باقی لشکر کے ساتھ وَلجہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ولجہ کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ سمندر کا ساحلی علاقہ ان کے بالکل قریب ہے اور اس میں جگہ جگہ کٹاؤ اور نشیب ہیں۔ اس موقع پر کثیر التعداد دشمن کو شکست دینے کے لیے ان کو ایک نہایت عمدہ جنگی تدبیر سوجھی، وہ یہ کہ تھوڑی فوج کو نشیبی جگہوں میں چھپا دیا اور خود چند مضبوط دستوں کے ساتھ دشمن کے مقابل ہوئے۔ دیر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی جب ایرانی فوج پر تھکاوٹ کے آثار طاری ہوئے تو حضرت خالدؓ نے کمین گاہوں میں چھپی ہوئی فوج کو حکم بھیجا کہ میدانِ جنگ میں پہنچ جاؤ۔ یہ فوج آناً فاناً دشمن پر قہرِ خدا بن کر ٹوٹ پڑی۔ بے شمار ایرانی قتل ہوئے اور باقی بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے، اندرزغر بھی ان میں شامل تھا وہ صحرا میں پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر

مر گیا البتہ بہمن بچ کر نکل گیا۔ جنگ کے بعد حضرت خالدؓ نے عام آبادی پر جزیہ عائد کر کے اس کو معافی دے دی۔

جنگِ ولجہ میں عربی النسل عیسائی قبائل کے بہت سے آدمی مارے گئے تھے وہ اس کا انتقام لینے کے لیے اُلّیس (کوفہ کے قریب عراقی سرحد پر ایک مقام) میں جمع ہو کر لڑائی کی تیاری کرنے لگے۔ اُدھر بہمن دربارِ ایران میں پہنچا اور وہاں سے ایک بھاری لشکر لے کر اُلّیس پہنچا۔ یہ لشکر اس نے علاقے کے ایرانی حاکم جابان کے سپرد کیا اور اس کو ہدایت کی میں دوبارہ شاہِ ایران کے پاس مشورہ کے لیے جا رہا ہوں تم میری واپسی سے پہلے جنگ نہ چھیڑنا۔ اسی اثنا میں حضرت خالدؓ اُلّیس پہنچ گئے اور بلا توقف عیسائی قبائل سے لڑائی چھیڑ دی۔ اس وقت جابان کی فوج اطمینان سے کھانا کھانے میں مشغول تھی کیوں کہ اس کو حکم تھا کہ بہمن کے واپس آنے سے پہلے لڑائی میں شریک نہ ہو۔ حضرت خالدؓ نے بھرپور حملہ کر کے عیسائی قبائل اور ایرانی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس معرکے میں ستر ہزار عیسائی اور ایرانی مارے گئے۔

معرکۂ اُلّیس سے فارغ ہو کر حضرت خالد اَمغیشیا کی طرف بڑھے۔ وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کا رُخ اپنی جانب دیکھا تو گھبرا گئے اور شہر سے نکل گئے۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے اس پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ وہاں سے کثیر مال غنیمت حاصل ہوا۔ حضرت خالدؓ نے اس کا پانچواں حصہ مژدۂ فتح کے ساتھ دربارِ خلافت میں بھیجا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ بہت خوش ہوئے اور ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

''اے معشرِ قریش تمہارے شیر نے ایک شیر پر حملہ کیا اور اس کے غار میں داخل ہو کر اس پر غلبہ پایا۔ اب عورتیں خالد جیسا دلاور پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔''

۱۱

امغیشیا کے قریب ہی حیرہ کا تاریخی شہر تھا (امغیشیا اور حیرہ اس جگہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھے جہاں کچھ عرصے کے بعد کوفہ کا شہر آباد ہوا۔) وہاں کے ایرانی حاکم آزادبہ (یا ارازبہ) کو معلوم ہوا کہ اب مسلمان حیرہ پر لشکر کشی کریں گے تو اس نے اپنے بیٹے کو ایک مضبوط فوج دے کر مسلمانوں کو روکنے کے لیے آگے روانہ کیا اور خود بھی اپنے لشکر کے ساتھ شہر سے باہر

نکل کر خیمہ زن ہو گیا تا کہ ضرورت پڑنے پر فوراً اپنے بیٹے کی مدد کو پہنچ سکے۔ امغیشیا اور حیرہ کے درمیان دریائے فرات تھا۔ ابنِ آزادبہ نے دریا پر بند باندھ کر اس کا پانی اس سے نکلنے والی نہروں میں ڈال دیا۔ مسلمان جو کشتیوں پر سوار ہو کر دریا کے راستے حیرہ کی طرف بڑھ رہے تھے اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے کیوں کہ دریا کے پانی کا رخ بدل جانے کی وجہ سے ان کی کشتیاں کیچڑ میں پھنس گئیں۔ حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کشتیوں کو وہیں چھوڑ دیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دشمن پر حملہ کریں۔ مسلمانوں نے اسی طرح کیا اور گھوڑے اڑاتے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ ابن آزادبہ اس ناگہانی حملہ کے لیے تیار نہ تھا اس لیے بدحواس ہو گیا اور اپنی فوج سمیت مارا گیا۔ مسلمانوں نے بند توڑ کر دریا کو دوبارہ معمول کے راستے پر جاری کر دیا اور حیرہ کی طرف بڑھے۔ اسی دوران میں شاہِ ایران اردشیر کا انتقال ہو گیا۔ آزادبہ کو اردشیر کی وفات اور اپنے بیٹے کے قتل کی خبر ایک ساتھ ملی۔ اس خبر نے اس کے حوصلے پست کر دیے اور وہ اپنے لاؤ لشکر کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ چنانچہ مسلمان کسی مزاحمت کے بغیر حیرہ کے قریب پہنچ گئے اور غربین اور قصرِ ابیض کے درمیان اس جگہ ڈیرے ڈال دیے جہاں آزادبہ نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ حیرہ میں جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت خالدؓ نے ان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم جزیہ دینا قبول کر لو اور قلعے کا دروازہ کھول دو تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔ اہل حیرہ نے اس پیغام کے جواب میں مسلمانوں پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان پر تسلسل کے ساتھ شدّت سے تیر برساؤ۔ مسلمانوں کی شدید تیر بازی سے حیرہ کے بے شمار باشندے مارے گئے، اس پر شہر کے مذہبی رہنماؤں اور پادریوں نے قلعہ کے سرداروں پر زور ڈالا کہ سنگ باری بند کرو اور اہل شہر کو مسلمانوں کے تیروں سے بچاؤ۔ ان سرداروں نے مجبور ہو کر حضرت خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ ہمارا ایک وفد آپ سے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے آنا چاہتا ہے اس لیے لڑائی بند کر دیں۔ حضرت خالدؓ نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ چنانچہ ان کے پانچ سرداروں عدی و عمرو پسران عدی حیری بن اکال، عمرو بن عبدالمسیح اور ایاس بن قبیصہ پر مشتمل ایک وفد حضرت خالدؓ بن ولید کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ جزیہ دینا منظور کر کے صلح کر لی۔ اس موقع پر جو صلح نامہ لکھا گیا اس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''یہ وہ معاہدہ ہے جو خالد بن ولید نے عدی اور عمرو پسران عدی، حیری بن اُکال، عمرو بن عبدالمسیح اور ایاس بن قبیصہ کے ساتھ کیا۔ یہ لوگ اہل حیرہ کی طرف سے اس عہد نامے کی تکمیل کے لیے مجاز گردانے گئے ہیں۔ معاہدے کے مطابق اہل حیرہ کو ہر سال ایک لاکھ نوّے ہزار درہم بطور جزیہ ادا کرنے ہوں گے۔ یہ جزیہ راہبوں اور قسیسوں (پادریوں) کو بھی ادا کرنا ہوگا۔ البتہ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہوں گے جو مفلس اور محتاج ہوں، تارک الدنیا راہب ہوں یا اپاہج ہوں۔ اگر یہ جزیہ باقاعدہ ادا کیا جاتا رہا تو اہل حیرہ کی حفاظت کی ذمہ داری مجھ (خالد بن ولید یا مسلمانوں) پر ہے۔ اگر میں (یا مسلمان) ان کی حفاظت نہ کرسکے تو جزیہ نہ لیا جائے گا اور اگر اہل حیرہ قولاً یا فعلاً بدعہدی کریں تو وہ ہماری پناہ (حفاظت) سے نکل جائیں گے۔ یہ معاہدہ ربیع الاوّل ۱۲ ہجری میں لکھا گیا۔''

حیرہ کی صلح کے بعد نواحی علاقے کے باشندوں نے بھی ۲۰ لاکھ درہم سالانہ پر صلح کرلی۔ حیرہ اور ملحقاتِ حیرہ پر مسلمانوں کا پورا تسلّط ہوگیا تو حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی، حضرت ضرارؓ بن ازور، حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ اور کچھ دوسرے افسران فوج کو سرحدوں کی حفاظت پر مامور کیا اور ان کو ہدایت کی کہ دشمن پر برابر یورش کرتے رہو اور اس کو جنگی تیاری کی مہلت نہ دو۔ چنانچہ ان افسروں نے اپنی سرحدوں سے آگے دجلہ کے کنارے تک سارا علاقہ دشمن سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ حضرت خالدؓ نے مختلف (مفتوحہ) علاقوں میں عُمّال مقرر کیے اور انہیں اپنے علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے اور جزیہ وصول کرنے کا ذمہ دار بنایا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسی موقع پر بانقیا اور باروسماء کے باشندوں کی طرف سے پادری صلوبا بن نسطونا حضرت خالدؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دس ہزار درہم سالانہ جزیہ دینے کا عہد کیا۔ اس کے عوض حضرت خالدؓ نے بانقیا اور باروسماء کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا اور تحریری معاہدہ لکھ دیا۔ اس معاہدے کا مضمون بھی قریب قریب وہی تھا جو اہل حیرہ کو لکھ کر دیا گیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اہل بانقیا اور باروسماء نے حضرت خالدؓ کا مقابلہ کیا لیکن جب دیکھا کہ مسلمان ان کو کچل ڈالیں گے تو صلح کرنے پر آمادہ ہوگئے اور اس مقصد کے لیے ویرناطف کے پادری صلوبا کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت خالدؓ کے پاس بھیجا۔

ان انتظامات سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ بن عمرو کو حیرہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود انبار کی طرف بڑھے، جو ایرانیوں کا ایک مضبوط گڑھ تھا۔ اہل انبار کو حضرت خالدؓ کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مسلمان شہر کے قریب پہنچے تو اہل انبار نے ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ حضرت خالدؓ نے قلعہ کے چاروں طرف چکر لگا کر ایرانیوں کے دفاعی انتظامات کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اہل انبار اصولِ جنگ سے ناواقف ہیں اس لیے انہیں آسانی سے تیروں کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ دشمن کے سپاہیوں کی آنکھوں کو تاک تاک کر نشانہ بناؤ۔ مسلمانوں نے اسی طرح کیا اور آناً فاناً دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں کی آنکھیں بے کار کر دیں۔ ایسی مصیبت سے اہل انبار کو پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ان میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ انبار کے ایرانی سپہ سالار شیر زاد نے فوج میں بددلی کے آثار دیکھے تو اس نے حضرت خالدؓ سے صلح کی بات چیت شروع کی لیکن ایسی شرطیں پیش کیں جو حضرت خالدؓ کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ چنانچہ بات چیت کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اب حضرت خالدؓ اپنے لشکر کو لے کر ایسے مقام پر آئے جہاں خندق کی چوڑائی بہت کم تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ بیمار اور ناکارہ اونٹ ذبح کر کے خندق میں ڈال دیے جائیں۔ اس طرح خندق کا ایک حصہ پٹ گیا اور پل سا بن گیا۔ اسلامی لشکر اس پر سے گزر کر خندق کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ مسلمانوں کا دباؤ برداشت کرنا اب ایرانیوں کے بس کی بات نہیں تھی ناچار انہوں نے حضرت خالدؓ کی شرائط پر صلح کر لی اور مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ انبار کے سقوط سے نواحی علاقے کے باشندوں کی ہمتیں بھی پست ہو گئیں اور انہوں نے کسی مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے حضرت زبرقانؓ بن بدر کو انبار میں اپنا نائب بنایا اور عین التمر کی طرف بڑھے جہاں ایک نامور ایرانی جرنیل مہران پسر بہرام چوبین ایرانیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی مدد کے لیے تغلب، ایاد اور نمر وغیرہ متعدد (عربی النسل عیسائی قبائل بھی عقہ بن عقہ کی قیادت میں پہنچ گئے تھے۔ مہران نے ایک خاص حکمت عملی کے تحت ان عرب عیسائی قبائل کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھایا۔ عقہ کرخ کے مقام پر اپنی فوج کی صف بندی کر رہا تھا کہ حضرت خالدؓ اس کے سر پر پہنچ گئے اور دم لیے بغیر عقہ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ حضرت خالدؓ صفوں کو چیرتے ہوئے عقہ کے قریب پہنچ گئے اور

کمند ڈال کر اس کو گرفتار کرلیا۔ اپنے سردار کی گرفتاری سے فوج حواس باختہ ہوگئی اور بھاگ کھڑی ہوئی مسلمانوں نے تعاقب کر کے سینکڑوں آدمیوں کو اسیر بنالیا، جو بچ گئے انہوں نے عین التمر کے قلعے میں پناہ لی۔ مہران نے عیسائی عربوں کا حشر دیکھا تو قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ حضرت خالدؓ نے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور دشمن پر اتنا شدید دباؤ ڈالا کہ اس کے لیے قلعے کے دروازے کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ حضرت خالدؓ نے تمام عیسائی عربوں کو گرفتار کرلیا۔ وہ ان کی آئے دن کی شرارتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ عقہ سمیت سب کی گردنیں اڑا دیں۔

جن ایاّم میں حضرت خالدؓ بن ولید عراق عرب کی مہمات میں مصروف تھے دومۃ الجندل میں بغاوت ہوگئی اور کلب، بہرا، غسّان، تنوخ اور ضجاعم کے قبائل اکیدر اور جودی کو اپنا سردار بنا کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے حضرت عیاضؓ بن غنم کو اس بغاوت پر قابو پانے کے لیے دومۃ الجندل روانہ کیا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر دشمن کو بہت طاقتور پایا تو حضرت خالدؓ کو مدد کے لیے بلا بھیجا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے بھی انہیں حضرت عیاضؓ کی مدد کے لیے پہنچنے کا حکم دیا۔ بہرصورت عین التمر کی جنگ سے فارغ ہوکر حضرت خالدؓ نے عویم بن کاہل اسلمی کو پیچھے چھوڑا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ دومۃ الجندل کا رخ کیا۔ جب دومۃ الجندل کے قریب پہنچے تو اکیدر نے یہ کہہ کر دوسرے باغی سردار جودی کا ساتھ چھوڑ دیا کہ میں خالد بن ولید سے نہیں لڑ سکتا۔ حضرت خالدؓ کو اکیدر کے فرار کا علم ہوا تو انہوں نے ایک دستۂ فوج اس کے پیچھے بھیجا جس نے اس کو گرفتار کرلیا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو عہد شکنی اور بغاوت کے جرم میں قتل کردیا۔ (اکیدر نے عہد رسالت میں اطاعت قبول کرلی تھی لیکن پھر بغاوت میں شریک ہوگیا تھا)۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ اور حضرت عیاضؓ نے دو طرفوں سے دومۃ الجندل کو گھیر لیا۔ باغیوں کی امداد کے لیے کئی عربی النسل عیسائی قبائل بھی پہنچ گئے تھے۔ یہ سب مل کر جودی بن ربیعہ، ودیعہ کلبی، ابنِ رومانس کلبی، ابن الایہمؓ اور ابن حدرجان کی قیادت میں مسلمانوں کے مقابل ہوئے۔ حضرت خالدؓ اور حضرت عیاضؓ نے انہیں شکست فاش دی۔ جودی اور ودیعہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئے اور باقی فوج نے پسپا ہوکر قلعے کا رُخ کیا۔ جب قلعہ بھر گیا تو اندر والوں نے دروازہ بند کرلیا اور اپنے ساتھیوں کو جو زیادہ تر بنو کلب سے تعلق رکھتے تھے

مسلمانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ بنوکلب نے حضرت خالدؓ کی فوج کے ایک سردار عاصمؓ بن عمرو تمیمی سے رحم کی التجا کی کیوں کہ ان کا قبیلہ تمیم، بنوکلب کا حلیف تھا۔ حضرت عاصمؓ نے ان کو امان دے دی۔ حضرت خالدؓ نے ان کے عہد کا احترام کیا اور بنوکلب کے لوگوں کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے قلعے کا پھاٹک اکھڑوا ڈالا اور قلعے میں موجود تمام باغیوں کو گرفتار کر لیا۔ پھر ان سب کو جودی سمیت بغاوت کی پاداش میں قتل کرا ڈالا۔

۱۲

حضرت خالدؓ ابھی دومۃ الجندل میں ہی تھے کہ عراقِ عرب میں ایرانیوں نے پھر شورش برپا کر دی۔ ان کے دو سرداروں روزبہ اور زرمہر نے حصید اور خنافس پر چڑھائی کر دی۔ حضرت زبرقانؓ بن بدر حاکم انبار کو ایرانیوں کی نقل وحرکت کی اطلاع ملی تو انہوں نے حاکم حیرہ حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی سے مدد طلب کی۔ حضرت قعقاعؓ نے ان کا پیغام ملتے ہی الگ الگ دو لشکر اعبد بن فدکی السعدی اور عروہ بن جعد البارقی کی قیادت میں حصید اور خنافس کی طرف بھیجے کہ ایرانیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیں۔ انہوں نے ریف میں روزبہ اور زرمہر کا راستہ روک لیا جہاں وہ بنو ربیعہ کا انتظار کر رہے تھے جو ان سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا معاہدہ کر چکے تھے۔ اسی اثنا میں حضرت خالدؓ بن ولید عیاضؓ بن غنم کو ساتھ لے کر دومۃ الجندل سے حیرہ واپس آ گئے۔ یہاں انہیں امرؤ القیس کا خط ملا کہ ہذیل بن عمران نے مُصَیَّخ اور ربیعہ بن بشر نے الثنی اور البشر کے مقامات پر فوجیں جمع کی ہیں اور وہ جلد ہی یہ فوجیں لے کر روزبہ اور زرمہر کی مدد کے لیے جا رہے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے یہ خط ملتے ہی حضرت قعقاعؓ اور ابولیلیٰ کو روزبہ اور زرمہر کے مقابلے کے لیے روانہ کیا اور پھر حیرہ میں حضرت عیاضؓ بن غنم کو چھوڑ کر خود بھی ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ حضرت قعقاعؓ اور حضرت ابولیلیٰ ابھی عین التمر تک پہنچے تھے کہ حضرت خالدؓ بھی ان سے آن ملے۔ یہاں سے انہوں نے حضرت قعقاعؓ کو حصید کی جانب اور حضرت ابولیلیٰؓ کو خنافس کی طرف روانہ کیا۔ روزبہ اور زرمہر نے مل کر حصید میں حضرت قعقاعؓ کا مقابلہ کیا لیکن دونوں لڑائی میں مارے گئے اور ان کی فوج نے بری طرح شکست کھائی۔ شکست خوردہ فوج نے بھاگ کر خنافس میں پناہ لی۔ اس اثناء میں حضرت ابولیلیٰ خنافس پہنچ گئے۔ ایرانی حاکم مہبوذان کو

مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑی اور وہ اپنی فوج کے ساتھ خنافس سے نکل کر مُصَیَّخ چلا گیا۔ چنانچہ حضرت ابولیلیٰؓ نے خنافس پر کسی مزاحمت کے بغیر قبضہ کرلیا۔ اب حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؒ، حضرت ابولیلیٰؓ حضرت اعبدؓ اور حضرت عروہؓ کو مُصَیَّخ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ فلاں رات کو فلاں مقام پر سب اکٹھے ہو جائیں۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ خود بھی مقررہ رات کو ان کے پاس پہنچ گئے اور پھر متحدہ اسلامی لشکر نے ایرانیوں اور ان کے عرب حلیفوں پر تباہ کن شب خون مارا۔ عیسائی عربوں کا سردار ہذیل بن عمران تو بچ کر نکل گیا لیکن مُصَیَّخ میں موجود باقی تمام عیسائی عرب اور ایرانی موت کے گھاٹ اتر گئے۔

مُصَیَّخ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ نے بنو تغلب کی طرف توجہ کی جو کئی بار ایرانیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ انہوں نے حضرت قعقاعؒ اور حضرت ابولیلیٰ کو بنو تغلب کی بستیوں الثنی اور البشر پر شبخون مارنے کا حکم دیا جہاں ربیعہ بن بجیر تغلبی اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ ان کے پیچھے حضرت خالدؓ بھی اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک مقررہ رات کو مجاہدین نے تین سمتوں سے الثنی پر حملہ کیا اور تمام دشمنوں کو (عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے سوا) فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ الثنی کے بعد البشر (جس کا دوسرا نام الزمیل ہے) کی باری آئی۔ وہاں بھی تغلبیوں کا ایک لشکر موجود تھا۔ ہذیل بن عمران نے مُصَیَّخ سے بھاگ کر اسی جگہ پناہ لی تھی۔ حضرت خالدؓ نے ایک ہی ہلّے میں البشر پر قبضہ کرلیا اور دشمن کا صفایا کر دیا۔ اس کے بعد وہ الرضاب کی طرف بڑھے جہاں عقہ (مقتول) کا بیٹا ہلال لشکر لیے پڑا تھا اس نے حضرت خالدؓ کے آنے کی خبر سنی تو شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس طرح الرضاب پر بھی مسلمانوں نے آسانی سے قبضہ کرلیا۔

الرضاب کی تسخیر کے بعد حضرت خالدؓ نے الفراض کا رُخ کیا۔ یہاں عراق، شام اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں اور جنگی نقطۂ نگاہ سے اس کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ حضرت خالدؓ الفراض پہنچے تو ان کے مقابلے میں نہ صرف ایرانی اور شامی متحد ہو گئے بلکہ تغلب، نمر اور ایاد کے عربی النسل قبائل بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اس متحدہ لشکر نے دریائے فرات کو پار کر کے بڑے جوش و خروش سے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے حضرت خالدؓ کی قیادت میں اس جرأت اور پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو لوہے کے چنے چبوا دیے اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اس موقع

پر حضرت خالدؓ نے للکار کر کہا، مسلمانو! ان کو گھیر لو اور کسی کو بچ کر نہ جانے دو۔ ان کی للکار پر مسلمان جانبازوں نے دشمن کے سپاہیوں کو گھیر گھیر کر مارنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کی بیشتر تعداد مسلمانوں کی تلواروں کا شکار ہوگئی، جو تھوڑے بہت پیچھے کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہوئے وہ دریائے فرات میں غرق ہو گئے۔ فتح کے بعد حضرت خالدؓ نے فوج سے کہا کہ وہ چند دن ستالے۔ چنانچہ سارا لشکر الفراض ہی میں ٹھہر گیا۔ دس دن کے بعد (۲۵ ذیقعدہ ۱۲ھ کو) حضرت خالدؓ نے فوج کو حیرہ کی جانب کوچ کا حکم دیا اور اپنے متعلق ظاہر کیا کہ جیسے وہ ساقہ (عقبی فوج) کے ساتھ آ رہے ہیں۔ لشکر کے کوچ کرتے ہی وہ نہایت رازداری کے ساتھ چند آدمیوں کو ہمراہ لے کر برق رفتاری سے مکہ معظّمہ پہنچے اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے اسی برق رفتاری سے واپس آ گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت الفراض سے آنے والی فوج کا آخری حصہ حیرہ نہیں پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ (خفیہ حج سے واپس آ کر) اس فوج کے ساقہ (آخری یا عقبی حصے) سے آ ملے۔ لشکر کے کسی اور آدمی کو ان کے حج پر جانے کا علم نہیں تھا۔ جب انہوں نے واپسی پر حضرت خالدؓ اور ان کے ساتھیوں کے سر منڈے ہوئے دیکھے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ حج کر کے آئے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو حضرت خالدؓ کے خفیہ حج کی اطلاع ملی تو انہوں نے ان کو لکھا کہ آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا کیوں کہ سپہ سالار کا اپنی فوج سے یکا یک غیر حاضر ہو جانا اس کے لیے کئی خطرات کا موجب بن سکتا ہے۔

حضرت خالدؓ حیرہ پہنچے ہی تھے کہ انہیں دربارِ خلافت سے فوراً شام جانے کا حکم ملا۔ چنانچہ وہ عراقِ عرب کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام حضرت مثنّیٰؓ بن حارثہ کے سپرد کر کے شام روانہ ہو گئے۔

حضرت خالدؓ نے کل ایک سال دو ماہ (محرم ۱۲ ہجری سے صفر ۱۳ تک) کا عرصہ عراقِ عرب میں گزارا۔ اس دوران میں انہوں نے پندرہ جنگیں لڑیں اور سب میں کامیاب ہوئے۔

۱۳

جس زمانے میں حضرت خالدؓ بن ولید عراق عرب میں ایرانی شہنشاہیت پر ضربیں لگا رہے تھے۔ رومی شہنشاہیت سے بھی معرکہ آرائیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور چار اسلامی

لشکر حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ اور حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ کی سرکردگی میں شام کے مختلف مقامات کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ رومی پوری قوت سے قدم قدم پر ان کی مزاحمت کر رہے تھے اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے میں سخت مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ یہی صورت حالات تھی جس سے مؤثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے حضرت خالدؓ کو حکم بھیجا کہ وہ فوراً شام میں مصروف جہاد مسلمانوں کی مدد کو پہنچیں۔ یہ حکم ملتے ہی حضرت خالدؓ نے (خلیفۃؓ الرسولؐ کی ہدایت کے مطابق نصف لشکر کے ساتھ) عراقِ عرب سے شام کا رُخ کیا۔

حضرت خالدؓ نے شام کے محاذِ جنگ پر پہنچنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ انتہائی دشوار گزار اور خطرناک تھا۔ انہوں نے پانچ چھ دن میں طے ہو جانے والے آسان اور معروف راستے کو چھوڑ کر جبل دروز (حوران) کے مشرق میں پھیلے ہوئے وسیع و عریض صحرا (بادیۃ الشام یا حمد (Hamad) کا طویل راستہ اختیار کیا۔ مؤرّخین نے حضرت خالدؓ کے اس طرزِ عمل کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ ان سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت یہ راستہ اختیار کیا اور اٹھارہ دن کے کٹھن اور پُرصعوبت سفر کے بعد سویٰ (موجودہ نام بئر سیبا) پہنچ گئے۔ اہل سویٰ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کوئی فوج ایسے ہیبت ناک صحرا سے گزر کر ان پر حملہ آور ہو سکتی ہے۔ جب انہوں نے اچانک اسلامی لشکر کو اپنے سر پر پایا تو حواس باختہ ہو گئے اور معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ سویٰ سے حضرت خالدؓ ارک، تدمر (پالموده) قریتین، حوارین اور قصم کو فتح کرتے ہوئے سیدھے جنوب کی طرف بڑھتے گئے اور دمشق کو ایک طرف چھوڑ کر مرج راہط پہنچ گئے۔ یہاں رومیوں کے ایک لشکر نے حضرت خالدؓ کا زبردست مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ مرج راہط سے حضرت خالدؓ وادیِ یرموک کے دَرّے ورعا میں داخل ہوئے اور جبل حوران کے دامن میں چلتے چلتے شام میں پہلے سے موجود اسلامی لشکر سے جا ملے۔ درعا کے قریب ایک زبردست رومی لشکر موجود تھا اور اس کے شان گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی دشمن صحرائے حمد سے گزر کر اس کے عقب میں پہنچ سکتا ہے۔ رومیوں کو حضرت خالدؓ کی آمد کا علم ہوا تو مبہوت ہو گئے اور ان کے مقابل ہونے کی ہمت نہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت خالدؓ کسی مزاحمت کے بغیر اپنے بھائیوں کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ

نے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجرّاح کو شام پر یلغار کرنے والی چاروں فوجوں کا سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ حضرت خالدؓ پہنچے تو حضرت ابوعبیدہؓ نے تمام افواج کی قیادت ان کے سپرد کر دی۔ ابن اثیرؒ اور بلاذریؒ کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے بصریٰ کے شہر پر حملہ کیا۔ بصریٰ کا بطریق (جو وہاں کا حاکم بھی تھا) ایک ہی جھڑپ میں ہمت ہار بیٹھا اور جزیہ دینا منظور کر کے مسلمانوں سے صلح کر لی۔

اُدھر ہرقل (قیصرِ روم) کو شام میں مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے ان کے مقابلے کے لیے الگ الگ فوجیں روانہ کیں تاکہ اسلامی فوجیں باہم ملنے نہ پائیں۔ رومی فوجوں کی قیادت دو آزمودہ کار جرنیل قبقلار اور تذارق کر رہے تھے۔ ان دونوں نے فلسطین کے ایک مقام اجنادین میں پڑاؤ ڈالا۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے فلسطین کی تسخیر پر حضرت عمروؓ بن العاص کو مامور کیا تھا وہ اس وقت عربات میں تھے۔ انہیں رومی فوجوں کی آمد کی اطلاع ملی تو اجنادین کی طرف بڑھے۔ حضرت خالدؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بھی بصریٰ کی مہم سر کر کے ان کی مدد کو پہنچ گئے۔

جمادی الاخریٰ ۱۳ ہجری میں اجنادین کے مقام پر رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان دو دن تک گھمسان کی جنگ ہوئی، جس میں تذارق اور قبقلار دونوں مارے گئے اور رومیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔

اجنادین میں رومیوں کو شکست دینے کے بعد حضرت خالدؓ نے اس رومی لشکر کی جانب توجہ کی، جو درعا کے قریب جبل دروز کے سلسلے اور دریائے یرموک کی گہری پہاڑی وادی کے درمیان گھاٹی میں قدم جمائے کھڑا تھا۔ اس کو نظر انداز کر کے شام کے دارالحکومت دمشق کی جانب بڑھنا بہت مشکل اور خطرناک تھا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو بئر شیبا میں چھوڑا اور باقی فوجوں کو لے کر بڑی سرعت کے ساتھ درعا پہنچ گئے۔ یہاں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان خون ریز جنگ ہوئی جو رومیوں کی شکست پر منتج ہوئی اور وہ درعا سے پسپا ہو گئے۔ اس طرح اسلامی فوجوں کے لیے دمشق کا راستہ صاف ہو گیا جو وہاں سے صرف ۶۵ میل دور تھا۔

یہ یرموک کی پہلی جنگ تھی، جو ابھی جاری تھی کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ وفات پا گئے اور ان کی جگہ حضرت عمر فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔

اثنائے جنگ میں مدینہ منورہ سے قاصد پہنچا، جس نے مسلمانوں کو حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی وفات اور حضرت عمر فاروقؓ کے خلیفہ بننے کی خبر دی۔ یہی قاصد حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فرمان بھی لایا کہ اب سے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجرّاح محاذِ شام کی اسلامی افواج کے سپہ سالارِ اعلیٰ (کمانڈر انچیف) ہوں گے اور حضرت خالدؓ بن ولید ان کی نیابت میں کام کریں گے۔ اس فرمان کا اعلان فتح کے بعد کیا گیا۔ حضرت خالدؓ نے بڑی خوشی سے اسلامی فوجوں کی کمان حضرت ابوعبیدہؓ کے سپرد کر دی۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شام کی مشہور جنگوں کے زمانۂ وقوع کے بارے میں مؤرّخین میں سخت اختلاف ہے۔ اسی طرح حضرت خالدؓ کے سالِ عزل کے بارے میں بھی مؤرّخین میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی (۱۳ ہجری میں) حضرت خالدؓ کو معزول کر دیا اور بعض اس طرف گئے ہیں کہ ان کی معزولی ۱۷ ہجری میں ہوئی۔ اس سلسلے کی تمام روایات کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت حضرت خالدؓ کی معزولی دو مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ ۱۳ ہجری میں ان کا مرتبہ (Rank) کم کیا گیا تاہم وہ حضرت ابوعبیدہؓ کے نائب یا فوج کے ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے برابر کام کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ۱۷ ہجری میں ان کو مکمل طور پر معزول کر دیا گیا بہ الفاظ دیگر ان کو افسری کے منصب سے ہٹا کر ایک عام سپاہی بنا دیا گیا۔

پہلی مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کا مرتبہ اس لیے کم کیا کہ وہ امین الاُمّت حضرت ابوعبیدہؓ بن الجرّاح کو سپہ سالارِ اعظم کے عہدہ کے لیے حضرت خالدؓ سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے اس لیے کہ حضرت خالدؓ بعض اوقات حد سے زیادہ خود اعتمادی یا جوشِ شجاعت میں کوئی ایسا قدم اٹھا لیتے تھے جو بہ ظاہر احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہوتا تھا۔

دوسری مرتبہ ان کی معزولی جن اسباب کی بنا پر عمل میں آئی، ان کا ذکر اپنے مقام پر آگے آئے گا۔ جہاں تک لڑائیوں کی ترتیب کا تعلق ہے ہم نے انہیں اپنی تحقیق کے مطابق بیان کیا ہے۔ ہماری تحقیق اور بیان کردہ ترتیب سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان تمام لڑائیوں کا ۱۳ ہجری سے ۱۷ ہجری کے درمیانی زمانے میں آگے یا پیچھے پیش آنا ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان لڑائیوں میں حضرت خالدؓ نے ایک اعلیٰ فوجی افسر کی حیثیت سے

بھر پور اور نمایاں حصہ لیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بیش تر جنگیں (بالخصوص دوسری جنگ یرموک) انہی کے منصوبوں اور حکمت عملی کے مطابق لڑی گئیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ ان کو اپنا نائب نہیں بلکہ بھائی سمجھتے تھے اور جنگی کارروائیوں کے سلسلے میں ان کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔

پہلی جنگ یرموک کے بعد مسلمان دمشق کی طرف بڑھے اور چاروں طرف سے اس کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ باب الجابیہ کے سامنے خیمہ زن ہوئے، حضرت عمروؓ بن العاص بابِ توما پر، حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ باب الفرادیس پر اور حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ باب کیسان پر متعین ہوئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے شہر پناہ کے مشرقی دروازے سے ایک میل کے فاصلے پر ایک خالی خانقاہ میں ڈیرہ ڈالا جو ان کے قیام کی نسبت سے ''دیر خالد'' مشہور ہوگئی۔ اگرچہ دمشق کی سردی عرب مجاہدین کے لیے ناقابلِ برداشت تھی لیکن انہوں نے بڑے عزم و ثبات سے محاصرہ جاری رکھا۔ یہ محاصرہ باختلاف روایت دو ماہ دس دن، تین ماہ یا چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں اہل دمشق کو شہر سے باہر نکل کر لڑنے کی جرأت نہ ہوئی البتہ وہ فصیل پر سے مسلمانوں پر تیر اور پتھر برساتے رہتے تھے۔ ایک رات کو ان کی طرف سے بہت کم سرگرمی دیکھنے میں آئی۔ حضرت خالدؓ اکثر رات رات بھر بیدار رہتے تھے اور فوجی انتظامات کے ساتھ ساتھ دشمن کی نقل و حرکت کی ٹوہ لگانے میں مشغول رہتے تھے۔ اس رات کو انہیں شہر کے اندر کوئی ہنگامہ اور شور و غل سنائی نہ دیا تو اپنے ذرائع سے اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا کہ دمشق کے بطریق کے گھر لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اس خوشی میں اس نے آج اہل شہر کی ضیافت کی تھی۔ انہوں نے دعوت میں خوب شراب پی اور شام ہی سے مدہوش پڑے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی حضرت خالدؓ اپنی خاص فوج کے ساتھ شہر پناہ کی طرف بڑھے اور پانی سے لبریز خندق کو عبور کر کے شہر پناہ کے نیچے پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ چند مجاہدین کے ساتھ کمند کے ذریعہ شہر پناہ کی دوسری طرف اتر گئے اور پہریداروں کو قتل کر کے دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ تکبیر کی آواز سنتے ہی باہر کھڑی فوج ریلا کر کے شہر میں داخل ہوگئی۔ اہلِ دمشق ابھی تک مدہوش پڑے تھے اس ناگہانی حملہ سے حواس باختہ ہوگئے۔ خود ہی شہر کے دوسرے دروازے کھول دیے اور حضرت ابوعبیدہؓ سے صلح کی درخواست کی، جو انہوں نے منظور کرلی۔ اب کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف سے حضرت ابوعبیدہؓ صلح منظور کر کے شہر کے اندر بڑھ رہے تھے اور دوسری طرف سے حضرت خالدؓ

فاتحانہ پیش قدمی کررہے تھے۔ شہر کے وسط میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ چوں کہ حضرت ابوعبیدہؓ صلح منظور کر چکے تھے اس لیے حضرت خالدؓ نے بھی تلوار نیام میں کرلی۔

بعض مؤرّخین نے (جن میں فرانسیسی محقق گستاؤلی بان مصنف ''تمدّن عرب'' بھی شامل ہے) لکھا ہے کہ دمشق عین اس روز فتح ہوا، جس روز حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے وفات پائی۔ لیکن یہ روایت قابل اعتنا نہیں ہے کیوں کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی تاریخ وفات ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ ہجری ہے جب کہ دمشق رجب ۱۴ ہجری میں فتح ہوا۔

مختلف مؤرّخین نے محاصرہ دمشق کے دوران میں مسلمانوں کو پیش آنے والے کئی واقعات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن ان کے بیانات میں سخت اختلاف ہے اور یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی۔ اس قسم کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) ہرقل نے ایک لشکر دمشق کے محصورین کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ حضرت خالدؓ نے آگے بڑھ کر اس لشکر کا رستہ روک لیا اور اسے دمشق نہیں پہنچنے دیا۔

(۲) ہرقل کے امدادی لشکر کو روکنے کے لیے حضرت خالدؓ نے حضرت ضرارؓ بن الازور کو پانچ سو سوار دے کر بھیجا۔ حضرت ضرارؓ دشمن کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کی تعداد بہت زیادہ (تقریباً دس بارہ ہزار) ہے۔ حضرت ضرارؓ جوش شجاعت میں اس لشکر سے بھڑ گئے۔ شومیِ قسمت سے ان کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ زمین پر گر گئے۔ رومیوں نے انہیں اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو گرفتار کرلیا۔ حضرت خالدؓ کو حضرت ضرارؓ کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو انہوں نے میسرہؓ بن مسروق کو ایک ہزار جوانوں کے ساتھ دمشق گئے مشرقی دروازے پر چھوڑا اور اپنی باقی فوج کو ساتھ لے کر حضرت ضرارؓ اور دوسرے اسیر مسلمانوں کو رومیوں کے پنجے سے چھڑانے کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے برق رفتاری سے چل کر رومی لشکر کو جالیا۔ دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے مورچہ بند ہو گئے۔ اسی اثناء میں حضرت خالدؓ کو معلوم ہوا کہ رومی سپہ سالار نے مسلمان اسیروں کو سو سواروں کی حفاظت میں حمص روانہ کر دیا ہے۔ حضرت خالدؓ نے رافع بن عمیرہ طائی کو سو سوار دے کر حمص کی جانب روانہ کیا کہ وہ اسیر مسلمانوں کو رومیوں سے چھڑا لائیں۔ رافعؓ رومیوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور بہت جلد ان کے سر پر جا پہنچے۔ رومیوں نے سخت مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں نے انہیں آناً فاناً کاٹ کر رکھ دیا اور حضرت ضرارؓ اور ان

کے ساتھیوں کو ہمراہ لے کر حضرت خالدؓ کے لشکر میں آ ملے۔ دوسرے دن حضرت خالدؓ نے رومی لشکر پر حملہ کیا اور اس کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

(۳) حضرت ابوعبیدہؓ کو اطلاع ملی کہ رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر اجنادین میں جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری میں مصروف ہے۔ انہوں نے دمشق کا محاصرہ عارضی طور پر اٹھا لیا اور اجنادین پہنچ کر رومیوں کو تباہ کن شکست دی۔ اس لڑائی میں حضرت خالدؓ نے نمایاں حصہ لیا اور ہر مرحلہ پر دوسرے افسروں کو مناسب ہدایات دیتے رہے۔ اس لڑائی سے فارغ ہو کر دوبارہ دمشق کا محاصرہ کر لیا۔

(۴) حضرت ابوعبیدہؓ کو اطلاع ملی کہ ہرقل نے ایک رومی جرنیل ورنجار کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج اہلِ دمشق کی مدد کے لیے بھیجی ہے اور یہ فوج مرج الصفر کے مقام پر خیمہ زن ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کو پیچھے چھوڑا اور باقی فوج کو ساتھ لے کر دشمن کی طرف بڑھے۔ حضرت خالدؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ مرج الصفر کے مقام پر فریقین میں خون ریز لڑائی ہوئی۔ حضرت خالدؓ نے رومی لشکر کا میسرہ برباد کر دیا اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے اس کے میمنہ کے قدم اکھاڑ دیے۔ اس طرح رومیوں کو شکستِ فاش ہوئی اور مسلمانوں نے مظفر و منصور واپس آ کر پھر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔

اسی قسم کے کچھ اور واقعات بھی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان واقعات کا ہونا بعید از قیاس نہیں لیکن یہ کب ہوئے اور ان کی ترتیب کیا تھی اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اصل میں چار پانچ سال کے عرصے میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس کثرت سے لڑائیاں ہوئیں کہ ان کے واقعات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ بہرصورت حضرت خالدؓ نے ان میں سے بیشتر معرکوں میں دادِ شجاعت دی اور فریقِ مخالف کو لوہے کے چنے چبوا دیے۔

(۱۴)

دمشق کی فتح سے رومیوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا۔ انہوں نے اُردن کے شہر بیسان میں جمع ہو کر زور شور سے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ ہرقل نے دمشق کے محصورین کے لیے، جو فوجیں بھیجی تھیں اور دمشق تک نہ پہنچ سکی تھیں، وہ بھی بیسان پہنچ گئیں۔ اس طرح چالیس پچاس

ہزار کا لشکر جمع ہو گیا، جن کا سپہ سالار سکلار نامی ایک رومی افسر تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ اور حضرت خالدؓ اپنی فوج کے ساتھ اردن کی طرف بڑھے اور بیسان کے سامنے ایک مقام فحل (Pella) میں پڑاؤ ڈالا۔ رومیوں نے مسلمانوں کی ہمت اور استقلال کو دیکھ کر صلح کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت معاذؓ کو مرعوب کرنا چاہا لیکن حضرت معاذؓ نے شانِ بے اعتنائی سے جواب دیا کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی ہو، یہ منظور نہیں تو جزیہ دو ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ تم ہمیں تعداد سے ڈراتے ہو، اگر تمہاری تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر بھی ہو تو کچھ پروا نہیں۔ ہمارا اللہ فرماتا ہے کہ کبھی تھوڑے بھی بہتوں پر غالب آ جایا کرتے ہیں۔

غرض شرائطِ صلح پر اتفاق نہ ہو سکا اور حضرت معاذؓ واپس آ گئے۔ دوسرے دن رومیوں نے اپنا قاصد حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس بھیجا۔ اس نے پیش کش کی کہ ہم تمہاری فوج کو دو دو دینار فی کس دیں گے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ پیش کش رد کر دی اور فوج کو کمر بندی کا حکم دے دیا لیکن رومی مقابلے پر نہ آئے۔ دوسرے دن حضرت خالدؓ اپنا سوار دستہ لے کر میدان میں نکلے۔ رومیوں نے اپنی فوج کے تین حصے کیے اور انہیں باری باری میدان میں بھیجا۔ ان کا پہلا دستہ حضرت خالدؓ کی طرف بڑھا تو انہوں نے قیسؓ بن ہبیرہ کو اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے مقابل ہوں وہ فوراً ان پر جھپٹ پڑے اور میدانِ کارزار گرم ہو گیا۔ اب رومیوں کا دوسرا دستہ میدان میں نکلا، حضرت خالدؓ کے حکم سے میسرہ بن مسروقؓ نے اس کو روکا۔ اس کے ساتھ ہی رومیوں کی فوج کا تیسرا حصہ جو سب سے بڑا تھا آگے بڑھا، حضرت خالدؓ نے اس کا حملہ بڑے استقلال سے سنبھالا۔ دیر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی یہاں تک کہ رومیوں پر تھکاوٹ کے آثار طاری ہونے لگے۔ حضرت خالدؓ نے ان کی کمزوری کو بھانپ لیا اور اپنی فوج کو للکار کر کہا کہ رومی اپنا زور لگا چکے اب تمہاری باری ہے۔ ان کی للکار سن کر مسلمانوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ رومی پسپا ہو کر اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ اب رات ہو چکی تھی اس لیے مسلمان واپس آ گئے۔ دوسرے دن فریقین میں پھر گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت خالدؓ نے دشمن کا میمنہ برباد کر دیا اور اس کے گیارہ

بڑے بڑے افسر مار ڈالے، قیس بن ہبیرہ نے رومیوں کے میسرہ کو شکست دی اور ہاشمؓ بن عتبہ لڑتے بھڑتے دشمن کے قلب لشکر تک پہنچ گئے۔ یہاں دیر تک اتنی شدید لڑائی ہوئی کہ تمام میدان میں خون کے نالے بہہ نکلے۔ آخر رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمانوں کو عظیم الشان فتح ہوئی۔ اس معرکہ کے بعد اردن کے دوسرے تمام شہر اور مقامات آسانی سے فتح ہو گئے۔

اب اسلامی افواج حمص کی طرف بڑھیں۔ یہ شام کا ایک اہم شہر تھا۔ ہرقل کو خبر ہوئی تو اس نے ایک زبردست فوج دمشق کی طرف روانہ کی تاکہ وہ مسلمانوں کو حمص تک پہنچنے کا موقع نہ دے اور ممکن ہو تو دمشق سے مسلمانوں کو نکال کر اس پر قابض ہو جائے۔ اس فوج کا سپہ سالار توذر نامی ایک بطریق تھا۔ توذر نے دمشق کے مغرب میں مرج الروم کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ توذر کے پیچھے ہرقل نے ایک اور فوج اس کی مدد کے لیے بھیجی، اس کا سپہ سالار ایک رومی جرنیل شنس تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو توذر کے مقابلے کے لیے روانہ کیا اور خود شنس کے مقابلہ پر گئے۔ توذر مرج الروم سے دمشق کی طرف بڑھا تو حضرت خالدؓ اس کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ حاکم دمشق کو جونہی توذر کی پیش قدمی ملی تو وہ اپنی فوج کے ساتھ اس کو روکنے کے لیے نکلے۔ دمشق کے قریب طرفین میں سخت معرکہ ہوا اسی اثناء میں حضرت خالدؓ نے عقب سے توذر پر حملہ کر دیا۔ اس طرح دونوں طرف سے اسلامی فوجوں نے رومیوں کو تباہ کر ڈالا۔ معدودے چند کے سوا سب رومی میدانِ جنگ میں کھیت رہے، ان میں توذر بھی شامل تھا۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے مرج الروم کے قریب شنس کو روک لیا اور ایک سخت لڑائی کے بعد اس کو شکست دی۔ شنس بے شمار رومیوں سمیت مارا گیا جو بچ گئے انہوں نے بھاگ کر حمص میں پناہ لی۔

توذر اور شنس سے نبٹنے کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حمص کی طرف پیش قدمی کی۔ حضرت خالدؓ بن ولید اپنے رسالے کے ساتھ آگے آگے تھے۔ راستے میں بقاع اور بعلبک کے شہر آئے۔ اہل بقاع نے تو کسی مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ البتہ اہل بعلبک نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن حضرت خالدؓ نے ان پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ فوراً گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت خالدؓ حمص سے چند میل کی مسافت پر تھے کہ رومیوں کی ایک بڑی فوج حمص سے نکل کران کے مقابل ہوئی لیکن حضرت خالدؓ کے پہلے ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کر شہر میں گھس گئی۔ حضرت خالدؓ نے میسرہؓ بن مسروق کی سرکردگی میں ایک دستہ آگے بڑھایا۔ راستے میں رومیوں کے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے جتھوں سے ان کا مقابلہ ہوا۔ ایسی تمام جھڑپوں میں مسلمان کامیاب رہے اور حمص کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ حضرت میسرہؓ بن مسروق کے پیچھے حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت خالدؓ بھی حمص کے باہر پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کے بڑے دروازے ''رستن'' کے سامنے پڑاؤ ڈالا اور شہر کے چاروں طرف فوجیں پھیلا دیں۔

ہرقل پہلے حمص ہی میں مقیم تھا لیکن تو ذر اور شنس مارے گئے تو وہ حمص سے ارہا چلا گیا اور وہاں سے اہل جزیرہ کو اہل حمص کی امداد کا حکم بھیجا۔ چنانچہ جزیرہ سے ایک زبردست لشکر اہل حمص کی مدد کے لیے روانہ ہوا لیکن حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے جو عراقِ عرب کی مہم پر مامور تھے کچھ فوج بھیج دی جس نے اس لشکر کو روک لیا اور آگے نہ بڑھنے دیا۔

جس زمانے میں مسلمانوں نے حمص کا محاصرہ کر رکھا تھا شدید سردی پڑ رہی تھی۔ اہل حمص کا خیال تھا کہ عرب لوگ اتنی شدید سردی برداشت نہ کر سکیں گے اور کھلے میدان میں زیادہ عرصہ ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا لیکن اُن کا خیال غلط ثابت ہوا۔ مسلمانوں نے بڑے عزم وثبات کا ثبوت دیا اور نہایت سختی سے محاصرہ جاری رکھا۔ آخر رومی ہمت ہار بیٹھے اور صلح کی درخواست کی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مسلمان بعض جگہوں سے شہر پناہ کو منہدم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر رومیوں نے گھبرا کر اطاعت قبول کر لی اور شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

حمص کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ وہیں مقیم ہو گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اردن میں قیام کیا اور حضرت خالدؓ ایک ہزار سواروں کے ساتھ دمشق چلے گئے۔

(۱۵)

رومیوں کی پیہم شکستوں نے ہرقل کو سخت برافروختہ کیا اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ سلطنت کا پورا زور صرف کر کے عربوں کو شام سے نکال دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام مقبوضات

آرمینیہ، الجزیرہ، قسطنطنیہ وغیرہ سے فوجیں طلب کیں جو سب انطاکیہ میں جمع ہوگئیں ان میں بڑے بڑے آزمودہ کار سپاہی اور جرنیل شامل تھے، یہاں تک کہ گوشہ نشین راہب اور پادری بھی اپنی اپنی خانقاہوں اور گرجوں سے نکل کر اس لشکر میں شریک ہوگئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ مذہب کا واسطہ دے کر رومیوں میں جوش پیدا کرتے تھے۔ یہ جرار لشکر انطاکیہ سے چلا تو ہر طرف ہلچل پڑ گئی۔ مسلمانوں کو دو لاکھ سے زائد جنگجوؤں پر مشتمل اس لشکر کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ شام کے جن جن شہروں پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے وہاں سے فوجیں ہٹالی جائیں اور یہ تمام فوجیں ایک جگہ جمع ہو کر رومیوں کا مقابلہ کریں۔ ساتھ ہی دربارِ خلافت سے مدد طلب کی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق مسلمانوں نے حمص، دمشق وغیرہ شہروں کو خالی کیا تو وہاں کے باشندوں کو جزیہ کی وہ ساری رقمیں جو ان سے وصول کی تھیں یہ کہہ کر واپس کر دیں کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ پابندیِ عہد اور رواداری کی ایسی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کا یہی اخلاق تھا، جس نے بدترین دشمنوں کے دلوں کو بھی مسخر کر لیا۔ اس حسن سلوک سے ان شہروں کے عیسائی اور یہودی اتنے متاثر ہوئے کہ روتے تھے اور دُعائیں کرتے تھے کہ خدا ان لوگوں (مسلمانوں) کو جلد واپس لائے۔

تمام اسلامی فوجیں شام کے شہروں سے نکل کر وادیِ یرموک میں رومی لشکر کے سامنے پہنچ گئیں۔ رومی لشکر کا پڑاؤ اُس میدان میں تھا، جو دریائے یرموک اور دریائے اُردن کے سنگم سے تیس میل اوپر دریائے یرموک کے نصف دائرے کی صورت میں چکر کاٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی پشت کی جانب واقوصہ کی تنگ گھاٹی تھی سامنے واقوصہ کی وادی تھی اور پہلو میں دریائے یرموک تھا۔ اس طرح یہ لشکر تین سمتوں سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ اسلامی لشکر اس کے بالکل سامنے آکر خیمہ زن ہوا۔ رومیوں کے خیال میں انہوں نے اپنے پڑاؤ کے لیے بہترین جگہ منتخب کی تھی لیکن یہ جگہ اسی صورت میں بہترین ثابت ہو سکتی تھی جب انہیں فتح ہو۔ شکست کی صورت میں یہ جگہ ان کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ بات ان کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس اتنا جرار لشکر شکست سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ رومیوں کی جائے قیام دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھے:

ایّھاالنّاس ابشروا حصرت واللّٰہ الروم وقل ما جاء محصورٍ بخیرٍ

(لوگو! خوش خبری ہو، خدا کی قسم رومی محصور ہو گئے اور محصور فوج بہت کم فلاح پاتی ہے)

مسلمانوں نے جس جگہ پڑاوَ ڈالا وہ عسکری نقطۂ نگاہ سے بہترین مقام تھا۔ وہاں سے وہ مرکز خلافت سے رابطہ قائم رکھ سکتے تھے اور ان کو کمک اور رسد بھی بآسانی پہنچ سکتی تھی۔ شکست کی صورت میں وہ صحرا کی جانب پسپا بھی ہو سکتے تھے۔ اس کے برعکس رومیوں کے لیے شکست کی صورت میں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ دوڈھائی لاکھ رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی کل تعداد (مل ملا کر) چھیالیس ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اس سے پہلے شام کے تمام معرکوں میں مسلمانوں نے رومیوں کی جو درگت بنائی تھی اس کے پیش نظر اپنی کثرتِ تعداد اور ساز وسامان کے باوجود رومی دل سے چاہتے تھے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے اور مسلمان کچھ لے دے کر واپس چلے جائیں۔ چنانچہ ان کے سپہ سالار باہان نے مسلمانوں کو پیش کش کی کہ وہ روپے لے لیں اور واپس چلے جائیں لیکن مسلمانوں نے یہ پیش کش ردّ کر دی اور جنگ ناگزیر ہو گئی۔ دونوں فوجیں باختلاف روایت دو ماہ، تین ماہ یا پانچ ماہ تک ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ اس دوران میں چھوٹی موٹی جھڑپیں تو ہوتی رہیں لیکن بڑی جنگ کی نوبت نہ آئی۔ بالآخر جمادی الاخری یا رجب ۱۵ ہجری میں طرفین پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ حضرت خالدؓ نے اپنی فوج کے ۳۶ (بہ روایت دیگر ۳۸ یا چالیس) دستے بنا دیے تاکہ دشمن کو اس کی تعداد اصل سے زیادہ نظر آئے۔ ان دستوں کے سردار ایسے لوگ تھے جو شجاعت اور جواں مردی میں اپنا جواب آپ تھے۔ مثلاً حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی، ہاشمؓ بن عتبہ، ضرارؓ بن الازور، عکرمہؓ بن ابی جہل، عبدالرحمٰنؓ بن خالد وغیرہ۔ قلب میں اٹھارہ دستے تھے جن کی قیادت حضرت ابوعبیدہؓ کر رہے تھے، میمنہ کے دس دستوں کی قیادت حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ کر رہے تھے اور میسرہ کے دس دستوں پر حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ افسر تھے۔ حضرت خالدؓ کے پاس رسالے کی کمان تھی۔ اس کے ساتھ لڑائی کی منصوبہ بندی اور عمومی نگرانی بھی انہی کے ذمہ تھی۔ حضرت مقدادؓ بن الاسود فوج کے سامنے سورۂ انفال کی تلاوت کرتے تھے

اور حضرت ابوسفیانؓ قاص کی خدمت انجام دیتے تھے یعنی مجاہدین کے سامنے کھڑے ہو کر ان کا جوشِ جہاد تازہ کرتے تھے۔ وہ ہر دستے کے سامنے جاتے اور کہتے:

"تم جواں مردانِ عرب ہو اور اسلام کے مددگار۔ وہ جواں مردانِ روم ہیں اور شرک کے مددگار۔
اے اللہ آج کا دن معرکہ کا دن ہے۔ اے اللہ اپنی مدد اپنے بندوں پر نازل فرما۔"

لشکر کو مختلف دستوں میں تقسیم کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ متفرق ہو کر لڑیں۔ حضرت خالدؓ نے ان کو پابند کر دیا تھا کہ وہ قلب، میمنہ اور میسرہ کے سرداروں سے احکام حاصل کریں اور انہی کے مطابق عمل کریں۔

اسلامی لشکر میں ایک ہزار صحابہ کرامؓ بھی شریک تھے جن میں سے سو بزرگ بدری تھے۔ جب حضرت خالدؓ صفیں قائم کر رہے تھے، ایک شخص کے منہ سے نکل گیا، رومیوں کے مقابلہ میں ہماری تعداد بہت کم ہے۔ حضرت خالدؓ غضب ناک ہو کر بولے:

"چپ رہ، فتح وشکست کا تعلق سپاہ کی کثرت یا قلتِ تعداد سے نہیں بلکہ اللہ کی تائید سے ہے۔ خدا کی قسم اگر میرے گھوڑے کے سُم درست ہوتے تو میں کہتا کہ رومی اتنی ہی تعداد اور بڑھا لیں۔"

صفیں مرتب کرنے کے بعد حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی اور حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کو حکم دیا کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ آور ہوں۔ وہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ساتھ ہی گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی جو تین (بہ روایت دیگر کئی) دن تک پوری شدّت سے جاری رہی۔ مؤرّخین نے اس جنگ کے واقعات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں لیکن ان کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ کسی نے کوئی واقعہ پہلے دن کی لڑائی کے ذیل میں لکھا ہے تو دوسرے نے وہی واقعہ دوسرے یا تیسرے دن کے واقعات میں شامل کیا ہے۔ ترتیب سے قطع نظر چند اہم واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) حضرت خالدؓ نے ایک دن صرف ساٹھ شہسواروں کا ایک رسالہ مرتب کیا اور رومی لشکر میں شامل ساٹھ ہزار عرب عیسائیوں کی فوج پر اس انداز سے حملہ کیا کہ کبھی اس کے ایک حصے پر جا پڑتے تھے اور کبھی دوسرے پر۔ اس طرح انہوں نے شام تک دشمن کو مصروف رکھا اور اپنے

بڑے لشکر کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ اس عجیب وغریب لڑائی میں دشمن کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے جب کہ مسلمانوں کے صرف دس آدمی شہید ہوئے اور پانچ دشمن کے ہاتھ اسیر ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے دوسرے دن ان قیدیوں کو رہا کرالیا۔

(۲) رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں کہ پیچھے ہٹنے یا بھاگنے کا خیال تک نہ آئے۔ ہزاروں پادری ہاتھوں میں صلیبیں لیے آگے آگے تھے اور اپنی فوج کو جوش دلاتے جاتے تھے۔

(۳) لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ نے حکم جاری کیا کہ تمام افسر حضرت خالد بن ولید کے حکم کی تعمیل کریں۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے تمام فوج کا معائنہ کیا۔ جس علم کے پاس پہنچتے اس کے جوانوں کو یوں خطاب کرتے:

> ''مسلمانو! فتح ثابت قدمی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ کمزوری کا نتیجہ ہمیشہ بربادی ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ جو ثابت قدمی سے کام لے گا اسی کو غلبہ حاصل ہوگا۔ کمزوری انہی کو لاحق ہوتی ہے، جو باطل کے پرستار ہوتے ہیں۔ حق کے علم بردار کبھی کمزوری نہیں دکھاتے کیوں کہ ان کو اپنے اللہ پر بھروسا ہوتا ہے۔ وہ حدودِ الٰہی کی حفاظت کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ شہید ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی حاصل کرلیں گے۔''

(۴) پہلے دن ایک رومی بطریق نے اپنی صفوں سے نکل کر مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ حضرت خالدؓ نے قیسؓ بن ہبیرہ کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے مقابلے پر جائیں۔ قیسؓ بن ہبیرہ نے آگے بڑھ کر ایک ہی وار میں ردی بطریق کو ڈھیر کر دیا۔ مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا، ابتدا مبارک ہوئی بس اب فتح ہے۔

(۵) رومی سپہ سالار باہان نے جرجہ (جارج) نامی ایک قاصد حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اپنے کسی معزز افسر کو گفتگوئے صلح کے لیے ہمارے پاس بھیجیں۔ جرجہ جس وقت اسلامی لشکر میں پہنچا شام ہو چکی تھی۔ ذرا دیر کے بعد مغرب کی نماز شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی نماز با جماعت کے روح پرور نظارے نے جرجہ کا دل نورِ ایمان سے منور کر دیا۔ مسلمان نماز سے فارغ ہوئے تو جرجہ حضرت ابوعبیدہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے چند

سوالات کیے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ تم لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہو۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا، ہمارا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے:

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور نہ اللہ کے بارے میں۔ جو کچھ کہو، حق کہو۔ عیسیٰؑ بن مریمؑ محض خدا کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ جسے اس نے مریمؑ کی طرف القا کیا اور اس کی طرف سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور تین خدا نہ کہو، اس کو چھوڑ دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ معبود واحد ہے۔ وہ اس بات سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، سب اسی کا ہے۔ نہ مسیح خدا کا بندہ ہونے سے عار محسوس کرتے ہیں اور نہ مقرب ملائکہ اور جو شخص اللہ کی بندگی سے عار محسوس کرے اور تکبّر سے کام لے تو لوگ سن لیں کہ اللہ ان سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔''

جرجہ حضرت ابوعبیدہؓ کا جواب سن کر بے اختیار پکار اٹھا کہ بے شک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہی اوصاف ہیں اور بے شک تمہارا پیغمبر سچا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کلمۂ توحید پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔ وہ اپنی قوم کے پاس واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے اس خیال سے کہ رومیوں کو بدعہدی کا خیال نہ ہو، اس کو مجبور کیا کہ اس وقت واپس جاؤ اور کل یہاں سے جو سفیر جائے اس کے ساتھ آ جاؤ۔ (الفاروق۔ شبلی نعمانیؒ)

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ (نواب صدر یار جنگ) نے اپنی کتاب ''سیرۃ الصدّیقؓ'' میں اس واقعے کو بالکل دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دوران کارزار میں رومیوں کا سردار جرجہ بن توذر میدان میں آیا اور للکار کر کہا، خالد میرے سامنے آئیں۔ حضرت خالدؓ آگے بڑھ کر دونوں لشکروں کے درمیان جرجہ سے ملے۔ اوّل دونوں نے ایک دوسرے کو پناہ دی بعد ازاں اس قدر مل کر کھڑے ہوئے کہ گھوڑوں کی کنوتیاں مل گئیں۔

جرجہ: خالد سچ کہنا جھوٹ مت بولنا، آزاد مرد جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہ دینا۔ فریب شرفاء کا شیوہ نہیں، میں یہ پوچھتا ہوں کہ خدا نے تمہارے نبی کے پاس آسمان سے تلوار بھیجی تھی وہ تم کو عطا ہوئی اور اس کا اثر ہے کہ تم ہر جگہ فتح یاب ہوتے ہو۔

حضرت خالدؓ: نہیں۔

جرجہ: پھر تمہارا لقب سیف اللہ کیوں ہے؟

حضرت خالدؓ: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ہمارے پاس بھیجا انہوں نے اسلام ہمارے سامنے پیش کیا۔ اوّل ہم سب کے سب بھاگ کر کنارہ کش ہو گئے۔ بعض نے تصدیق کر کے پیروی اختیار کی۔ بعض دُور دُور رہ کر جھٹلاتے رہے۔ میں ان میں تھا جو تکذیب پر قائم تھے۔ اس کے بعد اللہ نے ہمارے قلب پھیر دیے، گردنیں جھکا دیں اور ہدایت بخشی۔ میں نے بھی نبی ﷺ کی اطاعت قبول کی، اس وقت ارشاد ہوا:

''اے خالد تو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، جو مشرکین کے مقابلے کے لیے نیام سے نکلی ہے۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ اب میں سب مسلمانوں سے زیادہ مشرکوں کا دشمن ہوں۔

جرجہ: تم نے سچ کہا اب یہ بتاؤ کہ دعوت اسلام کیا ہے؟

حضرت خالدؓ: اس امر کا اقرار کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور اس پیغام کی تصدیق جو وہ خدا کی طرف سے لائے۔

جرجہ: اگر اس کو کوئی نہ مانے۔

حضرت خالدؓ: جزیہ دے۔

جرجہ: یہ بھی قبول نہ کرے۔

حضرت خالدؓ: ہم اعلانِ جنگ کریں گے۔

جرجہ: جو تم میں شامل ہو، اس کا مرتبہ؟

حضرت خالدؓ: اللہ کا فرمان ہے کہ سب مسلمان درجے میں برابر ہیں۔ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ۔ اوّل ہوں یا آخر۔

جرجہ: جو آج ایمان لائے وہ بھی رتبہ میں مساوی ہوگا؟

حضرت خالدؓ: برابر ہوگا بلکہ افضل۔

جرجہ: یہ کس طرح

حضرت خالدؓ: ہم نے جب اسلام قبول کیا، رسول اللہ ﷺ حیات تھے۔ نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا۔ آپؐ احکام آسمانی کی خبر دیتے تھے۔ ہم معجزات و تصرّفات کا مشاہدہ کرتے

تھے۔ اس صورت میں ہمارا مسلمان ہونا لازم تھا۔ آج تم ان باتوں کونہیں دیکھتے پھر بھی ایمان لاتے ہوتو ہم سے افضل ہو۔

جرجہ: تم قسم سے کہتے ہو کہ تم نے مجھ سے پورا سچ کہا، دھوکا نہیں دیا، تالیف قلب نہیں کی۔

حضرت خالدؓ: واللہ نہ میں نے جھوٹ کہا نہ مجھ کو تم سے یا کسی سے نفرت ہے جو تم نے پوچھا اس کا سچا جواب میں نے دے دیا۔ اللہ میرا مددگار رہے۔

جرجہ: بے شک تم نے سچ کہا۔

یہ کہہ کر اپنی ڈھال پس پشت ڈال دی اور کہا مجھ کو اسلام کی تلقین کرو۔

حضرت خالدؓ اس کو اپنے خیمے میں لے گئے، اوّل غسل دیا پھر تلقین اسلام کے بعد جرجہ کو مقتدی بنا کر دو رکعت نماز ادا کی۔ جرجہ کی یہ حالت دیکھ کر رومیوں نے عام ہلّہ کر دیا۔ جس وقت حضرت خالدؓ جرجہ کو لے کر خیمے سے نکلے تو رومی مسلمانوں کی صفوں میں گھُسے ہوئے تھے۔ حضرت خالدؓ نے للکارا تو مسلمانوں نے دلیری سے حملہ کر کے دشمن کو پیچھے ہٹا دیا۔ اب سیف اللہ نے ہلّہ کیا اور شمشیر آزمائی شروع ہوئی۔ چاشت سے دن ڈھلنے تک میدانِ جنگ یکساں گرم رہا انتہا یہ کہ عصر کی نماز اشارے سے ادا کی گئی۔ یہ عالم قابل دید تھا کہ وہ جرجہ جو صبح کو مسلمانوں کے دشمن تھے اب حضرت خالدؓ کے پہلو بہ پہلو نشۂ ایمان میں سرشار رومیوں پر وار کر رہے تھے اور یہ قسمت کہ عین معرکہ میں شہادت سے کامیاب ہوئے اور صرف وہ نماز ادا کر کے جو آغاز اسلام کا نیاز تھی سرخ رُو اپنے رب کے حضور میں پہنچے۔ رضی اللہ عنہ

(۶) جرجہ کی سفارت کے جواب میں دوسرے دن حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو سفیر بنا کر باہان کے پاس بھیجا۔ باہان نے اپنی شان وشوکت اور فوجی کثرت وقوت کے مظاہرے کا خاص اہتمام کیا۔ راستے میں دونوں جانب پیدل فوج کی دس دس صفیں تھیں اور ان کے پیچھے سواروں کی نہایت طویل قطاریں تھیں۔ یہ تمام سپاہی زرہ پوش اور پوری طرح مسلّح تھے۔ حضرت خالدؓ پر اس مظاہرے کا کوئی اثر نہ ہوا وہ رومیوں کے درمیان سے اس طرح گزرے جیسے بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ کے درمیان سے شیر گزرتا ہے۔ باہان کے خیمے کے پاس پہنچے تو اس نے بڑے احترام سے استقبال کیا

اور خیمے میں لا کر اپنے برابر بٹھایا۔ مترجم کے ذریعے پہلے کچھ رسمی باتیں ہوئیں اس کے بعد باہان نے اپنی تقریر کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف سے کیا اور پھر کہا:

''ہمارا بادشاہ تمام بادشاہوں کا شہنشاہ ہے اور ہماری قوم دنیا کی تمام قوموں سے بہتر قوم ہے۔''

حضرت خالدؓ نے قطع کلام کر کے فرمایا:

''تم اپنے بادشاہ کو جو چاہو سمجھو لیکن ہم نے جس کو سردار بنا رکھا ہے اگر اس کے دل میں ایک لحظہ کے لیے بھی بادشاہی کا خیال آئے تو ہم اس کو فوراً معزول کر دیں۔''

باہان نے پھر تقریر شروع کی اور اپنے ملک کی خوشحالی اور دولت کا ذکر کر کے کہا:

''اہلِ عرب آزادی کے ساتھ اس ملک میں آتے جاتے تھے۔ ان میں سے جو یہاں آباد ہو گئے ہم نے ان کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ کیا۔ لیکن تم لوگ ہمارے ممنون ہونے کی بجائے اس ملک پر چڑھ دوڑے۔ تم کو معلوم نہیں کہ تم سے پہلے کئی اور قوموں نے اس ملک کو فتح کرنے کا ارادہ کیا لیکن سب نے منہ کی کھائی۔ پھر تم جیسی جاہل، وحشی اور بے سروسامان قحط زدہ قوم اس ملک کو کیا فتح کرے گی۔ شاید تم افلاس اور قحط سالی سے مجبور ہو کر اس ملک میں داخل ہوئے ہو اس لیے ہم تمہاری جسارت سے درگزر کرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ہمارا ملک خالی کر دو تو ہم تمہارے سپہ سالار کو دس ہزار، ہر افسر کو ایک ایک ہزار اور ہر سپاہی کو سو سو دینار دلا دیں گے۔''

باہان اپنی تقریر ختم کر چکا تو حضرت خالدؓ نے اس کے جواب میں حمد و نعت کے بعد فرمایا:

''تم نے اپنی قوم کے تمول اور جاہ و حشمت کا جو حال بیان کیا ہے ہم اس کو جانتے ہیں، تم نے اپنے ہمسایہ عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا بھی ہمیں علم ہے لیکن یہ تمہارا احسان نہ تھا بلکہ یہ تم نے اپنی سلطنت اور مذہب کو فروغ دینے کے لیے کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ عیسائی ہو گئے اور آج وہ تمہارے ساتھ مل کر ہمارے خلاف لڑتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ہم نہایت مفلس نادار اور خانہ بدوش تھے۔ ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ جو قوی ہوتا تھا وہ کمزوروں کو کھا جاتا تھا۔ قبائل ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جاتے تھے ہم نے اپنے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے معبود بنا لیے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بت بناتے تھے اور ان کو پوجتے تھے۔ اللہ نے ہم پر رحم کیا اور ایک پیغمبر بھیجا جو خود ہماری قوم سے تھا۔ وہ ہم میں سب سے زیادہ شریف، سب سے زیادہ فیاض اور سب سے زیادہ پاک باز اور نیک سیرت تھا۔ اس نے ہمیں خدائے واحد کی طرف بلایا اور ہمیں تعلیم دی کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، بت پرستی کو چھوڑ دیں۔ اس کے بیوی اور اولاد نہ مانیں۔ اُس نے ہم کو یہ بھی حکم دیا کہ ہم اس کے لائے ہوئے دین کو دنیا میں بھی پھیلائیں۔ جس نے اس دین کو مان لیا وہ ہمارا بھائی ہے۔ جو دین میں تو داخل نہ ہوا لیکن جزیہ دینا قبول کیا، ہم اس کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ جس کو دونوں سے انکار ہو تو پھر وہ سمجھ لے کہ اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جو موت کو اسی طرح عزیز رکھتے ہیں جیسے وہ زندگی کو۔ ملک خدا کا ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ انجام کار وہی لوگ کامیاب ہوں گے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔''

باہان نے حضرت خالدؓ کی تقریر سن کر کہا:

''نہ ہم میں سے کوئی تمہارا دین قبول کرے گا اور نہ جزیہ دینے پر آمادہ ہوگا۔ ہم جزیہ لیتے ہیں دیتے نہیں۔''

غرض گفتگوئے صلح ناکام ہوگئی اور حضرت خالدؓ اٹھ کر اپنے لشکر میں آ گئے۔

(۷) **ایک موقع پر رومیوں نے مسلمانوں کے میمنہ کو اس قدر دبایا کہ وہ فوج سے الگ ہو کر نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا یہاں تک کہ عورتوں کے خیموں تک پہنچ گیا۔ عورتوں نے اپنے مردوں کو پسپا ہوتے دیکھا تو ان کو سخت غصہ آیا۔ اسلام کی ان غیور بیٹیوں نے خیموں کی چوبیں اکھاڑ لیں اور پیچھے ہٹنے والوں سے پکار کر کہا، اگر تم اِدھر آئے تو یہ چوبیں تمہارے سر توڑ دیں گی۔ بعض خواتین انہی چوبوں کے ساتھ رومیوں پر پل پڑیں اور بہت سے رومیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ عورتوں کا جوشِ ایمان دیکھ کر پیچھے ہٹنے والے مجاہدین کے قدم جم گئے اور وہ بڑے جوش سے لڑنے لگے۔ عین اس وقت حضرت خالدؓ صف چیر کر نکلے اور اس زور سے حملہ کیا کہ رومیوں کی کئی صفیں ابتر**

کر دیں۔ لیکن ان کا دباؤ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اب حضرت خالدؓ اسلامی میمنہ میں پہنچے، اس کی ترتیب از سرِ نو درست کی اور مسلمانوں کو للکار کر کہا:

''مسلمانو! دشمن کا جوش و خروش اور بہادری تم دیکھ چکے۔ اب اس پر پوری قوت سے ٹوٹ پڑو اللہ تمہیں کامیاب و کامران کرے گا۔''

حضرت خالدؓ کی للکار پر مسلمان دو چند جوش کے ساتھ لڑنے لگے۔ یکا یک حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور رومیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''رومیو! میں کسی زمانے میں (قبولِ اسلام سے پہلے) خود رسول اللہ ﷺ سے لڑ چکا ہوں کیا آج تمہارے سامنے پسپا ہو جاؤں گا؟ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔'' ـــــ یہ کہہ کر اپنی فوج کی طرف دیکھا اور کہا:

''آؤ کون میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرتا ہے۔''

ان کی آواز پر چار سو جانباز آگے بڑھے اور ان کے ہاتھ پر مرنے کی بیعت کی اس کے بعد ان سرفروشوں نے حضرت خالدؓ کے خیمے کے سامنے نہایت بے جگری سے لڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ حضرت عکرمہؓ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر سے ملی۔ ابھی کچھ دم باقی تھا۔ حضرت خالدؓ نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھا اور حلق میں پانی ٹپکا کر کہا:

''خدا کی قسم! عمرؓ کا گمان غلط تھا کہ ہم (بنو مخزوم) شہادت سے محروم رہیں گے۔''(۱)

غرض حضرت عکرمہؓ اور ان کے ساتھی خود شہید ہو گئے لیکن رومیوں کے ہزاروں آدمی بھی ہلاک کر دیے۔ حضرت خالدؓ کے تابڑ توڑ حملوں نے بھی ان کا زور توڑ دیا اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت خالدؓ تعاقب کرتے ہوئے ان کے سپہ سالار درنجار تک پہنچ گئے، جو اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔

''میرے سر اور آنکھوں پر کپڑا ڈال دو کاش میں مسلمانوں کو آگے بڑھتے نہ دیکھ سکتا۔''

آخر درنجار مسلمانوں کے گھیرے میں آ گیا اور مارا گیا۔

---

(۱) یہ طبری کا بیان ہے۔ بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت عکرمہؓ۔ جنگِ یرموک دوم (۱۵ھ) سے پہلے شہید ہو چکے تھے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ انہوں نے پہلی جنگ یرموک (۱۳ھ) میں یا جنگ اجنادین (۱۳ھ) میں شہادت پائی۔

مختصر یہ کہ مسلسل تین دن تک فریقین میں خونریز لڑائی ہوتی رہی۔ تیسرے دن رومیوں نے بار بار خوفناک حملے کیے لیکن مسلمان بڑے ثابت قدم نکلے اور ہر حملے کا بڑی جرأت سے مقابلہ کیا بالآخر انھوں نے تلواروں کے نیام توڑ کر پھینک دیے۔ نیزے سیدھے کر لیے اور سربکف دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کے قدم لڑکھڑا گئے۔ عین اس وقت قیس بن ہبیرہؓ جن کو حضرت خالدؓ نے فوج کا ایک حصہ دے کر میسرہ کی پشت پر متعین کر دیا تھا، عقب سے نکلے اور رومیوں پر بجلی بن کر گرے۔ ساتھ ہی حضرت سعیدؓ بن زید قلب لشکر سے نکل کر رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان حملوں سے رومی حواس باختہ ہو گئے۔ ان کی تقریباً نصف فوج ہلاک یا زخمی ہو گئی اور باقی بھاگ نکلی۔ اس طرح مسلمانوں کو عظیم الشان فتح ہوئی۔ اس جنگ کا شمار شام کی فیصلہ کن لڑائیوں میں ہوتا ہے اس کے بعد رومی کبھی اتنی تعداد میں جمع نہ ہو سکے۔ ہرقل کو انطاکیہ میں شکست کی خبر پہنچی تو اس کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

''رخصت! اے شام''

اور پھر اس نے فی الواقع سرزمینِ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ کی راہ لی۔

(۱۶)

یرموک کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو قنسرین کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ اثنائے راہ میں حاضر کے مقام پر ایک نامور رومی جرنیل میناس ایک بڑی فوج کے ساتھ حضرت خالدؓ کے مزاحم ہوا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو شکست فاش دی اور وہاں سے قنسرین کی طرف بڑھے۔ اہل قنسرین چند دن قلعہ بند ہو کر مدافعت کرتے رہے۔ حضرت خالدؓ نے ان کو پیغام بھیجا:

''تم اگر بادلوں میں جا چھپو گے جب بھی خدا ہمیں اٹھا کر تمہارے پاس پہنچا دے گا یا تمھیں ہمارے پاس اتار دے گا۔''

یہ پیغام ملنے پر محصورین ہمت ہار بیٹھے اور صلح کی درخواست کی حضرت خالدؓ نے اس شرط پر صلح منظور کی کہ شہر کی فصیل منہدم کر دی جائے۔

قنسرین کے بعد مسلمانوں نے حلب، انطاکیہ، منبج، مرعش، حصن حرث اور دوسرے

بہت سے مقامات بھی آسانی سے فتح کر لیے۔ ان میں سے مرعش خاص حضرت خالدؓ کے ہاتھ پر فتح ہوا۔

اب مسلمانوں نے بیت المقدس (یوروشلم) کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ عیسائیوں نے معمولی مزاحمت کی لیکن پھر اس شرط پر صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے کہ مسلمانوں کے خلیفہ خود آ کر معاہدۂ صلح لکھیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی تشریف آوری پر موقوف ہے۔ بیت المقدس عیسائیوں کا کعبۂ دین تھا اور مسلمانوں کے نزدیک بھی نہ صرف قبلۂ اوّل ہونے کی حیثیت سے نہایت معزّز و محترم تھا بلکہ اس لیے بھی کہ یہ انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ رہا تھا اور سرورِ عالم ﷺ نے اسی جگہ سے سفرِ معراج کی دوسری منزل کا آغاز فرمایا تھا۔ چوں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے وہاں تشریف لے جانے سے کسی کُشت وخون کے بغیر یہ مقدس شہر مسلمانوں کے ہاتھ آتا تھا اس لیے وہ بیت المقدس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ رجب ۱۶ ہجری میں چند مہاجرین اور انصار کو ساتھ لیا اور مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ جابیہ پہنچے تو حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت یزید بن ابی سفیانؓ اور دوسرے افسرانِ فوج نے استقبال کیا۔ یہ اصحاب دیبا وحریر کی قیمتی قبائیں پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو اس پُر تکلّف لباس میں دیکھا تو برہم ہو کر گھوڑے سے اتر پڑے اور زمین سے کنکریاں اٹھا کر ان کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا:

"تم لوگوں کو کیا ہوا جو اس تزئین وتکلّف کے ساتھ میرے استقبال کو آئے ہو؟ دو ہی سال کے عرصے میں تم نے اپنی سادگی ترک کر کے عجمی وضع اختیار کر لی۔"

انہوں نے عرض کیا:

"امیر المومنین ہم نے اپنی سپاہیانہ وضع ترک نہیں کی ہے ان قباؤں کے نیچے ہمارے ہتھیار موجود ہیں۔"

یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا، تو پھر کچھ مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد بیت المقدس تشریف لے گئے اور معاہدۂ صلح لکھ کر عیسائیوں کے حوالے کیا۔ انہوں نے خوشی کے ساتھ شہر مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔

۱۷ ہجری کے اوائل میں قیصرِ روم نے حمص پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے اصل محرک اہل جزیرہ تھے۔ انہوں نے قیصر کو لکھا کہ آپ حمص پر فوج کشی کیجیے ہم ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی تحریک پر قیصر نے ایک بڑا لشکر حمص کی طرف روانہ کیا۔ ادھر سے اہل جزیرہ بھی تیس ہزار فوج کے ساتھ حمص کی طرف بڑھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو اِدھر اُدھر سے جو کچھ فوج میسر آ سکتی تھی اس کو لے کر حمص کے باہر قیام کیا۔ حضرت خالدؓ اس وقت قنسرین میں تھے وہ بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے تمام حالات کی اطلاع حضرت عمر فاروقؓ کو دی تو انہوں نے ہر طرف قاصد دوڑا دیے کہ ہر جگہ سے فوج کا کچھ حصہ فوراً امداد کو پہنچے۔ حضرت سہیل بن عدیؓ کو حکم ہوا کہ جزیرہ پہنچ کر اہل جزیرہ کو حمص کی طرف بڑھنے سے روکیں۔ ساتھ ہی ولیدؓ بن عقبہ کو مامور کیا کہ جزیرہ پہنچ کر ان عرب قبائل کو تھام رکھیں جو جزیرہ میں آباد تھے۔ حضرت سہیلؓ اور ولیدؓ جزیرہ کی طرف بڑھے تو اہل جزیرہ کو گھر کی فکر پڑ گئی اور وہ حمص کا ارادہ چھوڑ کر واپس چل دیے۔ عرب قبائل جو رومیوں کی مدد کے لیے آئے تھے وہ بھی پشیمان ہوئے اور حضرت خالدؓ کو خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر آپ کہیں تو ہم اسی وقت رومیوں سے الگ ہو جائیں یا عین حالت جنگ میں ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ حضرت خالدؓ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ مجھ کو نہ تمہارے ٹھہرنے کی پروا ہے نہ رومیوں کا ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کی تاہم اگر تم سچے ہو تو عین موقعے پر رومی لشکر سے الگ ہو کر کسی طرف نکل جانا۔

اہلِ جزیرہ کے الگ ہو جانے سے رومیوں کی قوت کمزور ہو گئی۔ اُدھر مسلمانوں نے حضرت ابوعبیدہؓ سے تقاضا کیا کہ رومیوں پر حملہ کیا جائے۔ انہوں نے حضرت خالدؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی حملہ کرنے کے حق میں رائے دی اور کہا کہ رومی ہمیشہ اپنی کثرتِ تعداد کے بل پر لڑتے ہیں لیکن اب ان کو یہ بات بھی حاصل نہیں رہی اس لیے حملہ کرنے میں تاخیر مناسب نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے فوج کے سامنے ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا اور پھر رومیوں پر ہلّہ بول دیا۔ رومیوں نے اس حملہ کو سنبھالا لیکن دفعتہً عرب قبائل (جیسا کہ وہ حضرت خالدؓ سے قول و اقرار کر چکے تھے) رومی لشکر سے الگ ہو کر پیچھے ہٹے۔ اس طرح رومیوں کو سخت دھچکا لگا اور وہ بدحواس ہو کر بھاگ نکلے۔

علامہ شبلیؒ نے ''الفاروق'' میں لکھا ہے کہ:

”یہ اخیر معرکہ تھا، جس کی ابتدا خود عیسائیوں کی طرف سے ہوئی اور جس کے بعد پھر کبھی ان کو پیش قدمی کا حوصلہ نہ ہوا۔“

(۱۷)

پیچھے ذکر آ چکا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے مسند نشین خلافت ہو کر (۱۳ھ میں) حضرت خالدؓ بن ولید کو شام کے سپہ سالارِ اعلیٰ (کمانڈر انچیف) کے عہدے سے سبک دوش کر کے حضرت ابو عبیدہؓ الجراح کے ماتحت کر دیا تھا۔ بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے مسند خلافت پر قدم رکھتے ہی حضرت خالدؓ کو مکمل طور پر معزول کر دیا لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ (۱۳ھ میں) حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیا لیکن فوج کے ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے برقرار رکھا۔ البتہ ۱۷ ہجری میں ان کو مکمل طور پر معزول کر کے ایک عام سپاہی بنا دیا۔ اسلام کے اس عظیم ترین جرنیل کی معزولی کے کیا اسباب تھے؟ مؤرخین نے اس سلسلہ میں بہت سی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ ان کو ذاتی طور پر ناپسند کرتے تھے اور بچپن ہی سے اُن کا دل حضرت خالدؓ کی طرف سے صاف نہیں تھا لیکن یہ قیاس بدیہی طور پر غلط ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ دیانت اور تقویٰ کے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ امورِ مملکت میں اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ مملکت اسلامیہ اور اُمّت کے وسیع تر مفاد کو پیش نظر رکھتے تھے۔

مختلف روایتوں میں حضرت خالدؓ کی معزولی کے متعدد اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے، جو قرین عقل معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) حضرت خالدؓ نے عسکری مزاج پایا تھا وہ بسا اوقات ایسے موقعوں پر بھی سختی سے کام لیتے تھے جہاں نرمی اور درگزر سے کام لیا جا سکتا تھا۔ ان کے برعکس حضرت ابو عبیدہؓ بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور تدبیر و شجاعت کے اوصاف سے بھی بہرہ ور تھے۔

(۲) حضرت خالدؓ بعض اوقات جوشِ شجاعت و تہوّر میں ایسے اقدامات کر بیٹھتے تھے، جو حضرت عمرؓ کے نزدیک بے احتیاطی کی تعریف میں آتے تھے۔

(۳) حضرت خالدؓ نے مالک بن نویرہ کو قتل کر دیا اور بعد میں اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ بعض صحابۂ کرامؓ کو جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، حضرت خالدؓ کا یہ فعل پسند نہ آیا اور انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ وہ خالد کو معزول کر دیں۔ لیکن صدیقِ اکبرؓ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور حضرت خالدؓ کا عذر قبول کر کے فرمایا: ''میں اللہ کی تلوار کو نیام میں نہیں کر سکتا۔''

بقولِ بعض صدیقِ اکبرؓ نے حضرت خالدؓ کے اس فعل کو اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا اور انہیں بری الذمہ قرار دیا لیکن حضرت عمرؓ مطمئن نہ ہوئے۔

(۴) حضرت خالدؓ بعض اوقات حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اجازت کے بغیر بھی کوئی کام کر بیٹھتے تھے۔ ۱۲ ہجری میں ان کا محاذِ جنگ کو چھوڑ کر خفیہ حج کرنا ایسا ہی کام تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے درگزر سے کام لیا لیکن ان کو ہدایت کی کہ آئندہ کبھی ایسا نہ کریں۔ حضرت عمرؓ ایسی باتوں کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔

(۵) حضرت خالدؓ جزیہ لگان وغیرہ کا باقاعدہ حساب بارگاہِ خلافت میں نہیں بھیجتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک یہ طرزِ عمل قابلِ گرفت تھا۔

(۶) حضرت خالدؓ فوجی معاملات میں قدم قدم پر بارگاہِ خلافت سے رہنمائی اور اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ فوجی معاملات کو موقع پر موجود افسران ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، اس لیے ان کے پاس ہر قسم کا قدم اٹھانے کے وسیع اختیارات ہونے چاہئیں۔ حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کے اس وقف سے اتفاق نہ تھا وہ اپنے آپ کو فوج کے ایک ایک سپاہی کی سلامتی اور حفاظت کا ذمہ دار سمجھتے تھے اس لیے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی اہم قدم ان کے مشورہ کے بغیر نہ اٹھایا جائے۔

(۷) مسلمانوں میں یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ اسلامی فتوحات کا دارومدار حضرت خالدؓ کی جنگی مہارت اور قوّتِ بازو پر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اس قسم کے خیال کو اُمّتِ مسلمہ کے لیے مہلک سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک فانی انسان پر حد سے زیادہ بھروسا کرنا نہ صرف قوّتِ ایمانی کو کمزور کرنے کا باعث ہوسکتا تھا بلکہ اس سے مسلمان اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت

سے بھی محروم ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس خیال کو مسلمانوں کے دل سے نکالنے کے لیے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد کے سب سے بڑے فاتح جرنیل کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ تمام اسباب اپنی جگہ پر کتنے ہی اہم ہوں حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۳ھ میں صرف حضرت خالدؓ کا عہدہ (Rank) گھٹانے پر اکتفا کیا اور پھر چار سال سے کچھ زائد عرصہ تک ان سے کوئی تعرّض نہ کیا۔ ۱۷ہجری میں ان کی مکمل معزولی کا باعث جو واقعہ ہوا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک شاعر (اشعث بن قیس) کو ایک ہزار دینار (یا دس ہزار درہم) انعام دیے۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنے عُمّال اور افسروں کی ہر بات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور کسی ایسی چیز کو گوارا نہ کرتے تھے جو اسلام کی روح سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ان کو حضرت خالدؓ کی شاہانہ فیاضی'' کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو خط لکھا کہ اگر خالدؓ نے یہ رقم سرکاری خزانہ سے دی تو خیانت کی اور اپنی گرہ سے دی تو اسراف کیا دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔ جو قاصد یہ خط لے کر گیا حضرت عمرؓ نے اس کو ہدایت کی کہ خالدؓ سے مجمع عام میں دریافت کرو کہ اتنا بھاری انعام آپ نے کہاں سے دیا؟ اگر وہ اپنی خطا کا اقرار کرلیں تو ان سے درگزر کرنا ورنہ دستور کے مطابق اس مجمع کے سامنے ان کو معزول کر دینا۔

قاصد نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان مجمع عام میں پڑھا اور پھر حضرت خالدؓ سے پوچھا کہ آپ نے اتنا بڑا انعام کہاں سے دیا؟ حضرت خالدؓ نے جواب دیا کہ یہ انعام میں نے اپنے مال سے دیا اور میں نے کوئی خطا نہیں کی۔ چوں کہ انہوں نے خطا سے انکار کیا، قاصد نے کہا کہ آپ نے اسراف کیا اس لیے امیر المؤمنین کے حکم سے آپ کو معزول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتار لی اور عمامہ گردن میں ڈال دیا۔

ایک روایت کے مطابق یہ کام حضرت ابوعبیدہؓ نے کیا۔ اس موقع پر حضرت خالدؓ نے کہا، میں نے فرمان سنا اور مانا۔ اب بھی میں افسروں کے احکام ماننے اور خدمات بجالانے کے لیے تیار ہوں۔

ایک اور روایت میں ان سے یہ الفاظ منسوب ہیں۔ ''میں اپنا نفس اللہ تعالیٰ کو ہبہ کر چکا ہوں۔''

علامہ شبلی ''الفاروق'' میں لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایسا بڑا سپہ سالار جس کا نظیر تمام عالم اسلام میں کوئی شخص نہ ہو اور جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جارہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا۔ اس واقعے سے ایک طرف تو خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی سطوت وجلال کا اندازہ ہوتا ہے۔''

حضرت خالدؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم کر دیا لیکن وہ اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتے تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کے دل میں قدرے ملال پیدا ہوا۔ وہ حمص گئے تو لوگوں کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا:

''امیر المومنین نے مجھ کو افواجِ شام کا افسر بنایا اور جب میں نے سارا شام فتح کر لیا تو مجھ کو معزول کر دیا۔''

ان کے اس اظہارِ ملال پر ایک مجاہد اٹھ کھڑا ہوا اور کہا، ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیے ان سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔

حضرت خالدؓ نے فرمایا:

''میرے بھائی! عمرؓ کے ہوتے ہوئے کسی فتنے کا اندیشہ نہیں۔''

(کتاب الخراج، قاضی ابو یوسفؒ)

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ معزولی کے بعد حضرت خالدؓ حمص ہوتے ہوئے مدینہ منوّرہ گئے اور حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ آپ نے میرے معاملے میں زیادتی سے کام لیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا، تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟

انہوں نے کہا، مالِ غنیمت کے حصوں سے۔ میرے پاس ساٹھ ہزار سے زیادہ جو کچھ نکلے، وہ آپ لے لیجیے۔

حضرت عمرؓ نے فوراً حساب کرایا، بیس ہزار کی رقم زیادہ نکلی۔ حضرت خالدؓ نے یہ رقم بہ خوشی حضرت عمرؓ کے حوالے کر دی۔ انہوں نے اسے بیت المال میں داخل کرا دیا اور حضرت خالدؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

یَا خَالِدُ اِنَّکَ عَلَیَّ لَکَرِیْمٌ وَاِنَّکَ اِلَیَّ لَحَبِیْبٌ۔

اے خالدتم میرے نزدیک بزرگ ومحترم ہونے کے ساتھ مجھے عزیز اور پیارے بھی ہو۔

طبری کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے یہ شعر بھی پڑھا:

صنعت فلم یصنع کصنعک ھانع
وما یصنع الاقوام فاللّٰہ یصنع

(تم نے بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور کوئی شخص بھی تم جیسے کارہائے نمایاں انجام نہ دے سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قومیں کچھ نہیں کیا کرتیں، جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کرتا ہے)

اس کے بعد امیر المؤمنینؓ نے تمام ممالک محروسہ کو ایک فرمان بھیجا جس میں لکھا کہ:

''میں نے خالد کو کسی ناراضی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا، صرف اس لیے معزول کیا ہے کہ مسلمان جان لیں کہ اسلامی فتوحات کا انحصار خالد کے زور وقوت پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت پر ہے۔''

''مستدرک حاکم'' میں ہے کہ معزولی کے کچھ عرصے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت خالدؓ کو رہا، حران، آمد اور لرتہ کے علاقوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ ایک سال تک اس منصب پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ استعفا دینے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد حضرت خالدؓ نے کچھ دن بیمار رہ کر ۲۱ھ ۶۴۲ء (بہ روایتِ دیگر ۲۲ھ ۶۴۳ء) میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ وفات سے کچھ دیر پہلے حضرت خالدؓ نے (بصد حسرت ویاس) فرمایا:

''میں نے اپنی زندگی میں تقریباً تین سو (بہ روایتِ دیگر ایک سو سے زائد) جنگیں لڑی ہیں۔ میرے جسم کے ہر حصے میں تیروں، تلواروں اور نیزوں کے زخم لگے ہیں مگر شہادت نصیب نہیں ہوئی اور آج بستر پر اونٹ کی طرح جان دے رہا ہوں۔ خدا بزدلوں کو کبھی چین نصیب نہ کرے۔''

حضرت خالدؓ کی جائے وفات اور مدفن کے بارے میں ارباب سیر میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی اور حضرت عمر فاروقؓ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ اس دن مدینہ کی خواتین خصوصاً بنی مغیرہ میں کہرام برپا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو رنج و غم سے نڈھال دیکھ کر فرمایا، بنو مغیرہ کی عورتیں رونے میں معذور ہیں بہ شرطیکہ واویلا اور سینہ کوبی نہ کریں۔

— لیکن جمہور اہل سیر کا بیان ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں حضرت عمرؓ سے مل کر حمص چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان اہل سیر میں واقدیؒ، طبریؒ، ابن عساکرؒ، ابن اثیرؒ، حافظ ذہبیؒ اور علامہ عینیؒ شارح بخاری شامل ہیں — ابنِ عساکرؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''حضرت خالدؓ کی قبر حمص میں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے جنازے کو کس کس نے غسل دیا تھا اور کون کون جنازے پر حاضر ہوا تھا۔''

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ:

''صحیح یہ ہے کہ حضرت خالدؓ حمص میں فوت ہوئے اور ان کی قبر زیارت گاہ عوام ہے۔''

(سیر اعلام النبلاء)

حافظ ابن عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ وفات سے پہلے حضرت خالدؓ نے وصیت کی کہ میرے ہتھیار اور سواری کا گھوڑا اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے وقف کر دیے جائیں۔

بقول حافظ ذہبیؒ ان کا سارا اثاثہ یہ تھا:

ایک غلام، ایک گھوڑا اور اسلحہ

ابن عساکرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو حضرت خالدؓ کے ترکے کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا، اللہ ابو سلیمان پر رحم کرے، ہمیں یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس تنگ دستی سے گزارہ کرتے ہوں گے۔

ایک اور روایت میں ابن عساکرؒ کہتے ہیں کہ حضرت خالدؓ کی وفات پر حضرت عمر فاروقؓ کو سخت صدمہ ہوا اور انہوں نے فرمایا:

''خالد کے مرنے سے اسلام کی فصیل میں ایک ایسی دراڑ پڑ گئی ہے، جو کبھی پُر نہ ہو سکے گی۔ کاش اللہ تعالیٰ ان کو اور طویل عرصہ تک زندہ رکھتا۔''

(۱۸)

حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنی زندگی میں کئی نکاح کیے، جن سے کثیر اولاد پیدا ہوئی لیکن ان کی تعداد اور ناموں کی تفصیل نہیں ملتی۔ اہل سیر نے صرف ان کے چار بیٹوں کے نام خصوصیت سے لیے ہیں۔ سلیمان جن کے نام کی نسبت سے حضرت خالدؓ کی کنیت ابوسلیمان تھی۔ عبداللہ جو عراقِ عرب کے کسی معرکے میں شہید ہوئے۔ مہاجر جو جنگ صفّین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اور عبدالرحمٰنؓ جنہوں نے بہادری شہسواری اور سخاوت اپنے عظیم باپ سے ورثے میں پائی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں وہ امیر معاویہؓ والیِ شام کے ماتحت حمص کے امیر تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اس مشہور لشکر میں ایک افسر کی حیثیت سے شریک تھے، جس نے امیر معاویہؓ کے عہد میں سب سے پہلے قسطنطنیہ پر چڑھائی کی اور جس کے بارے میں سرورِ عالم ﷺ نے ''مغفور'' ہونے کی بشارت دی تھی۔ ابنِ قتیبہؒ کے بیان کے مطابق حضرت خالدؓ کے کئی لڑکے اور پوتے ۱۸ ہجری کی وبائے عمواس (طاعون) میں فوت ہو گئے۔

ابن اثیرؒ اور بعض دوسرے مؤرّخین کا بیان ہے کہ (دونسلوں کے بعد) حضرت خالدؓ بن ولید کی تمام اولاد ختم ہوگئی اور مشرق ومغرب میں کوئی شخص بھی ان کی اولاد میں سے باقی نہ رہا ــــ رہے نام اللہ کا ــــ حضرت خالدؓ کی نسل تو باقی نہ رہی لیکن انہوں نے جو کارنامے سرانجام دیے وہ ان کا نام ابد تک زندہ رکھیں گے۔

اربابِ سیر وتاریخ کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید شکل وصورت قد وقامت اور آواز میں حضرت عمر فاروقؓ سے گہری مشابہت رکھتے تھے۔ حتّٰی کہ بعض لوگ غلطی سے حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ سمجھ بیٹھتے تھے گویا حضرت خالدؓ کا حلیہ حضرت عمر فاروقؓ کا حلیہ تھا اور حضرت عمر فاروقؓ کا حلیہ علامہ شبلی نے ''الفاروق'' میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''رنگ گندم گوں، قد لانبا یہاں تک کہ سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں کھڑے ہوتے تھے تو ان کا قد سب سے نکلا ہوتا تھا۔ رخسار سے کم گوشت، گھن کی ڈاڑھی، مونچھیں بڑی بڑی سر کے بال سامنے سے اڑ گئے تھے۔''

(۱۹)

حضرت خالدؓ بن ولید اگرچہ خالص فوجی آدمی تھے لیکن علم و فضل سے تہی دامن نہ تھے۔ ان سے اٹھارہ احادیث مروی ہیں، جن میں سے دو متفق علیہ ہیں اور ایک میں بخاریؒ منفرد ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' اور تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ حضرت خالدؓ کے رواۃِ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، مقدام بن معدیکربؒ، قیس بن ابی حازمؒ، اشتر نخعیؒ، علقمہ بن قیسؒ، جبیر بن نفیرؒ اور ابوالعالیہؒ وغیرہم شامل ہیں۔

حضرت خالدؓ فقہ میں بھی دسترس رکھتے تھے لیکن جہاد میں مشغولیت کی وجہ سے مسند افتا پر نہ بیٹھے۔ ان کے فتووں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کی فقہی بصیرت کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ (قیام شام کے دوران میں) ایک مرتبہ ایک حمام میں غسل کے لیے گئے اور جسم کو عُصفُر نامی ابٹن سے رگڑا (یا ملوایا) جسے مٹی میں شراب ملا کر اور پھر اسے آگ میں پکا کر تیار کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت خالدؓ کو لکھا:

> ''مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے شراب سے تیار کیے ہوئے ابٹن کو اپنے جسم پر ملا۔ اللہ نے شراب کے ظاہر اور باطن کو اسی طرح حرام کیا ہے، جس طرح اس نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہوں کو حرام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح شراب پینے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح اس کے چھونے کو بھی حرام قرار دیا ہے چہ جائے کہ اس سے غسل کیا جائے۔ واضح ہو کہ شراب نجس ہے اسے ہاتھ نہ لگاؤ اور اگر (غلطی سے) ایسا کر لیا ہو تو آئندہ نہ کرنا۔''

حضرت خالدؓ نے جواب میں لکھا:

> ''ہم نے اس مٹی کو آگ میں پکا کر اس سے شراب کی خاصیتیں قطعاً دُور کر دی تھیں اس لیے اس سے جسم صاف کرنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔''

دینی احکام اور مسائل سے حضرت خالدؓ کی واقفیت کا ثبوت اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ان کو کئی موقعوں پر تبلیغ اور اشاعت دین پر مامور فرمایا۔ یہ فریضہ آپؐ انہی اصحاب کے سپرد فرماتے تھے، جو اسلامی عقائد و اعمال اور دینی امور سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے اور ہر لحاظ سے مبلّغ بننے کے اہل ہوتے تھے۔ بنو جذیمہ، بنو عبدالمدان، بنو حارث بن کعب

وغیرہ حضرت خالدؓ ہی کی تبلیغ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح فتنۂ ردّہ میں بنو ہوازن، بنو عامر، بنو سُلیم، بنو طے وغیرہ بھی دوبارہ انہی کی کوششوں سے اسلام لائے۔ جنگ یرموک میں رومی سفیر جرجہ کو ایسے مؤثر پیرایہ میں اسلام کی تبلیغ کی کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

(۲۰)

حضرت خالدؓ بن ولید کے گلشن اخلاق میں شوقِ جہاد، رسول اکرم ﷺ کی محبت، رضا جوئی اور آپؐ کا ادب واحترام، شجاعت وجواں مردی، حق پسندی اور جود وسخا سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ شوق جہاد تو ان کی زندگی کا اتنا نمایاں پہلو ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ۸ھ میں مشرف بہ ایمان ہوئے اور اس کے بعد تقریباً چودہ برس تک حیات رہے۔ اس مدت کا بیشتر حصہ میدان جہاد میں گزارا۔ تقریباً سوا سو (اور بہ روایتِ دیگر تین سو) لڑائیوں میں حصہ لیا اور ہر ایک میں کامیاب ہوئے۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جس پر کسی نہ کسی ہتھیار کا زخم نہ لگا ہو۔ فرمایا کرتے تھے کہ زندگی کی کوئی رات (یہاں تک کہ شب عروسی بھی) مجھے اُس سخت رات سے محبوب نہیں جس میں دشمنوں سے لڑوں۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ شہادت نصیب ہو لیکن دنیا میں کوئی ایسا ہتھیار بنا ہی نہیں تھا جو میدان جنگ میں ''اللہ کی تلوار'' کو توڑ سکے۔

سرور عالم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اور کسی کی زبان سے حضورؐ کی شان میں کسی قسم کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے پاس کچھ سونا آیا۔ اس وقت نجد کے کچھ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپؐ نے تمام سونا ان میں تقسیم کر دیا لیکن ایک شخص اپنے حصے سے مطمئن نہ ہوا اور کہا:

''محمدؐ اللہ سے ڈر''

رحمتِ عالمؐ نے نہایت تحمل سے فرمایا:

''اگر میں اللہ کی نافرمانی کرتا ہوں تو اور کون اس کی اطاعت کرتا ہے۔''

حضرت خالدؓ بھی اس موقعے پر موجود تھے وہ نجدی کی گستاخی پر سراپا جلال بن گئے، تلوار نیام سے کھینچی اور حضورؐ سے اس کی گردن اڑانے کی اجازت چاہی۔ لیکن آپؐ سراپا عفو وکرم تھے فرمایا، خالد جانے دو۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے ان کو ایک سریہ میں امیر بنا کر بھیجا۔ حضرت عمارؓ بن یاسرؓ بھی اس سریہ میں شریک تھے۔ انہوں نے حضرت خالدؓ سے پوچھے بغیر ایک شخص کو اسلام کا اقرار کرنے پر پناہ دے دی۔ اس پر حضرت خالدؓ سے ان کی تکرار ہوگئی اور نوبت سخت کلامی تک پہنچ گئی۔ حضرت عمارؓ نے مدینہ منورہ پہنچ کر بارگاہ رسالت میں حضرت خالدؓ کی شکایت کی۔ اسی اثنا میں حضرت خالدؓ بھی پہنچ گئے اور اپنے خلاف شکایت سن کر حضرت عمارؓ کو سخت سست کہنے لگے۔ حضورؐ نے اس پر بدیں الفاظ ناراضی کا اظہار فرمایا کہ جو شخص عمار سے بُغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بُغض رکھتا ہے اور جو مجھ سے بُغض رکھتا ہے وہ خدا سے بُغض رکھتا ہے۔

حضرت خالدؓ ارشادِ نبویؐ سن کر کانپ اٹھے۔ اسی وقت حضرت عمارؓ سے بار بار معافی مانگنے لگے لیکن وہ اس قدر رنجیدہ تھے کہ مجلس نبویؐ سے اٹھ کر چل دیے۔ حضرت خالدؓ بھی ان کے پیچھے ہو لیے اور اس قدر منت سماجت کی کہ بالآخر وہ راضی ہوگئے۔ خود ان کا بیان ہے کہ جب میں رسول اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھا تو عمار کو راضی کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز مجھ کو محبوب نہ تھی۔

فتنۂ ردّہ میں انہوں نے مالک بن نویرہ کو جن اسباب کی بنا پر قتل کیا ان میں ایک یہ تھا کہ وہ اپنی گفتگو میں حضورؐ کا ذکر بار بار ''صاحِبک'' کہہ کر کرتا تھا۔ اس پر حضرت خالدؓ برہم ہوگئے اور فرمایا:

''کیا رسول اللہ علیہ وسلم تمہارے صاحب نہیں تھے؟''

حضورؐ کے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ کے کچھ موئے مبارک اپنی ٹوپی میں سلوا لیے تھے اور اسی کو پہن کر میدانِ جنگ میں جایا کرتے تھے۔ جنگ یرموک میں ایک موقعے پر یہ ٹوپی کہیں گر گئی تو سخت پریشان ہوئے۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے تلاش کیا تب کہیں جا کر اطمینانِ خاطر میسر ہوا۔

ان کی شجاعت، جواں مردی اور عسکری قابلیت کا لوہا دشمن بھی مانتے تھے۔ فوجوں کو اس طرح مرتب کرتے اور لڑاتے تھے کہ فتح یقینی ہو جاتی تھی۔ جنگی چالوں میں بھی حیرت انگیز مہارت رکھتے تھے۔ ان کی جنگی چالیں دشمن کو حواس باختہ کر دیتی تھیں اور وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں خود فوجوں کی قیادت کرتے تھے اور صفِ اوّل میں ہو کر لڑتے تھے۔

حضرت خالدؓ نے ایک امیر کبیر گھرانے میں پرورش پائی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں عیش و تنعّم میں پڑنے سے بچالیا گو وہ قبولِ اسلام سے پہلے بھی سخت کوش تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد تو انہوں نے سخت کوشی کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا۔ میدانِ جہاد میں راتیں جاگ جاگ کر کاٹتے تھے نہ خود سوتے تھے اور نہ اپنے ساتھیوں کو سونے دیتے تھے۔ خود کو بھی اور انہیں بھی ہر وقت چوکنّا اور مستعد رکھتے تھے۔ دشمن کی تعداد، قوّت اور نقل و حرکت کی ٹوہ لینے کا خاص اہتمام کرتے تھے اور اس کی کوئی بات ان سے مخفی نہ رہ سکتی تھی۔

اپنے ماتحتوں سے حضرت خالدؓ کا سلوک نہایت مشفقانہ اور مربیانہ ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ فوج ان پر جان چھڑکتی تھی اور ان کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت خالدؓ کی فطرت میں انفاق فی سبیل اللہ اور جود وسخا کا جذبہ بھی ودیعت کیا تھا۔ ان کے پاس سامان حرب کا کافی بڑا ذخیرہ تھا۔ اسلام لائے تو اس کو راہِ خدا میں وقف کر دیا۔ چوں کہ اکثر جہاد میں مشغول رہتے تھے اس لیے بہ کثرت مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ وہ محتاجوں، غریبوں، حاجت مندوں اور اپنے ماتحتوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود کفایت اور سادگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی داد و دہش شاعروں تک پر محیط تھی۔ ایک شاعر کو بہت بڑی رقم انعام میں دے دی اور یہی بات ان کی فوری معزولی کا باعث بن گئی۔

حضرت خالدؓ اپنے عسکری مزاج کے باوجود نہایت حق پسند اور خدا سے ڈرنے والے تھے۔ اگر کسی بات پر حضورؐ نے ناراضی کا اظہار فرمایا تو فوراً اس کی تلافی میں لگ گئے اور پھر ایسی بات کبھی نہ کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں اس وقت معزول کیا جب ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی انتہائی عروج پر تھی۔ مجمع عام میں ان کی ٹوپی اتاری گئی اور عمامہ گردن میں ڈالا گیا لیکن انہوں نے امیر المؤمنینؓ کے فرمان کے سامنے دم نہ مارا۔

قوتِ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ ایک جنگ کے موقع پر کسی شخص نے کہا کہ رومی کس قدر کثیر ہیں اور مسلمان کس قدر کم ہیں۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا:

> ''رومی کس قدر کم ہیں اور مسلمان کس قدر کثیر؟ فوج تائیدِ الٰہی کے ساتھ کثیر ہوتی ہے اور اللہ کے رسوا کر دینے سے قلیل ہوتی ہے۔ آدمیوں کی تعداد پر اس کا دارو مدار نہیں ہے۔ خدا کی قسم مجھے تو یہ پسند ہے کہ میرا یہ اشقر گھوڑا اپنی دکھی چال چھوڑ دیتا اور مسلمان

تعداد میں اور بھی کم ہو جاتے۔ (حضرت خالدؓ کے گھوڑے کے سم زیادہ سفر کرنے کی وجہ سے پتلے پڑ گئے تھے) (تاریخ طبری)

ایک مرتبہ (عراقِ عرب کی جنگوں کے دوران میں) حضرت خالدؓ حیرہ میں بنی مرازبہ کے امیر کے پاس ٹھہرے۔ مسلمانوں نے ان سے کہا کہ زہر سے بچیے گا عجمی آپ کو زہر نہ کھلا دیں۔ حضرت خالدؓ نے لوگوں سے زہر طلب کیا۔ زہر ان کے پاس لایا گیا تو انہوں نے اسے اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر بسم اللہ کہہ کر اس کو نگل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوتِ ایمانی کی بدولت ان کو زہر کے اثر سے محفوظ رکھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ زہر کھاتے وقت حضرت، خالدؓ نے یہ بھی فرمایا:

''ہرگز کوئی نفس نہیں مرے گا، یہاں تک کہ اس کا وقت آجائے۔''

بعض اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید مستجاب الدعوات اور صاحب کرامات بھی تھے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے ''الاصابہ'' میں ان کی کئی کرامات نقل کی ہیں۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود رحمتِ دو عالم ﷺ ان کی شجاعت اور جواں مردی کے معترف اور مداح تھے، یہی سبب تھا کہ آپؐ نے انہیں ''سیف اللہ'' کا مہتم بالشان لقب مرحمت فرمایا۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت خالدؓ فاتحانہ شان کے ساتھ ایک گھاٹی سے نمودار ہوئے اور حضرت ابو ہریرہؓ نے حضورؐ کو بتایا کہ وہ سامنے خالد آرہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ اللہ کا بندہ بھی کیا خوب آدمی ہے۔'' (مسند احمدؒ)

ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

''تم لوگ خالد کو کسی قسم کی تکلیف نہ دو کیوں کہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے جسے اللہ نے کافروں پر کھینچا ہے۔''

عہد رسالت میں ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ نے تحصیل زکوٰۃ کے سلسلے میں حضرت خالدؓ پر سختی کی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

''تم لوگ خالد پر زیادتی کرتے ہو، اس نے اپنا تمام سامانِ حرب اللہ کی راہ میں وقف کر دیا اب اس پر زکوٰۃ کیسی؟''

خود حضرت خالدؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس دن سے میں اسلام لایا اس دن سے رسول اللہ ﷺ میرے اور دوسرے صحابہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ نے دو تین موقعوں پر حضرت خالدؓ کو کئی جلیل القدر (قدیم الاسلام) صحابہؓ پر افسر بنایا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے بھی عراقِ عرب اور شام کی جنگوں میں ان کو متعدد عظیم المرتبت صحابہؓ پر امیر مقرر کیا۔

سیدنا حضرت خالدؓ بن ولید کی سیرت و کردار اور عظیم الشان کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں یہاں اختصار کے ساتھ جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اب ہم اس تذکرہ جمیل کو ''خالدؓ سیف اللہ'' کے مؤلف ابوزید شلبی کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> ''اللہ حضرت خالدؓ بن ولید پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے اسلام کی خاطر جو خدمات سرانجام دیں وہ ایسی ہیں کہ بھلائی نہیں جا سکتیں۔ ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ان کی زندگی کے واقعات پر غور کرے اور اپنے میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے، جو حضرت خالدؓ میں تھیں کیوں کہ اسلام اور مسلمانوں کی زندگی انہی صفات کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔''

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ

فاتح مصر

(۱)

ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ کو کسی مہم کی قیادت کے لیے اپنے کسی ایسے جاں نثار کی ضرورت محسوس ہوئی جو عسکری امور میں مہارت رکھتے ہوں اور قائدانہ صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہوں۔ آپؐ نے اس کام کے لیے جن صاحب کو موزوں خیال فرمایا ان کو پیغام بھیجا کہ لباس بدل کر اور ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر فوراً آ جائیں۔ چھوٹے قد کے یہ تنومند صاحبِ رسول مسلّح ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ وضو فرما رہے تھے۔ آپؐ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ پھر نظر نیچی کر کے فرمایا:

"میں تم کو فلاں مہم پر امیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں، ان شاء اللہ تم محفوظ رہو گے اور مالِ غنیمت بھی ہاتھ آئے گا، جس میں سے تم کو معقول حصہ ملے گا۔"

انہوں نے نہایت ادب سے عرض کیا:

"یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، میں مال و دولت کی خاطر اسلام نہیں لایا بلکہ اس کو خلوصِ قلب سے قبول کیا۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"مالِ صالح مردِ صالح کے لیے بہتر ہے۔"

لسانِ رسالتؐ سے یہ الفاظ سن کر وہ صاحب خوشی خوشی اُس مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہ صاحب رسول جن پر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر اعتماد تھا کہ ان کو خاص مہموں کی انجام دہی کے لیے منتخب فرماتے تھے اور مردِ صالح کے لقب کا اہل سمجھتے تھے، حضرت عمرو بن العاصؓ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابوعبداللہ عمرو بن العاصؓ کا شمار قرنِ اوّل کے ان عظیم سپہ سالاروں اور مدبرین میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی بے مثل شجاعت، جنگی مہارت اور حسن تدبیر سے اسلامی مملکت کو نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا۔ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنوسہم سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عمرؓو بن العاص بن وائل بن ہاشم بن سعید بن سہم بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لؤی بن غالب۔

ماں کا نام نابغہ بنتِ حرملہ بن حارث تھا۔ وہ بھی آلِ عدنان سے تھیں۔

زمانۂ جاہلیت میں فصلِ مقدمات کا عہدہ بنوسہم کے پاس تھا۔ اس لحاظ سے قریش میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

حضرت عمرؓو کا والد عاص بن وائل اپنے خاندان کا سردار تھا۔ اپنے وسیع تجارتی کاروبار اور مرفہ الحالی کی بنا پر وہ قریش کے سربرآوردہ رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے تموّل کا یہ عالم تھا کہ دیبا اور قاقم جیسے قیمتی کپڑوں کی قبائیں پہنا کرتا تھا۔ یہ شخص اسلام کا بدترین دشمن تھا اور ان اشرارِ قریش میں شامل تھا جو دعوتِ حق کے جواب میں سرورِ عالم ﷺ پر پھبتیاں کستے تھے، یومِ آخرت کا انکار کرتے تھے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کو ناممکن قرار دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضوؐر کے صاحب زادے حضرت قاسمؓ اور پھر حضرت عبداللہؓ نے وفات پائی تو عاص بن وائل نے مشرکین قریش سے مخاطب ہو کر ان الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا:

ان محمدًا ابتر، لا ابن له يقوم مقامة بعده فاذا مات انقطع ذكره واسترحتم منه۔

''محمد (ﷺ) ابتر (بے نام ونشان) ہیں۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے۔ وہ مر جائیں گے تو تمہارا ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔''

اس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی جس میں حضورؐ کے دشمنوں کو ابتر قرار دیا گیا۔

بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ اور طبرانیؒ نے روایت کی ہے کہ مشہور صحابی حضرت خبّاب بن الارتؓ لوہار کا کام کرتے تھے۔ ان کی کچھ رقم عاص بن وائل کے ذمہ تھی۔ انہوں نے اس رقم کا مطالبہ کیا تو عاص نے کہا، جب تک اسلام کو ترک نہ کرو اور محمد (ﷺ) سے بیزاری کا اظہار نہ کرو، تمہاری رقم نہیں دوں گا۔

حضرت خبّابؓ نے فرمایا، یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں دینِ حق اور محمد ﷺ سے روگردانی کروں۔ مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن اسی دین حق پر اٹھوں گا۔

عاص نے حضرت خبّابؓ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا، اگر سب مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے والے ہیں تو جب میں اور تم دوبارہ زندہ ہوں گے تو اس وقت مجھ سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا، اس دن میرے پاس مال و دولت اور اولاد کی بہتات ہوگی، تمہاری رقم فوراً ادا کردوں گا۔

اس پر سورۂ مریم کی آیت ۷۷-۸۱ نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کرتا ہے اور (ازراہِ تمسخر) کہتا ہے کہ میں (دارِ آخرت میں) مال و اولاد سے بہرہ مند ہوں گا۔ کیا اس شخص کو غیب کا علم ہے یا اس نے اللہ سے اس بات کا کوئی عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہم بالفعل اس کی بات کو لکھے لیتے ہیں اور وقت آنے پر یہ سزا دیں گے کہ اس کے لیے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور اس کی بیان کردہ چیزوں کے ہم ہی مالک رہ جائیں گے وہ ہمارے پاس مجرد و تنہا ہو کر ہی آئے گا۔''

حضرت خبابؓ ایک مرتبہ پھر عاص کے پاس اپنی رقم کے تقاضے کے لیے گئے تو اس نے کہا:

''تم مسلمانوں کو وہم ہوگیا ہے کہ لوگ مٹی میں مل جانے کے بعد پھر جی اٹھیں گے میں قسم کھاتا ہوں کہ مرنے کے بعد جینا بالکل ناممکن ہے۔''

حضرت خبّابؓ نے اس کی باتوں کا معقول جواب دیا اور پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس آگئے۔

عاص بن وائل کو مرتے دم تک قبولِ حق کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور وہ بعثتِ نبوی کے

چند سال بعد حالت کفر ہی میں مر گیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اسی دشمن اسلام باپ کے فرزند تھے۔ وہ واقعۂ فیل کے چھ برس بعد پیدا ہوئے۔ (اس طرح وہ عمر میں سرورِ عالم ﷺ سے چھ برس چھوٹے تھے) باپ نے ان کی ولادت پر بڑی خوشی منائی، دس اونٹ ذبح کیے اور تمام رؤسائے قریش کی ضیافت کی۔ اس نے حضرت عمروؓ کی تربیت پر خاص توجہ دی اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑے ہو کر وہ ایک کامیاب تاجر، نہایت اچھے سپاہی (شہسوار، قدر انداز اور شمشیر زن) اور اعلیٰ درجہ کے مدبر بنے۔ سرورِ عالم ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو عاص بن وائل نے دین حق کی پُر زور مخالفت کی۔ حضرت عمروؓ نے بھی باپ کی پیروی کی اور سالہا سال تک کفر و شرک کی ظلمتوں میں بھٹکتے رہے البتہ اِن کے چھوٹے بھائی حضرت ہشام بن عاصؓ کا نصیبہ ان سے زیادہ یاور تھا۔ وہ بعثت نبوی کے ابتدائی زمانے میں ہی دولت اسلام سے بہرہ یاب ہو گئے اور قبولِ حق کی پاداش میں لاتعداد مصیبتیں برداشت کیں۔ جب اہل حق پر مشرکین قریش کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو ۵ اور ۶ بعدِ بعثت میں حضورؐ کے ایماء پر بہت سے مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ قریش نے ان لوگوں کو حبشہ سے نکلوانے کے لیے شاہِ حبشہ (نجاشی) کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اس وفد کے سب سے سرگرم رکن حضرت عمرو بن العاصؓ تھے۔ انھوں نے حبشہ پہنچ کر مسلمانوں کو وہاں سے نکلوانے کی بہت کوششیں کیں لیکن نجاشی نے ان کی کوئی بات نہ مانی اور وفد کو وہاں سے ناکام واپس آنا پڑا۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا یہاں تک کہ سرورِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد بدر، اُحد اور احزاب کے معرکے بھی گزر گئے۔ اس وقت تک حضرت عمرو بن العاصؓ پوری طرح مشرکین کے ساتھ تھے۔ غزوۂ احزاب میں جب مشرکین میں بھگدڑ مچی تو انھوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ مل کر دو سو سواروں کا ایک دستہ لیا اور بطور ساقہ مشرکین کے لشکر کے عقب کی حفاظت کی۔ لیکن غزوۂ احزاب (۵ ھ) میں مشرکین کی ناکامی نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا اور وہ حضورؐ کی دعوت پر غور کرنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ:

"غزوۂ احزاب سے واپسی کے بعد میں نے اسلام پر غور کرنا شروع کیا۔ اس غور و فکر سے اسلام کی حقیقت مجھ پر کھلنے لگی اور دل و دماغ برابر متاثر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ میں نے مسلمانوں کی مخالفت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا رویہ دیکھ کر قریش نے ایک آدمی حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا۔ اس نے آ کر مجھ سے

بحث شروع کردی۔ میں نے پوچھا، ہم حق پر ہیں یا اہلِ فارس وروم۔ اس نے کہا ہم۔ اس پر میں نے اس سے سوال کیا، دولت اور عیش ان کو میسر ہے یا ہمیں؟ اس نے کہا، ان کو، میں نے کہا، تو پھر یہ ہماری حق پرستی (بت پرستی) کس دن کام آئے گی جب کہ ہم اس عالم کے بعد دوسرے عالم میں یقین ہی نہیں رکھتے اور اس دنیا میں بھی باطل پرستوں کے مقابلے میں تنگ حال ہیں۔ اسی لیے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ محمد (ﷺ) کی یہ تعلیم کتنی صحیح اور دل لگتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک دوسرا عالم ہوگا جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے گا۔'' (الاصابہ لابن حجرؒ)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد حضرت عمروؓ نے صحیح خطوط پر سوچنا شروع کردیا تھا۔ یہی غور وفکر ان کے قبولِ اسلام کی بنیاد بن گیا۔

۳

حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ خود بیان کیا ہے۔ مسند احمد بن حنبلؒ میں ان کی زبانی روایت ہے کہ:

جب ہم لوگ غزوۂ احزاب سے واپس (مکہ) آئے تو میں نے اپنے تمام زیر اثر لوگوں کو بلا بھیجا۔ جب وہ آ گئے تو میں نے ان سے کہا، خدا کی قسم تم لوگ باور کرلو کہ محمد (ﷺ) کی بات تمام باتوں پر سربلند ہوگی۔ اس میں کسی تذبذب اور شک کی گنجائش نہیں۔ میری ایک رائے ہے معلوم نہیں اس کو کیسا سمجھتے ہو۔ انہوں نے پوچھا کیا رائے ہے؟ میں نے کہا، میرا خیال ہے کہ ہم لوگ نجاشی کے پاس حبش جا کر مقیم ہو جائیں۔ اگر محمد (ﷺ) ہماری قوم پر غالب آ گئے تو ہم لوگ وہیں نجاشی کے پاس ٹھہر جائیں گے کیوں کہ نجاشی کے پاس رہنا محمد (ﷺ) کے ماتحت ہو کر رہنے سے بہتر ہے اور اگر ہماری قوم محمد (ﷺ) پر غالب آ گئی تو ہمارے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا ہی ہوگا کیوں کہ ہم معزز لوگ ہیں۔

—— میری رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ پھر باہمی مشورہ سے طے پایا کہ ہم اپنے ساتھ یہاں کی بہترین سوغات چمڑا لے جائیں اور اسے نجاشی کی خدمت میں پیش کریں۔ اس سے وہ خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم بہت سا چمڑا لے کر حبشہ پہنچے اور وہاں ٹھہر گئے۔ ابھی ہم حبش میں ہی تھے کہ عمرو بن اُمیہ ضمریؓ وہاں آئے۔ انہیں

رسول اللہ ﷺ نے کسی ضرورت سے بادشاہ کے پاس بھیجا تھا۔ ہمیں ان کی آمد کا حال معلوم ہوا تو ہم نجاشی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے حسب معمول اس کو سجدہ کیا، اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور پوچھا، کیا اپنے ملک کا کوئی تحفہ لائے؟ میں نے کہا، حضور بہت سا چمڑا تحفہ میں لایا ہوں۔ یہ کہہ کر جو چمڑا ہم ساتھ لے کر گئے تھے اس کو پیش کیا۔ اس نے بہت پسند کیا۔ پھر میں نے عرض کیا، جہاں پناہ آپ کے پاس ہمارے دشمن کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا ہے جسے ہم نے دربار سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ اسے قتل کے لیے ہمارے حوالے کر دیں۔ اس نے ہمارے بہت سے اشراف و اکابر کو تکلیفیں پہنچائی ہیں ـــــ میری بات سن کر نجاشی بہت غضب ناک ہوا اور اپنا ہاتھ کھینچ کر اس زور سے اپنی ناک پر مارا کہ میں سمجھا ٹوٹ گئی۔ (بادشاہ کا رَدِّعمل دیکھ کر) میں اس قدر نادم ہوا کہ زمین میں سما جانا چاہتا تھا۔ پھر میں نے عرض کیا، اے شاہِ عالی جاہ اگر میں یہ جانتا کہ میری بات آپ کو ناگوار گزرے گی تو میں یہ ہرگز منہ سے نہ نکالتا۔

بادشاہ نے کہا، تم ایک ایسے شخص کو مجھ سے قتل کرنے کے لیے مانگتے ہو جو اس ہستی کا قاصد ہے جس کے پاس ناموسِ اکبر آتا ہے، وہی ناموسِ اکبر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا۔

میں نے عرض کیا، عالی جاہ کیا واقعی وہ ایسا ہے؟

بادشاہ نے کہا، عمرو تم پر افسوس ہے، میری مانو تو اس کی پیروی اختیار کرلو۔ خدا کی قسم وہ حق پر ہے اور وہ اسی طرح اپنے تمام مخالفوں پر غالب آئے گا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے لشکر پر غالب آئے تھے۔ میں نے کہا، تو پھر آپ محمد (ﷺ) کی طرف سے مجھ سے اسلام کی بیعت لے لیجیے۔ چنانچہ نجاشی نے ہاتھ بڑھا دیا اور میں نے اسلام کی بیعت کر لی۔ یہاں سے جب میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس گیا تو میرے خیالات میں یکسر انقلاب آ چکا تھا لیکن میں نے ان پر اس کا اظہار نہیں کیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر (باقاعدہ) قبولِ اسلام کے لیے عازمِ مدینہ ہوا۔ راستے میں خالد بن ولیدؓ مل گئے۔ وہ مکہ سے آرہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، اے ابا سلیمان کہاں کا قصد ہے؟ خالدؓ نے جواب دیا، خدا کی قسم خوب پانسہ پڑا، واللہ یہ صاحب، (محمد ﷺ) یقیناً نبی ہیں اس لیے میں اسلام قبول

کرنے جارہا ہوں، آخر ہم کب تک کفر کی ظلمت میں بھٹکتے رہیں گے۔ میں نے کہا، خدا کی قسم میں بھی اسی ارادہ سے جارہا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے خالد بن ولیدؓ نے آپؐ کی بیعت کی، پھر میں نے قریب ہو کر عرض کیا، یارسول اللہ میں آپ کی بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں لیکن پہلے میرے پچھلے گناہوں کو معاف فرمادیجیے۔

آپؐ نے فرمایا، عمرو! بیعت کرلو، اسلام پچھلے گناہوں کو مٹادیتا ہے اور ہجرت بھی ماقبل کے گناہوں کو منقطع کردیتی ہے۔

آپؐ کا ارشاد سن کر میں مطمئن ہوگیا فوراً آپؐ کی بیعت کی اور پھر مکہ آگیا۔''

امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے ساتھ حضرت خالد بن ولید کے علاوہ حضرت عثمان بن طلحہ عبدریؓ نے بھی اسلام قبول کیا۔ (مستدرک حاکم)

حضرت عمرو بن العاصؓ نے مکہ واپس آکر وہاں زیادہ دیر قیام نہ کیا۔ اب ان کے لیے دیارِ حبیبؐ سے دور رہنا محال تھا۔ چند دنوں کے بعد ہجرت کرکے مدینہ منورہ آگئے۔ یہ فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے۔

(۴)

حضرت عمرو بن العاصؓ کے مدینہ آنے کے بعد متعدد غزوات پیش آئے۔ اہل سیر نے ان غزوات میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی شرکت اور کسی کارنامہ کا خصوصیت سے ذکر نہیں کیا لیکن قیاس یہ ہے کہ وہ ان غزوات میں ضرور شریک ہوئے ہوں گے کیوں کہ نہ شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ حضورؐ کو ان پر بہت اعتماد تھا اس لیے کئی سرایا ان کی سرکردگی میں روانہ کیے۔ ان میں سے سریۂ ذات السلاسل اور سریۂ سواع بہت مشہور ہیں۔

سریۂ ذات السلاسل

سرورِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی کہ وادی القریٰ میں بنو قضاعہ کا ایک گروہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے جمع ہوا ہے۔ یہ مقام مدینہ سے دس یوم کی مسافت پر واقع تھا۔ جمادی الآخرہ ۸ ہجری میں آپؐ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو تین سو مہاجرین و انصار کے ہمراہ

ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمروؓ کی دادی بنو قضاعہ سے تھی اور وہ اس علاقے سے خوب واقف تھے اسی لیے حضورؐ نے اس مہم کی قیادت کے لیے انہیں بطورِ خاص منتخب کیا۔ حضرت عمروؓ مفسدین کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ سے کمک مانگ بھیجی۔ آپؐ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو دوسو آدمی دے کر ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ کہتے ہیں کہ مفسدہ پردازوں نے اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھ لیا تھا تا کہ جم کر لڑ سکیں۔ اسی لیے یہ سریہ ذات السلاسل (زنجیروں والا) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کے پہنچنے پر مہم کی امارت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا لیکن بالآخر حضرت عمروؓ کی امارت پر اتفاق ہو گیا۔ مجاہدین نے دشمن پر کاری ضربیں لگا کر اسے منتشر کر دیا اور حضرت عمرو بن العاصؓ مظفر و منصور مدینہ واپس آئے۔ (ابن سعدؒ)

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ دراصل حضورؐ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو قبائل بلی و عذرہ کی طرف اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ لوگ لڑنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ حضرت عمروؓ نے دربارِ رسالت سے امداد طلب کی اور یہ سریہ پیش آیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سریّہ سواع

اس کو سریۂ عمرو بن العاصؓ بھی کہا جاتا ہے۔

سواع قبیلہ ہذیل کا بت تھا جو مکہ معظّمہ سے تین میل دور ایک مقام رُہاط میں نصب تھا۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس کے گرانے پر مامور فرمایا۔ وہ جب وہاں گئے تو سواع کے مجاور نے پوچھا، تم کس غرض سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا، سواع کو ڈھانے کے لیے۔ مجاور نے بڑی تحدّی کے ساتھ کہا، تم ایسا نہیں کر سکتے، سواع خود اپنی حفاظت کرے گا۔ حضرت عمروؓ نے فرمایا، تمہاری عقل پر افسوس ہے بھلا ایک بت جو نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ سن سکتا ہے، وہ اپنی حفاظت کیا کرے گا؟

پھر انہوں نے آناً فاناً سواع کو زمین بوس کر دیا اور مجاور سے کہا، تم نے اس کی بے بسی دیکھ لی ــــ! وہ یہ واقعہ دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

علّامہ بلاذریؒ نے ''فتوح البلدان'' میں بیان کیا ہے کہ فتح مکہ کے کچھ عرصہ بعد حضورؐ

نے حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابوزید انصاریؓ کو جو حافظ قرآن تھے، دعوتِ اسلام کا خط دے کر عمان بھیجا۔ یہ خط وہاں کے رئیسوں عبید وجیفر کے نام تھا۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے اور مجوسی المذہب تھے۔ دعوتِ اسلام کا خط ملنے پر دونوں مشرف بہ اسلام ہو گئے اور ان کی ترغیب سے وہاں کے دوسرے لوگ بھی اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو عمان کا عامل مقرر کر دیا اور وہ آپؐ کے وصال تک وہیں مقیم رہے۔

(۵)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت کے آغاز میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑکے تو خلیفۃ الرسول نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو سرورِ عالم ﷺ کے وصال اور ارتداد کی فتنہ سامانیوں کی اطلاع دی اور انہیں مدینہ بلا بھیجا۔ حضرت عمروؓ بحرین کے راستے مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر میں بنی عامر کے رئیس قرۃ بن ہبیرہ کے ہاں قیام کیا۔ اس نے ان کو بڑی قدر و منزلت سے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ جب وہ چلنے لگے تو انہیں تخلیہ میں لے جا کر کہا، آپ بہت ہوش مند اور فہیم ہیں، اس وقت عرب کی حالت نازک ہے، آپ خلیفۃ الرسول کو مشورہ دیں کہ اگر عربوں سے زکوٰۃ لی گئی تو وہ کسی کی امارت قبول نہ کریں گے ہاں اگر زکوٰۃ معاف کر دی جائے تو وہ فرماں بردار رہیں گے اس لیے بہتر یہی ہے کہ زکوٰۃ کا قانون منسوخ کر دیا جائے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کو قرۃ کی باتیں سن کر جلال آ گیا، فرمایا:

"قرہ! کیا تم کافر ہو گئے ہو جو ایسا کہتے ہو اور مجھے عربوں سے ڈراتے ہو خدا کی قسم میں منکرین زکوٰۃ کو گھوڑے کی ٹاپوں سے مسل ڈالوں گا۔"

یہ دوٹوک بات کر کے وہ عازم مدینہ ہو گئے۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ بعد میں قرّہ بن ہبیرہ مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں گرفتار ہوا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اقرار کیا کہ زکوٰۃ کے بارے میں اس کی رائے نیک نیتی پر مبنی تھی لیکن وہ اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا اور اس پر قائم رہا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس کے بیان کی تصدیق کی تو اسے رہا کر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ارتداد میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کو قتل کرا دیا گیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ مدینہ پہنچے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں بنو قضاعہ کے مرتدین کی سرکوبی پر

مامور فرمایا۔ انہوں نے اپنے حسن تدبیر سے ان لوگوں کو اسلام پر قائم کیا اور ان سے زکوٰۃ وصول کر کے مدینہ واپس آئے۔ ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے انہیں اپنے عہدہ پر دوبارہ عمان جانے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ اپنے مفوّضہ فرائض خدا ترسی کے ساتھ انجام دیتے رہو۔ چنانچہ وہ عہد صدّیقی میں کم و بیش سوا سال تک عمان کی گورنری پر مامور رہے اور اپنے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔

(۶)

۱۲ ہجری میں ایران اور روم سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو شام بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمروؓ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے تمہیں سریۂ ذات السلاسل کا امیر بنا کر بنو قضاعہ کی طرف بھیجا تھا اس لیے میں نے بھی ارتداد کے موقع پر انہی کی مہم پر روانہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے تم کو عمان کا عامل بنایا اس لیے میں نے (فتنۂ ارتداد کے فرو ہو جانے کے بعد) تمہیں دوبارہ عمان کی امارت پر واپس کر دیا تھا۔ اب میں تمہارے سپرد ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جو تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کے لیے زیادہ مفید ہے۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس کے جواب میں خلیفۃ الرسول کو لکھا:

''میں اللہ کا ایک تیر ہوں اور آپ اس کے تیر انداز ہیں اس لیے آپ کو اختیار ہے جدھر چاہیں پھینکیں۔''

چنانچہ حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے انہیں عمان سے بلا کر فلسطین (جو اس وقت شام کا حصہ تھا) کی تسخیر پر مامور فرمایا۔ ان کے ماتحت فوج کی تعداد نو ہزار تھی، جس میں قریش، ہوازن، ثقیف اور بنی کلاب کے لوگ شامل تھے۔ اُنھیں علَم دیتے وقت حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے جو نصیحتیں کیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

''تم اب فلسطین کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ تم اپنی فوج کے امیر ہو لیکن ابو عبیدہ بن الجراحؓ سے اہم معاملات میں مکاتبت اور مشورت کرتے رہنا اور جب انہیں تمہاری امداد کی

ضرورت ہو تو فوراً امداد دینا اور دیکھو ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں خدائے علیم وخبیر سے ڈرتے رہنا۔ تمہیں میں نے اُن لوگوں پر ترجیح دی ہے جن کو قبول حق میں تم پر سبقت حاصل ہے۔ تمہاری تمام سعی و جہد دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے وقف رہنی چاہیے اور جہاد سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہونی چاہیے، تمہارے ساتھیوں میں مہاجرین وانصار اور اہل بدر بھی ہیں اور تم ان کے امیر ہو۔ ان کی عزت اور فضیلت کو ملحوظ رکھنا ایسا نہ ہو کہ تم امیر ہونے کی بنا پر ان پر اپنی فضیلت جتانے لگو۔ اس شیطانی غرور کو اپنے قریب ہرگز نہ پھٹکنے دینا، یہ محض نفس کا ایک فریب ہے۔ مل جل کر رہنا اور تمام کام باہمی مشورے سے کرنا۔ نماز باجماعت سے غفلت نہ برتنا۔ فوج کو کسی ہدایت کی ضرورت ہو تو مختصر نصیحت پر اکتفا کرنا۔ لڑائی کے دوران میں پورے استقلال، صبر اور پامردی سے کام لینا اور کسی حالت میں بھی قدم پیچھے نہ ہٹانا۔ دنیوی مزخرفات اور لغویات سے کنارہ کش رہنا تاکہ صالحین اور ائمہ ہدایت میں شمار کیے جاؤ۔ کوشش کرتے رہنا کہ دشمن کے حالات تم تک برابر پہنچتے رہیں اور پہرے داروں کو برابر اپنے کام پر مستعد رکھنا۔'' (فتوح البُلدان۔ بلاذُری)

حضرتِ عمرو بن العاصؓ نے ان ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور اپنے لشکر کو لے کر فلسطین کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس وقت کچھ اور اسلامی لشکر بھی مختلف افسروں کی قیادت میں شام میں داخل ہو چکے تھے۔ ہرقل کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے ان سب کے مقابلہ کے لیے علاحدہ علاحدہ فوجیں روانہ کیں۔ ان میں سے ایک مضبوط فوج کی قیادت اس کے دو آزمودہ کار جرنیل تذارق اور قبقلار کر رہے تھے۔ انہوں نے فلسطین کے ایک مقام اجنادین میں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ وہاں پہنچے تو اپنی فوج سے کئی گنا لشکر کو اپنے مقابل پایا۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے شام میں موجود دوسری اسلامی فوجیں بھی حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاحؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کی قیادت میں اجنادین پہنچ گئیں۔ اسی دوران میں رومی سپہ سالار نے ایک عرب کو سراغ رسانی پر مامور کیا۔ وہ دیکھ بھال کر واپس گیا تو رومی سپہ سالار نے اس سے پوچھا، اسلامی لشکر کے بارے میں کیا خبر لائے؟ اس نے کہا:

''یہ لوگ رات کو عابد شب بیدار (راہب) ہیں۔ اور دن کو میدان جنگ کے شہسوار ہیں۔

''فی اللّیل رهبان وفی النّهار فرسانٌ''اگر ان کا کوئی شہزادہ بھی کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کو بھی اپنی شریعت کے مطابق سزا دیتے ہیں۔''

یہ سن کر رومی سپہ سالار نے کہا،''اگر واقعی یہ لوگ ایسے ہی ہیں جیسا کہ تم نے بیان کیا تو ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے زمین میں دفن ہو جانا بہتر ہے۔''لیکن اب لڑائی کو ٹالنا رومی سپہ سالار کے بس میں نہیں تھا۔ دونوں لشکروں میں گھمسان کا رن پڑا جس میں رومیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی اور ان کے ہزاروں آدمی تذارق اور قبقلار سمیت میدانِ جنگ میں کھیت رہے۔

اس لڑائی میں حضرت عمروؓ کے چھوٹے بھائی حضرت ہشام بن عاصؓ نے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ وہ ایک تنگ گھاٹی میں شہید ہو کر گرے تو مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے کیوں کہ ان کی لاش پر سے گھوڑے گزارے بغیر گھاٹی کی دوسری جانب مصروفِ دغا مسلمانوں کی مدد کو پہنچنا ممکن نہ تھا۔ حضرت عمروؓ نے یہ صورت حال دیکھی تو مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''مسلمانو! ہشام کی روح اللہ کے پاس پہنچ گئی ہے اب یہاں اس کا جسد خاکی ہے اس کی خاطر دوسرے مسلمانوں کی جانوں کو خطرہ میں نہ ڈالو۔''

یہ کہہ کر خود گھوڑا آگے بڑھایا اور ہشامؓ کی لاش پر سے گزر گئے۔ دوسرے مجاہدین نے بھی ان کی تقلید کی۔ اس طرح شہید راہِ حق حضرت ہشامؓ کی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اختتام جنگ پر حضرت عمروؓ نے تمام ٹکڑوں کو ایک بوری میں ڈال کر سپرد خاک کیا۔ حضرت عمروؓ کو اپنے بھائی کی شہادت ہمیشہ یاد رہی۔ وہ کہا کرتے تھے، ہم دونوں رات بھر شہادت کے لیے دست بہ دعا رہے، صبح ہوئی تو ہشامؓ کی دعا قبول ہو گئی اور میری دعا نا مقبول رہی، اس طرح ہشامؓ مجھ پر سبقت لے گیا۔

(۷)

معرکۂ اجنادین کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ بھی حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاحؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے بڑے لشکر کے ساتھ ہو گئے۔ اس میں ان کی حیثیت لشکر کے ایک حصہ کے افسر کی تھی۔ اس لشکر نے آگے بڑھ کر شام کے دارالحکومت دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ شہر پناہ کے تمام بڑے بڑے دروازوں پر الگ الگ افسر متعین کیے گئے۔

علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ ''باب توما'' پر مامور تھے۔ وہ رومیوں کو برابر دباتے رہے۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوگیا اور حضرت عمر فاروقؓ مسند نشین خلافت ہوئے۔ انہوں نے بھی اس مہم کو جاری رکھنے کا حکم دیا یہاں تک کہ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور شہر پر ان کا قبضہ ہوگیا۔

فتح دمشق کے بعد مسلمانوں نے فحل اور بیسان کے معرکوں میں رومیوں کو عبرت ناک شکست دی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ ان معرکوں میں امتیازی حیثیت سے شریک رہے۔

رومیوں کی پے بہ پے شکستوں نے قیصرِ روم کو چونکا دیا۔ چنانچہ اس نے انطاکیہ میں بہت بڑی فوج جمع کر کے مسلمانوں کو شام سے نکال دینے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ یہ فوج جس میں دو لاکھ کے قریب آزمودہ کار سپاہی اور افسر شامل تھے، مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ کر کے انطاکیہ سے چلی تو مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ جن جن شہروں پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے وہاں سے فوجیں ہٹالی جائیں اور یہ سب فوجیں متحد ہو کر رومیوں کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے کردار کی بلندی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ وہ یہ کہ دمشق حمص وغیرہ شہروں سے نکلتے وقت وہاں کے باشندوں کو یہ کہہ کر جزیہ کی رقمیں لوٹا دیں کہ سرِ دست ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس اقدام کا ان شہروں کے لوگوں پر اتنا اثر ہوا کہ وہ روتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ خدا تم (مسلمانوں) کو پھر واپس لائے۔

مسلمان مجاہدین شام کے شہروں سے نکل کر یرموک پہنچے۔ (دریائے یرموک کے کنارے یہ ایک کھلا میدان تھا) اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ دو لاکھ رومیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد مل ملا کر بھی چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان تھی لیکن ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ پہلے دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے۔ رومیوں کی خواہش تھی کہ مسلمان روپے لے لیں اور واپس چلے جائیں لیکن مسلمان اس پر تیار نہ ہوئے۔ بالآخر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اس جنگ میں اسلامی لشکر کے میمنہ کے سردار تھے۔ دونوں فوجوں کے درمیان کئی خونریز معرکے ہوئے جن میں فریقین نہایت بے جگری سے لڑے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے ہر معرکے میں سر بکف ہو کر دادِ شجاعت دی۔ وہ اپنی پُر جوش تقریروں

سے لشکر میں آگ لگا دیتے تھے۔ ایک دو موقعوں پر رومی مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے عورتوں کے خیموں تک پہنچ گئے لیکن اسلام کے ان غیور بیٹیوں نے خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر رومیوں کا منہ پھیر دیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے مسلمانوں کو بھی غیرت دلا کر میدانِ جنگ میں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

مسلمانوں نے بھی کئی بار جی توڑ کر حملے کیے لیکن رومیوں نے انہیں ہٹا دیا۔ آخر مسلمانوں کی ثابت قدمی اور جاں بازی رنگ لائی۔ مسلمانوں کی فوج کے ایک حصے نے (لڑائی کے آخری دن) بجلی کی تیزی کے ساتھ رومیوں کے عقب سے حملہ کیا جس سے ان کی صفیں ابتر ہو گئیں۔ ان کی آدھی فوج تو میدانِ جنگ میں کام آئی اور جو لوگ زندہ بچ گئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت عمرو بن العاص، فلسطین کا کچھ حصہ فتح دمشق سے پہلے مسخر کر چکے تھے لیکن پھر انہیں دمشق، فحل اور یرموک وغیرہ کی مہموں میں شریک ہونا پڑا اس لیے جس خاص مہم پر وہ مامور ہوئے تھے وہ ناتمام رہ گئی تھی۔ یرموک کی لڑائی کے بعد وہ پھر اس طرف متوجہ ہوئے اور غزہ، نابلس، لُد، بیت حبرین اور عمواس وغیرہ یکے بعد دیگرے فتح کر کے بیت المقدس کے سوا تمام فلسطین کو اسلامی مملکت میں شامل کر دیا۔ اب انہوں نے رومی سپہ سالار ارطبون کو خط لکھا کہ بیت المقدس کو ہمارے حوالے کر دو اور اس مقدس شہر میں خونریزی نہ ہونے دو۔ لیکن ارطبون نے بڑا گستاخانہ جواب دیا جس میں ڈینگ ماری کہ اب عمرو بن العاصؓ کو اس زمین کے ایک چپے پر بھی قبضہ نہیں کرنے دیا جائے گا۔ حضرت عمروؓ نے آگے بڑھ کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ بن الجرّاحؓ بھی قنسرین کی مہم سر کر کے بیت المقدس پہنچ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ رومی سپہ سالار ارطبون اپنی فوج لے کر مصر چلا گیا تھا اس لیے بیت المقدس میں کچھ زیادہ فوج نہیں تھی۔ چنانچہ بیت المقدس کے باشندے بہت جلد ہمت ہار بیٹھے اور اس شرط پر بلا مزاحمت شہر مسلمانوں کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ مسلمانوں کے خلیفہ خود یہاں آ کر ہمارے ساتھ تحریری معاہدۂ صلح کریں۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو مطلع کیا گیا تو انہوں نے یہ شرط قبول کر لی اور چند مہاجرین و انصار کے ساتھ بیت المقدس تشریف لے گئے، وہاں عیسائیوں کی خواہش کے مطابق معاہدۂ صلح لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ اس طرح یہ مقدس شہر کسی

خون خرابے کے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور سارا شام پورے فلسطین سمیت مسلمانوں کے زیرِ نگین ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد شام میں طاعون کی خوفناک وبا پھیل گئی جو" طاعونِ عمواس" کے نام سے مشہور ہے۔ والیِ شام حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاحؓ اور ہزاروں دوسرے مسلمان اس وبا میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاحؓ نے وفات سے پہلے حضرت معاذ بن جبل انصاریؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے انہیں اس مقام سے فوجیں ہٹا لینے کا مشورہ دیا لیکن وہ نہ مانے اور خود بھی طاعون میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے طاعون زدہ مقامات سے فوجیں ہٹا لیں اور انہیں پہاڑوں پر پھیلا دیا، اس طرح وہ وبا سے محفوظ ہو گئیں۔

⑧

جہادِ شام کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کی زندگی کا وہ دَور شروع ہوا جس میں وہ دنیا کے نامور فاتحین کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں انہوں نے نہ صرف مصر کے وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب ملک پر پرچم اسلام بلند کیا بلکہ اسلامی فتوحات کو طرابلس الغرب تک پہنچا دیا۔ مصر پر حضرت عمرو بن العاصؓ کی لشکر کشی کے کیا محرّکات تھے؟ اس کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ مصر قیصرِ روم کا باج گزار تھا۔ شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد قیصر کی طرف سے مصر کے اندر سے بڑھنے کا خطرہ تھا (بہ قولِ بعض وہ حملہ کی تیاری کر رہا تھا)، دوسری روایت یہ ہے کہ مصری آئے دن شام میں گھس کر مسلمانوں پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کو زمانۂ جاہلیت میں بسلسلۂ تجارت اکثر مصر جانے کا اتفاق ہوا تھا وہ اس ملک کی زرخیزی اور شادابی سے بہ خوبی آگاہ تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ ملک اسلامی مملکت میں شامل ہو جائے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے شام کا جو اخیر سفر کیا اس میں حضرت عمرو بن العاصؓ ان سے تنہائی میں ملے اور مصر پر لشکر کشی کی اجازت چاہی۔ شروع میں حضرت عمر فاروقؓ نے ان وجوہ کی بنا پر اجازت دینے میں تامل کیا کہ شام کو سر کر لینے کے بعد اسلامی فوجوں نے ابھی پوری طرح دم بھی نہیں لیا تھا، دوسری

یہ کہ طاعونِ عمواس میں پچیس ہزار مسلمان فوت ہو گئے تھے اور مسلمانوں کی فوجی طاقت قابل اطمینان نہیں تھی، تیسری یہ کہ دور دراز کا سفر تھا اور کئی مشکلات راستے میں حائل تھیں، چوتھی یہ کہ مقوقس والیِ مصر کی فوجی قوت اور وسائل کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ بڑے بہادر اور حوصلہ مند آدمی تھے انہوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں مصر کی طرف پیش قدمی کی اجازت دے دی۔ (یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اجازت دیتے وقت امیر المؤمنین کے پیشِ نظر شام پر مصر کی طرف سے حملے کا خطرہ بھی ہو اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے ذہن میں بھی یہ بات ہو کہ رومی فوجیں مصر میں جمع ہو کر کہیں شام اور فلسطین کے لیے خطرہ نہ بن جائیں) لیکن اس مقصد کے لیے صرف چار ہزار فوج فراہم ہو سکی۔

۱۸ ہجری کے اخیر میں حضرت عمرو بن العاصؓ اسی فوج کے ساتھ مصر کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے باب الیون (بابلیون) کے مقام پر ایک مصری فوج نے ان کی مزاحمت کی لیکن حضرت عمروؓ نے اسے شکست فاش دی۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر العریش پہنچ گئے۔ ابھی وہیں تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اگر حدودِ مصر میں نہ داخل ہوئے ہو تو واپس آجاؤ اور داخل ہو چکے ہو تو اللہ کے بھروسے پر پیش قدمی جاری رکھو۔ العریش چوں کہ حدودِ مصر میں واقع ہے اس لیے حضرت عمروؓ نے خط پڑھ کر کہا کہ اب تو ہم حدودِ مصر کے اندر پہنچ چکے۔ غرض العریش سے آگے بڑھ کر فرما پہنچے جو دریائے نیل کے کنارے ایک قدیم اور بڑا شہر تھا۔ اس کی حفاظت پر ایک مضبوط فوج مامور تھی۔ اس نے ایک ماہ تک مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر شکست کھائی۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ بلبیس اور ام ونین وغیرہ فتح کرتے ہوئے عین شمس پہنچ گئے۔ قدیم زمانے میں یہ ایک بڑا شہر تھا لیکن اس وقت تباہ ہو چکا تھا۔

مؤرّخ مقریزی کا بیان ہے کہ بعد میں یہی مقام دوبارہ آباد ہو کر ''فسطاط'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مقام پر حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور چراگاہوں کے درمیان ایک مضبوط قلعہ ''قصرِ شمع'' تھا۔ اس میں سرکاری فوج اور مصری سلطنت کے بڑے بڑے حکام رہتے تھے۔ چوں کہ دریائے نیل اس کی فصیل کے نیچے بہتا تھا، جہاز اور کشتیاں اس کے دروازے پر آ کر لگتی تھیں اس لحاظ سے یہ ایک نہایت اہم مقام تھا اور اس کو مسخر کیے بغیر مصر میں آگے بڑھنا سخت خطرناک تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مصری فوج نے بڑی ثابت قدمی

سے مقابلہ کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ خود مقوقس قلعہ میں پہنچ کر اس کا دفاع کر رہا تھا۔ جب محاصرے نے طول کھینچا تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے دربارِ خلافت سے مدد طلب کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دس ہزار (بہ روایت دیگر بارہ ہزار) فوج حضرت زبیر بن العوامؓ کی قیادت میں بھیج دی۔ اس فوج کے دوسرے افسر حضرت مقداد بن الاسودؓ، حضرت عبادہ بن صامت انصاریؓ اور حضرت مسلمہ بن مخلّد انصاریؓ تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمروؓ کو لکھا کہ حضرت زبیرؓ اور یہ تینوں افسر ایک ایک ہزار سواروں کے برابر ہیں۔ حضرت زبیرؓ کے بلند مرتبہ کے پیشِ نظر حضرت عمروؓ نے محاصرہ کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے خندق کے ارد گرد چکر لگایا اور خاص خاص مقامات پر سوار اور پیادے متعین کیے، اس کے ساتھ ہی منجنیقوں سے قلعہ کی دیواروں پر شدید سنگ باری شروع کر دی لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود جب قلعہ سات ماہ تک فتح ہونے میں نہ آیا تو ایک دن حضرت زبیرؓ یہ کہہ کر کہ آج مسلمانوں پر فدا ہوتا ہوں، شمشیر بہ دست سیڑھی کے ذریعے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ چند اور مجاہدین نے ان کا ساتھ دیا۔ ان سب نے فصیل پر پہنچ کر اس زور سے تکبیر کے نعرے بلند کیے کہ مصری سمجھے مسلمان قلعہ کے اندر گھس آئے۔ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر چھپنے لگے اُدھر حضرت زبیرؓ نے فصیل سے اتر کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور سارا اسلامی لشکر اندر داخل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر مصریوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی درخواست کی۔ حضرت عمروؓ نے معمولی شرائط پر صلح کر لی اور تمام اہلِ قلعہ کو امان دے دی۔ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے فرمان کے مطابق اس علاقہ کی اراضی زمین داروں کے پاس رہنے دی گئی اور ان پر لگان لگا دیا گیا۔

بعض مؤرّخین نے یہ سارے واقعات بابلیون کی تسخیر کے سلسلے میں لکھے ہیں لیکن ہم نے طبریؒ، بلاذریؒ اور مقریزیؒ کے بیانات کو ترجیح دی ہے۔

۹

قصرِ شمع میں چند دن قیام کرنے کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ امیر المؤمنینؓ سے اجازت لے کر مصر کے سب سے اہم شہر اسکندریہ کی طرف بڑھے۔ اثنائے راہ میں اشمون، عالیا، کوم، مافوف، کریون اور بعض دوسرے مقامات پر مصری فوج اسلامی لشکر کی مزاحم ہوئی لیکن ہر جگہ

شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئی اور حضرت عمرو بن العاصؓ یلغار کرتے ہوئے اسکندریہ کی دیواروں کے نیچے پہنچ گئے۔ اسکندریہ میں پچاس ہزار رومی فوج متعین تھی اور ایک مضبوط بحری بیڑا بھی اس کی حفاظت کے لیے موجود تھا۔ شہر میں ہتھیاروں اور سامانِ رسد کے بڑے بڑے ذخیرے موجود تھے اس لیے رومیوں کے حوصلے بلند تھے اور انہوں نے قلعہ بند ہوکر آخری دم تک مقابلہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا____ علامہ بلاذریؒ اور مقریزیؒ کا بیان ہے کہ مقوقس مسلمانوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن علی الاعلان جنگ سے کنارہ کش نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ اس صورت میں وہ قیصر کے قہر وغضب کا نشانہ بن سکتا تھا۔ دوسری طرف مقوقس کو یقین تھا کہ جن مسلمانوں نے قیصر کو شام سے نکال باہر کیا ہے وہ بالآخر مصر کو بھی مسخر کرلیں گے۔ چنانچہ اس نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے خفیہ معاہدہ کرلیا کہ یہ لڑائی ہماری مرضی کے خلاف ہورہی ہے اور ہم طوعاً وکرہاً اس میں شریک ہیں اس لیے مسلمانوں کو خیال رکھنا ہوگا کہ ان کے ہاتھ سے میری قوم (قبطی) کو کوئی ضرر نہ پہنچنے پائے۔ جب مسلمانوں کو فتح ہوگئی تو بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور اپاہجوں کو چھوڑ کر ہر قبطی دو دینار سالانہ جزیہ ادا کرے گا اور جہاں جہاں مسلمان فوجیں جائیں گی قبطی ان کے لیے سڑکیں اور پل درست کریں گے، غلہ اور چارہ کی منڈیاں کھولیں گے اور مسلمانوں سے ہر طرح کا تعاون کریں گے۔

بلاذریؒ کا بیان ہے کہ لڑائی سے پہلے مقوقس نے اسکندریہ کی فصیلوں پر شہر کے تمام مردوں اور عورتوں کو فوجی لباس پہنا کر کھڑا کردیا تاکہ مسلمان ان کی کثرتِ تعداد سے مرعوب ہوجائیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ منظر دیکھا تو مقوقس کو کہلا بھیجا کہ ہم نے اب تک جو ملک فتح کیے وہ فوج کی کثرت کے بل پر نہیں کیے۔ تمہارا بادشاہ ہرقل جس سازوسامان کے ساتھ ہمارے مقابلے پر آیا تم کو معلوم ہے اور جو نتیجہ ہوا وہ بھی تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مقوقس کو یہ پیغام ملا تو اس نے اہلِ سکندریہ کو اس سے آگاہ کرکے کہا، اس میں کیا شک ہے کہ ان عربوں نے ہمارے شہنشاہ کو شام سے نکال کر قسطنطنیہ پہنچا دیا ہم لوگوں کی ان کے سامنے کیا حقیقت ہے؟ اس پر رومی بہت برافروختہ ہوئے اور مقوقس کو بہت جلی کٹی سنائیں۔ وہ مصلحتاً خاموش ہوگیا۔ البتہ لڑائی میں قبطیوں نے کوئی سرگرمی نہ دکھائی بلکہ ایک حد تک الگ رہے۔ ایک روایت کے مطابق تو انہوں نے درپردہ مسلمانوں کی مدد بھی کی۔ (راستے صاف کیے اور پلوں کی مرمت کی)

حضرت عمرو بن العاصؓ نے رومیوں کے تیور دیکھے تو انہوں نے نہایت سختی سے

اسکندریہ کا محاصرہ کرلیا۔ رومیوں کے دفاعی انتظامات بڑے مضبوط تھے اس لیے وہ مقابلے پر ڈٹے رہے۔ عام طور پر وہ شہر کے اندر ہی رہتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کا کوئی دستہ شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں سے دو دو ہاتھ آتا تھا۔ ایک دن ایسی ہی ایک جھڑپ میں بارہ مسلمان شہید ہو گئے۔ ایک اور موقع پر رومیوں نے ایک مسلمان کو شہید کر کے اس کا سر کاٹ لیا اور اسے اسی وقت رومیوں کے حوالے کیا جب انہوں نے شہید مسلمان کا سر واپس کیا۔

ایک اور موقع پر رومیوں نے گھات لگا کر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد (ایک روایت کے مطابق ۶۳۴) کو شہید کر ڈالا لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس کا فوراً بدلہ لے لیا اور تمام حملہ آوروں کو تہس نہس کر دیا۔ اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ قیصرِ روم بڑے ساز و سامان کے ساتھ خود اسکندریہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کو پیغامِ اجل آ پہنچا، تاہم اسکندریہ میں موجود رومیوں نے مقابلہ برابر جاری رکھا۔

ایک دن رومیوں کا ایک دستہ شہر سے نکلا تو اس میں سے ایک رومی جنگجو نے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔ حضرت مسلمہ بن مخلدؓ اس کے مقابل ہوئے لیکن اتفاق سے گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور رومی نے ان کو زمین پر دے مارا۔ اس نے ان کو قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ ایک مسلمان شہسوار نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر ان کو بچا لیا۔

یہ واقعہ دیکھ کر حضرت عمرو بن العاصؓ اس قدر غضب ناک ہوئے کہ ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ''ایسے نامردوں کو میدانِ کارزار میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔'' حضرت مسلمہؓ کو ان کی بات سن کر بہت رنج ہوا لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔ اب عام لڑائی شروع ہو گئی مسلمانوں نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح اس زور سے حملہ کیا کہ رومی پیچھے ہٹتے ہٹتے قلعے کے اندر گھس گئے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ دیر تک قلعہ کے اندر معرکہ گرم رہا، آخر رومیوں نے سنبھل کر ایسا زبردست جوابی حملہ کیا کہ مسلمانوں کو قلعہ سے باہر نکلنا پڑا البتہ چار مجاہدین قلعہ کے اندر ہی رہ گئے۔ ان میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت مسلمہ بن مخلدؓ بھی تھے لیکن رومی ان کو پہچانتے نہ تھے۔ انہوں نے ان چاروں کو زندہ گرفتار کرنا چاہا مگر جب دیکھا کہ چاروں مرنے مارنے پر تیار ہیں اور کسی صورت میں زندہ ہمارے ہاتھ نہیں آئیں گے تو انہوں نے کہا کہ تم میں سے ایک آدمی ہمارے ایک آدمی کا مقابلہ کرے اگر تمہارا آدمی غالب آ گیا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ شرط منظور کر لی اور خود رومی جنگجوؤں کے مقابلہ پر نکلنا چاہا لیکن حضرت مسلمہؓ نے کہا، آپ فوج کے سردار ہیں اگر خدانخواستہ آپ کو کوئی ضرر پہنچ گیا تو فوج کا کیا حال ہوگا۔ آپ پیچھے رہیں میں رومی کے مقابلہ پر جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر گھوڑا آگے بڑھایا اور رومی جنگجو کے سامنے پہنچ گئے۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے پر وار کرتے رہے۔ آخر حضرت مسلمہؓ نے ایک ایسا ہاتھ مارا کہ رومی ڈھیر ہو گیا۔ رومیوں نے اقرار کے مطابق قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور چاروں باہر آ گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ حضرت مسلمہؓ کی بہادری سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے پہلے الفاظ پر ندامت کا اظہار کیا اور ان سے معافی مانگی۔ انہوں نے صاف دلی سے معاف کر دیا۔ اسی طرح عرصہ تک جھڑپیں ہوتی رہیں اور محاصرہ طول کھنچتا گیا یہاں تک کہ دو سال گزر گئے۔ اُدھر حضرت عمر فاروقؓ اس تاخیر سے بہت متفکّر تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمروؓ کو ایک سخت خط لکھا کہ شاید تم لوگ وہاں رہ کر رومیوں کی طرح آرام پسند ہو گئے ہو ورنہ فتح میں اتنی دیر نہ ہوتی۔ جس دن میرا خط پہنچے، تمام فوج کو جمع کر کے جہاد کے فضائل پر خطبہ دو اور جن چار آدمیوں کو میں نے افسر بنا کر بھیجا تھا، جمعہ کے دن زوالِ آفتاب کے بعد ان کو فوج کے آگے کر کے فیصلہ کن حملہ کرو۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے امیر المؤمنینؓ کے فرمان کے مطابق تمام فوج کو جمع کر کے جہاد کے فضائل پر ولولہ انگیز خطبہ دیا۔ اس کو سن کر تمام مجاہدین لڑائی کے لیے بے تاب ہو گئے۔ حضرت عمروؓ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو بلا کر ان سے کہا کہ اپنا نیزہ مجھے دیجیے۔ پھر اپنا عمامہ سر سے اتار کر نیزہ پر باندھا اور اس کو حضرت عبادہؓ کے سپرد کر کے کہا کہ یہ سپہ سالار کا علم ہے اور آج آپ سپہ سالار ہیں۔ ساتھ ہی حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت مسلمہؓ کو فوج کے ہراول کا افسر مقرر کیا۔ اب مجاہدین نے حضرت عبادہؓ کی قیادت میں ایسا زبردست حملہ کیا کہ پہلے ہی ہلّے میں رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بری اور بحری راستہ سے جدھر راہ ملی بھاگ نکلے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے ایک ہزار آدمیوں کو اسکندریہ چھوڑا اور خود اندرونِ مصر بھاگنے والے رومیوں کا تعاقب کیا۔ اُدھر رومیوں نے موقع پا کر بحری راستے سے اسکندریہ میں موجود مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں بہت سے مسلمانوں نے جامِ شہادت پیا۔ حضرت عمروؓ کو

اطلاع ملی تو بھگوڑے رومیوں کا تعاقب چھوڑ کر پلٹ پڑے اور حملہ آور رومیوں کو شکست دے کر اسکندریہ پر مضبوطی سے قبضہ کرلیا۔

اگرچہ یہ شہر بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا لیکن حضرت عمروؓ نے عام آبادی میں سے نہ کسی کو قتل کیا اور نہ قید کیا بلکہ جزیہ اور خراج تشخیص کرنے کے بعد سب کو امن و امان سے رہنے کی اجازت دے دی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کا خط اسکندریہ کے محاصرے کے چار ماہ بعد حضرت عمروؓ کو موصول ہوا۔ یہ خط ملنے کے بعد انہوں نے رومیوں پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن شرط یہ رکھی کہ شہر گیارہ ماہ بعد مسلمانوں کے حوالے کریں گے۔ حضرت عمروؓ نے کشت و خون سے بچنے کے لیے یہ شرط منظور کرلی اور گیارہ ماہ گزرنے کے بعد فوراً شہر پر قبضہ کرلیا۔

صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو اسکندریہ کی تسخیر سے مصر کے دوسرے شہروں میں موجود رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان شہروں کی تسخیر کے لیے حضرت عمیر بن وہبؓ، حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ اور حضرت خارجہ بن حذافہؓ کی سرکردگی میں مختلف اطراف میں لشکر روانہ کیے۔ کسی کسی جگہ رومیوں نے مزاحمت کی لیکن بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح تمام مصر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے معاویہ بن خدیج کو فتح مصر کی خوش خبری دے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ یہ مژدہ سن کر بے اختیار رب العزّت کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور پھر تمام اہلِ مدینہ کو جمع کر کے یہ خوش خبری سنائی۔

۱۰

مصر کی تسخیر کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ برقہ کی طرف بڑھے جو اسکندریہ اور طرابلس الغرب کے درمیان ایک شاداب اور گنجان آباد علاقہ تھا۔ برقہ حدودِ مصر سے باہر تھا لیکن اس کے باشندے حکومتِ مصر کے باج گزار تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے برقہ میں داخل ہو کر وہاں کے سب سے اہم اور مرکزی شہر انطابلس کا محاصرہ کرلیا۔ اہلِ شہر نے بہت جلد اطاعت قبول کرلی اور تیرہ ہزار دینار سالانہ جزیہ دینے کا اقرارنامہ لکھ دیا۔

برقہ کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ نے عقبہ بن نافعؓ کو زویلہ روانہ کیا جو سوڈان کی سرحد پر ایک آباد شہر تھا۔ اہلِ زویلہ نے کسی مزاحمت کے بغیر جزیہ دینا قبول کرلیا۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے طرابلس الغرب کا رُخ کیا جو بحرِ روم کے کنارے افریقہ کا ایک نہایت اہم مقام تھا۔ اہلِ طرابلس نے مسلمانوں کی آمد کی خبر سنی تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے شہر کی مشرقی سمت میں پڑاؤ ڈالا اور نہایت اہتمام سے اس کا محاصرہ کرلیا۔ دو ماہ تک محاصرہ جاری رہا لیکن شہر میں داخلہ کا کوئی راستہ نہ ملتا تھا۔ ایک دن چند مسلمان شکار کو گئے۔ اتفاق سے ان کی نظر ایک خشک راستے پر پڑی جو سمندر میں پانی اتر جانے کی وجہ سے بن گیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ شہر اور سمندر کے درمیان کوئی فصیل یا رکاوٹ نہیں ہے۔ لشکر میں واپس آ کر انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس سے حضرت عمرو بن العاصؓ کو آگاہ کیا۔ انہوں نے فوراً اسی راستہ سے شہر پر حملہ کر دیا۔ اس ناگہانی حملہ سے شہر والے بدحواس ہو گئے اور تھوڑی دیر مزاحمت کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

طرابلس کی تسخیر کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ وہیں رہے اور فوج کا ایک دستہ سبرہ روانہ کیا جو طرابلس سے کچھ فاصلے پر ایک اہم شہر تھا۔ اہل سبرہ کو طرابلس کے واقعہ کا علم نہیں تھا اس لیے شہر کا پھاٹک کھول کر اطمینان سے کاروبار میں مشغول تھے۔ مسلمان اچانک یلغار کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔ اہلِ سبرہ کو مقابلہ کی ہمت نہ پڑی اور انہوں فوراً اطاعت قبول کر لی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ لاکھوں مربع میل پر پرچم اسلام بلند کر چکے تھے اور اب اسکندریہ سے سینکڑوں میل دور ایک ایسی سرزمین میں تھے جہاں سفر دشوار تھا اور پانی کمیاب لیکن ان کی ہمت جوان تھی۔ اب ان کی نظریں افریقیہ (تونس، الجزائر اور مراکش) کے افق پر جمی ہوئی تھیں۔ انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھا کہ ہم نے طرابلس تک فتح حاصل کر لی ہے، یہاں سے افریقیہ کی حدود نو دن کی مسافت پر ہیں اگر اجازت ہو تو ہم اوپر (شمالی افریقہ) کا رخ کریں۔ امیر المؤمنین نے جواب میں لکھا:

> ''افریقہ میں قدم نہ رکھو، یہ ملک اختلاف وافتراق کا مرکز ہے اور وہاں کے لوگ کبھی متحد نہیں رہتے۔ وہاں کا پانی سخت دلی پیدا کرتا ہے اسے جو بھی پیے گا اس کا دل سخت ہو جائے گا۔''

اس کے ساتھ ہی حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔

اسکندریہ پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد بہت سے رومی اپنے گھر بار چھوڑ کر بحری راستے سے قیصر کی سلطنت میں چلے گئے تھے، مسلمانوں کو ان کے چھوڑے ہوئے بہت سے مکان حویلیاں اور محل خالی ملے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا کہ میں اسکندریہ کو دارالحکومت بنانا چاہتا ہوں کیوں کہ یہاں رہائش کا تسلّی بخش انتظام ہے لیکن انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی اور لکھا:

''میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تم مسلمان غازیوں کو ایسی جگہ آباد کرو جس کے اور میرے درمیان گرمی یا جاڑے میں کوئی دریا حائل ہو۔''

اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے ایک نیا شہر ''فسطاط'' آباد کیا اور اسی کو مستقرِ حکومت بنایا۔ یہ شہر کیسے آباد ہوا، اس کی تفصیل علامہ شبلی نعمانی نے ''الفاروق'' میں اس طرح بیان کی ہے:

''عمرو بن العاصؓ اسکندریہ سے چل کر قصر الشمع میں آئے۔ یہاں ان کا وہ خیمہ اب تک اسی حالت میں کھڑا تھا جس کو وہ اسکندریہ کے حملہ کے وقت خالی چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ اسی خیمہ میں اُترے اور وہیں نئی آبادی کی بنیاد ڈالی۔ ہر ہر قبیلہ کے لیے الگ الگ احاطے کھینچے اور معاویہ بن خدیجہ، شریک بن سمیؓ، عمرو بن مخزوم اور ابنِ ناشرہ کو متعین کیا کہ جس جس قبیلہ کو جہاں مناسب سمجھیں آباد کریں۔ جس قدر محلے اس وقت تھے اور جو قبائل ان میں آباد ہوئے ان کے نام علامہ مقریزی نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ جامع مسجد خاص اہتمام سے بنی۔ عام روایت ہے کہ ۸۰ صحابہؓ نے جمع ہو کر اس کے قبلہ کی سمت متعین کی، ان صحابہ میں زبیرؓ، مقدادؓ، عبادہؓ، اور ابو درداءؓ اور بڑے بڑے اکابر شریک تھے۔ یہ مسجد ۵۰ گز لمبی اور ۳۰ گز چوڑی تھی۔ تین طرف دروازے تھے جن میں سے ایک دارالحکومت کے مقابل تھا اور دونوں عمارتوں میں سات گز کا فاصلہ تھا۔ عمرو بن العاصؓ نے ایک مکان خاص حضرت عمرؓ کے لیے تعمیر کرایا تھا لیکن جب حضرت عمرؓ نے لکھ بھیجا کہ میرے کس کام کا ہے تو وہاں بازار آباد کرایا گیا۔ چوں کہ اس شہر کی آبادی خیمہ گاہ سے شروع ہوئی تھی اس لیے اس کا نام فسطاط پڑا جس کے معنی عربی میں خیمہ کے ہیں۔ آبادی کا سنہ ۲۱ ہجری ہے۔ فسطاط نے نہایت جلد ترقی کی اور اسکندریہ کی بجائے مصر کا صدر مقام بن گیا۔''

فسطاط کی تعمیر شروع ہوئی تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے دریائے نیل کے مغربی کنارے پر (فسطاط کے بالمقابل) ایک عارضی چھاؤنی بنائی جس میں قبائل حمیر، ہمدان، آل رعین، ازد بن حجر اور حبشہ کے تھوڑے سے لوگ رکھے گئے۔ یہ اس غرض سے کیا گیا کہ مسلمانوں کو تعمیر فسطاط میں مشغول پا کر مغرب کی طرف سے کوئی دشمن دریا کی راہ سے چڑھ نہ آئے۔ جب نیا شہر بس گیا تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان قبائل کو فسطاط میں بلا کر آباد کرنا چاہا لیکن ان لوگوں کو دریا کا مغربی کنارہ اتنا بھایا کہ اس کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ اس چھاؤنی کا نام جنیرہ پڑ گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ خط لکھا:

> ''تم نے یہ کیسے گوارا کیا کہ تمہاری فوج تم سے الگ رہے اور تمہارے اور اس کے درمیان دریا ہو، کیا خبر ان پر اچانک کوئی مصیبت آ پڑے اس وقت شاید تم ان کی مدد نہ کر سکو اور ان کو نقصان پہنچ جائے۔ لہٰذا ان کو فسطاط بلا لو اور اگر وہ تیار نہ ہوں تو ان کی بستی کے چاروں طرف سرکاری روپے سے ایک قلعہ بنوا دو۔''

چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے وہاں ایک قلعہ بنوا دیا لیکن قبیلہ ہمدان اور کچھ دوسرے قبیلوں کے لوگوں نے کہا کہ ہم نامردوں کی طرح قلعہ کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتے ہمارے قلعے خود ہماری تلواریں ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ قلعہ کے باہر کھلے میدان میں بس گئے اور ہمیشہ وہیں رہے۔ جلد ہی یہ ایک پُر فضا اور بارونق شہر بن گیا جس کو باغوں نے گھیر رکھا تھا۔

جب فسطاط آباد ہو گیا تو مصر کے سابق والی مقوقس نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے درخواست کی کہ کوہِ مقطم کے دامن کی بنجر اراضی میرے ہاتھ بیچ دیں، میں اس کے لیے ستر ہزار دینار دینے کے لیے تیار ہوں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا، مصر کی زمین تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ اس کا کوئی بھی حصہ نہیں بک سکتا۔ پھر بھی میں امیر المومنینؓ کو لکھتا ہوں اگر انہوں نے اجازت دے دی تو تمہارے ہاتھ یہ زمین فروخت کر دوں گا۔

جب یہ معاملہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس پہنچا تو انہوں نے لکھا:

> ''مقوقس سے پوچھو کہ وہ اس ناکارہ زمین کی اتنی زیادہ قیمت کیوں دے رہا ہے نہ اس میں پانی ہے اور نہ یہ زراعت کے لائق ہے۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے مقوقس سے جب یہ سوال کیا تو اس نے بتایا کہ ہماری

کتابوں میں لکھا ہے کہ یہاں جنت کے پودے لگائے جائیں گے (عیسائیوں کا قبرستان بنے گا) ۔حضرت عمر فاروقؓ کو اس جواب سے مطلع کیا گیا تو انہوں نے لکھا:

''میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے علاوہ اور کون جنت کا پودا ہوسکتا ہے لہٰذا فسطاط میں جو مسلمان فوت ہوں انہیں مقطم کے دامن میں دفن کرو اور کسی قیمت پر اسے نہ بیچو۔''
(حسن المحاضرہ للسیوطی)

حضرت عمر فاروقؓ نے تمام گورنروں کو حکم دیا تھا کہ ہر سال حج کے زمانے میں حاضر ہوں وہ تمام گورنروں کی موجودگی میں مجمع عام میں اعلان کرتے تھے کہ جس کو کسی گورنر سے شکایت ہو پیش کرے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایسے ہی موقع پر لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا، ''لوگو! میں تم پر جن لوگوں کو حاکم بنا کر بھیجتا ہوں ان کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ تم کو تھپڑ مار دیں یا تمہارا مال چھین لیں بلکہ اس لیے کہ وہ تم کو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ سکھائیں۔ اگر کسی گورنر یا حاکم نے اس کے خلاف کیا تو بلا جھجک اُٹھ کر بیان کرو تاکہ میں اس کا تدارک کروں۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے اٹھ کر کہا، امیر المؤمنین اگر کوئی عامل کسی کو تادیب کے طور پر مارے تو کیا اس کا بھی محاسبہ کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، خدا کی قسم میں اس کو بھی سزا دوں گا کیوں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ خبردار مسلمانوں کو نہ مارا کرو ورنہ وہ ذلیل ہوجائیں گے۔ ان کے حقوق مت تلف کرو ورنہ وہ کفرانِ نعمت کریں گے۔

ایک دفعہ حسبِ معمول تمام گورنر حاضر تھے، ایک مصری نے اٹھ کر شکایت کی کہ گورنر نے مجھ کو بلا قصور سو کوڑے مارے۔ حضرت عمرؓ نے مصری سے پوچھا، کیا تم بھی قصاص میں سو کوڑے مارنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا، بے شک۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم مجمع عام میں گورنر کو سو کوڑے مار سکتے ہو۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کیا، ''امیر المومنین! یہ امر عُمّال پر گراں گزرے گا اور آئندہ کے لیے نظیر قائم ہوجائے گی اس طرح حکومت کا نظم ونسق چلانا مشکل ہوجائے گا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ میں مستغیث کی دادرسی نہ کروں۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے مستغیث کو اس شرط پر راضی کیا کہ ایک ایک کوڑے کے عوض دو دو اشرفی لے لے اور اپنی شکایت واپس لے کر قصاص کا مطالبہ چھوڑ دے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس شکایت پہنچی کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے محمد بن عمروؓ نے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ایک مصری کو یہ کہہ کر پیٹ دیا کہ تو شرفا کے بیٹوں کے منہ آتا ہے۔ (بہ روایت دیگر یہ کہہ کر اس کو کوڑے مارے "یہ لے میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں)

حضرت عمر فاروقؓ نے شکایت کنندہ کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور حضرت عمروؓ اور محمد بن عمروؓ کو مصر سے بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئے تو حضرت عمر فاروقؓ نے مصری کو طلب کر کے اس کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور فرمایا" اس کوڑے سے اس بڑے باپ کے بیٹے کی خبر لے۔" مصری نے محمد بن عمروؓ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے اس دوران میں حضرت عمرؓ برابر فرماتے رہے:

"ہاں مار اس بڑے باپ کے بیٹے کو۔"

جب وہ مار چکا اور کوڑا حضرت عمر فاروقؓ کو واپس کرنے لگا تو انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

"ایک دو کوڑے اس کو بھی رسید کر کیوں کہ اسی کے بل پر برخوردار نے تمہیں کوڑے مارنے کی جرأت کی۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کی" امیر المؤمنین انصاف کا حق ادا ہو گیا۔"

مصری نے بھی کہا کہ امیر المؤمنین مجھ پر جس نے ظلم کیا تھا، میں نے اس سے بدلہ لے لیا، اب اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا:" تیری مرضی ورنہ تو ان کو بھی مارنا چاہتا تو میں تجھ کو نہ روکتا۔"

اس کے بعد انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے بیٹے دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"تم نے ان لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔"

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؓ سے، جو مصر میں مقیم تھے،

شراب پینے کی لغزش سرزد ہوگئی۔ ہوش آیا تو بہت پشیمان ہوئے فوراً حضرت عمرو بن العاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے جرم کا اقرار کر کے ان سے درخواست کی کہ مجھ پر حد جاری کیجیے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر ٹال دینا چاہا لیکن وہ اپنے آپ پر حد جاری کرانے پر اصرار کرتے رہے اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ان پر حد جاری نہ کی گئی تو وہ امیر المؤمنین (اپنے والد) سے شکایت کریں گے۔ ان کی بات سن کر مجھے ڈر ہوا کہ اگر واقعی انہوں نے شکایت کی تو مجھ پر امیر المؤمنین کا عتاب نازل ہوگا۔ چنانچہ میں نے ان کو اپنے مکان کے صحن میں بلا کر ان پر حد جاری کر دی اور انہوں نے خود مکان کے ایک گوشہ میں جا کر اپنا سر مونڈ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو کسی ذریعے سے اس واقعہ کی اطلاع مل گئی اس پر انہوں نے مجھے یہ عتاب نامہ بھیجا:

''امیر المؤمنین عبداللہ عمر کی طرف سے عاصی بن عاصی کے نام ــــــ

اے ابن عاص! مجھ کو تمہاری جرأت اور عہد نہ نباہنے پر تعجب ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تم معزول کر دیے جانے کے سزاوار ہو۔ تم نے عبدالرحمٰن پر اپنے مکان کے اندر حد جاری کی اور وہیں اس کا سر مونڈا حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس قسم کی رعایت میرے اصول کے خلاف ہے۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعیت کا ایک فرد تھا اس لیے تم پر لازم تھا کہ تم اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے جس طرح دوسروں کے ساتھ کرتے ہو لیکن تم نے اس بنا پر اس سے رعایت کی کہ وہ امیر المؤمنین کا بیٹا ہے حالاں کہ تم کو علم ہے کہ حق کے معاملہ میں میرے ساتھ یہاں کسی کے ساتھ رورعایت نہیں ہے۔

اب میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ میرا خط ملتے ہی عبدالرحمٰن کو قتب (چھوٹے تکلیف دہ کجاوہ یا کاٹھی) پر بٹھا کر مدینہ روانہ کر دو تا کہ میں اس کو قرار واقعی سزا دوں۔''

میں نے اس عتاب نامہ کے جواب میں ایک خط لکھا جس میں اپنی غلطی کا اقرار کیا اور امیر المؤمنین سے معافی مانگی۔ یہ معذرت نامہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاتھ بھیجا اور انہی کے ساتھ عبدالرحمٰنؓ کو روانہ کر دیا۔

چوں کہ عبدالرحمٰنؓ کو امیر المؤمنین کے حکم کے مطابق صرف کاٹھی پر سوار کر کے بھیجا گیا تھا اس لیے وہ مدینہ پہنچتے پہنچتے بیمار ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سفارش کی کہ امیر المؤمنین ان پر حد جاری ہو چکی ہے اب ان کو مزید سزا نہ دی جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی

سفارش نہ مانی اور تادیب کے طور پر ان کو سزا دی اور کچھ عرصہ کے لیے قید میں بھی رکھا۔ محمد حسین ہیکل نے ''الفاروق عمرؓ'' میں لکھا ہے کہ عبدالرحمٰنؓ اس سزا کی وجہ سے بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ عبدالرحمٰنؓ چھ ماہ قید رہ کر اچھے ہو گئے۔ پھر بیمار پڑے اور وفات پائی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۱۱)

امارتِ مصر کے زمانہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ کا ایک بڑا کارنامہ ''نہر امیر المؤمنین'' کی تعمیر ہے جس کے ذریعے دریائے نیل کو بحیرہ قلزم سے ملا دیا گیا۔ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ۲۱ ہجری میں مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں خشک سالی نے قیامت ڈھا دی۔ نالے ندیاں جن سے مدینہ کے کھیت اور نخلستان سیراب ہوتے تھے، سوکھ گئے۔ تاجروں نے مدینہ آنا بند کر دیا۔ انسان اور مویشی سوکھ کر کانٹا بن گئے۔ بازار میں کھانے پینے کی چیزیں نہ ملتیں اور اگر ملتیں تو گراں قیمت پر۔ ساٹھ ہزار بدو بھوک سے بے تاب ہو کر صحراؤں سے نکل پڑے اور مدینہ کو گھیر لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس قحط پر قابو پانے کے لیے عراق، شام اور مصر کے گورنروں سے مدد طلب کی۔ امیر معاویہؓ والیِ شام نے غلّہ سے لدے ہوئے تین ہزار اونٹ اور اتنے ہی کپڑے بھیجے۔ والیِ کوفہ نے دو ہزار اونٹ بھیجے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن العاصؓ نے اونٹوں کا ایک بہت بڑا قافلہ غلّہ اور کپڑوں سے لدوا کر بھیجا۔ چوں کہ مصر سے خشکی کا راستہ بہت دور تھا اس لیے غلّہ پہنچنے میں دیر ہوئی تو حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ خط لکھا:

> عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے عمرو بن العاص کو سلام علیک میری جان کی قسم عمرو! اگر تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا پیٹ بھرا رہے اور میں اور میرے ساتھی بھوکوں مریں تو تمہیں پروانہ ہو۔ المدد المدد۔''

ایک اور روایت کے مطابق اس خط کے الفاظ یہ تھے:

> ''مدد، مدد، عربوں کی مدد، اونٹوں کا ایک قافلہ جس کا اگلا حصہ میرے پاس ہو اور پچھلا تمہارے پاس، عباؤں میں آٹا بھر کر میرے پاس روانہ کرو۔''
>
> (حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، بہ حوالہ مدونۃ الکبریٰ)

حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس خط کا یہ جواب دیا:

''لبّیک لبّیک یا امیر المؤمنین۔ جلد ہی آپ کے پاس غلّہ سے لدے ہوئے اونٹوں کا اتنا بڑا قافلہ پہنچے گا کہ اس کا اگلا حصہ آپ کے پاس ہوگا اور پچھلا میرے پاس۔ مجھے امید ہے کہ ایسی صورت بھی نکل آئے گی کہ آپ کے پاس سمندر کی راہ سے غلّہ بھیج سکوں گا۔''

حضرت عمر فاروقؓ کو سمندری راستہ کے بارے میں حضرت عمرو بن العاصؓ کا ارادہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی لیکن چند دن کے بعد انہیں حضرت عمرو بن العاصؓ کا خط ملا کہ سمندری راستہ کا کھولنا اتنا دشوار اور مہنگا ہے کہ اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ سخت غضب ناک ہوئے اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ

''نیل سے سمندر تک نہر کھدواؤ چاہے اس پر تمہیں مصر کا سارا خراج صرف کرنا پڑے۔''
(حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط بہ حوالہ ابنِ زولاق)

علّامہ سیوطیؒ نے ''حسن المحاضرۃ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس سلسلہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو مدینہ منورہ طلب کیا۔ جب وہ آئے تو فرمایا ''اگر ایک نہر کھود کر دریائے نیل کو سمندر سے ملا دیا جائے تو مکہ اور مدینہ میں مصر سے غلّہ آنے میں آسانی ہوگی اور عرب میں قحط اور گرانی کا کبھی اندیشہ نہ ہوگا ورنہ خشکی کی راہ سے غلّہ لانا دِقّت سے خالی نہیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر واپس جا کر فوراً کام شروع کر دیا اور فسطاط کے قریب دریائے نیل سے بحیرہ قلزم تک تقریباً ۶۹ میل لمبی نہر چھ ماہ کے اندر تیار کرا دی۔ جہاز اس نہر کے ذریعے دریائے نیل سے چل کر بحرِ قلزم میں آتے تھے اور وہاں جدّہ پہنچ کر لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ نہر ''نہر امیر المؤمنین'' کے نام سے مشہور ہوئی اور مدتوں جاری رہی۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ مصر اور مدینہ میں غلّہ کا بھاؤ ایک ہوگیا اور مصر کی تجارت کو نہایت ترقی ہوئی۔ سالہا سال بعد حکام کی لاپروائی سے یہ نہر بند ہوگئی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''الفاروق'' میں لکھا ہے کہ:

''ایک عجیب بات یہ ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے بحرِ روم و بحرِ قلزم کو براہِ راست ملا دینے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے موقع اور جگہ کی تجویز بھی کر لی تھی اور چاہا تھا کہ

فرما کے پاس سے جہاں سے بحرِ روم و بحرِ قلزم میں صرف ۷۰ میل کا فاصلہ رہ جاتا ہے نہر نکال کر دونوں سمندروں کو ملا دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ کو ان کے ارادے سے اطلاع ہوئی تو ناراضامندی ظاہر کی اور لکھ بھیجا کہ اگر ایسا ہوا تو یونانی جہازوں میں آ کر حاجیوں کو اڑا لے جائیں گے۔ اگر عمرو بن العاصؓ کو اجازت ملی ہوتی تو نہر سویز کی ایجاد کا فخر درحقیقت عرب کے حصے میں آتا۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے امارتِ مصر کے فرائض نہایت عمدگی سے انجام دیے۔ ملک خوش حال تھا اور رعایا بھی ہمیشہ ان سے خوش رہی۔ البتہ حضرت عمر فاروقؓ اس بات کے شاکی تھے کہ مصر کی شادابی، زرخیزی اور وسعت کی نسبت سے خراج کم وصول ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو کئی سخت خط لکھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو ان خطوط کی سخت عبارت ناگوار گزری اور انہوں نے بھی ان کے جواب سخت لہجے میں دیے۔ اپنے جوابی خطوط میں انہوں نے تقلیلِ خراج کے وجوہ تفصیل سے بیان کیے اور امیر المؤمنینؓ سے درخواست کی کہ وہ انہیں امارتِ مصر کی ذمہ داری سے سبک دوش کر دیں لیکن امیر المؤمنینؓ نے ان کی درخواست منظور نہیں کی البتہ اپنے عہد خلافت کے آخر میں انہوں نے مصر کے ایک چھوٹے حصے ''صعید مصر'' پر عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو والی بنا دیا، تاہم مصر کے بڑے حصے کی امارت پر حضرت عمرو بن العاصؓ ہی فائز رہے۔

ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ خط لکھا:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس اونٹ بکریاں گائیں گھوڑے اور غلام ہو گئے ہیں جو گورنری سے پہلے نہ تھے اور نہ تمہیں تنخواہ میں دیے گئے پھر یہ دولت تمہارے پاس کہاں سے آئی۔ میرے پاس تم سے بہتر ایسے دیرینہ مہاجر تھے جن کو میں گورنر مقرر کر سکتا تھا لیکن اگر یہ عہدہ تمہارے فائدہ اور ہمارے نقصان کے لیے ہے تو پھر کیوں تمہیں ان مہاجرین پر ترجیح دی جائے؟ بہت جلد لکھو کہ یہ دولت تمہارے پاس کہاں سے آئی۔''

''حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس خط کا یہ جواب بھیجا:

''امیر المؤمنین آپ نے میرے تموّل کے بارے میں جو لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ یہاں

چیزیں سستی ہیں اور آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں (جن سے مالِ غنیمت برابر حاصل ہوتا رہتا ہے) پس انداز کیے ہوئے روپے سے میں نے یہ سامان جمع کرلیا ہے اگر آپ کی خیانت درست ہوتی تب بھی میں خیانت نہ کرتا کیوں کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ رہا آپ کا یہ کہنا کہ آپ کے پاس مجھ سے بہتر مہاجرین اوّلین تھے تو آپ نے یہ عہدہ ان کو کیوں نہیں دیا، میں نے تو اس کے لیے آپ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا۔''

حضرت عمر فاروقؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ کو یہ فرمان دے کر حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس مصر بھیجا کہ اپنا سارا مال ان کے سامنے رکھ دو یہ اس میں سے آدھا (بہ روایت دیگر جس قدر مناسب سمجھیں گے) بیت المال کے لیے لے لیں گے۔
حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس کارروائی پر ملال تو بہت ہوا لیکن انہوں نے امیر المؤمنین کے فرمان کی تعمیل کی اور اپنا سارا مال حضرت محمد بن مسلمہؓ کے سامنے پیش کردیا۔ انہوں نے اس میں سے آدھا (یا کسی قدر) لے لیا اور باقی واپس کردیا۔

(اصابہ، کنز العمال، حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط بہ حوالہ ابن ابی الحدید)

مصر میں بہت سے صحابۂ کرامؓ نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ ان کا بے حد اعزاز واکرام کرتے تھے اور ان کی سخت باتیں بھی بڑے صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔ اگر کبھی کوئی صحابی کوئی خلاف قانون کام کر بیٹھتے تو وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے امیر المؤمنینؓ سے ضرور اجازت لے لیتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا، آپ کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے آپ کا کام ضرورت کے وقت کفّار سے جہاد کرنا ہے زراعت کرنے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ حضرت شریکؓ نے ممانعت کے باوجود کھیتی باڑی شروع کردی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان کی شکایت امیر المؤمنین کو لکھ بھیجی۔ انہوں نے حضرت شریکؓ کو مدینہ طلب کیا جب وہ آئے تو ان سے کہا:

''میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ مصر کے لوگ عبرت پکڑیں گے۔''

حضرت شریکؓ نے اپنے کام پر ندامت کا اظہار کیا اور معافی مانگی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمروؓ کو لکھا:

"شریک بن سمی میرے پاس آئے اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور معذرت کی۔ میں نے ان کی معذرت قبول کر لی ہے۔"

ایک مرتبہ ایک صحابی حضرت غرفہ بن حارثؓ نے مصر کے ایک ذمی رئیس کو دعوتِ اسلام دی۔ اس نے دعوت قبول کرنے کی بجائے رسولِ اکرم ﷺ کی شان میں توہین آمیز الفاظ کہے۔ حضرت غرفہؓ نے طیش میں آ کر اس کو قتل کر دیا۔ معاملہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے حضرت غرفہؓ سے فرمایا کہ آپ کو قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہم ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ حضرت غرفہؓ نے کہا، یہ درست ہے لیکن کسی ذمی کو یہ حق نہیں کہ وہ اسلام یا ہمارے نبی ﷺ کی توہین کرے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت غرفہؓ نے ان کے خلاف حضرت عمر فاروقؓ کو یہ شکایت بھیجی کہ عمرو بن العاصؓ ہمارے سامنے مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ مجھ سے شکایت کی گئی ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو، ایسا نہ کیا کرو۔ اس طرح بیٹھو جیسے اور لوگ بیٹھتے ہیں۔ (ابن عساکر)

ارباب سیر و تاریخ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی امارت مصر کے زمانہ کے اور بھی بہت سے واقعات بیان کیے ہیں، ان سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنے عمّال پر کس قدر کڑی نظر رکھتے تھے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے ہمیشہ امیر المؤمنینؓ کے احکام کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا اور ان سے انحراف کا کبھی دل میں خیال تک نہ لائے۔ ان کو کسی معاملہ میں کوئی مشکل یا الجھن پیش آئی تو فوراً امیر المؤمنین کو لکھ بھیجتے اور وہاں سے جو حکم آتا اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

(۱۲)

۲۴ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان ذوالنّورینؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے حالات کا جائزہ لے کر حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ مصر کی شادابی اور زرخیزی کی نسبت سے خراج کی رقم کم وصول ہوتی ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے جواب میں لکھا کہ:

''گائے اس سے زیادہ دودھ نہیں دے سکتی۔''

یہ جواب ملنے پر حضرت عثمانؓ نے خراج کی وصولی کے فرائض ان سے لے کر عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو تفویض کر دیے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کو معزول کر کے عبداللہ بن سعدؓ کو سارے مصر کا مستقل والی مقرر کر دیا۔ عبداللہ بن سعدؓ نے خراج کی جو رقم مرکز کو بھیجی وہ اس رقم سے کہیں زیادہ تھی جو حضرت عمرو بن العاصؓ بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ مصر سے مدینہ واپس آئے اور حضرت عثمانؓ سے ملاقات کی تو امیر المؤمنینؓ نے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس موقع پر دونوں بزرگوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی مؤرّخ یعقوبی نے اُس کی تفصیل اس طرح دی ہے:

حضرت عثمانؓ: تم نے عبداللہ بن سعد کو کس حال میں چھوڑا؟

حضرت عمرو بن العاصؓ: جیسا آپ کا منشا تھا۔

حضرت عثمانؓ: وہ کیا؟

حضرت عمرو بن العاصؓ: اپنی ذات کے لیے طاقت ور اور خدا کے لیے کمزور

حضرت عثمانؓ: میں نے تو اس کو تمہارا طرزِ عمل اپنانے کی ہدایت کی تھی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ: آپ نے اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا۔

حضرت عثمانؓ: دیکھو گائے (یا اونٹنی) نے زیادہ دودھ دیا۔ (عبداللہ بن سعد نے زیادہ خراج بھیجا)

حضرت عمرو بن العاصؓ: لیکن بچے بھوکے رہ گئے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی مصر سے واپسی کے بعد اہل اسکندریہ نے قیصرِ روم کی شہ پا کر بغاوت کر دی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ بغاوت فرو کرنے پر مامور فرمایا کیوں کہ وہاں کے حالات کا ان سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔ حضرت عمروؓ بن العاصؓ نے مصر پہنچ کر قیصر کے لشکر کو جو اہل اسکندریہ کی مدد کے لیے آیا تھا، شکست دی لیکن اس کا ایک حصہ اسکندریہ پر قابض ہو گیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اسکندریہ میں داخل ہو کر اس کو نکال باہر کیا۔ چوں کہ مقوقس اور اس کی قوم (قبطی) نے رومیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا اس لیے رومیوں نے پسپا ہوتے ہوئے ان کی آبادیوں کو لوٹ لیا۔ جب باغی مصریوں اور حملہ آور رومیوں کا قلع قمع ہو گیا تو قبطیوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس فریاد کی کہ بغاوت میں شریک نہ ہونے کی بنا پر رومیوں اور

ان کے حامیوں نے ہمارا مال واسباب لوٹ لیا یہ ہمیں واپس دلایا جائے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے شناخت کرا کے جن جن لوگوں کا مال تھا واپس کرا دیا۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ آئندہ بغاوت کے خطرہ سے بچنے کے لیے حضرت عمرو بن العاصؓ نے اسکندریہ کی فصیل منہدم کرا دی۔ بغاوت فرو ہو جانے کے بعد امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ نے ان کو مصر کا امیر جنگ (یا امیر عسکر) مقرر کرنا چاہا لیکن انہوں نے یہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت کر دی۔

طبری اور کچھ دوسرے مؤرّخین کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی معزولی کا واقعہ اسکندریہ کی بغاوت فرو ہو جانے کے بعد ۲۶ھ میں پیش آیا۔ لیکن امام سیوطی الکندیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ اسکندریہ کی بغاوت سے پہلے ۲۵ھ میں معزول ہو چکے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے انہیں بغاوت فرو کرنے کے لیے بطور خاص دوبارہ مدینہ سے مصر بھیجا۔ بغاوت کے خاتمہ کے بعد جب انہیں امارت جنگ کا عہدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

''مجھ کو یہ پسند نہیں ہے کہ گائے کے سینگ میں پکڑوں اور دودھ کوئی دوسرا دوہے۔''

یعنی عبداللہ بن سعد تو مصر کے والی ہوں اور میں دشمن کا مقابلہ کروں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کو اپنی معزولی ناگوار تو گزری لیکن انہوں نے اس کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور ہمیشہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی خیر خواہی کا دم بھرتے رہے۔ امیر المؤمنینؓ کے خلاف شورش کا آغاز ہوا اور مصر سے باغیوں کا گروہ چلا تو حضرت عثمانؓ کی خواہش پر حضرت عمرو بن العاصؓ ان کے پاس تشریف لے گئے اور سمجھا بجھا کر واپس کیا۔ پھر شہر کے لوگوں کو جمع کر کے امیر المؤمنینؓ کی طرف سے صفائی پیش کی۔

سیدنا حضرت عثمانؓ کے خلاف سازشیں زور پکڑ گئیں تو انہوں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو بھی شریک کیا۔ جب دوسرے لوگ رائے دے چکے تو امیر المؤمنینؓ نے حضرت عمروؓ سے بطور خاص ان کی رائے پوچھی انہوں نے عرض کیا:

''امیر المؤمنین ان سازشوں اور فتنہ وفساد کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ نرمی کرتے ہیں اور سختی کے موقعوں پر چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ملکی معاملات میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی پیروی کیجیے اور سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی سے کام لیجیے۔''

معزولی کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ عام طور پر فلسطین میں رہتے تھے لیکن گاہے گاہے مدینہ آتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کیا وہ مدینہ میں موجود تھے لیکن حالات کے سامنے بے بس تھے اور امیر المومنینؓ کی کوئی مؤثر مدد نہ کر سکتے تھے۔ اپنی بے بسی کا اس شدت سے احساس تھا کہ یہ کہہ کر مدینہ سے شام چلے گئے کہ:

''جو شخص عثمانؓ کے قتل میں حصہ لے گا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔ اور جو شخص ان کی مدد کرنے سے قاصر ہو اس کو مدینہ چھوڑ دینا چاہیے۔''

شام جانے کے بعد بھی ان کو حضرت عثمانؓ کی سلامتی کا اس قدر خیال تھا کہ ہر آنے جانے والے سے ان کا حال پوچھتے تھے۔ ان کی شہادت کی خبر سنی تو سخت دُکھ کا اظہار کیا۔

(۱۳)

حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں جو عزلت گزینی اختیار کی تھی وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے مسند نشین خلافت ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک جاری رکھی اور جنگ جمل میں مطلق کوئی حصہ نہیں لیا۔

حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلاف نے شدت اختیار کی تو امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو بلا بھیجا اور ان کے تعاون کے خواست گار ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنا دست تعاون ان کی طرف بڑھا دیا۔ یوں امیر معاویہؓ کو ایک عظیم سپہ سالار اور مدبر کی حمایت حاصل ہوگئی۔ وہ خود بھی بہت بڑے مدبر تھے لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ کے مشوروں سے ان کو اپنی مشکلات پر قابو پانے میں بڑی مدد ملی۔ جنگ صفین کا سلسلہ شروع ہوا تو امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ اثنائے جنگ میں حضرت عمار بن یاسرؓ جو حضرت علیؓ کے پرجوش حامی تھے، شہید ہوئے تو دو شخص جھگڑتے ہوئے امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ اس نے عمار بن یاسرؓ کو شہید کیا ہے اس لیے وہی انعام کا حق دار ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ حضرت عمارؓ کی شہادت کی خبر سن کر سخت دل گرفتہ ہوئے اور فرمایا:

’’خدا کی قسم یہ دونوں جہنم کے لیے جھگڑ رہے ہیں۔‘‘

امیر معاویہؓ کو ان کی بات ناگوار گزری اور انہوں نے فرمایا:

’’عمرو! تم ان لوگوں کے لیے ایسا کہتے ہو جو ہماری خاطر اپنی جانیں لڑا رہے ہیں۔‘‘

حضرت عمرو بن العاصؓ نے ایک آہ بھری اور کہا ’’کاش آج سے بیس برس پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔‘‘

امیر معاویہؓ نے فرمایا ’’عمار کے قتل کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ان کو میدانِ کارزار میں لائے۔‘‘ اس طرح بات رفت گزشت ہوگئی۔

۱۰؍صفر ۳۷ھ کو دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ طبریؒ، ابن سعدؒ، ابن اثیرؒ، ابن کثیرؒ اور ابن خلدون کا بیان ہے کہ شامی فوج کی حالت نازک ہوگئی تو اس نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے مشورہ کے مطابق اپنے نیزوں پر قرآن اٹھا کر یہ نعرہ لگایا:

’’هٰذا حَکَمٌ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ‘‘

(یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم ہے)

اس پر حضرت علیؓ کے لشکر نے جنگ سے ہاتھ روک لیا اور فریقین کے مابین تحکیم (ثالثی) پر اتفاق ہوگیا۔ امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ حَکَم مقرر ہوئے اور حضرت علیؓ کی جانب سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ۔

یہ دونوں بزرگ دومۃ الجندل میں ایک دوسرے سے ملے اور تخلیہ میں اس معاملہ پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ یہ گفتگو کیا تھی اور دونوں میں کیا طے پایا اس کو خدائے علیم وخبیر ہی جانتا ہے لیکن بہت سے اربابِ سیر نے اس گفتگو کو مکالمے کی صورت میں اس طرح قلم بند کیا ہے گویا یہ ان کے سامنے ہوئی ہو۔ حالاں کہ سبھی نے صراحت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ گفتگو خلوت میں ہوئی جب کہ کوئی تیسرا شخص ان کے پاس موجود نہیں تھا۔

بہر حال جب دونوں بزرگ تخلیہ سے باہر آئے تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کے سامنے یہ فیصلہ سنایا:

’’میں اور میرے دوست (عمرو بن العاصؓ) غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علیؓ

اور معاویہؓ دونوں خلافت سے الگ ہو جائیں اور لوگ باہمی مشورے سے جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں۔ لہٰذا میں علیؓ اور معاویہؓ کو معزول کرتا ہوں۔ اب آپ لوگوں کو اختیار ہے جسے اہل سمجھیں اپنا خلیفہ بنائیں۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے اور یہ فیصلہ سنایا:

''ابوموسیٰ نے جو کچھ کہا آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی (حضرت علیؓ) کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی ان کو معزول کرتا ہوں لیکن اپنے آدمی (حضرت معاویہؓ) کو قائم رکھتا ہوں کیوں کہ وہ عثمان بن عفانؓ کے ولی، ان کے خون کے دعویدار اور ان کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔''

گویا دونوں ثالثوں کا فیصلہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ اس طرح تحکیم کا سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ جنگ ملتوی ہو گئی۔

حافظ ابن کثیرؒ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے فیصلہ کی یہ توجیہ کی ہے:

''حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس حالت میں لوگوں کو بلا امام چھوڑنا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ اس وقت لوگوں میں جو اختلاف برپا تھا اس کو دیکھتے ہوئے انہیں اندیشہ تھا کہ اُمت کو بلا امام چھوڑ دینا نہ ختم ہونے والے فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اس لیے انہوں نے بربنائے مصلحت امیر معاویہؓ کو برقرار رکھا اور اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔''

۳۸ ہجری میں امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو چھ ہزار فوج دے کر مصر کی تسخیر کے لیے روانہ کیا جہاں اس وقت حضرت علیؓ کی طرف سے محمد بن ابی بکرؓ گورنر تھے۔ عازمِ مصر ہونے سے پہلے حضرت عمرو بن العاصؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کو خط لکھا کہ ''اہل مصر تمہارے مخالف ہیں اس لیے تم میرے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم خود بخود ہی مصر چھوڑ دو۔ میں تمہارے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے جو کچھ اس خط میں لکھا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا کیوں کہ محمد بن ابی بکرؓ کے خلاف مصر میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور حکومت کے مخالفین کی ایک مضبوط جماعت وہاں موجود تھی۔ جس میں مسلمہ بن مخلدؓ اور معاویہ بن خدیج جیسے نامور لوگ شامل تھے۔

لیکن محمد بن ابی بکرؓ نے اس خط کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور اسے حضرت علیؓ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں سے مقابلہ کا حکم آیا۔ چنانچہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ مصر پہنچے تو محمد بن ابی بکرؓ کو مقابلہ کے لیے تیار پایا۔ فریقین میں خون ریز لڑائی ہوئی۔ مصر کے مشہور بہادر کنانہ بن بشر نے حضرت عمروؓ کے لشکر کے خلاف حیرت انگیز شجاعت اور پامردی دکھائی۔ جدھر کا رُخ کرتے صفیں درہم برہم کر دیتے۔ بالآخر معاویہ بن خدیج ان کے مقابل ہوئے۔ بہت سے شامیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور کنانہ کو گھیر کر قتل کر ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی محمد بن ابی بکرؓ کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ محمد روپوش ہو گئے لیکن شامیوں اور ان کے مصری حامیوں نے انھیں ڈھونڈ نکالا اور نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ اس طرح مصر پر حضرت عمرو بن العاص کا قبضہ ہو گیا۔ امیر معاویہؓ نے انہیں چند شرائط پر مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ ان میں ایک شرط یہ تھی کہ وہ ہمیشہ امیر معاویہ کے وفادار رہیں گے۔

اُدھر نہروان میں حضرت علیؓ نے خارجیوں کو شکست دی تو انہوں نے طے کیا کہ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ تینوں کو شہید کر دیا جائے تا کہ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔ چنانچہ طے شدہ منصوبہ کے مطابق ابن ملجم نے حضرت علیؓ پر حملہ کیا اور وہ شہید ہو گئے۔ برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ پر حملہ کیا لیکن وار اوچھا پڑا اور وہ بچ گئے۔ عمرو بن بکر تمیمی حضرت عمرو بن العاص کو قتل کرنے گیا لیکن اتفاق سے ان کی طبیعت اس دن ناساز تھی اس لیے انہوں نے اپنی جگہ خارجہ بن حذافہؓ کو نماز پڑھانے کے لیے بھیج دیا۔ عمرو بن بکر نے حضرت عمرو بن العاص کے دھوکے میں خارجہؓ کو قتل کر دیا۔

(۱۴)

امیر معاویہؓ کی طرف سے مصر کا گورنر مقرر ہوتے وقت حضرت عمرو بن العاصؓ کی عمر اسّی برس سے اوپر تھی لیکن وہ کئی سال تک اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ باختلاف روایت ۴۳ھ یا ۴۷ھ میں شدید بیمار ہوئے یہاں تک کہ جاں بری کی امید نہ رہی۔ صحیح مسلم میں عبدالرحمٰن بن شماسہ مہریؒ سے روایت ہے کہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے مرض الموت میں ان کی عیادت کے لیے گیا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے رونے لگے۔ ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے کہا، ابا جان آپ روتے کیوں ہیں، کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ

نے فلاں فلاں بشارتیں نہیں دی ہیں؟ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا:

''میرے پاس سب سے قیمتی متاع لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ہے۔ مجھ پر زندگی کے تین دور گزرے۔ ایک وہ دور تھا کہ میں رسول اللہ ﷺ سے سخت عناد رکھتا تھا اور میری دلی تمنا تھی کہ آپؐ میرے ہاتھ آ جائیں تو قتل کر دوں۔ اگر اس حالت میں مجھے موت آ جاتی تو یقیناً جہنم میں جاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو اسلام کی طرف پھیر دیا۔ میں اسلام قبول کرنے کی غرض سے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ اپنا دست مبارک پھیلایئے کہ میں بیعت کروں۔ آپؐ نے ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ آپؐ نے فرمایا، عمرو بن العاصؓ یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نے عرض کی، ایک شرط پر اسلام لاتا ہوں، آپؐ نے پوچھا، وہ شرط کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، میری مغفرت ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا، اے عمرو! کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے، ہجرت بھی اپنے سے پہلے کے گناہوں کو کالعدم کر دیتی ہے۔ اس طرح حج بھی اپنے سے پہلے کے گناہوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد میری یہ حالت ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ میرے لیے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر محبوب ہو گئے اور ان سے زیادہ میری نگاہ میں کوئی بزرگ نہ رہا۔ آپؐ کی انتہائی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے میں آپؐ کو نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھ سے آپؐ کا حلیہ پوچھے تو میں نہیں بتا سکتا کیوں کہ میں نے کبھی آپؐ کو نظر بھر کے دیکھا ہی نہیں۔ اگر اس حالت میں مر جاتا تو جنت کی امید تھی۔ پھر زندگی کا تیسرا دور آیا جس میں میں نے مختلف قسم کے اعمال کیے۔ اب میں نہیں جانتا کہ میرا کیا حشر ہوگا۔ جب میں مر جاؤں تو نوحہ کرنے والی عورتیں میرے جنازے کے ساتھ نہ جائیں، نہ جنازے کے پیچھے آگ جائے۔ دفن کرتے وقت مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا۔ تدفین کے بعد اتنی دیر تک قبر کے پاس رہنا جب تک جانور ذبح ہو کر اس کا گوشت تقسیم ہو جائے تا کہ میں تمہاری وجہ سے مانوس ہو جاؤں اور یہ غور کر لوں کہ اپنے خالق کے قاصدوں کو کیا جواب دوں۔''

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ موت سے پہلے اپنے محافظ دستے کو بلا بھیجا اور پوچھا میں تمہارا کیسا ساتھی تھا؟ جواب ملا، آپ ہم پر بہت شفیق تھے، ہمارا احترام کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتے تھے اور ہم کو دل کھول کر انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے۔

فرمایا، میں یہ سب سلوک اس لیے کرتا تھا کہ تم مجھ کو موت سے بچاؤ گے۔ اب موت میرے سامنے کھڑی ہے اسے یہاں سے دور کردو۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولے، اے ابا عبداللہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھلا موت پر بھی کسی کا زور چل سکتا ہے؟ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا، میں جانتا ہوں کہ موت کے مقابلے میں تم میری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ کاش میں نے اپنی حفاظت کے لیے تمہیں نہ رکھا ہوتا۔ افسوس علی ابن ابی طالبؓ سچ کہتے تھے کہ انسان کی موت خود اس کی محافظ ہے۔ پھر خشوع طاری ہوا اور زبان پر یہ الفاظ آ گئے، الٰہی میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کروں، قوی نہیں ہوں کہ غالب آ جاؤں، اگر تو نے اپنی رحمت سے نہ نوازا تو میرے لیے ہلاکت ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ زندگی میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ بعض لوگ موت کے وقت پورے ہوش و ہواس میں ہوتے ہیں لیکن وہ موت کی حقیقت نہیں بیان کر سکتے۔ نزع کے وقت ان کے فرزند نے کہا، ابّا جان آپ کے ہوش وحواس پوری طرح قائم ہیں ذرا موت کی کیفیت تو بیان کیجیے۔ فرمایا، بیٹا اس کی کیفیت حد بیان سے باہر ہے بس مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جبل رضوی میری گردن پر ٹوٹا پڑتا ہے۔ میری آنتوں کو کھجور کے کانٹوں پر گھسیٹا جا رہا ہے اور میری جان سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہے۔ (طبقات ابن سعد)

اس کے بعد اپنے صاحب زادے کو وصیت کی کہ جب میرا دم نکل جائے تو پہلے معمولی پانی سے غسل دینا اور جسم کو کپڑے سے خشک کرنا، پھر تازہ اور صاف پانی سے نہلانا اور تیسری مرتبہ ایسے پانی سے جس میں کافور کی آمیزش ہو پھر کپڑے سے خشک کرنا، کفناتے وقت ازار کس کے باندھنا، جنازہ کو نہ تیز تیز لے جانا اور نہ آہستہ آہستہ۔ لوگوں کو جنازہ کے پیچھے پیچھے رکھنا اس کے آگے فرشتے چلتے ہیں اور پیچھے انسان۔ قبر میں رکھنے کے بعد مٹی آہستہ آہستہ دینا۔ پھر دعا میں مصروف ہو گئے کہ الٰہ العالمین تو نے حکم دیا، میں نے عدول حکمی کی، تو نے ممانعت کی میں نے نافرمانی کی میں بری نہیں کہ معذرت کروں۔ طاقت ور نہیں کہ غالب آ جاؤں ہاں لا الٰہ الاّ اللہ لا الٰہ الاّ اللہ یہی کہتے کہتے آخری ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ یکم شوال ۴۳ھ کو عید الفطر کی نماز کے بعد ان کے صاحب زادے نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسلام کے اس رجل عظیم کو جبل مقطم کے دامن میں سپرد خاک کر دیا۔

وفات کے وقت حضرت عمرو بن العاصؓ کی عمر نوے برس کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے، عبداللہؓ اور محمدؒ۔ حضرت عبداللہؓ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے والد گرامی سے بہت پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے تھے اور نہایت عابد و زاہد تھے۔

(۱۵)

حضرت عمرو بن العاصؓ کی عمر کا زیادہ حصہ میدانِ جنگ میں گزرا، عہد رسالت کے غزوات میں شریک رہے، عمان کی امارت کے فرائض انجام دیے۔ پھر فتنۂ ارتداد کے استیصال میں بھرپور حصہ لیا۔ فلسطین اور شام کی لڑائیوں میں سرفروشانہ شریک ہوئے۔ مصر اور طرابلس فتح کیے۔ ان جنگوں سے وقت بچا تو مصر کی گورنری کے فرائض ادا کرتے رہے۔ ان مصروفیات کے باوجود انہوں نے دینی علوم سے بھی حصہ وافر پایا۔ نبوت کے سرچشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہونے کا جتنا موقع بھی ملا اس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ فطرتاً نہایت ذہین اور ذکی واقع ہوئے تھے اس لیے علم و فضل کے اعتبار سے خاص مقام حاصل کر لیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ ان کو قرأۃِ قرآن سے خاص ذوق تھا اور قرآن پاک بہت صاف اور واضح پڑھتے تھے۔ حضورؐ کے ارشادات بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتے تھے۔ ان سے ۳۹ا احادیث مروی ہیں۔ ان میں تین متفق علیہ ہیں۔ ایک میں بخاری اور تین میں مسلم منفرد ہیں۔ ان کے رواۃِ حدیث، تلامذہ اور مستفیدین میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ (صاحب زادے) ابوقیس (غلام) عروہ بن زبیرؒ، ابوعثمان نہدیؒ، عبدالرحمٰن بن شماسہ مہریؒ، عمارہ بن خزیمہؒ، محمد بن کعبؒ، علی بن رباحؒ اور قیس بن ابی حازمؒ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ، نے سرورِ عالم ﷺ سے جو کچھ سنا تھا اور جو کچھ آپؐ کو کرتے دیکھا تھا اس کو لوگوں تک بھی پہنچاتے رہتے تھے۔ ان کو اسوۂ حسنہ پر چلنے اور بدعات و اوہام سے مجتنب رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

سریۂ ذات السلاسل میں کامیابی کے بعد کچھ عرصہ وہاں مقیم رہ کر نومسلموں کو تعلیم دیتے رہے۔ عمان میں دو برس تک یہی سلسلہ جاری رکھا۔ لوگوں میں دنیا طلبی کا رجحان بڑھتے

دیکھا تو بہت رنج ہوا، لوگوں کے سامنے اکثر خطبہ دیتے اور ان کو اِتباع سنت کی ہدایت کرتے، علی بن رباح لخمی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ان کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنا:

''لوگو! یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے کہ دنیا میں پھنس کر آخرت سے غافل ہوتے جا رہے ہو۔ رسول اللہ ﷺ جن امور سے اجتناب فرماتے تھے تم لوگ ان کی طرف راغب ہو رہے ہو۔ حالاں کہ تمہیں علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیا طلبی سے کتنے کنارہ کش رہتے تھے۔''

امام جلال الدین سیوطیؒ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں لکھا ہے کہ عہد فاروقی میں حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے گورنر مقرر ہوئے تو ایک دن بہت سے مصری ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہماری زراعت کا انحصار دریائے نیل کے پانی پر ہے۔ جب دریائے نیل خشک ہو جاتا ہے تو جب تک ہم ایک رسم جو قدیم زمانے سے چلی آتی ہے، ادا نہ کریں اس میں پانی نہیں چڑھتا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے پوچھا، وہ کیا رسم ہے؟

انہوں نے جواب دیا: ''ہم چاند کی گیارہ تاریخ (بہ روایتِ دیگر ہر سال جون کی بارہ تاریخ) کو ایک کنواری لڑکی کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کے والدین کی مرضی سے اس کو بیش قیمت زیورات اور کپڑے پہناتے ہیں۔ پھر اس کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح دریا میں پانی چڑھ جاتا ہے۔ آج کل بھی دریا میں پانی بہت کم ہو گیا ہے اس لیے آپ ہمیں اپنی یہ قدیم رسم ادا کرنے کی اجازت دیں۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا: ''جو کچھ تم نے کہا، یہ محض توہم پرستی ہے اسلام ایسے اوہام اور لغویات کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ میں تم کو کسی بے گناہ لڑکی پر ایسا ظلم کرنے کی اجازت ہرگز نہ دوں گا۔''

مصری مایوس ہو کر چلے گئے۔ اتفاق سے دریائے نیل میں پانی بالکل کم ہو گیا اور بہت سے لوگ قحط کے ڈر سے وطن چھوڑنے کی تیاری کرنے لگے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس صورتِ حال کی اطلاع امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو دی تو انہوں نے لکھا:

''الحمدللہ! تم نے مصریوں کو ٹھیک جواب دیا ہے۔ فی الحقیقت اسلام ایسی رسوم باطلہ کو

مٹانے آیا ہے۔ میں اس خط کے ساتھ ایک رقعہ بھیج رہا ہوں اس کو دریائے نیل میں ڈال دو۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ خط ملا تو انہوں نے رقعہ کو دریائے نیل میں ڈالنے سے پہلے اس کی عبارت پڑھی جو یوں تھی:

"اللہ کے بندے عمر امیر المؤمنین کی طرف سے۔ دریائے نیل کو معلوم ہو کہ اگر تو اپنے اختیار سے بہہ رہا ہے تو رک جا اور اگر تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بہہ رہا ہے تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے پہلے کی طرح (بہ فراوانی) رواں کر دے۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے ساتھی یہ رقعہ دریا میں ڈال کر واپس آ گئے۔ اگلی صبح کو جب اہل مصر نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے قدرتِ الٰہی کا عجیب کرشمہ دیکھا کہ دریائے نیل میں پانی سولہ ہاتھ اٹھ گیا تھا اور زمین سیراب ہو رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سے مصری حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور یہ ظالمانہ رسم ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کو اللہ تعالیٰ نے ملکۂ اجتہاد سے بھی بہرہ ور کیا تھا۔ سریۂ ذات السلاسل میں ایک رات غسل کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس وقت شدید سردی پڑ رہی تھی سرد پانی سے نہانے میں بیمار ہو جانے کا ڈر تھا اور نہ نہانے میں نماز قضا ہوتی تھی۔ حضرت عمروؓ عجیب کشمکش میں پڑ گئے۔ آخر عقل و اجتہاد سے کام لیا اور غسل کی حالت کو وضو پر قیاس کیا، اجتہاد سے کام لے کر تیمّم کر لیا اور نماز پڑھ لی۔ واپس مدینہ منورہ گئے اور حضورؐ سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا، عمرو بن العاص! تم نے جنابت کی حالت میں نماز پڑھ لی؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ رات کو سخت سردی تھی مجھ کو اندیشہ ہوا کہ اگر اس حالت میں غسل کیا تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ اگر نہیں کرتا تو نماز جاتی ہے۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ مجھ کو قرآن کی یہ آیت یاد آ گئی۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○ (النسآء:۲۹)

چنانچہ میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی۔ سرورِ عالم ﷺ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

(مسند احمد)

طاعونِ عمواس کے زمانہ میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مثلاً حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاحؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ وبا کی جگہ سے باہر نکلنے کو تقدیرِ الٰہی کے خلاف سمجھتے تھے لیکن عمرو بن العاصؓ

کہتے تھے کہ جس خطرے سے انسان اپنی سعی سے بچ سکتا ہے اس سے بچنے کی سعی نہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی وفات کے بعد انہوں نے امارت سنبھالتے ہی فوجوں کو وبا کے مقام سے ہٹا کر پہاڑوں پر پھیلا دیا۔ اس طرح وہ وبا میں مبتلا ہونے سے بچ گئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی حضرت عمرو بن العاصؓ کے اس عمل کو سراہا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ ادب و انشاء اور خطابت میں بھی بڑی دسترس رکھتے تھے۔ فصاحت و بلاغت، اختصار، جامعیت اور نادر تشبیہات ان کی تحریروں اور خطبوں کی خصوصیات تھیں۔ کتب سیر میں ان کے ذوق ادب اور زبان آوری کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں خط لکھا:

''اے عمرو میں تجھ سے جو چیز چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی تو مجھ کو مصر کی ایسی درست کیفیت لکھ بھیج جس سے مجھے معلوم ہو کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اس ملک کو دیکھ لیا ہے۔''

حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس کے جواب میں لکھا:

''اے امیر المؤمنین مصر کو یوں سمجھیے کہ ایک خشک ریگستان اور ایک بہت شاداب خطّہ دو ایسے پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہیں، جن میں ایک توریت کے ٹیلے کی شکل کا ہے اور دوسرا ایک دُبلے گھوڑے کے پیٹ یا اونٹ کی پیٹھ کی صورت۔ یہ ہے مصر کی ظاہری صورت۔ اس ملک کی ساری پیداوار اور اس کی ساری دولت اسوان سے لے کر حدودِ غزہ تک ایک دریا کی بدولت ہے جو نہایت شان وشوکت کے ساتھ اس میں سے گزر رہا ہے۔ اس دریا کے مدوجزر کا زمانہ ویسا ہی مقرر ہے جیسا آفتاب و ماہتاب کا دور۔

ایک وقت مقررہ پر تمام عالم کے چشمے اس دریاؤں کے بادشاہ کو خراج دیتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اس وقت دریا کا پانی بڑھنے لگتا ہے اور دونوں کناروں پر پھیل جاتا ہے اور شاداب کرنے والی چکنی مٹی زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔

اس وقت مختلف قریوں میں بجز چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے اور کوئی ذریعہ آمد و رفت کا نہیں رہتا۔ اور یہ کشتیاں اس کثرت سے ہوتی ہیں جیسے کھجور کے پتے۔

اس کے بعد جب وہ وقت آ جاتا ہے کہ زمین کو شاداب کرنے کے لیے پانی کی ضرورت نہیں رہتی تو پھر یہ نیک بخت دریا اپنی حدود کے اندر عود کرتا ہے جو قدرت نے اس کے لیے ٹھہرائی ہیں تاکہ وہ ذخیرے جو اس نے زمین کے اندر پوشیدہ کیے ہیں ہاتھ آ سکیں۔ ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے اور شہد کی مکھیوں کی طرح دوسروں کے لیے مشقت کرتی ہے اور اپنی محنت اور اپنے گاڑھے پسینے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی۔ اس زمین پر ہلکا سا ہل چلا کر اس میں بیج بو دیتی ہے اور اُس قادرِ مطلق سے سرسبزی کی امیدوار ہوتی ہے جو غلّہ کو نمو بخشتا اور پکاتا ہے۔ بیج جمتا ہے درخت بڑھتا ہے اور شبنم کی مدد سے جو مینہ کا کام دیتی ہے اور دریا کے لائے ہوئے کھاد کی پرورش کرتی ہے۔ خوشہ پیدا ہوتا ہے اور پختگی کو پہنچتا ہے۔

عمدہ سے عمدہ فصل کے بعد دفعتاً خشک سالی ہو جاتی ہے اور امیر المؤمنین یہ مصر کی زمین کبھی تو خشک اور اوسر ریگستان اور سفید میدان ہے اور کبھی دلدل۔ جس پر سیاہ اور گہری کیچڑ جمی ہوئی ہے اور کبھی سبزہ زار جس میں انواع واقسام کے پھول تلے اوپر کیاریوں میں نظر آ رہے ہیں اور کبھی ایک عظیم الشان کشت زار جس میں غلّہ پختگی کے قریب آ چلا ہے، حمد و ثنا ہمیشہ اس خالق مطلق کو جس نے یہ عجائبات پیدا کیے۔

مصر کی سرسبزی اور اس کے باشندوں کی خوش وقتی زیادہ تر تین چیزوں پر موقوف ہے۔ اوّلاً کوئی ایسی تجویز کی جائے جس سے لگان میں اضافہ ہو۔ ثانیاً مال گزاری کا ایک ثلث نہروں اور پلوں کی نگہ داشت اور نئی تعمیر میں صرف کیا جائے۔ ثالثاً لگان ہمیشہ زمین کی پیداوار کی حیثیت پر قائم کیا جائے۔ والسلام۔''

امیر معاویہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے قبرص (Cyprus) پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی تو امیر المؤمنینؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو خط لکھ کر سمندر کے حالات دریافت کیے۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

''میں نے ایک بڑی مخلوق دیکھی جس پر چھوٹی مخلوق اس طرح سوار ہوتی ہے جیسے لکڑی پر کیڑا۔ اگر لکڑی ذرا بھی پلٹا کھائے تو کیڑا ڈوب جائے۔ اور اگر صحیح سلامت باہر آ جائے تو دہشت زدہ ہو کر رہ جائے۔''

(۱۶)

حضرت عمرو بن العاصؓ کے صحیفۂ حیات میں حُبِّ رسولؐ، شجاعت، شوق جہاد، انفاق فی سبیل اللہ، شرافت، نرم دلی اور تدبیر وسیاست سب سے نمایاں ابواب ہیں۔

حُبِّ رسولؐ کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں ایک افواہ پر شدید اضطراب اور ہیجان پیدا ہوگیا۔ سرورِ عالم ﷺ اس وقت چند صحابہ کے ہمراہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے چوں کہ حقیقت حال کا کسی کو علم نہیں تھا اس لیے عام بھاگڑ مچ گئی۔ اس نازک وقت میں صرف سالمؓ مولیٰ ابو حذیفہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ شمشیر بہ دست مسجد میں کھڑے رہے تاکہ حضور رسالت مآب ﷺ پر کوئی آنچ نہ آنے دیں اور ضرورت پڑے تو آپؐ پر اپنی جانیں قربان کردیں۔ صورت حال ذرا پُرسکون ہوئی تو حضورؐ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا جس میں فرمایا، تم لوگ اللہ اور رسول کی پناہ میں کیوں نہ آئے اور عمرو بن العاص اور سالم کو کیوں نہ نمونہ بنایا۔ سراسیمگی میں تمہیں مستعد ہوکر اللہ کے رسول کے پاس جمع ہوجانا چاہیے تھا اور متحد ہوکر خطرے کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ خود کہا کرتے تھے کہ قبولِ اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر مجھ کو دنیا میں کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ حضورؐ بھی ان کی بڑی قدر فرماتے تھے اور ان پر بہت شفیق تھے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے کہا، کیا وہ شخص نیک سیرت نہیں ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے آخر دم تک محبوب رکھا ہو۔

انہوں نے فرمایا، ایسے شخص کی سعادت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

اس شخص نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک آپ سے محبت کرتے رہے۔''

سرورِ عالم ﷺ نے متعدد موقعوں پر حضرت عمرو بن العاصؓ کی کھلے لفظوں میں تعریف فرمائی۔ ایک مرتبہ ان کے ایمان کی تعریف میں فرمایا، ہشامؓ اور عمروؓ سچے مومن ہیں۔ (مسند احمد)

ایک موقع پر ارشاد ہوا، عمرو بن العاص قریش کے صالح لوگوں میں سے ہیں۔ (الاصابہ)

ایک اور موقع پر فرمایا، ''عبداللہ اور ابو عبداللہ (عمرو بن العاصؓ) کیا اچھے گھرانے کے لوگ ہیں۔ (کنز العمال)

حضوؐر نے کئی مہموں میں ان کو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ پر افسر بنا کر بھیجا۔ نہایت شجاع اور دلیر تھے۔ لڑائی میں اس وجہ سے پیچھے نہیں بیٹھتے تھے کہ فوج کے امیر ہیں بلکہ صف اوّل میں ہو کر دادِ شجاعت دیتے تھے۔

جہادِ فی سبیل اللہ کا اس قدر شوق تھا کہ عہد رسالت میں بھی اور عہد رسالت کے بعد بھی دشمنانِ اسلام کے خلاف بے شمار لڑائیوں میں سربکف ہو کر لڑے۔ شہادت کی آرزو ہر وقت دل میں مچلتی رہتی تھی اس لیے ہر جنگ میں درّانہ دشمن کی صفوں میں گھس جاتے تھے اور نہایت بے جگری سے لڑتے تھے۔ جنگ اجنادین میں وہ اور ان کے بھائی ہشامؓ ساری رات شہادت کی دعا مانگتے رہے۔ دوسرے دن لڑائی میں حضرت ہشامؓ شہید ہو گئے لیکن وہ بچ گئے۔ شہادت سے محروم رہنے پر ہمیشہ حسرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ ہشام مجھ سے افضل تھا اسی لیے شرفِ شہادت کے لیے اس کی دعا قبول ہو گئی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ تموّل اور ثروت کے لحاظ سے عرب کے سر برآوردہ لوگوں میں سے تھے لیکن جس قدر وہ امیر اور صاحب جائداد تھے اسی قدر دریا دل بھی تھے۔ اپنا مال بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے۔

''سب سے بڑا سخی وہ ہے جو دنیا کو دین کی بہتری میں صرف کرے۔''

خود سرورِ عالم ﷺ نے ایک مرتبہ ان کے جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ کی بدیں الفاظ تین مرتبہ تعریف فرمائی:

الٰہی! عمرو بن العاص کی مغفرت فرما کہ میں نے جب بھی ان کو صدقہ کے لیے بلایا وہ فوراً صدقہ لائے۔'' (کنز العمال)

امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں حضرت علقمہ بن رمثہ بلویؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو کسی مہم پر بحرین بھیجا اور خود ایک دوسری مہم پر تشریف لے گئے۔ ہم لوگ بھی حضوؐر کے ہم رکاب تھے۔ اثنائے راہ میں آپ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ بیدار ہوئے تو فرمایا:

''اللہ، عمرو پر رحم کرے۔''

یہ سن کر ہم میں سے ہر شخص ''عمرو'' نام کے اشخاص کا ذکر کرنے لگا۔ دوبارہ پھر آنکھ لگ

گئی بیدار ہوئے تو پہلے الفاظ کا اعادہ فرمایا۔ تیسری مرتبہ پھر یہی صورت پیش آئی تو ہم میں تابِ ضبط نہ رہی اور ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ کا اشارہ کس عمرو کی طرف ہے۔ ارشاد ہوا، عمرو بن العاص کی طرف۔ ہم نے اس عنایت کا سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا، مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں لوگوں سے صدقہ منگواتا تھا تو وہ کثیر صدقہ لاتے تھے، میں پوچھتا، کہاں سے لائے تو کہتے اللہ نے دیا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ طبعاً فیاض اور سخی تھے۔ غریبوں اور حاجت مندوں کو مٹھیاں بھر بھر کر دیتے تھے۔ غریب شرفا پر اُن کی خاص نظرِ کرم تھی ان کو بلا طلب دیتے تھے اور دل کھول کر دیتے تھے۔

شرافت اور نرم دلی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ جنگ بلبیس میں مقوقس کی بیٹی گرفتار ہو کر ان کے سامنے پیش ہوئی تو اس کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آئے اور بہ حفاظت اس کے باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

بغاوت اسکندریہ میں ایک قبطی رئیس طلما گرفتار ہو کر ان کے سامنے پیش ہوا تو اس کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور متنبہ کر کے آزاد کر دیا کیوں کہ قبطیوں نے عام طور پر بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا اور جو چند ایک شریک ہو گئے تھے ان کو رومیوں نے گمراہ کیا تھا۔

ان کی نرم دلی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ عین شمس یا قصر شمع کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے دربارِ خلافت سے اسکندریہ پر فوجیں بڑھانے کی اجازت طلب کی۔ وہاں سے منظوری آئی تو حضرت عمروؓ نے کوچ کا حکم دیا۔ اتفاق سے ایک کبوتر نے حضرت عمروؓ کے خیمہ میں گھونسلا بنا لیا تھا۔ خیمہ اکھاڑا جانے لگا تو حضرت عمروؓ کی نگاہ گھونسلے پر پڑی۔ حکم دیا کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ ہمارے مہمان کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ چوں کہ عربی میں خیمہ کو فسطاط کہتے ہیں اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے اسکندریہ سے واپس آ کر اسی خیمہ کے قریب شہر بسایا اس لیے خود شہر بھی فسطاط کے نام سے مشہور ہو گیا اور آج تک یہی نام لیا جاتا ہے۔ (الفاروق)

حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے زمانۂ امارت میں اہل مصر (بالخصوص قبطیوں) سے نہایت مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے یہی سبب تھا کہ یہ لوگ ان کے سچے خیر خواہ اور اطاعت گزار بن گئے تھے۔ بہ ظاہر ان کا یہی نرم سلوک تھا جس کی بنا پر خراج کم وصول ہوتا تھا۔ اس معاملہ میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ دونوں نے ان سے جواب طلب کیا لیکن انہوں نے اپنی

حکمت عملی تبدیل نہ کی۔ معزولی کے بعد ان کی حضرت عثمانؓ سے جو گفتگو ہوئی اس میں جب ان کو بتایا گیا کہ ان کے جانشین نے زیادہ خراج وصول کر کے بھیجا ہے (اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا) تو انہوں نے یہ معنی خیز فقرہ کہا ''مگر بچے بھوکے رہ گئے۔''

اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اہل مصر سے خراج تو زیادہ وصول کر لیا گیا لیکن یہ نہیں دیکھا گیا کہ خراج دینے کے بعد وہ قلاش یا تنگ دست تو نہیں ہو گئے۔

تدبیر وسیاست اور فہم وفراست کے اعتبار سے حضرت عمرو بن العاصؓ کا شمار عرب کے چوٹی کے مدبرین (دُہاۃ عرب) میں ہوتا تھا۔ ان کی سیرت پر بہ غور نظر ڈالیں تو یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا کہ دماغی قابلیت کے لحاظ سے وہ یکتائے عصر تھے۔ ان کی اصابت رائے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود سرور عالم ﷺ نے ایک دفعہ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''تم اسلام میں صائب رائے کے آدمی ہو۔'' (کنز العمال)

حضرت عمر فاروقؓ جیسے مردم شناس عبقری کہا کرتے تھے:

''عمرو بن العاص حکومت کے لیے موزوں ہیں۔''

وہ جب کسی ناپختہ اور ضعیف رائے کے آدمی کو دیکھتے تو یہ کہہ کر حیرت کا اظہار کرتے ـــــ ''اللہ اکبر ـــــ اس شخص کا اور عمرو بن العاص کا خالق ایک ہے۔''

شیخینؓ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا بعض اربابِ سیر و تاریخ نے اس پر تنقید کی ہے۔ لیکن اس قسم کے مباحث ہماری کتاب کا موضوع نہیں ہیں۔ علماء سلف کے نزدیک مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں کفِ لسان بہترین طریقہ ہے۔ اگر کسی صاحب رسولؐ سے کوئی لغزش سرزد ہو بھی گئی ہو تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ ہمارے لیے روا نہیں کہ ان پر زبانِ طعن دراز کریں اور ان کے دوسرے فضائل ومناقب کو نظر انداز کر دیں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ باوجود اپنے اعلیٰ منصب اور تمول کے نہایت منکسر المزاج تھے۔ نخوت اور تندخوئی ان کو چھو کر نہیں گئی تھی۔ ماتحتوں پر باپ کی طرح شفیق تھے۔ ایک جنگ میں ان کا غلام اور فرزند دونوں زخمی ہو گئے، وہ پہلے غلام کے پاس گئے اس کے زخم دیکھے اور تسلی دے کر کہا، اب کچھ روز آرام کرو۔ اس کے بعد بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا حال دریافت کیا۔

حضرت قبیصہؓ کا بیان ہے کہ ''حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے دوستوں میں اتنے محترم اور محبوب تھے کہ ان سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔''

انہوں نے اپنے حسن سلوک سے مصریوں کے دل موہ لیے تھے اور وہ ان کو اپنا مربی سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار غصہ آ جاتا تھا لیکن عام طور پر نہایت شیریں گفتار اور خوش اخلاق تھے۔ ایک دفعہ ایک بڈھے خچر پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ ایک صاحب دیکھ کر بولے کہ آپ امیر مصر ہو کر ایسے جانور پر سوار ہوتے ہیں، فرمایا، جانور جب تک بوجھ اٹھائے، بیوی جب تک وفا شعار رہے، دوست جب تک راز دار رہے میں کسی سے بیزار نہیں ہوتا۔

اہلِ سیر نے حضرت عمروؓ بن العاص کے بہت سے اقوالِ حکمت نقل کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

- ☆ سب سے بڑا بہادر اور جری وہ ہے جس کے غضب (یا جس کی جہالت) پر اس کا حلم غالب ہو۔
- ☆ سب سے بڑا سخی وہ ہے جو اپنی دنیا کو دین کی بہتری میں صرف کرے۔
- ☆ ایک ہزار لائق آدمیوں کے مر جانے سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا ایک نالائق کے صاحب اختیار ہونے سے پہنچ جاتا ہے۔
- ☆ شریف بھوکا ہوتا ہے تو مقابلہ کرتا ہے اور رذیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو بالمقابل کھڑا ہونے کی ہمت کرتا ہے۔ لہٰذا بھوکے شریف اور شکم سیر رذیل سے ڈرتے رہو۔ شریف کو کھانے کو دو اور رذیل کو قابو میں رکھو۔
- ☆ میں نے خود اپنا راز کسی دوست سے کہہ دیا اور اس نے اسے عالم آشکار کر دیا تو قابل ملامت وہ نہیں میں ہوں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت امیر معاویہؓ کے وفادار ساتھی تھے لیکن ان کے سامنے حق بات کہنے میں کبھی نہ جھجکتے تھے اور جو دل میں ہوتا زبان پر لے آتے تھے۔

اہل سیر نے اس قسم کے کئی واقعات بیان کیے جن سے ان کی حق گوئی اور بے باکی کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ بلاشبہ ہماری تاریخ کی ایک قد آور شخصیت ہیں۔ بھلا جس ہستی کو خود سید المرسلین فخر موجودات رحمت دو عالم ﷺ نے مردِ صالح کے خطاب سے نوازا ہو اور آخر دم تک محبوب رکھا ہو اس کی خوش بختی اور عظمت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ
شہسوارِ قریش

①

سرورِ عالم ﷺ کی طرف سے ہجرت کا اِذن ملنے پر بیشتر صحابۂ کرامؓ جو سالہا سال سے مشرکینِ مکہ کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے، اپنے گھربار اور وطنِ عزیز کو خیرباد کہہ کر یثرب آ گئے ـــــ جلد ہی بعد حضورؐ نے بھی یثرب میں نزول اجلال فرمایا اور ارضِ حجاز کا یہ قدیم شہر ''مدینۃ النبیؐ'' بن گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مہاجرین کے مدینہ آنے کے بعد عرصہ تک ان میں سے کسی کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ یہودِ مدینہ جو نہایت بدباطن اور شریر لوگ تھے، انھوں نے مشہور کردیا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر کے ان کا سلسلۂ نسل منقطع کر دیا ہے۔ مسلمانوں کو یہود کی باتوں پر یقین تو نہیں تھا پھر بھی وہ کچھ افسردہ سے تھے۔ عین اس وقت جب یہودیوں کی شر انگیزی پورے عروج پر تھی، ایک مہاجر گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کی ولادت کی خبر مشہور ہوئی تو مسلمانوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے وفورِ انبساط میں اس زور سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے کہ دشت وجبل گونج اٹھے۔ اس بچے کے والدین اس کو لے کر سرورِ کونین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ پھر ایک کھجور منگوائی، دہن مبارک میں ڈال کر اسے چبایا اور اپنے لعابِ دہن کے ساتھ اسے نومولود کے منہ میں ڈال دیا۔ پھر اس بچے کے لیے دُعائے خیر وبرکت مانگی اور اسے اس کی والدہ کی گود میں ڈال دیا۔

یہ خوش بخت بچہ جس کی پیدائش پر اہلِ حق نے غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا اور جس کے دہن وشکم میں سب سے پہلے جو چیز گئی وہ رحمتِ دوعالم فخرِ موجودات سیّد الانبیاء والمرسلین ﷺ کا مقدس لعابِ دہن تھا، سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ تاریخِ اسلام کی نہایت اہم اور قد آور شخصیت ہیں۔ اگر چہ سرورِ عالم علیہ وسلم کے وصال کے وقت ان کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اپنے شرفِ خاندانی، علم و فضل، زہد و عبادت، شجاعت و شہامت اور بعض دوسرے اوصاف کی بنا پر ان کا شمار اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنو اسد سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبد اللہ بن زبیرؓ بن العوّام بن خویلد بن اسد بن عبد العزّیٰ بن قصی

حضرت عبد اللہؓ کے والد حضرت زبیر بن العوّامؓ اصحابِ عشرہ مبشرہؓ میں سے ہیں۔ حواریِ رسولؐ ان کا لقب تھا اور وہ اُمُّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہ بنتِ عبد المطلب ان کی والدہ تھیں۔ اس نسبت سے حضورؐ ان کے ماموں زاد بھائی تھے اور حضرت عبد اللہؓ حضورؐ کے بھتیجے۔

حضرت عبد اللہؓ کی والدہ حضرت اسماءؓ سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی بڑی صاحب زادی تھیں ان کا شمار بڑی جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔ ان کا لقب ذات النطاق یا ذات النطاقین تھا کیوں کہ ہجرتِ نبوی کے موقع پر انھوں نے اپنا کمر بند (نطاق) پھاڑ کر کھانے کے برتن کا منہ باندھا تھا۔ والدہ کے تعلق سے محسنۂ امت امُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی خالہ تھیں۔ غرض دادھیال اور ننھیال دونوں کے اعتبار سے ان کا خاندانی شرف و مجد سب کے نزدیک مسلم تھا۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے سالِ ولادت کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ ۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور دوسری روایت کے مطابق ان کی ولادت ہجرت سے بیس ماہ بعد ۲ ہجری میں ہوئی۔ جس فضا اور ماحول میں ان کی ولادت ہوئی اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے ان کے جلیل القدر نانا کی کنیت پر ان کی کنیت بھی ابوبکر رکھی۔ ان کی دوسری کنیت ابوخبیب تھی اور اسی نے زیادہ شہرت پائی۔

امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ سات آٹھ برس کے

ہوئے تو ایک دن حضرت زبیرؓ انھیں ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یارسول اللہ میرے اس بچے کو بیعت سے مشرف فرمائیے۔''

حضورؐ کم سن عبداللہؓ کو دیکھ کر متبسم ہوئے اور پھر انھیں بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ بیعت سے مشرف فرمایا۔

اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو سرورِ عالم ﷺ سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ اکثر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے اور فیضانِ رسالت سے خوب بہرہ یاب ہوتے۔ امُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھانجے سے بہت محبت تھی اس لیے وہ کبھی والدہ کے ہمراہ اور کبھی تنہا ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہتے تھے۔ حافظہ نہایت قوی پایا تھا، حضورؐ کو جو کچھ کرتا دیکھتے یا آپؐ سے جو کچھ سنتے اسے یاد رکھتے تھے چناں چہ انھوں نے متعدد احادیث براہِ راست حضورؐ سے روایت کی ہیں۔

ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ نے پچھنے لگوائے۔ اس وقت حضرت عبداللہؓ بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے۔ پچھنے لگنے سے جو خون نکلا، حضورؐ نے وہ حضرت عبداللہؓ کو دے کر فرمایا کہ اس کو کہیں دبا دو۔ ان کو حضورؐ سے اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ یہ مقدس خون خاک میں دبانا گوارا نہ ہوا۔ حضورؐ کی نظروں سے اوجھل ہو کر اس کو پی لیا۔ واپس آئے تو آپؐ نے پوچھا، اس خون کو کہاں پھینکا؟

انھوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! میں نے اس کو پی لیا۔''

حضورؐ نے فرمایا۔ ''جس کے بدن میں میرا خون جائے گا اس کو جہنم کی آگ نہیں چھو سکتی البتہ ایک دن تم لوگوں کے ہاتھ سے اور لوگ تمھارے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔''

(تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ بحوالہ مسند ابویعلیٰ)

(۳)

حضرت عبداللہؓ بچپن ہی سے بہت دلیر اور نڈر تھے۔ جنگِ خندق کے وقت ان کی عمر تقریباً پانچ برس کی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر جنگ کے مناظر دیکھا کرتے تھے اور ذرا بھی خوف نہیں کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ اپنے چند ہم عصر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ کسی شخص نے بچوں کو ڈرانے کے لیے بھیانک آواز نکالی۔ دوسرے بچے تو ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن حضرت عبداللہؓ اپنی جگہ پر ڈٹے رہے پھر اپنے ساتھیوں کو واپس بلایا اور ان سے کہا، میں تمھارا سردار بنتا ہوں آؤ سب مل کر اس شخص کو اس کی شرارت کا مزہ چکھائیں۔ چناں چہ سب لڑکے ان کو اپنا سردار بنا کر اس شخص پر ٹوٹ پڑے یہاں تک کہ اس کو بھاگتے ہی بنی۔

حضرت عمر فاروقؓ بڑے رعب اور دبدبہ کے آدمی تھے۔ اگر بچے کسی جگہ کھیل رہے ہوتے اور ان کو دیکھ لیتے تو بھاگ کھڑے ہوتے۔ ایک دن حضرت عبداللہؓ بہت سے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ اُدھر سے حضرت عمر فاروقؓ گزرے۔ سب لڑکے کھیل چھوڑ چھاڑ اِدھر اُدھر دبک گئے لیکن حضرت عبداللہؓ وہیں کھڑے رہے۔ حضرت عمرِ فاروقؓ نے پوچھا۔ ''لڑکے تم کیوں نہیں بھاگے؟''

حضرت عبداللہؓ نے بے باکی سے جواب دیا۔ ''میں کیوں بھاگتا؟ نہ میں نے کوئی شرارت کی ہے اور نہ راستہ تنگ ہے کہ آپ کے لیے چھوڑتا۔''

حضرت عمر فاروقؓ ان کی جرأت اور بے خوفی دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

حضرت عبداللہؓ عہدِ رسالت اور عہدِ صدیقی میں کمسن تھے اس لیے کسی غزوے میں شریک نہ ہوسکے۔ عہدِ فاروقی میں اُن کا عنفوانِ شباب تھا۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ''الِاصابہ'' میں لکھا ہے کہ اس عہد میں وہ سب سے پہلے اپنے والد کے ہم راہ جنگِ یرموک (۱۵ھ) میں شریک ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ برس کے لگ بھگ تھی۔ چوں کہ ابھی ناتجربہ کار تھے اور جنگ کے ہنگامے میں انھیں نقصان پہنچ جانے کا خدشہ تھا، اس لیے حضرت زبیرؓ نے انھیں گھوڑے پر سوار کردیا تھا اور ایک مجاہد کو ان کی حفاظت پر مامور کردیا تھا۔

۱۹ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی مدد کے لیے ایک امدادی فوج مصر روانہ کی۔ حضرت عبداللہؓ کے والد حضرت زبیرؓ بھی اس کے افسروں میں شامل تھے۔ انھوں نے مدینہ سے چلتے وقت اپنے ساتھ حضرت عبداللہؓ کو بھی لے لیا۔ چناں چہ وہ مصر کے کئی معرکوں میں اپنے والد کے ساتھ شریک ہوئے۔ مصر سے واپسی کے بعد وہ تحصیلِ علم میں مشغول

ہو گئے حتیٰ کہ ۲۴ھ میں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کا آغاز ہو گیا۔ ۲۶ ہجری میں امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ غنی نے حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو طرابلس (لیبیا) کی تسخیر کے لیے افریقیہ روانہ کیا (افریقیہ اس زمانے میں لیبیا، الجزائر اور مراکش وغیرہ کے مجموعے کا نام تھا اور طرابلس اس کا مرکزِ حکومت تھا)۔

طرابلس کا حکمراں ایک عیسائی بطریق جرجیر گریگوری (Exarch Gregory) نامی ایک آزمودہ کار جرنیل تھا۔ وہ ایک لاکھ بیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل لشکر مسلمانوں کے مقابلے پر لے آیا۔ اس کی ایک بیٹی، جس کا نام بعض روایتوں میں فلپانا بیان کیا گیا ہے، حسن و جمال اور ذہانت و شجاعت میں اپنی مثال آپ تھی وہ بھی باپ کے پہلو بہ پہلو گھوڑے پر سوار ہو کر لڑائی میں شریک ہوتی تھی اور اپنے لشکر کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلاتی تھی۔ کئی ماہ تک دونوں فوجوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن لڑائی کا کوئی فیصلہ ہونے میں نہ آیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جرجیر نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے سپہ سالار کا سر کاٹ کر لائے گا اسے وہ ایک لاکھ دینار نقد انعام دے گا اور اپنی بیٹی بھی اس کے ساتھ بیاہ دے گا۔ اس اعلان سے عیسائی لشکر کی ہمت دو چند ہو گئی تھی اور بہت سے عیسائی فوجی حضرت عبداللہ بن سعدؓ کی تاک میں رہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن سعدؓ نے بہ نظرِ احتیاط میدانِ جنگ میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ کو کئی ماہ تک لڑائی کے نتیجے کی اطلاع نہ ملی تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی سرکردگی میں ایک کمکی فوج طرابلس بھیجی۔ ابنِ زبیرؓ میدانِ جہاد میں وارد ہوئے تو مسلمانوں نے انھیں دیکھ کر تکبیر کا نعرہ لگایا۔ جرجیر نے اس کا سبب پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے تازہ دم فوج پہنچی ہے۔ اس پر وہ سراسیمہ ہو گیا لیکن اپنی فوج کی ہمت بہ دستور بندھاتا رہا۔ ابنِ زبیرؓ کے آنے سے پہلے لڑائی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا انھوں نے آتے ہی صبح سے دوپہر تک کا وقت رزم آرائی کے لیے مقرر کیا۔ چناں چہ لڑائی اسی ڈھنگ سے ہونے لگی۔ ابنِ زبیرؓ کے مشورہ پر سپہ سالار عبداللہ بن سعدؓ نے بھی اعلان کر دیا کہ جو شخص جرجیر کا سر کاٹ کر لائے گا اسے ایک لاکھ نقد انعام دیا جائے گا اور جرجیر کی بیٹی بھی اس کے ساتھ بیاہ دی جائے گی۔ یہ اعلان کرنے کے بعد وہ خود بھی لڑائی میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے لیکن پھر بھی لڑائی کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہوئی۔ ایک دن ابنِ زبیرؓ نے اپنے سپہ سالار سے کہا کہ لڑائی کا اس طرح فیصلہ نہ ہوگا

کیوں کہ ہم اپنے مرکز سے بہت دُور ہیں جب کہ جرجیر اپنے ملک کے اندر ہے اور اس کو ہر طرح کی مدد مل رہی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ کل ہم اپنی فوج کے منتخب بہادروں کو ان کے خیموں میں چھوڑ دیں اور باقی فوج کے ساتھ عیسائیوں سے نبرد آزما ہوں۔ جب دوپہر کے بعد عیسائی فوج تھک کر لوٹنے لگے تو ہمارے تازہ دم بہادر خیموں سے نکل کر اس پر ٹوٹ پڑیں۔ سپہ سالار نے اس تدبیر کو بہت پسند کیا اور دوسرے دن اسی کے مطابق عمل کیا۔ جب عیسائی فوج تھک کر پیچھے ہٹی تو ابنِ زبیرؓ اپنے تازہ دم بہادروں کو ساتھ لے کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ اتنا شدید اور ناگہانی تھا کہ جرجیر اور اس کی بیٹی کی ہزار کوششوں کے باوجود عیسائی قدم جما کر لڑ نہ سکے اور سخت افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ جرجیر حضرت ابنِ زبیر کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس کی بیٹی کو مسلمانوں نے اسیر کرلیا۔ سپہ سالار نے اپنے اعلان کے مطابق اسے ابنِ زبیرؓ کو دے دیا، انھوں نے اس لڑکی سے شادی کرلی یا اسے آزاد کردیا؟ مستند تاریخوں سے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

طرابلس کی تسخیر کے بعد مسلمانوں نے افریقیہ کے دوسرے تمام مشہور شہر اور علاقے بھی یکے بعد دیگرے فتح کرلیے۔ ان تمام معرکوں میں ابنِ زبیرؓ نہایت بے جگری سے لڑے اور اپنی شجاعت کی دھاک بٹھا دی۔ ''دائرۂ معارفِ اسلامیہ'' میں الاغانی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابنِ زبیرؓ فتح وظفر کی خبر لے کر مدینے واپس آئے اور انھوں نے اس مہم کا نقشہ نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں کھینچا۔ ۲۹-۳۰ھ میں حضرت سعید بن العاصؓ نے طبرستان (شمالی ایران) پر لشکر کشی کی تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی ان کے لشکر میں شامل ہوگئے اور متعدد معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ طبرستان کی فتح کے بعد واپس آئے تو حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے انھیں اُس مجلس کا رکن مقرر کیا جو انھوں نے تحریر مصاحف (قرآنِ کریم کی نقل) کے لیے قائم کی۔ اس مجلس کے دوسرے ارکان حضرت زید بن ثابت انصاریؓ، حضرت سعید بن عاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ تھے۔ حضرت ابنِ زبیرؓ کی عمر اس وقت صرف تیس برس کی تھی لیکن اس مقدس اور اہم کام کے لیے ان کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس وقت علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر فائز ہو چکے تھے۔

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے خلاف شورش نے زور پکڑا اور ۳۵ھ میں مفسدہ پردازوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کرلیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ان سرفروشوں میں شامل تھے جو

باغیوں سے لڑنا چاہتے تھے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ سے درخواست کی کہ وہ اجازت دیں تو وہ اپنی جمعیت کے ساتھ باغیوں سے نبرد آزما ہوں لیکن کریم النفس امیر المؤمنینؓ نے فرمایا کہ میں تم کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی میری خاطر خون نہ بہائے اور نہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالے۔ اس پر حضرت ابنِ زبیرؓ خاموش ہو گئے تاہم وہ بعض دوسرے جوانانِ قریش کی معیت میں دروازے کے باہر کھڑے ہو کر پہرہ دیتے رہے۔ محاصرے کے چالیسویں دن باغی صدر دروازہ چھوڑ کر پچھلی طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور ضعیف العمر امیر المؤمنینؓ کو، جب وہ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے، نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قصاصِ عثمانؓ یا اصلاح کا علم بلند کیا۔ اسی سلسلہ میں ۳۶ھ میں جمل کی افسوس ناک لڑائی پیش آئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اُمّ المؤمنینؓ کی پیدل فوج کے افسر تھے۔ وہ اس بے جگری سے لڑے کہ سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ اختتامِ جنگ پر شمار کیا گیا تو ان کے بدن پر نیزوں اور تلواروں کے چالیس سے زیادہ زخم پائے گئے۔ لڑائی کے آغاز سے پہلے حضرت عبداللہؓ سایۂ پدری سے بھی محروم ہو گئے۔ والدِ گرامی حضرت زبیرؓ میدانِ جنگ سے کنارہ کش ہو کر واپس جا رہے تھے کہ ایک بد باطن شخص عمرو بن جرموز نے انھیں عین اس وقت شہید کر دیا جب وہ نماز پڑھتے ہوئے سربسجدہ تھے۔ لڑائی میں حضرت علیؓ غالب آئے تو حضرت عبداللہؓ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور صفین کی خانہ جنگی میں مطلق کوئی حصہ نہ لیا سوا اس کے کہ دومۃ الجندل کے محاکمے میں موجود تھے جس کا مقصد فریقین میں صلح کی راہ ہموار کرنا تھا۔

(۴)

رمضان ۴۰ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شہادت پائی اور سیدنا حضرت حسنؓ سریر آرائے خلافت ہوئے لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ چند ماہ بعد وہ امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اس طرح ۴۱ھ میں امیر معاویہؓ تمام عالم اسلام کے بلا شرکتِ غیرے فرماں روا بن گئے۔ حضرت ابنِ زبیرؓ نے ان کے عہدِ خلافت کا بیشتر حصہ گوشہ نشینی میں گزارا اور ملکی سیاست میں کسی قسم کا حصہ نہ لیا۔ کسی جھگڑے میں پڑنے کی بہ جائے انھوں نے

امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ والد محترم کے ترکہ سے ان کے حصے میں کافی جائداد آئی تھی اور پھر تجارت بھی کرتے تھے اس لیے فکرِ معاش کی طرف سے بے نیاز تھے۔ ۴۹-۵۰ھ (یا بہ روایتِ دیگر ۵۱-۵۲ء) میں امیر معاویہؓ نے ایک لشکر قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر اس لشکر میں شریک ہو گئے۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ وہی لشکر تھا جس کے بارے میں سرورِ عالم ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ:

''میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر جہاد کرے گا، اللہ نے اس کو بخش دیا ہے۔''

اس مہم سے واپسی کے بعد انھوں نے حسبِ سابق گوشۂ عزلت اختیار کر لیا تا آں کہ امیر معاویہؓ نے اپنی خلافت کے آخری زمانہ میں یزید کو ولی عہد نامزد کیا اور لوگوں کو یہ نامزدگی تسلیم کرنے کی دعوت دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسین بن علیؓ نے یزید کی ولی عہدی کی پُرزور مخالفت کی۔ امیر معاویہؓ ان کو اس بات پر رضامند کرنے کے لیے بہ نفسِ نفیس دمشق سے مکہ معظّمہ آئے جہاں یہ اصحاب مدینہ منوّرہ سے آکر مقیم ہو گئے تھے (ایک اور روایت کے مطابق امیر معاویہؓ سے ان اصحاب کی گفتگو مدینہ منوّرہ ہی میں ہوئی)۔ امیر معاویہؓ نے ان چاروں کو بلا بھیجا۔ سب نے گفتگو کے لیے اپنا نمائندہ حضرت ابنِ زبیرؓ کو بنایا۔ حضرت معاویہؓ اور ابنِ زبیرؓ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

امیر معاویہؓ: تم سب میرے عزیز ہو اور تمھیں بہ خوبی علم ہے کہ میں نے ہمیشہ تمھارے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔ یزید تمھارا بھائی اور ابنِ عم ہے۔ (مسلمانوں کو انتشار اور خوں ریزی سے بچانے کے لیے) میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اسے خلافت کے لیے نامزد کر دو۔ لیکن حکومت کے تمام اختیارات تم اپنے ہاتھ میں رکھو وہ تم سے کوئی تعرّض نہ کرے گا۔

عبداللہ بن زبیرؓ: اے امیر ہم تین صورتیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک آپ اختیار کر لیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرح کسی کو نامزد نہ کیجیے۔ امت آپ کے بعد خود ہی خلیفہ منتخب کر لے گی، دوسرا طریقہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہے اپنا جانشین اس شخص کو مقرر

کیجیے جو نہ آپ کا رشتہ دار ہو اور نہ آپ کے قبیلے سے ہو۔ تیسری صورت حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل ہے کہ چند اشخاص کو نامزد کر دیجیے جو آپ کے بعد خلیفہ کا انتخاب اپنے میں سے کر لیں۔

امیر معاویہؓ: رسول اللہ ﷺ کے بعد ایسے لوگ موجود تھے جن پر اُمت اتفاق کر سکتی تھی اور اس نے ابوبکر صدیقؓ پر اتفاق کر لیا لیکن اب وہ بات کہاں؟ اب تو اختلاف کے اور بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی نگاہ حضرت عمرؓ پر پڑ سکتی تھی لیکن میرے بعد (بنو امیہ سے باہر) ایسا کون ہے جس کو میں کامل اعتماد کے ساتھ نامزد کر سکوں۔ تیسری صورت پر بھی موجودہ حالات میں عمل کرنا ممکن نہیں۔ کیا ان کے علاوہ کوئی اور طریقہ بھی ہے؟

عبداللہ بن زبیرؓ: نہیں۔

اس گفتگو کے بعد امیر معاویہؓ نے ان بزرگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا یا ان سے جبراً یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے لی؟ اس کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بہر صورت امیر معاویہؓ کے دل میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف سے کھٹک پیدا ہو گئی۔ چناں چہ رجب ۶۰ ہجری میں اپنی وفات سے پہلے انھوں نے یزید کے لیے جو وصیت چھوڑی اس میں منجملہ دوسری نصیحتوں کے ایک یہ بھی تھی کہ:

> ''خلافت کے معاملے میں تجھے قریش کے تین آدمیوں سے خطرہ رہے گا۔ حسین بن علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ۔(۱) حسینؓ کو ایک نہ ایک دن اہلِ عراق ضرور تمھارے مقابلہ پر لائیں گے۔ ان پر قابو پالو تو درگزر سے کام لینا۔ وہ ہمارے قرابت دار ہیں، رسول اللہ ﷺ کے نواسے ہیں اور ان کا ہم پر حق ہے۔
>
> عبداللہ بن عمرؓ خلافت کے جنجال میں پڑنا پسند نہیں کریں گے اور اپنی عبادت سے کام رکھیں گے۔ جب دوسرے لوگ تمھاری بیعت کر لیں گے تو وہ بھی اس معاملہ میں ان کا ساتھ دیں گے البتہ جس شخص سے تمھیں حقیقی خطرہ ہے وہ عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ یہ شخص لومڑی کی چال چل کر شیر کی طرح تم پر حملہ آور ہوگا۔ اس پر قابو پالو تو کبھی زندہ نہ چھوڑنا۔ ہاں اگر وہ صلح کر لے تو قوم کو خوں ریزی سے بچانے کے لیے تم بھی صلح سے انکار نہ کرنا۔''

---

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس وقت وفات پا چکے تھے۔

(۵)

امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید تختِ حکومت پر بیٹھا تو اہلِ شام نے فوراً اس کی بیعت کرلی۔ حجاز کے اکثر لوگوں سے امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں بیعت لے لی تھی۔ جن لوگوں نے بیعت نہیں کی تھی ان میں سیدنا حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دو ایسی شخصیتیں تھیں جنھیں یزید کسی صورت میں نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے ولید بن عتبہ حاکمِ مدینہ کو تاکیدی حکم بھیجا کہ ان دونوں بزرگوں سے میری بیعت لو۔ ولید نے ان دونوں کو بُلا بھیجا۔ حضرت حسینؓ اس کی طلبی پر چلے آئے لیکن بیعت سے انکار کردیا۔ ابنِ زبیرؓ نے ایک دن کی مہلت مانگ لی اور راتوں رات اہلِ وعیال سمیت مدینہ منوّرہ سے نکل کر مکہ معظّمہ آگئے۔ اہلِ مکہ نے ابنِ زبیرؓ کو ہاتھوں ہاتھ لیا کیوں کہ وہ ان کے زہد و اتقا اور دوسرے اوصاف و محاسن کی بنا پر ان کے مداح تھے۔ اسی دوران میں حضرت حسینؓ بھی اہل وعیال سمیت کوفہ کے قصد سے مدینہ سے مکہ تشریف لے آئے۔ حضرت ابنِ زبیرؓ کو سیدنا حسینؓ کے عزمِ کوفہ کا علم ہوا تو وہ ان کے پاس آئے اور کہا:

''بہتر یہ ہے کہ آپ یہیں حرم میں مقیم رہیں۔ یہیں سے سارے شہروں کی طرف اپنے قاصد دوڑا دیں۔ اور اپنے عراقی حامیوں سے کہیں کہ وہ یہیں آپ کے پاس پہنچ جائیں۔ پھر جب آپ کے ہاتھ مضبوط ہوجائیں، تو یزید کے عمال کو یہاں سے نکال باہر کریں۔ میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا، یہ میرا فرض ہے۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ خلافت کا مطالبہ یہیں حرم میں رہ کر کریں اس لیے کہ تمام دنیا کے لوگ یہیں جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ اپنے مقصد میں ناکام نہ رہیں گے۔''

حضرت حسینؓ کوفہ جانے کا پختہ عزم کرچکے تھے اس لیے انھوں نے ابنِ زبیرؓ کا مشورہ قبول نہ کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے حضرت ابنِ زبیرؓ کو یہ جواب دیا کہ:

''میں نے اپنے والد سے یہ حدیث سنی ہے کہ حرم کا ایک مینڈھا ہے جس کی وجہ سے اس کی حُرمت اٹھ جائے گی، میں نہیں چاہتا کہ یہاں رہ کر وہ مینڈھا بنوں۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے بہی خواہوں نے بھی سیّدنا حسینؓ کو کوفہ نہ جانے کا مشورہ دیا لیکن انھوں نے کسی کا مشورہ قبول نہ کیا اور اہل وعیال سمیت عازمِ کوفہ ہوگئے۔

۱۰ محرم ۶۱ ہجری کو کربلا کا دل دوز سانحہ پیش آیا اور سیّدنا حسینؓ اپنے متعدد عزیزوں اور ساتھیوں سمیت میدانِ کربلا میں یزیدی فوج کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ اس حادثۂ فاجعہ کی خبر حضرت ابنِ زبیرؓ کو ہوئی تو انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے تمام اہلِ مکہ کو مسجدِ حرام میں بُلایا اور ان کے سامنے ایک رِقت انگیز تقریر کی جس میں فرمایا:

''لوگو! اہلِ عراق سے بدتر مخلوق روئے زمین پر نہیں ہے اور عراقیوں میں بدترین کوفہ کے لوگ ہیں۔ انھوں نے بار بار خطوط بھیج کر حسینؓ کو اس لیے بُلایا کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے لیکن جب حسینؓ ان کی سرحد میں پہنچے تو ان لوگوں نے ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا بلکہ اکثر نے بنوامیہ کی حمایت کی۔ یزیدی فوج نے مظلوم حسین کو گھیر لیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ یزید کی بیعت کرو اور اپنے آپ کو ابن زیاد کے حوالے کر دو ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ واللہ حسینؓ اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ بے سرو سامان ہیں لیکن انھوں نے ذلت کی زندگی کو ٹھکرا دیا اور عزت کی موت قبول کی۔ خدا حسینؓ کے قاتلوں کو ذلیل کرے لیکن مشیّتِ ایزدی کے سامنے چارہ نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا حسینؓ کی شہادت کے بعد ہم ان بدکردار لوگوں کے قول و فعل پر بھروسا کر سکتے ہیں؟''

سارے مجمع نے بیک آواز کہا —— ''ہرگز نہیں۔''

حضرت ابنِ زبیرؓ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! خدا کی قسم ان ظالموں نے اس عظیم المرتبت شخص کو قتل کیا جو دن کو روزے رکھتا تھا اور رات کو عبادت کرتا تھا، جو قرآن خواں اور پاک باز تھا۔ جو ہر لحاظ سے ان سے بڑھ کر خلافت کا مستحق تھا۔ واللہ حسینؓ روزے کے مقابلے میں بادہ خواری، خوفِ خدا سے رونے کے مقابلے میں رقص و سرود، قرآن کی ہدایت کے مقابلے میں گم راہی اور ذکرِ حق کے مقابلے میں شکاری کتوں کے ذکر کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ خدا ان دھوکے باز قاتلوں کو سخت سزا دے گا۔''

ابنِ زبیرؓ تقریر ختم کر کے رو پڑے اور مجمع بھی اشک بار ہو گیا۔ پھر سب لوگ ابنِ زبیرؓ کے گرد جمع ہو گئے اور کہا'' واللہ حسینؓ کے بعد آپ سے بڑھ کر کوئی مستحقِ خلافت نہیں، حسینؓ کے قاتلوں سے ہم بے زاری کا اظہار کرتے ہیں آپ ہاتھ بڑھایئے ہم آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتے ہیں۔''

لوگوں کے اصرار پر حضرت ابنِ زبیرؓ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور ابنِ عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کے سوا تمام اہلِ مکّہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

(۶)

یزید کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور حاکمِ مدینہ کو حکم بھیجا کہ ابنِ زبیرؓ کو گرفتار کر کے دمشق بھیجو۔ یہ حکم ملنے پر حاکمِ مدینہ نے ایک چھوٹی سی فوج ابنِ زبیرؓ کی گرفتاری کے لیے بھیجی۔ اس فوجی دستے کی قیادت حضرت عبداللہؓ کا ایک بھائی عمرو بن زبیرؓ کر رہا تھا، ایک اور روایت کے مطابق عمرو بن زبیرؓ ایک سفارت لے کر عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ امیر المؤمنین یزید بن معاویہؓ آپ کو عزت و احترام کے ساتھ دمشق بلاتے ہیں۔ اس سفارت کا اصل مقصد یہ تھا کہ اگر ابن زبیرؓ اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائیں تو انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ بہرصورت حضرت عبداللہؓ نے یزیدی فوج کو شکست دے کر یا اپنے خلاف سازش کرنے کے جرم میں عمرو بن زبیرؓ کو گرفتار کرلیا اور چند دن بعد مروا دیا۔ اس کے بعد ابنِ زبیرؓ نے کھلم کھلا یزید کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ اہلِ مدینہ نے بھی ان کی مثال کی پیروی کی اور انھوں نے یزید کی خلافت سے انکار کر کے حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ کو اپنا مقامی امیر منتخب کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ فسخِ بیعت سے پہلے اہلِ مدینہ کا ایک وفد دمشق گیا وہاں اس کی بہت آؤ بھگت ہوئی لیکن اس وفد نے واپس آ کر اہلِ مدینہ کے سامنے یزید کے مشاغل کی ایسی مکروہ تصویر کھینچی کہ وہ اس سے منحرف ہوگئے۔ یزید نے اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے مسلم بن عقبہ مرّی کی سرکردگی میں ایک شامی فوج حجاز روانہ کی۔ جب یہ فوج مدینہ پہنچی تو اہلِ مدینہ نے اس کا پُرزور مقابلہ کیا مگر مسلم بن عقبہ کی جنگی مہارت سے مات کھا گئے۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ نے سینکڑوں اہلِ مدینہ سمیت مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی ان میں بیسیوں اصحابِ رسولؐ بھی شامل تھے۔ شامی فوج نے تین دن تک مدینہ منوّرہ میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اس کے بعد وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو مطیع کرنے کے لیے مکہ معظّمہ کی طرف روانہ ہوئی۔ اثنائے راہ میں مسلم بن عقبہ نے وفات پائی اور اس کی جگہ حصین بن نمیر شامی فوج کا سپہ سالار بنا۔ وہ مکہ کے قریب پہنچا تو ابنِ زبیرؓ نے شہر سے باہر نکل کر شامی فوج کا پُرزور مقابلہ کیا لیکن شامیوں کے زبردست دباؤ کی وجہ سے انھوں

نے محصور ہو کر مدافعت کا فیصلہ کیا۔ حصین بن نمیر نے جبل ابو قبیس پر منجنیق نصب کر کے خانۂ کعبہ پر آتش باری اور سنگِ باری شروع کر دی۔ اس سے کعبہ کی عمارت کو بہت نقصان پہنچا تاہم حضرت ابنِ زبیرؓ نہایت پامردی سے مقابلہ کرتے رہے۔ انھوں نے مسجدِ حرام میں خیمہ نصب کر رکھا تھا نہ آتش باری کی پروا تھی نہ سنگ باری کی۔ خیمے سے نکل کر نہایت سکون سے حرم کے اندر نماز میں مشغول رہتے تھے۔ خود حصین بن نمیر کا بیان ہے کہ جب میں نے مکہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، ابنِ زبیرؓ اپنے خیمے۔ سے اس طرح نکلتے تھے، جس طرح جھاڑی سے شیر نکلتا ہے۔

اثنائے محاصرہ میں خوارج کی ایک جماعت نافع بن ارزق اور نجدہ بن عامر کی سرکردگی میں مکہ آئی۔ یہ لوگ یزید کے مخالف تو تھے ہی لیکن ابنِ زبیرؓ کے حامی بھی نہیں تھے تاہم وہ انہیں یزید سے بہتر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ابنِ زبیرؓ ان کی ہمنوائی کریں تو وہ یزیدی لشکر کے مقابلے میں اس نازک وقت میں ان کی مدد کریں گے۔ نافع اور نجدہ ابنِ زبیرؓ سے ملے اور ان کو پیش کش کی کہ اگر آپ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور اپنے والد حضرت زبیرؓ سے بے زاری کا اظہار کریں اور ان کی مذمّت کریں تو ہماری سرفروش جماعت آپ کی حمایت میں شامی لشکر سے لڑنے کے لیے تیار ہے۔ حضرت ابنِ زبیرؓ نے ان بزرگوں کی مذمّت کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ان کے تمام دلائل کا دنداں شکن جواب دے کر آخر میں فرمایا:

> ''بلا شبہ اس وقت تمھاری امداد ہمارے لیے بڑی قدر و منزلت رکھتی ہے لیکن مجھے نہ حکومت کی آرزو ہے اور نہ فتح و شکست کا خیال۔ میں تو حق و صداقت کے لیے لڑ رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ مل کر شامیوں کا مقابلہ کرو گے تو اللہ تمھیں اس کا اجر دے گا اور اگر تم میری مدد نہ کرو گے تو مجھے اللہ کافی ہے۔ مجھے تو اس کی بھی پروا نہیں کہ تم میرے دشمنوں سے جا ملو۔''

ان کا جواب سن کر خوارج مایوس ہو گئے اور واپس چلے گئے۔

مکہ کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ ۱۴ / ربیع الاول ۶۴ھ کو یزید نے وفات پائی۔ اس کی وفات کی خبر مکہ پہنچی تو حصین بن نمیر نے محاصرہ اٹھا لیا۔ ایک روایت کے مطابق محاصرہ ختم ہونے کے بعد حصین بن نمیر کی درخواست پر حضرت ابنِ زبیرؓ نے حرم کے دروازے کھول دیئے اور شامی بلا روک ٹوک طواف کرنے لگے۔ اسی دوران میں حصین اور ابنِ زبیرؓ کی ملاقات ہو گئی۔ دوسری

روایت یہ ہے کہ کوچ سے پہلے حصین نے حضرت ابنِ زبیرؓ کو پیغام بھیجا کہ میں رات کو بطح کے مقام پر آپ سے تخلیہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ دس آدمی میرے ساتھ ہوں گے اور دس آپ اپنے ساتھ لے آئیں۔ جتنی دیر تک ہم گفتگو کریں گے یہ آدمی الگ بیٹھے رہیں گے۔ بہر صورت دونوں کی ملاقات ہوئی تو حصین نے ابنِ زبیرؓ سے کہا، یزید فوت ہو چکا اب میری نظر میں آپ سے بڑھ کر خلافت کا کوئی حق دار نہیں، میں اور میرے ساتھی آپ کی بیعت کے لیے تیار ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ شام چلیں، میں تمام اہلِ شام کو آپ کی بیعت پر آمادہ کروں گا، اہلِ حجاز پہلے ہی آپ کے ساتھ ہیں۔ اہلِ شام کی بیعت کے بعد تمام عالمِ اسلام آپ کو خلیفہ تسلیم کر لے گا۔ اب تک ہمارے درمیان جو خوں ریزی ہوئی، اسے آپ معاف کر دیں۔

ابنِ زبیرؓ نے حصین بن نمیر کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور باآوازِ بلند بولے:

''اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ کا خون معاف کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ واللہ جب تک ایک ایک حجازی کے قصاص میں دس دس شامیوں کے سر قلم نہ کرالوں گا، تم سے مفاہمت نہ کروں گا۔''

حصین نے مایوس ہو کر کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ آپ مدبّرینِ عرب میں سے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا، میں آپ کو خلافت کی طرف بلاتا ہوں اور آپ مجھے جنگ کی دھمکی دیتے ہیں، میں آہستہ بولتا ہوں اور آپ باآوازِ بلند بات کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر حصین اپنے لشکر میں واپس چلا گیا اور دوسرے دن شام روانہ ہو گیا۔

(۷)

محاصرہ کے دوران میں کعبہ کی عمارت کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ حصین کی واپسی کے بعد حضرت ابنِ زبیرؓ نے خانۂ کعبہ کو ازسرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا، اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے پرانی عمارت بالکل گرا دی جائے لیکن کسی کو یہ کام کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی بالآخر ابنِ زبیرؓ خود خدا کا نام لے کر دیوار پر چڑھ گئے اور ایک پتھر اکھاڑ کر گرا دیا۔ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ جب ساری دیواریں گر گئیں تو بنیادوں کی کھدائی شروع ہو گئی۔ ابنِ زبیرؓ نے حطیم کا چھوٹا ہوا حصہ بھی کعبہ کی حدود میں شامل کر دیا اور نئی عمارت کی اس طرح تعمیر کی جس طرح رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کام پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا اور

بڑی ہمت اور ایثار سے کام لیا۔ جس دن وہ اس کام سے فارغ ہوئے انھوں نے نئی عمارت کو اندرونی اور بیرونی جانب سے اوپر سے نیچے تک مشک اور عنبر سے بسوایا اور اس پر دیباج کا غلاف چڑھایا۔ شکرانہ کے طور پر انھوں نے بہت سے غلام آزاد کیے اور بہت سے اونٹ اور بکریاں ذبح کیں پھر وہ قریش کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ برہنہ پا گھر سے نکلے اور مقامِ تنعیم میں پہنچ کر عمرہ کا احرام باندھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسولِ اکرم ﷺ کی خواہش کے مطابق ابراہیمی بنیاد پر کعبہ کو تعمیر کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے حجرِ اسود پر چاندی چڑھوائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آتش باری اور سنگ باری سے اس میں دراڑ پڑ گئی تھی، ابنِ زبیرؓ نے اس کو چاندی سے بندھوا دیا۔

اُدھر شام میں یزید کی موت کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تخت نشین ہوا۔ وہ ایک دیندار اور نرم مزاج آدمی تھا اور حکومت کے جھمیلے میں پڑنا پسند نہیں کرتا تھا اس لیے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خلافت سے دست بردار ہوگیا۔ اب سارے حجاز، عراق، مصر اور جنوبی عرب نے ابنِ زبیرؓ کی خلافت تسلیم کرلی یہاں تک کہ شام میں موجود مخالفینِ بنواُمیہ نے بھی ان کو خلیفہ مان لیا۔ اس زمانہ میں ابنِ زبیرؓ سے ایک سیاسی غلطی ہوگئی۔ انھوں نے مدینہ منوّرہ سے بنواُمیّہ کے عمال کو نکالا تو ساتھ ہی بنواُمیّہ کے دوسرے عمائد کو بھی جبراً وہاں سے نکال دیا، ان میں مروان بن الحکم اور اس کا بیٹا عبدالملک بھی شامل تھے۔ یہ لوگ دمشق پہنچے تو وہاں بدنظمی کی کیفیت تھی۔ بالآخر بنوامیّہ کے تمام بااثر حامیوں نے جابیہ میں جمع ہوکر مروان کو خلیفہ منتخب کرلیا۔ مروان تیرہ ہزار اموی جنگجوؤں کے ساتھ ''مرجِ راہط'' کی طرف بڑھا جہاں ضحاک بن قیسؓ کی قیادت میں ابنِ زبیرؓ کی حامی فوج خیمہ زن تھی۔ دونوں فوجوں میں خوں ریز لڑائی ہوئی جس میں اموی فوج کا پلّہ بھاری رہا۔ اس طرح پورے شام پر بنوامیّہ کا تسلّط بہ حال ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مروان نے عمرو بن سعید بن عاص کی سرکردگی میں ایک فوج مصر بھیج دی۔ ابنِ زبیرؓ کے عاملِ مصر عبدالرحمٰن بن حجدم تابِ مقاومت نہ لا سکے اور مصر عمرو بن سعید کے حوالے کردیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ حجاز اور عراق پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا قبضہ تھا اور شام و مصر پر مروان کی حکومت تھی۔ مروان کو زیادہ مدت تک حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور وہ رمضان ۶۵ھ میں فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک مسندِ حکومت پر بیٹھا۔

(۸)

اسی زمانہ میں معرکۂ جسر (۱۳ھ) کے شہید سپہ سالار ابو عبید ثقفیؓ کے بیٹے مختار ثقفی نے عراق پر قبضہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ اس نے ''قصاصِ حسینؓ'' کا علم بلند کیا اور کوفہ کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا۔ عراق میں موجود بنوامیّہ کے تمام مخالفین اس کے ساتھ مل گئے اور انھوں نے ابنِ زبیرؓ کی طرف سے کوفہ کے حاکم عبداللہ بن مطیع کو بزور وہاں سے نکال دیا۔ اس طرح کوفہ اور اس کے ساتھ ہی سارے عراق پر (سوائے بصرہ کے) مختار بن ابی عبید کا قبضہ ہوگیا۔ اب اس نے شمشیرِ انتقام بے نیام کی اور ان تمام لوگوں کو چن چن کر قتل کیا جنھوں نے واقعۂ کربلا میں حصہ لیا تھا یا بنوامیّہ کی مدد کی تھی۔ ان میں شمر ذی الجوشن، حرملہ بن کامل، خولی بن یزید، عمر بن سعد، زیاد بن مالک، عبداللہ بن قیس اور عثمان بن خالد جیسے بیسیوں لوگ شامل تھے۔ اس کے بعد اس نے ایک لشکر ابراہیم بن مالک اشتر کی سرکردگی میں عبیداللہ بن زیادہ کی سرکوبی کے لیے موصل کی طرف روانہ کیا۔ ارل اور موصل کے درمیان نہر خازر کے کنارے اس لشکر کی مڈبھیر ابنِ زیاد کے لشکر سے ہوئی۔ ابراہیم بن مالک اشتر نے ابنِ زیاد کو بری طرح شکست دی اور اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

اگر مختار اپنی تحریک کو صرف قاتلانِ حسینؓ سے انتقام لینے تک محدود رکھتا تو کچھ اور بات تھی لیکن اس نے بیک وقت ابنِ زبیرؓ اور بنوامیّہ دونوں کے اقتدار کے خلاف مسلّح جدوجہد شروع کردی اور اپنے بعض فاسد خیالات وعقائد بھی لوگوں میں پھیلانے شروع کردیئے۔ جہاں تک بنوامیّہ کا تعلق ہے، ابنِ زیاد کو شکست دینے کے بعد مختار کی ان سے براہِ راست کوئی ٹکّر نہ ہوئی البتہ ابنِ زبیرؓ سے اس کی کش مکش میں شدت پیدا ہوگئی۔ اُدھر ابنِ زبیرؓ کو شبہ ہوا کہ مختار کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کی سرپرستی یا حمایت حاصل ہے، انھوں نے از راہِ احتیاط ان دونوں بزرگوں کو نظر بند کردیا۔ مختار کو خبر ہوئی تو اس نے ایک فوج مکہ بھیج کر ان کو نظر بندی سے رہائی دلائی اور وہ دونوں وہاں سے طائف چلے گئے۔ مختار اپنے خروج کے اٹھارہ ماہ بعد تک عجمیوں کے بل پر بنوامیّہ اور ابنِ زبیرؓ کا کامیاب مقابلہ کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے کوفہ کے عربوں پر اس قدر سختی کی کہ وہ اس کے خلاف ہوگئے اور ان کے بہت سے اشراف کوفہ کی

سکونت ترک کر کے بصرہ چلے گئے جہاں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے چھوٹے بھائی مصعب بن زبیرؓ حاکم تھے۔ ان لوگوں نے مصعب کو کوفہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ مصعب نے اپنے دَور کے نامور جرنیل مہلّب بن ابی صفرہ کو بصرہ بلا بھیجا۔ اس وقت وہ خوارج سے برسرِ پیکار تھے اور ابنِ زبیرؓ کی طرف سے فارس کے گورنر تھے۔ انھوں نے خوارج سے ایک معینہ مدّت کے لیے صلح کر لی اور ایک طاقتور لشکر لے کر بصرہ پہنچ گئے۔

اب مصعب بن زبیرؓ پوری طرح تیار ہو کر کوفہ کی طرف بڑھے، مختار نے بھی مقابلہ کے لیے زبردست تیاری کر رکھی تھی۔ فریقین کی فوجوں میں دو تین خوں ریز معرکے ہوئے جن میں مختار نے شکست کھائی اور بالآخر کوفہ کے دارالامارۃ میں محصور ہو کر بیٹھ گیا۔ مصعب نے محاصرہ میں اس قدر سختی برتی کہ چالیس دن کے بعد اسے باہر آنا پڑا۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف انیس آدمی تھے۔ یہ سب مختار سمیت مصعب کی فوج سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس طرح ابنِ زبیرؓ کے ایک بڑے دشمن کا خاتمہ ہو گیا اور عراق پر ان کا اقتدار بحال ہو گیا۔

(۹)

مختار کی زندگی میں ابنِ زبیرؓ اور بنو امیہ دونوں اس کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے رہے۔ اس کے قتل کے بعد عبدالملک اور ابن زبیرؓ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے اور دونوں میں کش مکش کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے عبدالملک ایک مضبوط فوج کے ساتھ قرقیسیا کی طرف بڑھا جہاں حضرت ابن زبیرؓ کی طرف سے زفر بن حارث والی تھے۔ زفر نے عبدالملک کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا لیکن بالآخر انھوں نے عبدالملک سے صلح کر لی اور اپنی لڑکی کا نکاح اس کے بیٹے مسیلمہ سے کر دیا۔ اب عبدالملک نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ عراق کا رُخ کیا۔ اس کے عراق پہنچنے سے پہلے مصعب بن زبیرؓ مہلّب بن ابی صفرہ کو فارس اور عبداللہ بن حازم کو خراسان بھیج چکے تھے۔ اس طرح ان کے پاس عبدالملک کے مقابلے میں بہت کم فوج رہ گئی تھی تاہم انھوں نے ہمت نہ ہاری اور ''دیر جاثلیق'' کے مقام پر اموی لشکر کا پر زور مقابلہ کیا۔ عبدالملک نے مصعب کو امان کی پیش کش کی لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا اور نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے۔ مصعب کے قتل کے بعد عراق پر عبدالملک کا تسلّط قائم ہو گیا۔ اب

اس نے مکہ معظّمہ پر فوج کشی کی تیاری شروع کردی۔ ''مستدرکِ حاکم'' میں ہے کہ ایک دن اس نے تمام عمائد بنی اُمیّہ اور اپنے دوسرے ہواخواہوں کو جمع کیا اور منبر پر چڑھ کر کہا:

''تم میں سے کون ابنِ زبیر کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے؟''

عبدالملک کے سوال پر حجاج بن یوسف ثقفی نے اٹھ کر کہا:

''امیر المؤمنین یہ کام میرے سپرد کیجیے۔''

عبدالملک نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا اور تینوں مرتبہ حجاج ہی نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور کہا، میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک ڈھال میں نے چھین کر لگالی ہے۔

آخر عبدالملک نے یہ مہم حجاج کے سپرد کی اور اسے حکم دیا کہ فی الحال اہل مدینہ سے کوئی تعرّض نہ کرنا اور سیدھے طائف پہنچ کر قیام کرنا وہاں سے چھوٹے چھوٹے دستے مکہ معظّمہ پر حملہ کے لیے روانہ کرتے رہنا تاکہ ابن زبیرؓ کی طاقت خوب کمزور ہو جائے۔ اس کے بعد اگر مزید فوج کی ضرورت ہوئی تو مجھے لکھنا۔

حجاج نے ان احکام پر عمل کرنے کا عہد کیا اور تین ہزار سواروں کے ساتھ طائف پہنچ کر قیام کیا۔ ابنِ زبیرؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو انھوں نے بھی مکہ کی حفاظت کے انتظامات کرلیے۔ حجاج کے سوار وقتاً فوقتاً مکہ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے لیکن ابن زبیرؓ کے آدمی ان کو بھگا دیتے۔ جب کئی مہینے اسی طرح گزر گئے تو حجاج نے عبدالملک سے مدد طلب کی اور ساتھ ہی مکہ کا محاصرہ کرنے کی اجازت مانگی۔ عبدالملک نے فوراً پانچ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ایک فوج حجاج کی مدد کے لیے روانہ کردی، اور اسے مکہ کی طرف بڑھنے کی اجازت دے دی۔ حجاج نے کمک پہنچتے ہی آگے بڑھ کر مکہ کا محاصرہ کرلیا اور کوہ ابوقبیس پر منجنیقیں لگا کر شہر اور بیت اللہ الحرام پر پتھر اور آگ کے گولے برسانے شروع کردیئے۔ یہ محاصرہ یکم ذی قعدہ ۷۲ ہجری (۲۵/مارچ ۶۹۲ء) کو شروع ہوا اور سات ماہ سے بھی کچھ زائد مدت تک جاری رہا۔ اس دوران میں شہر اور بیت اللہ شریف برابر سنگ باری اور آتش باری کی زد میں رہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بڑے استقلال اور عزم و ہمت کے ساتھ اس محاصرے کا مقابلہ کیا۔ پتھروں اور آگ کی بارش میں بھی وہ نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ خانۂ کعبہ میں نماز پڑھتے تھے لیکن غضب یہ ہوا کہ شہر میں خوراک کی شدید قلت پیدا ہوگئی اور ابن زبیرؓ کے ساتھی

محاصرے کی سختی اور بھوک کی تکلیف سے عاجز آکر ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ دس ہزار آدمی ابن زبیرؓ کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کی پناہ میں چلے گئے۔ ان میں ابن زبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی شامل تھے۔ صرف ایک بیٹے زبیر نے آخری دم تک ان کا ساتھ دیا۔

اسی زمانے میں ایک دن حضرت عبداللہؓ اپنی بوڑھی والدہ حضرت اسماءؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ (اس وقت حضرت اسماءؓ کی عمر سو سال سے اوپر تھی اور ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی) حضرت عبداللہؓ نے پوچھا:

''اماں جان آپ کا کیا حال ہے۔''

حضرت اسماءؓ: میرا حال کیا پوچھتے ہو، بینائی زائل ہو چکی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ: اماں جان! موت میں بڑی راحت ہے۔

حضرت اسماءؓ: بیٹے میں تمھارا انجام دیکھ کر مرنا چاہتی ہوں تاکہ اگر تمھیں شہادت نصیب ہو تو اپنے ہاتھ سے تمھارا کفن دفن کروں اور اگر تم فتح پاؤ تو میرا دل ٹھنڈا ہو۔

حضرت عبداللہؓ ہنس پڑے اور چلے گئے۔ دس دن بعد وہ آخری سلام کے لیے ان کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ مسجدِ حرام میں تشریف فرما تھیں۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا:

''اماں جان! محاصرے کو سات ماہ گزر چکے ہیں۔ میرے فرزند زبیر اور گنتی کے چند آدمیوں کے سوا سب لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے پاس چلے گئے ہیں۔ وہ مجھے بھی امان دینے کے لیے تیار ہے اور عبدالملک نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جو طلب کروں گا وہ دے گا، فرمائیے ایسی حالت میں آپ کا کیا حکم ہے؟''

حضرت اسماءؓ: بیٹے، تم اپنے معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو، اگر تم حق پر ہو تو جاؤ، جس راہ میں تمھارے ساتھیوں نے جانیں دیں تم بھی اسی راہ پر چل کر جان دے دو اور اگر تم ناحق لڑے تو بہت برا کیا، مسلمانوں کا خون بہایا، ساتھیوں کی جانیں گنوائیں اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

حضرت عبداللہؓ: اماں جان! میں حق و صداقت کے لیے لڑا اور حق و صداقت کے لیے ساتھیوں کو لڑایا۔ صرف بدلی ہوئی صورتِ حال سے آپ کو آگاہ کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

حضرت اسماءؓ: اگر تم اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہو لیکن اب حامیوں کے نہ ہونے اور

حالات کی ناسازگاری کے باعث دشمنوں کے سامنے جھکنا چاہتے ہوتو یہ شریفوں اور دین داروں کا شیوہ نہیں۔

حضرت عبداللہؓ: امّاں جان! میں موت سے نہیں ڈرتا، صرف یہ خیال ہے کہ دشمن میری موت کے بعد میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے اور انھیں سولی پر لٹکائیں گے۔

حضرت اسماءؓ: بیٹے جب بکری ذبح کرڈالی جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں اسے کیا پروا؟ تم اللہ پر بھروسا کرکے نکلو، موت کے خوف سے غلامی کی ذِلّت قبول نہ کرنا، خدا کی قسم عزت کی موت ذِلّت کی حکومت سے اچھی ہے اور راہِ حق میں تلواروں سے قیمہ ہونا گم راہوں کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اپنی جلیل القدر والدہ کے یہ حوصلہ افزا کلمات سُن کر حضرت عبداللہؓ پر رقّت طاری ہوگئی۔ انھوں نے فرطِ محبت سے ان کا سر چوم لیا اور پھر کہا:

''امّاں جان، میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ حق کی راہ میں مردانہ وار لڑ کر جان دوں لیکن میں چاہتا تھا کہ آپ کی رائے بھی لے لوں تاکہ میرے مرنے کے بعد آپ رنج وغم نہ کریں۔ الحمد للہ کہ میں نے آپ کو اپنے سے بڑھ کر ثابت قدم پایا۔ آپ کی باتوں نے میرے ایمان کو طاقت اور میرے ایقان کو تقویت عطا کی ہے۔ میں آج ضرور قتل ہوجاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے قتل کے بعد بھی اسی طرح صبر وشکر سے کام لیں گی۔ بہ خدا میں نے کبھی برائی کو پسند نہ کیا، کسی مسلمان پر ظلم نہ کیا، نہ کوئی عہد توڑا، نہ امانت میں خیانت کی۔ اگر میرے کسی عامل نے بے جا ظلم کیا تو میں نے اس کی حوصلہ شکنی کی۔ بہ جز رضائے الٰہی کے مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔''

پھر انھوں نے آسمان کی جانب نگاہ کی اور کہا:

''اے اللہ میں نے یہ باتیں از راہِ فخر نہیں کیں بلکہ اپنی والدہ کے اطمینان کے لیے کہی ہیں۔''

حضرت اسماءؓ نے فرمایا، جاؤ بیٹے اللہ کی راہ میں جان دو، ان شاء اللہ میں صابر وشاکر رہوں گی۔ اب آگے آؤ تاکہ میں آخری بار تمھیں پیار کرلوں۔

حضرت عبداللہؓ آگے بڑھے اور حضرت اسماءؓ نے انھیں گلے لگالیا۔ ان کا ہاتھ حضرت عبداللہؓ کی زرہ پر پڑا تو پوچھا، بیٹے یہ تمھارے جسم پر کیا ہے؟

ابنِ زبیرؓ: امّاں جان! یہ زرہ ہے تاکہ دشمن کی تلوار اور حربہ سے بچاؤ ہو۔
حضرت اسماءؓ: بیٹے! اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لیے نکلتے ہو اور ان عارضی چیزوں کا سہارا لیتے ہو۔

ابنِ زبیرؓ نے اسی وقت زرہ اتار دی اور خود بھی اتار کر پھینک دیا۔ پھر معمولی لباس پہن لیا اور سر پر سفید رومال باندھ لیا۔ والدہ کو اس سے آگاہ کیا تو انھوں نے فرمایا، اب میں خوش ہوں، جاؤ اللہ کے رستے میں لڑو اور اس کے ہاں اسی لباس میں جاؤ۔

۱۰

ماں سے رخصت ہو کر حضرت عبداللہؓ نے قمیص کے دامن اٹھا کر کمر سے باندھ لیے۔ دونوں آستینیں چڑھا لیں اور دونوں ہاتھوں میں تلواریں پکڑ کر رزم گاہ میں پہنچے۔ اس وقت گنتی کے چند فداکاران کے ساتھ تھے جن میں ان کا فرزند زبیر ایک پہلو میں اور ابن صفوان دوسرے پہلو میں تھے۔ ابن زبیرؓ اور ان کے ساتھی جس طرف رُخ کرتے تھے شامی فوج کائی کی طرح پھٹ جاتی تھی۔ ابنِ زبیرؓ اگرچہ بہتر برس کے تھے لیکن شجاعت اور بے خوفی میں اپنی مثال آپ تھے۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلاتے دشمن کی صفوں میں دور تک گھس گئے اور پھر پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے آملے۔ ان کے ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے تو کسی نے ان سے کہا، آپ اجازت دیں تو میں کعبہ کا دروازہ کھول دوں تاکہ آپ اس میں داخل ہو جائیں اور دشمن کی زد سے محفوظ ہو جائیں۔ اس وقت ابنِ زبیرؓ کی زبان پر یہ رجزیہ شعر جاری ہو گئے:

و لست بمبتاع الحیاۃ بسبۃ　　　ولا مرتق من خشیۃ الموت سلما
انا فس سھبما انہ غیر بارح　　　ملاقی المنایا ای حرف تیمما

”میں ذِلّت اختیار کر کے زندگی کو مول لینے والا نہیں اور موت کے ڈر سے سیڑھیوں پر چڑھنے والا نہیں۔
میں ایسے تیر کی رغبت کرتا ہوں جو جدا ہونے والا نہیں اور موت سے ملاقات کرنے والا کون سی جانب قصد کر سکتا ہے۔“

اس کے بعد وہ شیر کی طرح شامیوں پر ٹوٹ پڑے اور ظہر تک نہایت بے جگری سے لڑتے رہے۔ اس اثنا میں انھیں کئی زخم لگ چکے تھے۔ لیکن ان کی جبینِ ہمت پر شکن تک نہ آئی۔

ایک موقع پر کسی سیاہ فام شخص نے ان کو گالی دی تو آگے بڑھ کر اس پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ آخر ایک شامی نے ایک پتھر ان کے سر پر دے مارا جس سے شدید زخم آیا اور سر اور ماتھے سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ شعر جاری تھا:

فَلَسْنَا عَلَی الْاَعْقَابِ تَدْمِی کُلُوْمُنَا

وَ لٰکِنْ عَلٰی اَقْدَامِنَا تَقْطُرُ الدَّماء

''ہم وہ نہیں جن کی ایڑیوں پر پشت پھیرنے کی وجہ سے خون گرتا ہے بلکہ سینہ سپر ہونے کی وجہ سے ہمارے قدموں پر خون ٹپکتا ہے۔''

خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے بے انتہا نقاہت ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں شامیوں نے نرغہ کر کے ان پر تلواروں کی بارش کر دی، اس طرح حواریِ رسولؐ اور ذات النطاقینؓ کا نورِ نظر اور اپنے دَور کا شجاع ترین انسان شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر گیا۔ شامیوں نے فوراً ان کا سر کاٹ لیا۔

حجاج بن یوسف کو حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت سے آگاہ کیا گیا تو وہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے ان کا سر عبدالملک کے پاس دمشق بھجوا دیا اور لاش ایک بلند مقام پر سولی پر لٹکوا دی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ادھر سے گزر ہوا تو وہ یہ منظر دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور تین مرتبہ لاش کو خطاب کر کے یہ الفاظ کہے:

''ابو خبیب، السّلام علیکم! خدا کی قسم تم بڑے نمازی اور روزہ دار آدمی تھے۔ یہ الگ بات ہے تم نے دنیا کو اس کی حیثیت سے زیادہ وقعت دی حالاں کہ وہ اس وقعت کی اہل نہ تھی، وہ جماعت جس کے گئے گزرے فرد تم تھے بڑی ہی عالی قدر جماعت تھی۔''

شہادت کے تیسرے دن حضرت اسماءؓ مقام حجون تشریف لے گئیں جہاں ابنِ زبیرؓ کی لاش لٹکی ہوئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت حجاج بھی وہاں موجود تھا، حضرت اسماءؓ کو بتایا گیا کہ حجاج آپ کے قریب کھڑا ہے تو انھوں نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''کیا اس سوار کے اترنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟''

حجاج: وہ ملحد تھا اس کی یہی سزا تھی۔

حضرت اسماءؓ: خدا کی قسم وہ ملحد نہیں تھا روزے رکھتا تھا، نمازیں پڑھتا تھا اور پرہیز گار تھا۔

حجاج: بڑی بی یہاں سے چلی جاؤ تمھاری عقل سٹھیا گئی ہے۔

حضرت اسماءؓ: میری عقل نہیں سٹھیا گئی۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ بنو ثقیف میں ایک کذّاب اور ایک سفّاک پیدا ہوگا۔ سو کذّاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور سفّاک سو وہ تو ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حجاج نے سنا کہ حضرت ابنِ عمرؓ نے ابنِ زبیرؓ کی تعریف کی ہے تو اس نے ان کی لاش کو سولی سے اتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں پھینکوا دیا۔ اور حضرت اسماءؓ کو بُلا بھیجا۔ انھوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حجاج برافروختہ ہوگیا اور پھر پیغام بھیجا کہ فوراً چلی آؤ ورنہ چوٹی پکڑ کر گھسٹواؤں گا۔ انھوں نے نہایت بے باکی سے جواب دیا، خدا کی قسم اس وقت تک نہ آؤں گی جب تک تو چوٹی پکڑ کر گھسٹوا نہ لے گا۔ یہ جواب سُن کر حجاج خود ان کے پاس گیا اور کہا:

''سچ کہنا خدا کے دشمن کا کیا انجام ہوا۔''

حضرت اسماءؓ نے فرمایا: ''ہاں تو نے اس کی دنیا خراب کی لیکن اس نے تیری آخرت برباد کر دی۔ تو میرے بیٹے کو طنزاً ابن ذات النطاقین کہتا تھا تو خدا کی قسم میں ہی ذات النطاقین ہوں، یہ معزز لقب رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس وقت دیا تھا جب میں نے (ہجرت کے موقع) آپ کا کھانا چیونٹیوں سے بچانے کے لیے اپنے نطاق سے ڈھانکا تھا، میں نے آپؐ سے سنا ہے کہ بنی ثقیف میں ایک کذّاب اور ایک ظالم ہوگا، کذّاب کو تو ہم نے دیکھ لیا تھا اور ظالم تو ہے۔''

حضرت اسماءؓ کی بے باکانہ گفتگو سن کر حجاج چپکے سے لوٹ گیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ عبدالملک کو کسی ذریعے سے اطلاع ملی کہ حجاج نے ابنِ زبیرؓ کی لاش حضرت اسماءؓ کے حوالے نہیں کی تو اس نے حکم بھیجا کہ فوراً ان کی لاش حضرت اسماءؓ کے سپرد کر دو۔ چناں چہ حجاج نے حضرت ابن زبیرؓ کی لاش ان کی غم زدہ ماں کے سپرد کر دی۔ انھوں نے اسے غسل دلا کر حجون میں سپردِ خاک کر دیا۔

علّامہ شبلی نعمانی نے یہ واقعہ اس طرح نظم کیا ہے:

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابنِ زبیرؓ — سب نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے یکبار
ابنِ مروان نے حجاج کو بھیجا پئے جنگ — جس کی تقدیر میں مرغانِ حرم کا تھا شکار
حرمِ کعبہ میں محصور ہوئے ابن زبیرؓ — فوجِ بے دین نے کیا کعبۂ ملت کا حصار

دامنِ عرش ہوا جاتا تھا آلودۂ گرد
بارشِ سنگ سے اٹھتا تھا جو رہ رہ کے غُبار

تھا جو سامانِ رسد چار طرف سے مسدود
ہر گلی کوچہ بنا جاتا تھا اک کنجِ مزار

جب یہ دیکھا کہ کوئی ناصر و یاور نہ رہا
ماں کی خدمت میں گئے ابنِ زبیرؓ آخر کار

جا کے کی عرض کہ اے اختِ حریم نبوی
نظر آتے نہیں اب حرمتِ دین کے آثار

آپ فرمائیے اب آپ کا ارشاد ہے کیا؟
کہ میں ہوں آپ کا اک بندۂ فرماں بردار

صلح کرلوں کہ چلا جاؤں حرم سے باہر
یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہوجاؤں نثار

بولی وہ پردہ نشینِ حرم سرِّ عفاف
حق پہ گر تو ہے تو پھر صلح ہے مستوجبِ عار

یہ زمیں ہے وہی قربانِ گہ اسماعیلؑ
فدیۂ نفس ہے خود دینِ خلیلی کا شعار

ماں سے رخصت ہوئے یہ کہہ کے باآداب و نیاز
آپ کے دودھ سے شرمندہ نہ ہوں گا زنہار

پہلے ہی حملہ مین دشمن کی الٹ دیں فوجیں
جس طرف جاتے تھے یہ، ٹوٹتی جاتی تھی قطار

منجنیقوں سے برستے تھے جو پتھر پیہم
ایک پتھر نے کیا آ کے سَر و رُخ کو فگار (۱)

خون ٹپکا جو قدم پر تو کہا از رہِ فخر
یہ ادا وہ ہے کہ ہم ہاشمیوں کا ہے شعار (۲)

اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم
خون ٹپکے گا تو ٹپکے گا قدم پر ہر بار

زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک
آخر الامر گرے خاک پہ مجبور و نزار

لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا
اس کو سولی پہ چڑھاؤ کہ یہ تھا قابلِ دار

لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن لیکن
ان کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار

اتفاقات سے اک دن جو ادھر جا نکلیں
دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں یکبار

ہوچکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب
اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کی جلیل القدر والدہ حضرت اسماءؓ نے بھی وفات پائی۔

---

(۱) جمہور مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کسی شامی کے پتھر سے زخمی ہوئے تھے منجنیق کے پتھر سے نہیں۔

(۲) حضرت عبداللہؓ، ہاشم کے چچازاد بھائی اسد بن عبدالعزیٰ کی اولاد سے تھے۔

(۱۱)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا شمار ان صحابۂ کرامؓ میں ہوتا ہے جو علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ اگر چہ ان کو فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا زیادہ موقع نہ ملا لیکن انھوں نے حضرت زبیر بن العوامؓ (والد) حضرت اسماء بنتِ ابوبکر صدیقؓ (والدہ) حضرت ابوبکر صدیقؓ (نانا) اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ (خالہ) جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی اس لیے مختلف دینی علوم میں درجۂ تبحر حاصل کرلیا۔

قرآنِ حکیم جو اسلام کے تمام علوم و معارف کا سرچشمہ ہے، حضرت ابنِ زبیرؓ اس کے بہت بڑے عالم اور قاری تھے۔ وہ کبھی کبھی قرآنِ حکیم کی تفسیر کیا کرتے تھے۔ چناں چہ ان سے بعض آیتوں کی تفسیر صحیح بخاری میں منقول ہے۔ قرأتِ قرآن سے ان کو خاص شغف تھا۔ حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کی قرأتِ قرآن کے مداح تھے اور ان کو ''قاری للقرآن'' کہا کرتے تھے۔ ۳۰ ہجری میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے قرآنِ حکیم کی نقل کرنے کا کام جن صحابۂ کرامؓ کے سپرد کیا ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے تینتیس احادیث مروی ہیں۔ ان میں دو متفق علیہ ہیں، ۶ میں بخاری اور ۲ میں مسلم منفرد ہیں۔ ان کی مرویات کا زیادہ حصہ خود رسولِ اکرم ﷺ سے ماخوذ ہے۔ حضورؐ کے علاوہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرِ فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زید بن ثابت انصاریؓ سے بھی روایت کی ہے۔ ان کے تلامذہ میں حضرت عروہ بن زبیرؓ، طاؤسؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، ابنِ ابوملیکہ، ثابت بن اسلم بنانیؒ، محمد بن منکدرؒ، عبادؒ، ہشامؒ، ابوالشعثاؒ اور ابوالذبیانؒ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

تفقہ فی الدّین کے لحاظ سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مدینہ کے فقہاء صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ لوگوں کو فقہی مسائل بتایا کرتے تھے اور ان کو سنت پر چلنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اپنے فضل و کمال کے باوجود حضرت ابنِ زبیرؓ اپنے معاصرین سے دینی و علمی مسائل میں استفادہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ جس مسئلہ کا علم نہ ہوتا بلا تکلّف ان سے پوچھ لیتے تھے۔ اگر ان کی رائے وقیع معلوم ہوتی تو اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔

''مستدرکِ حاکم'' میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو عربی کے علاوہ دوسری متعدد زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کے پاس مختلف قوموں اور نسلوں کے بہت سے غلام تھے اور ان کی زبانیں بھی مختلف تھیں۔ ابنِ زبیرؓ ان سب سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ بعض مؤرّخین کا قول ہے کہ حضرت ابنِ زبیرؓ کو سات غیر ملکی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔

حضرت ابنِ زبیرؓ کو خطابت میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کے خطبے جہاں حسنِ گفتار اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہوتے تھے وہاں لہجے کی رفعت و جلالت اور آواز کی بلندی میں بھی بہت کم لوگ ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔

(۱۲)

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کا معدنِ اخلاق بڑے گراں مایہ جواہر سے پُر تھا۔ عبادت و ریاضت، حق گوئی و بے باکی، استقلال و استقامت، پابندیِ سنت اور شجاعت و شہامت ان کے مخصوص اوصاف تھے۔

عبادتِ الٰہی سے ان کو بے انتہا شغف تھا۔ اکثر رات بھر قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے۔ شوقِ عبادت اور مسجد سے دل بستگی کی بنا پر وہ ''حمامۃ المسجد'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ نماز میں ان کے انہماک اور خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ قیام کی حالت میں بے جان ستون کا گمان ہوتا تھا، سجدہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کپڑے کی کوئی گٹھڑی پڑی ہے۔ چڑیاں اور کبوتر ان کے سر، کندھوں اور پشت پر آ کر بیٹھتے تھے اور ان کو مطلق خبر نہ ہوتی تھی۔ بعض دفعہ ساری ساری رات رکوع یا سجدہ ہی میں گزار دیتے۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ کئی دفعہ دوسرے لوگ پوری سورۂ بقرہ ختم کر دیتے مگر ابنِ زبیرؓ کا رکوع ختم نہ ہوتا۔ ایک دفعہ گھر کے اندر نماز ادا کر رہے تھے پاس ہی ان کا ایک چھوٹا بچہ سویا ہوا تھا۔ یکا یک مکان کی چھت سے ایک سانپ بچے پر گرا۔ گھر کے سب لوگ بچے کو بچانے کے لیے دوڑے اور گھر میں شور مچ گیا لیکن ابنِ زبیرؓ کو خبر تک نہ ہوئی اور وہ پورے سکون سے نماز میں مشغول رہے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو اس واقعہ کا علم ہوا۔

حضرت ابنِ زبیرؓ نے نازک سے نازک موقعوں پر بھی نماز میں اپنا انہماک قائم رکھا۔

معاصرۂ مکہ کے دوران میں ان کے اردگرد پتھروں کی بارش ہورہی ہوتی لیکن وہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ نماز میں مشغول رہتے تھے۔ ایک مرتبہ منجنیق کا ایک پتھر مسجدِ حرام کے کنگرے پر لگا اور اس کا ایک کونہ گر گیا۔ حضرت ابنِ زبیرؓ پاس ہی نماز پڑھ رہے تھے وہ نہ اس طرف متوجہ ہوئے اور نہ ان کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر ظاہر ہوا۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھنا چاہتے ہو تو ابنِ زبیرؓ کی نماز دیکھو۔

حضرت ابنِ زبیرؓ نے اپنی زندگی میں متعدد حج کیے۔ (ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد شاید ہی کوئی حج ناغہ کیا ہو۔ بعض روایتوں کے مطابق انھوں نے کل آٹھ حج کیے) ایک مرتبہ خانۂ کعبہ میں سیلاب کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ حضرت ابنِ زبیرؓ نے کئی فٹ گہرے پانی میں تیر کر طواف کیا۔

حضرت ابنِ زبیرؓ نہایت حق گو اور بے باک تھے۔ جو دل میں ہوتا زبان پر لے آتے اور کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے۔ حضرت امیر معاویہؓ بڑے طاقت ور فرماں روا تھے لیکن حضرت ابنِ زبیرؓ نے ان کے سامنے یزید کی ولی عہدی پر اعتراض کیا اور کسی صورت میں بھی اس کو قبول کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔

خوارج کی ایک طاقت ور جماعت نے بعض شرائط پر ان کو امداد کی پیش کش کی۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور حضرت ابنِ زبیرؓ کو امداد کی شدید ضرورت تھی لیکن انھوں نے خوارج کی شرائط ماننے سے صاف انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے عقائد اور خیالات سے انحراف کرنے کے لیے تیار نہیں۔

حصین بن نمیر نے ان کو شام چلنے کی دعوت دی اور مدد کا وعدہ کیا بشرطے کہ وہ اس خوں ریزی کو نظر انداز کر دیں، جس کا ارتکاب گزشتہ چند ماہ میں شامیوں نے کیا تھا۔ لیکن ابنِ زبیرؓ ان کی اس ظالمانہ خوں ریزی کو معاف کرنے پر تیار نہ ہوئے اور حصین سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس خوں ریزی کا بدلہ لے کر رہیں گے۔

ابنِ زبیرؓ نے تقریباً بارہ برس تک خلافت کی اس سارے عرصے میں انھیں ایک دن بھی

چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بنو امیہ، مختار ثقفی، خوارج اور دوسرے مخالفین نے انھیں سخت پریشان کیا لیکن انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور بڑے استقلال و استقامت کے ساتھ ہر قسم کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ محاصرۂ مکہ کے آخری دنوں میں بھی جب کامیابی کی کوئی امید نہ رہی تھی وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

پابندیِ سنت کے لحاظ سے بھی حضرت ابنِ زبیرؓ اپنی مثال آپ تھے۔ ہر کام میں رسولِ اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور لوگوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ اپنے عہدِ خلافت میں انھوں نے احکامِ شریعت کے نفاذ و اجرا کے لیے طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا۔

حضرت ابنِ زبیرؓ کی شجاعت وشہامت، دوست اور دشمن سب کے نزدیک مسلّم تھی اور ان کا شمار شجاعانِ عرب میں ہوتا تھا۔ مشہور سپہ سالار مہلّب بن ابی صفرہ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا، آج کل کن لوگوں کو شجاعانِ عرب کہا جاسکتا ہے؟

مہلّب نے جواب دیا۔ ”مصعب بن زبیرؓ، عمر بن عبید اللہ اور عباد بن حصین کو۔

سوال کرنے والے نے حیران ہو کر کہا۔ ”اور عبداللہ بن زبیرؓ؟“

مہلّب نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”وہ تو جن ہیں جن، میں عام انسانوں کا ذکر کر رہا ہوں۔“

مہلّب بن ابی صفرہ کا شمار قرنِ اوّل کے عظیم ترین مسلمان جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ شجاعت کے مفہوم سے جس قدر وہ آگاہ تھے کوئی دوسرا کم ہی ہوسکتا تھا۔ ان کے نزدیک ابنِ زبیرؓ کی شجاعت اتنی غیر معمولی تھی کہ ان کے جیسے شجاعانہ کارناموں کی کسی جن ہی سے توقع کی جاسکتی تھی۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے ”تاریخ الخلفاء“ میں لکھا ہے کہ ابنِ زبیرؓ قریش میں بڑے شہسوار مشہور تھے اور ان کی بہادری کے اکثر واقعات زبان زدِ خواص وعوام تھے۔

حضرت ابنِ زبیرؓ اپنے والدین کے بے حد خدمت گزار تھے اور ان کی اطاعت کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ جنگِ جمل کے موقع پر حضرت زبیرؓ نے حضرت عبداللہؓ کو وصیت کی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرے سر پر جو بھاری قرض ہے اس کی ادائی گی تمھارے ذمہ ہوگی۔

حضرت ابنِ زبیرؓ نے والدِ گرامی کی وصیت کے مطابق ان کے قرض کی پائی پائی چکا دی اور بہ نظرِ احتیاط متواتر چار سال تک حج کے موقع پر اعلان کرتے رہے کہ کسی کا قرض میرے والدِ مرحوم کے ذمہ ہو تو وہ مجھ سے وصول کر سکتا ہے۔ جب ان کو پورا یقین ہو گیا کہ اب کوئی قرض خواہ باقی نہیں رہا تو والدؓ کی میراث تمام وُرثاء میں احکامِ شریعت کے مطابق تقسیم کر دی۔

والدہ حضرت اسماءؓ نے طویل زندگی پائی۔ ان کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور دل و جان سے ان کی خدمت کرتے رہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ان کی خالہ تھیں اور ان کو بہت محبوب رکھتی تھیں۔ انھی کے نام پر انھوں نے اپنی کنیت امِ عبد اللہ رکھ لی تھی۔ جب تک وہ حیات ہیں، حضرت ابن زبیرؓ ان کا حد سے زیادہ ادب و احترام اور مالی خدمت کرتے رہے۔ اُمّ المؤمنینؓ بے حد فیاض اور کشادہ دست تھیں۔ ابنِ زبیرؓ جو کچھ انھیں دیتے بہت جلد راہِ خدا میں صرف کر دیتیں۔ ایک دفعہ ابنِ زبیرؓ کے منہ سے نکل گیا کہ اگر خالہ جان نے ہاتھ نہ روکا تو آیندہ میں ان کی امداد نہ کروں گا۔ اُمّ المؤمنینؓ کو معلوم ہوا تو انھیں بہت رنج ہوا اور انھوں نے ناراض ہو کر قسم کھالی کہ اب عبد اللہ سے کبھی نہ بولوں گی۔ جب ان کی ناراضی طول پکڑ گئی تو ابنِ زبیرؓ بہت گھبرائے۔ حضرت مسور بن مخرمہ اور عبد الرحمٰن بن اسود کی وساطت سے خالۂ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے گلے مل کر رونے لگے لیکن اُمّ المؤمنینؓ خاموش رہیں اس پر حضرت مسورؓ اور عبد الرحمٰنؓ نے حضورؐ کی یہ حدیث بیان کی کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ترکِ کلام جائز نہیں۔ اُمّ المؤمنینؓ نے اشک بار ہو کر فرمایا، میں نے عبد اللہ سے نہ بولنے کی قسم کھائی ہے اور قسم کا توڑنا بھی جائز نہیں لیکن وہ دونوں برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اُمّ المؤمنینؓ بھانجے سے راضی ہو گئیں اور قسم توڑنے کے کفّارہ میں چالیس غلام آزاد کیے۔

حضرت عبد اللہؓ کو والدِ گرامیؓ کے ترکہ میں بہت بڑی جائداد ملی تھی۔ خود بھی متعدد جنگوں میں شریک ہوئے اور کافی مالِ غنیمت حاصل کیا تھا اس لیے فکرِ معاش سے بے نیاز تھے۔ تموّل کے باوجود وہ بہت کفایت شعار تھے لیکن جہاں جائز ضرورت ہوتی دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ تو خیر ان کی خالہ تھیں انھوں نے دوسری اُمہات المؤمنینؓ کی بھی مالی خدمت کرنے سے دریغ نہ کیا۔ کعبہ کی تعمیرِ نو پر بھی بے دریغ روپیہ

خرچ کیا۔ چوں کہ نہایت متقی تھے اس لیے سخی کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ خود انھی لوگوں کی مدد کرتے تھے جن کے بارے میں یقین ہوتا تھا کہ واقعی حاجت مند ہیں۔ البتہ اپنی والدہ حضرت اسماءؓ اور خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ذریعہ (بالواسطہ) ہزاروں روپے راہِ خدا میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ازواج واولاد کی صحیح تعداد اور تفصیل بتانا مشکل ہے کیوں کہ اس بارے میں مؤرّخین کے بیانات میں بہت اختلاف ہے۔ ان کی ایک زوجہ ''خولہ بنتِ منظور فزاریہ'' کا نام بعض روایتوں میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ اسی طرح بعض مؤرّخین نے ان کے چار بیٹوں، خبیب، عباد، حمزہ اور زبیر کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

شکل وصورت میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اپنے جلیل القدر نانا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بہت مشابہ تھے۔ (سفید رنگ، اکہرا جسم، رخساروں پر گوشت کم، پیشانی بلند اور آنکھیں قدرے اندر کو دھنسی ہوئی) بعض اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ ان کے چہرے پر بال نہیں تھے (یا بہت کم تھے) البتہ نہایت بارعب اور طاقت ور تھے۔ دونوں ہاتھوں میں دو تلواریں پکڑ کر بے دریغ چلا سکتے تھے۔ بڑے اچھے شہسوار تھے اور فنونِ حرب میں بہت مہارت رکھتے تھے۔

(۱۳)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا زمانۂ خلافت بہت پُر آشوب تھا لیکن گوناگوں مشکلات کے باوجود انھوں نے اپنے زیرِ اقتدار علاقوں میں قرآن وسنت کے احکام نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ لوگوں کو لہو ولعب میں مبتلا ہونے سے سختی کے ساتھ روکتے تھے اور حضورؐ کی اس حدیث پر عمل کرتے تھے:

''جو شخص منکراتِ شرعیہ کو دیکھے تو اپنی طاقت سے ان کو مٹا دے۔''

انھوں نے اپنے دَورِ خلافت میں اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص شطرنج (نردشیر) کھیلتا ہوا پایا گیا تو خدا کی قسم میں اس کے بال کھنچواؤں گا اور اسے دُرّے لگاؤں گا۔ ایسے مجرم کے پکڑنے والے کو مجرم کے جسم کا تمام سامان ضبط کر کے دے دیا جائے گا۔

ابن زبیرؓ نے امارت وقضا کے محکموں کو ایک دوسرے سے جدا رکھا اور اپنے قضاۃ کو

ہدایت کی کہ وہ اپنے فیصلوں کی بنیاد ہمیشہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ پر رکھیں اور اس معاملہ میں کسی کی رورعایت نہ کریں۔

ابن زبیرؓ اپنے عمال کے انتخاب میں ہمیشہ زہد وتقویٰ اور دین داری کوملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے چند عمّال کے نام یہ ہیں:

حضرت عبداللہؓ بن یزید خطمی (مکہ معظّمہ۔مختصر مدت کے لیے)

حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ (حمص)۔عبداللہ بن مطیع (کوفہ)

مہلّب بن ابی صفرہ (خراسان)۔عبدالرحمٰن بن حجدم (مصر)

مصعب بن زبیرؓ (بصرہ)

ابن زبیرؓ اپنے عمّال پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ اگر کسی عامل کے خلاف انھیں کوئی شکایت پہنچتی تو فوراً اس کی تحقیقات کراتے۔ اگر درست ثابت ہوتی تو شکایت کی نوعیت کے مطابق اس کا تدارک کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنے بیٹے حمزہ کو بصرہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ اس نے بصرہ کے اشراف سے ناروا سلوک کیا۔ حضرت ابن زبیرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے فوراً حمزہ کو بصرہ کی امارت سے معزول کردیا۔ ایک مرتبہ ان کے عاملِ مدینہ جابر بن اسود نے جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیّبؒ کو اس بنا پر کوڑوں سے پٹوایا کہ وہ ابن زبیرؓ کی بیعت سے انکار کرتے تھے۔ ابن زبیرؓ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ سخت رنجیدہ ہوئے اور ایک غضب آلود خط جابر کو لکھا جس میں اس کو اس زیادتی پر ملامت کی اور حکم دیا کہ خبردار سعیدؒ سے کوئی تعرض نہ کرو۔

حضرت ابن زبیرؓ نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ گول (مستدیر) درہم ڈھلوائے، درہم کی ایک طرف محمد رسول اللہ نقش تھا اور دوسری طرف اَمَرَ اللّٰہُ بِالْوَفَاءِ وَالْعَدْلِ۔

حضرت ابن زبیرؓ کے پاس برّی فوج کے علاوہ بحری فوج بھی تھی لیکن وہ اس کی تنظیم پر چنداں توجہ نہ دے سکے۔ مصعب بن زبیرؓ کے قتل کے بعد ان کی بری فوج کی طاقت بھی بالکل کم ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی سیرت وکردار پر بہ غور نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے نہ کبھی کسی جوڑ توڑ اور سازش میں حصہ لیا اور نہ ملکی عہدوں کو سیاسی رشوت کے طور پر استعمال کیا۔

ان کے دورِ خلافت میں کئی موقعے ایسے آئے کہ وہ چاہتے تو سیاسی جوڑتوڑ سے کام لے کر اپنے حریفوں کو مات دے سکتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھا اور کبھی چال بازی سے کام نہیں لیا۔ جو موقف پہلے دن حق سمجھ کر اختیار کیا آخر دم تک اس پر ڈٹے رہے نہ کوئی ترغیب و تحریص ان کو اپنی راہ سے ہٹا سکی اور نہ دشمن کی زبردست قوت ان کو ہراساں کر سکی۔ انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنا حوصلہ بلند رکھا، سر کٹا دیا لیکن دشمن کے سامنے جھکنا گوارا نہ کیا۔ اگر وہ دوسرے سیاسی طالع آزماؤں کی طرح جوڑتوڑ سے کام لیتے یا مکہ معظّمہ سے باہر نکل کر نبرد آزما ہوتے تو شاید آج تاریخِ اسلام کسی اور انداز سے لکھی جاتی لیکن انھوں نے اپنا دامن نہ مکر و فن سے آلودہ ہونے دیا اور نہ ارضِ حرم سے جدا ہونا گوارا کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض معاملات میں حضرت ابنِ زبیرؓ کے طرزِ عمل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قرنِ اوّل کی ایک عظیم شخصیت تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت مغیرہ بن حارث ہاشمیؓ

(۱)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن اصحاب کو آپؐ کے حلقۂ احباب میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ان میں سے ایک مغیرہ بن حارثؓ تھے جو تاریخ میں اپنی کنیت ابوسفیان سے مشہور ہیں۔ وہ حضورؐ کے چچازاد بھائی بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی کیوں کہ دونوں نے حضرت حلیمہ سعدیہؓ کا دودھ پیا تھا۔ حضرت ابوسفیان مغیرہؓ کا نسب نامہ یہ ہے:

مغیرہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی

والدہ کا نام غزنہ (یا بہ روایتِ دیگر غزیہ) تھا جو بنوفہر سے تھیں ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

غزنہ (غزیہ) بنتِ قیس بن طریف بن عبدالعزیٰ بن عامرہ بن عمیرہ بن ودیعہ بن حارث بن فہر۔

مغیرہؓ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر اور جگری دوست تھے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ وہ صورتاً حضورؐ سے مشابہت رکھتے تھے، نہایت حسین وجمیل اور وجیہ۔ فنونِ سپہ گری اور شعروشاعری سے بھی شغف تھا۔ عنفوانِ شباب ہی سے قریش کے نہایت اچھے شہسواروں اور شاعروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ قرابتِ قریبہ اور ہم سنی کے باعث حضورؐ اور ان کے درمیان کمال درجے کی محبت اور الفت تھی۔ حضورؐ اپنے ہم عمر جوانانِ قریش میں ان کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو مغیرہ اس دعوت پر لبیک کہنے اور آپؐ کی تائید وحمایت میں کھڑے ہونے کی بہ جائے آپؐ کے مخالفین کی صف میں

جا شامل ہوئے اور حق کی مخالفت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ان کی مخالفت حضورؐ سے دشمنی اور عناد کی صورت اختیار کر گئی یہاں تک کہ انھوں نے حضورؐ کی ہجو کہنے سے گریز کیا اور نہ اہلِ حق کی ایذا رسانی میں دوسرے اشرارِ قریش سے پیچھے رہے۔ حضورؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے تو بھی مغیرہ کی اسلام دشمنی میں کوئی کمی نہ آئی۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان جتنی لڑائیاں ہوئیں ابوسفیان مغیرہ نے ان سب میں مشرکین کی طرف سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس طرح حق کی پُر زور مخالفت کرتے کرتے انھوں نے پورے بیس برس گزار دیئے۔ ان کا یہ خلافِ توقع طرزِ عمل اور معاندانہ رویّہ حضورؐ کے لیے بڑے دُکھ اور اذیّت کا باعث ہوا اور آپؐ ان سے سخت بے زار ہو گئے۔

(۲)

۸ ہجری میں مغیرہؓ کو خبر ملی کہ سرورِ عالم ﷺ ایک زبردست لشکر کے ساتھ مکہ پر قبضہ کرنے آرہے ہیں۔ یہ خبر سن کر وہ سخت ہراساں ہوئے اور اپنی اہلیہ اور بچوں سے کہا کہ محمدؐ ایک لشکرِ گراں کے ساتھ مکہ پہنچنے والے ہیں، قریش میں اتنی طاقت نہیں کہ ان کی مزاحمت کر سکیں اگر میں مسلمانوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم یہاں سے نکل چلیں۔

اہلیہ بڑی نیک بخت اور سمجھ دار تھیں۔ انھوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا:

> ''کیا اب بھی تمھاری آنکھیں نہیں کھلیں جب کہ عرب و عجم کے لوگ جوق در جوق محمدؐ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ تم پر افسوس ہے کہ ابھی تک اپنی معاندانہ روش پر قائم ہو حالاں کہ تمھیں دوسرے لوگوں سے بڑھ کر محمدؐ کی نصرت و تائید کرنی چاہیے تھی۔''

اہلیہ کی باتوں کا حضرت مغیرہؓ پر خاص اثر ہوا اور جب ان کے بچوں نے بھی اپنی ماں کی تائید کی تو ان کے دل کی دنیا بالکل ہی بدل گئی۔ اسی وقت اپنے غلام ''مذکور'' کو حکم دیا کہ ہمارے لیے ایک اونٹنی اور گھوڑی تیار کرو۔ پھر انھوں نے اپنے نوخیز فرزند جعفرؓ کو ساتھ لیا اور بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونے کے ارادہ سے بہ جانبِ مدینہ چل پڑے، اس وقت مسلمانوں کے ہراول دستے

مقام ابواء تک پہنچ چکے تھے۔ انھیں دیکھ کر مغیرہؓ نے اپنا بھیس بدل لیا اور سواریوں کو کسی جگہ باندھ کر چھپتے چھپاتے ایک میل پیدل چل کر بڑے اسلامی لشکر میں پہنچ گئے۔ اس وقت ان پر خوف اور دہشت کی کیفیت طاری تھی اور ہر آن یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہونے سے پہلے ہی کسی مسلمان کے ہاتھ سے قتل نہ ہو جائیں لیکن حسنِ اتفاق سے یکا یک سرورِ عالم ﷺ ان کے سامنے تشریف لے آئے، وہ آگے بڑھ کر حضورؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ ان کا خیال تھا کہ حضورؐ انھیں اپنے سامنے پا کر خوش ہوں گے لیکن انھیں یہ یاد نہیں رہا تھا کہ گزشتہ بیس برسوں میں دینِ حق کی مخالفت میں وہ کیا کچھ کر چکے تھے۔ آپؐ کی نظر جونہی مغیرہ پر پڑی آپؐ نے اپنا چہرۂ اقدس دوسری جانب پھیر لیا وہ اس رُخ کی طرف ہو گئے تو آپؐ نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ مسلمانوں نے ان سے حضورؐ کی یہ بے التفاتی دیکھی تو انھوں نے بھی اُن سے ترش روئی اختیار کی۔ ایک انصاری صاحبِ رسولؐ حضرت نعیمانؓ کو اس قدر جوش آیا کہ انھوں نے سخت غضب آلود لہجے میں مغیرہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''او دشمن خدا تو وہی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور آپؐ کی دشمنی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب تو اپنی شرارتوں کا مزہ چکھے.....''

حضرت نعیمانؓ کی آواز لحظہ بہ لحظہ تیز اور بلند ہوتی جاتی تھی اور مغیرہ کی خوف کے مارے جان نکلی جاتی تھی یہاں تک کہ انھوں نے دوڑ کر اپنے چچا حضرت عباسؓ کی پناہ لی۔ حضرت عباسؓ نے پہلے تو ان سے بے رُخی برتی لیکن جب انھوں نے حد سے زیادہ منت سماجت کی اور اپنی قرابت کا واسطہ دے کر التجا کی کہ نعیمانؓ اور دوسرے مسلمانوں سے میری جان بچائیے تو حضرت عباسؓ کو رحم آ گیا اور انھوں نے حضرت نعیمانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے نعیمان! ابوسفیان (مغیرہ) رسول اللہ ﷺ کا چچا زاد بھائی اور میرا برادر زادہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج رسول اللہ ﷺ اس سے ناراض ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ کسی دن آپؐ اس کو معاف فرما دیں۔''

حضرت نعیمانؓ، حضرت عباسؓ کی بات سن کر خاموش ہو گئے اور دوسرے مسلمانوں نے بھی انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

(۳)

سرورِ عالم ﷺ نے حجفہ میں نزول اجلال فرمایا تو مغیرہؓ اپنے بیٹے کے ساتھ کاشانۂ رسالت کے باہر بیٹھ گئے۔ حضورؐ باہر تشریف لائے تو انھیں دیکھ کر کراہت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ حضرت مغیرہؓ کو دُکھ تو بہت ہوا تاہم وہ مایوس نہ ہوئے۔ برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر اپنا قصور معاف کرائیں۔ حضورؐ جہاں بھی قیام فرما ہوتے، وہ وہیں پہنچ جاتے لیکن آپؐ اپنا رُخِ اقدس ان کی طرف سے پھیر لیتے۔ آخر حضرت مغیرہؓ اُمّ المومنین حضرت اُمِ سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بڑی لجاجت کے ساتھ درخواست کی کہ بارگاہِ رسالت مآبؐ میں میری سفارش کیجیے۔ وہ مان گئیں اور حضورؐ کی خدمت میں عرض کی:

''یا رسول اللہ اپنے ابنِ عم کو مایوس نہ فرمائیے۔''

ارشاد ہوا: ''مجھے ایسے ابنِ عم کی ضرورت نہیں۔ اس نے مجھے کچھ کم نہیں ستایا۔''

حضرت مغیرہؓ کو حضورؐ کے جواب کا علم ہوا تو اُن کا دل ٹوٹ گیا اور انھوں نے مایوسی کے عالم میں اپنی اہلیہ سے کہا، ''میرے لیے عفو و کرم کا دروازہ بند ہو چکا ہے اب جینے سے کیا حاصل؟ میں اس کم سِن بیٹے کو ساتھ لے کر یہاں سے جا رہا ہوں، دونوں دربدر مارے مارے پھریں گے اور ایک دن بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔''

سرورِ عالم ﷺ کو کسی ذریعے سے حضرت مغیرہؓ کے ارادے کی خبر پہنچ گئی، اس وقت آپؐ کا دریائے کرم جوش پر آ گیا اور آپؐ نے حضرت مغیرہؓ کو اپنے سامنے آنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ دونوں باپ بیٹے چہروں پر ڈھاٹا باندھے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور السّلامُ علیک یا رسول اللہ کہہ کر آگے بڑھے۔ حضورؐ نے خدامِ بارگاہ سے فرمایا، ان کے چہروں سے ڈھاٹا ہٹاؤ، صورت تو نظر آئے۔ انھوں نے فوراً ڈھاٹا ہٹا دیا۔ دونوں باپ بیٹے اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ حضورؐ نے مغیرہؓ کی ایک ہجو کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

''ابوسفیان تم نے مجھ کو کب مکہ سے نکالا تھا؟''

انھوں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ میں پہلے ہی بہت نادم ہوں اب اور ملامت کر کے شرمندہ نہ کیجیے۔''

فرمایا، ''اب کوئی ملامت نہیں۔''

پھر آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو حکم دیا کہ اپنے ابنِ عم کو ساتھ لے جاؤ، اسے وضو اور سنت کی تعلیم دو اور نہلا کر میرے پاس لاؤ۔ حضرت علیؓ نے ارشادِ نبویؐ کی تعمیل کے بعد حضرت مغیرہؓ کو دوبارہ حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا تو آپؐ نے انھیں نماز پڑھائی اور اعلان فرمادیا کہ ابوسفیان سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہو گیا اس لیے تمام مسلمان بھی راضی ہو جائیں۔ حضورؐ کے اس اعلان سے حضرت مغیرہؓ کو اس قدر مسرت ہوئی کہ ان کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ اب ان کی زندگی میں یکسر انقلاب آ گیا اور وہ دینِ حق کے ایک جاں باز سپاہی بن گئے۔

(۴)

قبولِ اسلام کے بعد حضرت ابوسفیان مغیرہؓ ان دس ہزار قدوسیوں میں شامل ہو گئے جنھیں فتح مکہ کے موقع پر رحمتِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اگلے ماہ شوال ۸ ہجری میں غزوۂ حنین پیش آیا تو حضرت مغیرہؓ اس میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ آغازِ جنگ میں بنو ہوازن کی بے پناہ تیر باری سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا تو حضرت مغیرہؓ ان چند اصحاب میں تھے جو سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے تھے۔ جب مشرکین کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو وہ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے گھوڑے کی پیٹھ سے کود پڑے اور دشمن کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عباسؓ نے یہ جاں بازی دیکھ کر حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا ''یارسول اللہ اپنے ابنِ عم سے راضی ہو جائیے۔'' حضورؐ نے فرمایا، میں راضی ہو گیا، اس نے مجھ سے جتنی بھی عداوتیں کیں اللہ ان کو معاف فرمائے۔ پھر آپؐ نے حضرت مغیرہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''میری عمر کی قسم تم میرے بھائی ہو۔'' حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر انھیں اس قدر خوشی ہوئی کہ بے اختیار آپؐ کے قدم مبارک چوم لیے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس وقت حضرت عباسؓ نے حضورؐ کے سفید خچر کی لگام پکڑ رکھی تھی اور حضرت مغیرہؓ نے زین کا پچھلا حصہ تھام رکھا تھا۔ حضورؐ کا ارشاد سنتے ہی وہ مشرکین پر سربکف ہو کر حملہ آور ہوئے، دوسرے مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور مشرکین کو پیچھے دھکیل دیا۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت مغیرہؓ کی سرفروشی اور فدویت کے جذبہ نے حضورؐ کو بہت مسرور کیا اور آپؐ نے انھیں ''اسد اللہ'' اور ''اسد الرسول'' کا لقب عطا فرمایا۔

حنین کے بعد عہد رسالت میں پیش آنے والے دوسرے غزوات میں بھی حضرت مغیرہؓ نے حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

(۵)

قبول اسلام کے بعد حضرت مغیرہؓ نے غزوات ہی میں شریک ہو کر اپنی گزشتہ زندگی کی تلافی نہیں کی بلکہ اپنے روز و شب کا بیشتر حصہ عبادت و ریاضت کے لیے وقف کر دیا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ رات رات بھر نمازیں پڑھتے رہتے تھے اور گرمی کے طویل دنوں میں صبح سے لے کر سورج کے نصف النہار پر آنے تک نوافل پڑھتے رہتے تھے۔ کچھ وقفہ کے بعد یہ پھر سلسلہ جاری کر دیتے یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو جاتا۔ ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ نے انھیں مسجد میں داخل ہوتے دیکھ کر اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا:

"عائشہ! جانتی ہو یہ کون ہے؟"

انھوں نے عرض کیا: "نہیں یا رسول اللہؐ"

ارشاد ہوا: "یہ میرا ابن عم ابوسفیان بن الحارث ہے دیکھو یہ سب سے پہلے مسجد میں داخل ہو رہا ہے اور سب سے بعد اس سے باہر نکلے گا اور اس کی نگاہ اس کے جوتے کے تسمے سے جدا نہیں ہوتی۔"

امام حاکمؒ نے اپنی "مستدرک" میں یہ روایت درج کی ہے کہ حضرت مغیرہؓ کے شغفِ عبادت و ریاضت کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے انھیں "جوانانِ جنت کے سردار" کا لقب عطا فرمایا۔ اسی زمانے میں حضرت مغیرہؓ نے سید الانام ﷺ کی مدح میں بہت سے اشعار کہے جن کا رنگ یہ تھا:

لقد نطق المامون بالصدق و الھدیٰ و بین الاسلام دیناً و منھجا

یعنی مامون (رسول اللہؐ) نے سچائی اور ہدایت کی باتیں ہمیں بتائیں اور اسلام کا دین اور راستہ واضح فرمادیا۔

حضرت مغیرہؓ اپنے نئے دورِ حیات میں قبلِ بعثت کے زمانہ کی طرح پھر سرورِ عالم ﷺ کی محبت اور شفقت کا مورِد بن گئے۔ آپؐ فرطِ محبت میں انھیں "خیر اہلی" فرمایا کرتے تھے۔

حضرت مغیرہؓ کو بھی حضورؐ سے اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ اس کی کوئی حد و نہایت نہیں تھی۔ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہوا تو دنیا ان کے لیے اندھیر ہوگئی اور انھوں نے ایک دل دوز مرثیہ کہا۔ تین چار سال بعد ان کے محبوب بھائی نوفل بن حارثؓ نے وفات پائی تو ان کا دل دنیا سے بالکل سرد ہو گیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے دعا مانگی کہ الٰہی، رسول اللہ ﷺ اور بھائی کے بعد زندگی تلخ اور دنیا بے لطف ہوگئی ہے اس لیے جلد دنیا سے اٹھا لے —— اس دعا کے چند ہی دن بعد حج کا موسم آ گیا، وہ حج میں شریک ہوئے۔ منیٰ میں سر منڈایا تو سر میں ایک پھنسی کو استرا لگ گیا اس سے ایسا خون جاری ہوا کہ کسی طرح رکنے میں نہ آتا تھا۔ مدینہ منوّرہ واپس گئے تو خود اپنی قبر کھودی۔ حالت نازک ہوئی تو اعزّہ و اقارب رونے لگے۔ انھوں نے سب کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا، اسلام کے بعد سے آج تک اللہ نے ہر لغزش سے محفوظ رکھا۔ قبر کھودنے کے تیسرے دن پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں سپردِ خاک کیا۔ انھوں نے اپنے پیچھے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں چھوڑیں لیکن ان سے نسل نہیں چلی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو العاص بن ربیعؓ

(۱)

سیدنا حضرت ابوالعاص بن ربیعؓ قریش کے ان تین خوش بخت فرزندوں میں سے ایک ہیں جنھیں فخرِ موجودات سرورِ کائنات رحمتِ دو عالم ﷺ کے خویش بننے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ دوسرے دو حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں۔ حضرت ابوالعاصؓ کا نام باختلافِ روایت لقیط، مہشم یا ہشیم تھا لیکن انھوں نے اپنی کنیت ابوالعاص ہی سے شہرت پائی۔

ان کا تعلق قریش کے نہایت معزز خاندان بنو عبدِ شمس سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوالعاصؓ بن ربیع بن عبد العزیٰ بن عبدِ شمس بن عبدِ مناف بن قصی۔

عبدِ مناف پر ان کا سلسلۂ نسب سرورِ عالم ﷺ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔

والدہ کا نام ہالہ بنتِ خویلدؓ تھا جو اسلام کی خاتونِ اوّل اُمُّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ جمہور اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ وہ شرفِ اسلام و صحابیت سے بہرہ ور ہوئیں اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

حافظ ابنِ عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ وہ سرورِ عالم ﷺ سے ملنے کے لیے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ گئیں۔ آستانۂ رسالت پر پہنچ کر انھوں نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ ان کی آواز حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی آواز سے بہت ملتی تھی۔ حضورؐ کے سمعِ مبارک تک آواز پہنچی تو آپؐ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ یاد آگئیں اور آپؐ نے اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا: ''(خدیجہؓ کی بہن) ہالہ ہوں گی۔'' وہ اندر آئیں تو حضورؐ نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی۔

اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اپنے بھانجے ابو العاصؓ سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان کو اپنا فرزند سمجھتی تھیں۔ ابو العاصؓ عنفوانِ شباب ہی میں تجارت میں مشغول ہو گئے تھے اور اپنی سمجھ بوجھ اور خوش معاملگی کی بہ دولت بڑے وسیع کاروبار کے مالک ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کا شمار قریش کے صاحبِ ثروت لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی دیانت اور حسنِ معاملہ پر لوگوں کو اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے۔ بہ قول ابنِ اثیرؒ وہ بھی سرورِ عالم ﷺ کی طرح ''الامین'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابو العاصؓ ''امین'' ہونے کے علاوہ بڑے دلیر اور بہادر بھی تھے۔ اہلِ عرب نے ان کی شجاعت کے اعتراف میں انھیں ''جرد البطحا'' (شیرِ حجاز) کا لقب دے رکھا تھا۔ بعثت سے کچھ عرصہ پہلے سرورِ عالم ﷺ نے اپنی بڑی صاحب زادی حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت ابو العاصؓ سے کر دیا۔ اس رشتہ کا محرک جہاں ابو العاصؓ کے اخلاقِ حمیدہ تھے وہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی خواہش اور اصرار بھی تھا۔ اہلِ سِیَر نے یہ تصریح نہیں کی کہ نکاح کے وقت حضرت زینبؓ کی عمر کیا تھی لیکن بہر صورت وہ کم سن تھیں۔ اس لیے قیاس یہ ہے کہ پہلے ان کا حضرت ابو العاصؓ سے نکاح ہوا ہوگا اور رخصتی چند سال بعد ہوئی ہوگی۔

سرورِ عالم ﷺ نے بعثت کے بعد دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ حضرت زینبؓ بھی مشرف بہ اسلام ہو گئیں لیکن حضرت ابو العاصؓ بعض موانع اور مصالح کی بنا پر اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے تاہم انھوں نے دینِ حق یا ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے خلاف کسی سرگرمی میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ قریش کے چند لوگوں نے حضرت ابو العاصؓ کو مجبور کیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں اور قریش کی کسی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیں لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہی سبب تھا کہ حضورؐ ان کے قبولِ اسلام سے پہلے بھی ان کا تذکرہ ہمیشہ بھلائی ہی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

۷ بعدِ بعثت میں مشرکینِ قریش نے سرورِ عالم ﷺ اور آپؐ کے حامی ہاشمیوں اور مطلّبیوں کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا اور کھانے پینے کی کوئی بھی چیز شعب کے اندر لے جانے کی ممانعت کر دی۔ یہ ہول ناک مقاطعہ پورے تین برس تک جاری رہا۔ اس دوران میں

مشرکین کی پابندیوں اور روک ٹوک کے باوجود حضرت ابوالعاصؓ جان پر کھیل کر کھانے پینے کی کچھ چیزیں کبھی کبھی شعب کے اندر پہنچا دیا کرتے تھے۔ بہ قول مرزا محمد تقی صاحبِ ''ناسخ التواریخ'' حضورؐ نے ان کی اس خدمت کا اعتراف ان الفاظ میں فرمایا:

''ابوالعاص نے ہماری دامادی کا حق ادا کر دیا۔''

(۲)

نبوّت کے تیرہویں سال سرورِ عالم ﷺ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو حضرت زینبؓ اپنے سسرال میں تھیں۔ حضرت ابوالعاصؓ اپنے آبائی مذہب پر ہونے کے باوجود ان سے نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ ۲ ہجری میں مشرکین مکہ غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت ابوالعاصؓ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ کوئی صحت مند شخص لڑائی کو پسند نہ کرنے کے باوجود پیچھے نہیں رہ سکتا تھا کیوں کہ اس صورت میں مشرکین اس کو بزدلی کا طعنہ دیتے تھے اور کسی قرشی کے لیے یہ طعنہ بڑے ننگ کی بات تھی۔ میدانِ بدر میں قریش کو شکست ہوئی تو حضرت ابوالعاصؓ ایک انصاری جاں باز حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے ہاتھ اسیر ہو گئے۔ ان کے ساتھ دوسرے بہت سے مشرکین کو بھی مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔

اہلِ مکہ نے یہ خبر سنی تو قیدیوں کے قرابت داروں نے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں اپنے عزیزوں کی رہائی کے لیے زرِ فدیہ بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے بھی اپنے دیور عمرو بن ربیع کے ہاتھ یمنی عقیق کا ایک ہار حضرت ابوالعاصؓ کی رہائی کے لیے بھیجا۔ یہ ہار حضرت زینبؓ کو ان کی مرحومہ والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے شادی کے وقت تحفہ میں دیا تھا۔ جب حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں یہ ہار پیش کیا گیا تو آپؐ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ یاد آ گئیں اور آپؐ اشک بار ہو گئے۔ حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار! زینبؓ کو واپس بھیج دو۔ یہ اس کی ماں کی نشانی ہے۔
ابوالعاص کا فدیہ یہ ہے کہ وہ مکہ جا کر زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں۔''

تمام صحابۂ کرامؓ نے ارشادِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت ابوالعاصؓ نے بھی یہ شرط قبول کر لی۔ وہ رہا ہو کر مکہ پہنچے اور وعدہ کے مطابق حضرت زینبؓ کو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ بن ربیع کے ساتھ مدینہ منورہ کی جانب روانہ کر دیا۔ مشرکین قریش کو جب یہ اطلاع ملی کہ

حضرت زینبؓ مدینہ جارہی ہیں تو انھوں نے کنانہ بن ربیع اور حضرت زینبؓ کا تعاقب کیا اور مقام ''ذی طویٰ'' میں انھیں جا گھیرا۔ حضرت زینبؓ اونٹ پر سوار تھیں۔ ایک مشرک ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو اپنے نیزے سے زمین پر گرا دیا۔ (یا اونٹ کا منہ پھیرنے کے لیے اپنا نیزہ گھمایا، اونٹ تیزی سے پیچھے مڑا تو حضرت زینبؓ گر پڑیں) وہ حاملہ تھیں سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا۔ کنانہ بن ربیع غضب ناک ہو گئے۔ ترکش سے تیر نکالے اور للکار کر کہا، ''خبردار اب تم میں سے کوئی آگے بڑھا تو اسے چھلنی کر دوں گا۔'' کفار رُک گئے۔ ابوسفیان نے کنانہ سے مخاطب ہو کر کہا، ''بھتیجے اپنے تیر روک لو میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

کنانہ نے پوچھا، ''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

ابوسفیان نے ان کے کان میں کہا ''محمدؐ کے ہاتھوں ہمیں جس ذلّت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑا ہے تمھیں اس کا علم ہے اگر تم اس کی بیٹی کو اس طرح علانیہ ہمارے سامنے لے جاؤ گے تو ہماری بڑی بے عزتی ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس وقت زینب کے ہم راہ مکہ واپس آجاؤ اور پھر کسی وقت پوشیدہ طور پر زینب کو لے جاؤ۔'' کنانہ نے یہ بات مان لی اور حضرت زینبؓ کو ساتھ لے کر مکہ واپس آگئے۔ چند دن بعد وہ رات کو چپکے سے حضرت زینبؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل آئے اور انھیں مدینہ منوّرہ پہنچا دیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابوالعاصؓ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہؓ کو بھیجا تھا کہ وہ حضرت زینبؓ کو اپنے ہم راہ مدینہ لے آئیں۔ حضرت زیدؓ ''بطن یاجج'' کے مقام پر ٹھہر گئے تھے۔ کنانہ حضرت زینبؓ کو اس مقام تک پہنچا کر مکہ واپس چلے گئے اور وہاں سے حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو اپنے ہم راہ مدینہ لے گئے۔

حضرت زینبؓ کے جانے کے بعد قریش کا ایک وفد حضرت ابوالعاصؓ کے پاس گیا اور ان سے خواہش کی کہ تم زینبؓ کو طلاق دے دو اس کے بدلے میں قریش کی جس عورت کو تم پسند کرو گے ہم اس کے ساتھ تمھاری شادی کر دیں گے۔ حضرت ابوالعاصؓ نے جواب دیا:

''خدا کی قسم۔ میں زینب کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ قریش کی کوئی اور عورت اس کی برابری نہیں کر سکتی۔''

اس پر قریش کا وفد اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

(۳)

حضرت ابوالعاصؓ کو حضرت زینبؓ سے بہت محبت تھی۔ ان کے مدینہ منوّرہ چلے جانے

کے بعد وہ بہت بے چین رہنے لگے۔ ایک دفعہ جب وہ شام کی طرف سفر کر رہے تھے تو بڑی پُر درد آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے:

ذکرت زینب لما درکت ارما
فقلت سقیاً لشخص یسکن الحرما
بنت الامین جزاھا اللہ صالحہ
و کل بعلٍ یثنی ما الّذی علما

''جب میں ارم کے مقام سے گزرا تو زینب کو یاد کیا اور کہا کہ خدا اس شخص کو شاداب رکھے جو حرم میں مقیم ہے
امینؐ کی بیٹی کو خدا جزائے خیر دے۔
اور ہر خاوند اسی بات کی تعریف کرتا ہے جس کو وہ خوب جانتا ہے۔''

۶ ہجری میں حضرت ابو العاصؓ ایک تجارتی قافلے کے ہم راہ شام جا رہے تھے کہ عیص کے مقام پر مجاہدینِ اسلام کی ایک جماعت نے قافلے پر چھاپہ مارا اور تمام مال واسباب پر قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کے لوٹنے کے بعد حضرت ابو العاصؓ بھی سیدھے مدینہ منوّرہ پہنچے اور حضرت زینبؓ کے پاس جا کر پناہ طلب کی۔ انھوں نے بلا تامّل ان کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ صبح کو جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے مسجدِ نبوی میں آئے تو حضرت زینبؓ نے بآوازِ بلند کہا: '' انی قد اجرت ابا العاص بن الربیع''

''مسلمانو! میں نے ابوالعاص بن ربیع کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔''

حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''لوگو تم نے کچھ سنا؟''

سب نے عرض کیا: ''ہاں یارسول اللہ''

حضورؐ نے فرمایا: ''خدا کی قسم اس سے پہلے مجھے اس واقعہ کی کوئی اطلاع نہ تھی اور پناہ دینے کا حق تو ہر ادنیٰ مسلمان کو بھی حاصل ہے۔''

اس کے بعد حضورؐ گھر تشریف لائے تو حضرت زینبؓ نے سفارش کی کہ ابوالعاصؓ کا مال انھیں واپس کر دیا جائے۔

چوں کہ حضرت ابو العاصؓ نے حضرت زینبؓ سے مکہ میں بہت اچھا سلوک کیا تھا اس لیے حضورؐ ان کا لحاظ کرتے تھے۔ آپؐ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا:

''تم میرے اور ابو العاص کے رشتہ سے واقف ہو اگر تم اس کا مال واپس کر دو گے تو یہ تمھارا احسان ہوگا اور میری خوشی کا باعث ہوگا۔ اگر نہ کرو گے تو یہ خدا کا عطیہ اور تمھارا حق ہے۔ مجھ کو اس پر کوئی اعتراض یا اصرار نہیں ہے۔''

صحابۂ کرامؓ کو تو ہر وقت خوش نودیِ رسولؐ مطلوب تھی فوراً تمام مال واسباب حضرت ابو العاصؓ کو واپس کر دیا۔ وہ اسے لے کر مکہ پہنچے اور تمام لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں۔ پھر اہلِ مکہ سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے اہلِ قریش اب میرے ذمہ کسی کی کوئی امانت یا مال تو نہیں ہے؟''

تمام اہلِ مکہ نے یک زبان ہو کر کہا: ''بالکل نہیں، خدا تمھارا بھلا کرے تم ایک نیک نہاد اور باوفا شخص ہو۔''

حضرت ابو العاصؓ نے ان کا جواب سن کر کہا:

''تو سن لو کہ میں مسلمان ہوتا ہوں، خدا کی قسم اسلام قبول کرنے میں مجھے صرف یہ امر مانع تھا کہ تم مجھے خائن نہ سمجھو۔''

یہ کہہ کر کلمۂ شہادت پڑھا اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ یہ محرم ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔

مدینہ پہنچ کر حضرت ابو العاصؓ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور باقاعدہ مشرف بہ ایمان ہو گئے۔

حضرت ابو العاصؓ کے قبولِ اسلام کے بعد حضورؐ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کے نکاح کی تجدید فرمائی یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تجدید نہیں فرمائی اور حضرت زینبؓ کو بعقدِ اوّل ان کی طرف رجوع کر دیا۔ دوسری یہ کہ حضرت زینبؓ اور حضرت ابو العاصؓ میں شرک کی وجہ سے تفریق ہو گئی تھی اس لیے حضورؐ نے حضرت ابو العاصؓ کے قبولِ اسلام کے بعد حضرت زینبؓ کو پہلے حقِ مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر کے حضرت ابو العاصؓ کے گھر بھیجا۔

(۴)

حضرت ابو العاصؓ مکہ میں بڑا وسیع تجارتی کاروبار چھوڑ آئے تھے اور ان کے حسنِ معاملہ اور دیانت وامانت کی وجہ سے مشرکین کو ان کے مسلمان ہونے کے باوجود مکہ میں رہنے پر کوئی

اعتراض نہیں تھا۔ چناں چہ وہ حضورؐ سے اجازت لے کر پھر مکہ آ گئے اور حسبِ سابق اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ مکہ میں قیام کی وجہ سے انھیں غزوات میں شریک ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

حافظ ابنِ حجرؒ کے بیان کے مطابق وہ صرف ایک سریّہ میں شریک ہوئے جو حضورؐ نے ۱۰ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سرکردگی میں یمن بھیجا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے یمن سے مراجعت کرتے وقت حضرت ابوالعاصؓ کو یمن کا عامل بنا دیا تھا۔

حضرت ابوالعاصؓ کی اہلیہ حضرت زینب بنتِ رسول اللہؐ ۸ ہجری میں وفات پا گئیں۔ حضرت ابوالعاصؓ کو ان کی وفات سے بے حد صدمہ پہنچا لیکن انھوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور بچوں کی غور پرداخت میں مصروف رہنے لگے۔ حضرت زینبؓ سے وفاداری کا حق انھوں نے یوں ادا کیا کہ ان کے بعد کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔

حافظ ابنِ عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالعاصؓ نے ذی الحجہ ۱۲ ہجری میں وفات پائی لیکن تاریخ ابنِ مندہ والاکمال میں ہے کہ حضرت ابوالعاصؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں فتنۂ رِدّہ کے استیصال میں بھرپور حصہ لیا اور مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کی لڑائی میں مردانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت پیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت زینبؓ کے بطن سے حضرت ابوالعاصؓ کی دو اولادیں ہوئیں۔ ایک فرزند علیؓ اور ایک صاحب زادی اُمامہؓ۔

حضرت علی بن ابوالعاصؓ سرورِ عالم ﷺ کے سب سے بڑے نواسے تھے اور آپؐ کو بے حد محبوب تھے۔ ان کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں۔

پہلی روایت یہ ہے کہ وہ صغرسنی میں وفات پا گئے۔

(رحمۃ للعالمین جلد دوم۔ قاضی سلمان منصور پوری)

(سیر الصحابہ حصہ ہفتم۔ شاہ معین الدین احمد ندوی)

دوسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے رضاعت کے دو سال قبیلہ بنی غاضرہ میں گزارے۔ حضورؐ نے ایّامِ رضاعت کے بعد ان کو مدینہ منوّرہ منگوا لیا اور خود ان کی پرورش و تربیت فرمائی۔ آپؐ نے حضرت زینبؓ اور حضرت ابوالعاصؓ سے یہ بچہ مانگ لیا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر یہی علیؓ سبطِ رسول سرورِ عالم ﷺ کی اونٹنی پر آپؐ کے ردیف تھے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی۔ (''الاصابہ'' لابن حجر عسقلانیؒ) انھوں نے سنِ بلوغ کے عنفوان میں اپنے والد حضرت ابوالعاصؓ کی زندگی میں وفات پائی۔ (الاستیعاب۔ لابنِ عبد البرؒ)

تیسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے جنگِ یرموک (۱۵ ہجری) میں جامِ شہادت پیا۔
(تاریخ ابنِ عساکرؒ)

حضرت اُمامہ بنتِ ابو العاصؓ طویل عرصے تک زندہ رہیں۔ حضورؐ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ ایک دفعہ نجاشی (شاہِ حبشہ) نے ایک انگوٹھی حضورؐ کی خدمت میں بہ طور تحفہ بھیجی۔ آپؐ نے فرمایا:

''یہ انگوٹھی میں اس کو دوں گا جو مجھے سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔'' (اَحَبُّ اَھلِیُ اِلَیَّ)

سننے والوں کا خیال تھا کہ آپؐ یہ انگوٹھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دیں گے لیکن آپؐ کی مراد بڑوں کی بجائے بچوں سے تھی۔ چناں چہ آپؐ نے حضرت امامہؓ کو بلایا اور یہ انگوٹھی انھیں پہنادی۔ بعض روایتوں میں انگوٹھی کے بہ جائے زرّیں ہار کا ذکر ہے جو کسی نے ہدیۃً بھیجا تھا۔ حضورؐ نے حضرت امامہؓ کو بلا کر یہ ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ کی حضرت اُمامہؓ سے محبت کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ انھیں بعض اوقات اپنے ساتھ مسجد میں لے جاتے تھے۔ ایک دن آپؐ اس حالت میں مسجد میں پہنچے کہ حضرت اُمامہؓ دوشِ مبارک پر سوار تھیں۔ آپؐ نے اسی حالت میں نماز پڑھنی شروع کر دی۔ جب رکوع اور سجدے میں جاتے تو ننھی اُمامہؓ کو آہستہ سے اتار دیتے۔ جب کھڑے ہوتے تو پھر دوش مبارک پر بٹھا لیتے۔ اسی طرح پوری نماز ادا فرمائی۔

حضرت زینبؓ نے ۸ ہجری میں وفات پائی تو حضرت اُمامہؓ شفیق نانا کی سرپرستی اور نگرانی میں آ گئیں۔ حضورؐ کے وصال کے بعد والدِ گرامی حضرت ابو العاصؓ ان کے نگراں بنے۔ انھوں نے اپنی وفات (شہادت) سے پہلے حضرت اُمامہؓ کو حضرت زبیر بن العوامؓ (اپنے ماموں زاد بھائی) کی سرپرستی میں دے دیا۔ حضرت فاطمہ الزہراؓ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اور حضرت زبیرؓ کے ایما پر حضرت علیؓ نے حضرت اُمامہؓ سے نکاح کر لیا۔ ۴۰ ہجری میں حضرت علیؓ نے شہادت پائی تو وہ مغیرہ بن نوفلؓ (بن حارث بن عبد المطلب) کے عقدِ نکاح میں آئیں اور ان کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت اُمامہؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور بہ قولِ بعض، مغیرہ کی صُلب سے ان کا ایک لڑکا یحییٰ پیدا ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت یزید بن ابوسفیانؓ

(۱)

حضرت ابو خالد یزید بن ابوسفیانؓ کا شمار اُن شجاعانِ اسلام میں ہوتا ہے جنھوں نے باطل کے مقابلے میں اپنی نوکِ شمشیر سے تاریخِ اسلام کا ایک ولولہ انگیز باب رقم کیا۔ ان کا تعلق قریش کی معزز شاخ بنو امیہ سے تھا اور وہ سپہ سالارِ قریش ابوسفیانؓ (بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبدِ مناف بن قصی) کے فرزند دلبند تھے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ وہ ابوسفیانؓ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق، بہادر، فیّاض اور نیک خو تھے اسی لیے اہلِ مکہ میں ''یزید الخیر'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ حبیبہؓ، حضرت یزیدؓ کی علاّتی (ماں کی طرف سے سوتیلی) بہن تھیں۔ اس طرح وہ سرورِ عالم ﷺ کے برادرِ نسبتی (سالے) تھے۔ مدبّرِ عرب امیر معاویہؓ اُن کے چھوٹے علاّتی بھائی تھے۔ امّ المومنین حضرت امِ حبیبہؓ تو بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے ہی میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئی تھیں اور یوں سابقون الاوّلون کی مقدّس جماعت میں داخل ہو گئی تھیں البتہ حضرت یزیدؓ اپنے دوسرے اہلِ خاندان کے ساتھ فتح مکہ (رمضان ۸ ہجری) کے موقع پر مشرّف بہ اسلام ہوئے تاہم اس سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی انھوں نے نہ کبھی مسلمانوں کو ایذا پہنچائی اور نہ کبھی اخلاق سے گری ہوئی کوئی حرکت کی۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت یزیدؓ نے سب سے پہلے غزوۂ حنین (شوال ۸ ہجری) میں شرکت کی —— فتح کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو حضرت یزیدؓ کو چالیس اوقیہ

(سونا یا چاندی) اور سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ غزوۂ حنین کے بعد حضورؐ نے حضرت یزیدؓ کو بنی فراس کا امیر بنایا۔

(۲)

حضرت یزید بن ابوسفیانؓ شجاعت و شہامت میں اپنا جواب آپ تھے لیکن بہت آخر میں اسلام لائے تھے اس لیے عہدِ رسالت میں انھیں اپنی شمشیر خارا شگاف کے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتاً فتنۂ ارتداد نے سارے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خلیفۃ الرسول نے جو عزم و استقامت کا پہاڑ تھے، چند ماہ کے اندر اندر اس فتنہ کو کچل دیا۔ اس کے بعد وہ روم اور ایران کی جانب متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے شام پر لشکر کشی کی تیاری کی جس پر قیصرِ روم (ہرقل) کی حکومت تھی۔ صدیقِ اکبرؓ نے سارے عرب میں جہاد کی منادی کرادی۔ اس پر ہر طرف سے مجاہدین جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے۔ جب کافی لوگ جمع ہوگئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت یزید بن ابوسفیانؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور حضرت معاذ بن جبل انصاریؓ کو طلب کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تم لوگوں کو جہادِ شام کی ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔ جتنی فوج جمع ہوگی میں اس کو تم میں سے ہر ایک کی قیادت میں جدا جدا روانہ کروں گا۔ اگر میدان جہاد میں تم سب یکجا ہوگے تو سپہ سالارِ اعلیٰ ابوعبیدہ بن الجراحؓ ہوں گے اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو یزید بن ابی سفیانؓ تمام فوجوں کی قیادت کریں گے۔ اب تم لوگ جاؤ اور شام جانے کی تیاری کرو۔''

چند دن بعد جب مزید مجاہدین مدینہ پہنچ گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ لشکر گاہ میں تشریف لے گئے اور حضرت یزید بن ابوسفیانؓ کو علم مرحمت فرما کر روانگی کا حکم دیا۔ حضرت یزید بن ابی سفیانؓ گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوئے تو خلیفۃ الرسول سیدنا صدیق اکبرؓ پاپیادہ ان کی مشایعت کے لیے چلے۔ حضرت یزید بن ابوسفیانؓ نے فرطِ ادب سے عرض کیا ''اے خلیفۃ الرسول یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا مجھے اجازت دیں کہ میں بھی سواری سے اتر پڑوں، مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میں سواری پر ہوں اور آپ پاپیادہ۔''

صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا:

''نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تمھیں سواری سے اترنے دوں گا۔ میں جتنے قدم چلتا ہوں انھیں خدا کی راہ میں شمار کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کا اجر دے گا۔''

کچھ دور جا کر صدیقِ اکبرؓ، حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو الوداع کہنے لگے تو انھیں یہ وصیت فرمائی:

''ابو خالد شام میں تم کو بہت سے مقامات پر تارک الدنیا راہبوں سے واسطہ پڑے گا، ان کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ تم کو جنگ میں بعض ایسے لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو بیچ سے سر منڈاتے ہیں۔ تم اور تمھارے ساتھی ان کے اسی حصہ پر تلوار ماریں۔ اس کے علاوہ دس باتوں کا خاص خیال رکھنا، عورتوں بچوں اور بڈھوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ سبز درختوں کو نہ کاٹنا، بستیوں کو ویران نہ کرنا، بکریوں اور اونٹوں کو ضرورت کے علاوہ ذبح نہ کرنا، درختوں کو آگ نہ لگانا، کسی کو پانی میں نہ ڈبونا، خیانت نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔''

اس کے بعد انھوں نے حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کا ہاتھ پکڑ کر جوشِ محبت سے فرمایا:

''یزید میں تمھیں اللہ کے حوالے کرتا ہوں، تم پر خدا کی رحمت و سلامتی ہو، تم میرے سب سے پہلے سپہ سالار رہو (جو مدینہ منوّرہ سے رخصت ہو رہے ہو)۔''

مدینہ منوّرہ سے رخصت ہو کر حضرت یزید بن ابوسفیانؓ تیزی سے شام کی طرف بڑھے۔ اسی اثنا میں حضرت خالد بن ولیدؓ بھی عراقِ عرب کی مہمات سے فارغ ہو کر ان کے پاس پہنچ گئے اور دونوں نے مل کر شام کے سرحدی شہر بصریٰ پر حملہ کیا۔ ورنجار نامی رومی بطریق نے پانچ ہزار کی جمعیت کے ساتھ مسلمانوں کا سخت مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی۔ آخر میں اُس نے اس شرط پر صلح کر لی کہ مسلمان رومیوں کی جان و مال کی حفاظت کریں گے اور وہ مسلمانوں کو اس کے عوض جزیہ دیں گے۔

(۳)

حضرت یزید بن ابوسفیانؓ کے شام آنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کو بھی لشکر دے کر شام روانہ کر دیا۔

ساتھ ہی حضرت عمرو بن العاصؓ کو جو عمان میں تھے، حکم بھیجا کہ تم بھی اپنی فوج کے ساتھ شام پہنچ جاؤ۔ یہ سارے لشکر شام کے مختلف مقامات پر پھیل گئے۔ اُدھر قیصرِ روم کو شام میں مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے ایک زبردست لشکر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ اس لشکر نے فلسطین کے ایک مقام اجنادین میں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ (فلسطین اس زمانے میں شام ہی کا ایک حصہ تھا) رومی لشکر کی قیادت دو نامور سردار تذارق اور قبقلار کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو رومیوں کے اجتماع کی خبر ملی تو وہ بھی ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر اجنادین پہنچ گئے۔ ان کی قیادت حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت یزید بن ابی سفیانؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کر رہے تھے۔ بہ روایت ابنِ اسحاقؒ ۲۸ رجمادی الاولیٰ ۱۳ھ ۶۳۴ء کو رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ رومی جان توڑ کر لڑے لیکن پرجوش مسلمانوں کے تیز و تند حملوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور جلد ہی ان پر ہزیمت کے آثار طاری ہونے لگے۔ تذارق اور قبقلار نے اپنی فوج کو بڑی غیرت دلائی اور دیر تک اسے سنبھالے رکھا لیکن جب وہ دونوں مسلمان جاں بازوں کی تلواروں کا نشانہ بن گئے تو رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس لڑائی میں تین ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت پیا لیکن رومی مقتولوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی۔

مؤرّخ ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ شہدائے اجنادین میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے بھائی حضرت ہشام بن العاصؓ بھی تھے۔ وہ سابقون الاوّلون میں سے تھے اور دو ہجرتوں کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ مسلمانوں نے رومیوں کا تعاقب کیا تو راستے میں انھیں ایک تنگ گھاٹی ملی جس سے صرف ایک ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ جو مسلمان اس مقام سے پار ہو گئے رومی ان سے لڑنے لگے، حضرت ہشامؓ شہید ہو کر اس تنگ مقام میں گر پڑے۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچتا تھا حضرت ہشامؓ کی لاش کو روندے بغیر گھاٹی کو پار نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہیں رُک جاتا تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ وہاں پہنچے تو مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"برادرانِ اسلام! اللہ نے میرے بھائی کو شہادت عطا کی اور اس کی روح کو اٹھالیا۔ یہاں تو صرف اس کا جسم ہے اس لیے تم لوگ اس کی لاش پر سے گھوڑے لے جاؤ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے خود گھوڑا بڑھایا ساتھ ہی ان کے پیچھے دوسرے مجاہدین بھی چل

پڑے اور شہیدِ راہِ حق حضرت ہشامؓ کی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ لڑائی ختم ہوئی تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے بھائی کی لاش کے ٹکڑوں کو بورے میں بھر کر سپردِ خاک کیا۔

اجنادین کے معرکے کے بعد مسلمان شام کے صدر مقام دمشق کی طرف بڑھے اور جاتے ہی چاروں طرف سے اس کا محاصرہ کرلیا۔ شہر پناہ کے بڑے بڑے دروازوں پر وہ افسر متعین ہوئے جو شام کے مختلف صوبوں کی تسخیر پر مامور ہو کر آئے تھے۔ چناں چہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ باب الجابیہ پر، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ باب الفرادیس پر، حضرت عمرو بن العاصؓ بابِ توما پر، حضرت خالد بن ولیدؓ باب الشرق پر اور حضرت یزید بن ابوسفیانؓ بابِ کیسان پر متعین ہوئے۔ یہ محاصرہ عرصہ تک (ایک روایت کے مطابق چھ ماہ تک) جاری رہا۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی اور حضرت عمر فاروقؓ مسند نشین خلافت ہوئے۔ انھوں نے ایک خط لکھ کر حضرت ابوعبیدہؓ کو صدیقِ اکبرؓ کی وفات کی اطلاع دی اور جو قاصد یہ خط لے کر گیا اس کو تاکید کی کہ وہ حضرت ابوعبیدہؓ سے بہ طورِ خاص حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت یزید بن ابوسفیانؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کا حال دریافت کرے۔ اس کے استفسار پر حضرت ابوعبیدہؓ نے اسے بتایا کہ یہ سب اصحاب اپنے طور طریق اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں ویسے ہی ہیں جیسا انھیں میرے اور عمرؓ کے نزدیک ہونا چاہیے۔

چھ ماہ محصور رہنے کے بعد دمشق کی رومی فوجوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا کیوں کہ ایک شب ان کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر حضرت خالد بن ولیدؓ چند جاں بازوں کے ساتھ فصیلِ شہر پر چڑھ گئے اور پھر دوسری جانب نیچے اتر کر شہر کے دروازے کھول دیئے۔ ادھر اسلامی لشکر تیار کھڑا تھا، سیلاب کی طرح شہر میں داخل ہوگیا۔ رومیوں نے معمولی مزاحمت کی لیکن بالآخر ہتھیار پھینک کر صلح کی ملتجی ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے ان پر جزیہ عائد کر کے صلح منظور کرلی۔

دمشق کی فتح نے رومیوں کو سخت برہم کیا اور وہ ہر طرف سے جمع ہو کر بڑے زور اور قوّت کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے آمادہ ہوئے۔ علامہ طبریؒ کا بیان ہے کہ چالیس ہزار (بہ روایت دیگر اسی ہزار) رومی ہیکلار نامی ایک نامور جرنیل کی قیادت میں اُردن کے شہر بیسان میں خیمہ زن ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ اُردن کی طرف بڑھے اور بیسان کے مقابل فحل کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ رومیوں نے پہلے قاصد

بھیج کر حضرت ابوعبیدہؓ کو پیش کش کی کہ اگر مسلمان واپس چلے جائیں تو ہر مسلمان سپاہی کو دو دو اشرفیاں دی جائیں گی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اس پیش کش کو پائے استحقار سے ٹھکرادیا اور لڑائی ناگزیر ہوگئی۔ قاصد کی واپسی کے دوسرے دن فریقین میں خوں ریز جنگ ہوئی۔ رومیوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمان سرفروشوں نے بہت جلد ان کی صفیں درہم برہم کردیں اور وہ نہایت بدحواسی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس معرکہ کے بعد اردن کے دوسرے تمام شہر اور مقامات آسانی سے سے فتح ہوگئے۔ علامہ بلاذُریؒ نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ اردن کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے حضرت یزید بن ابوسفیانؓ کو ساحلی علاقہ کی طرف روانہ کیا۔ انھوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے ساتھ مل کر اس کو نہایت مختصر عرصے میں مسخّر کرلیا۔

اردن اور ساحلی علاقوں کی تسخیر کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حمص کا رُخ کیا تو حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو دمشق میں اپنا قائم مقام بنا کر چھوڑ گئے۔

ہرقل قیصرِ روم کو خبر ملی کہ مسلمان حمص پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس نے ایک مضبوط لشکر اپنے ایک جرنیل توذر کی قیادت میں دمشق کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ مسلمانوں کو حمص کی طرف بڑھنے نہ دے اور ممکن ہو تو دمشق پر قبضہ کرلے۔ توذر نے دمشق کے مغرب میں مرج الروم کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ توذر کے پیچھے ہرقل نے ایک اور لشکر اُس کی مدد کے لیے روانہ کیا اس کا سردار شنس نامی ایک رومی جرنیل تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے توذر کے مقابلے کے لیے حضرت خالد بن ولید کو مقرر کیا اور خود شنس کے مقابلے پر گئے۔

حضرت یزید بن ابوسفیانؓ دمشق میں خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ بلکہ حالات پر کڑی نظر رکھ رہے تھے انھیں توذر کے عزائم کا علم ہوا تو ایک دن اپنی فوج کو ساتھ لے کر دمشق سے نکلے اور توذر کے سر پر جا پہنچے، وہ بھی لڑائی کے لیے تیار تھا دونوں لشکر جنگی نعرے لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ جب لڑائی کا تنور پوری طرح گرم تھا، حضرت خالد بن ولیدؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ پہنچ گئے، انھوں نے رومیوں کے عقب سے حملہ کردیا۔ اس طرح دونوں طرف سے اسلامی فوجوں نے رومیوں کو تباہ کر ڈالا۔ دوسری طرف حضرت ابوعبیدہؓ نے شنس کے لشکر کو

شکست دی اور پھر آگے بڑھ کر حمص کو گھیر لیا۔ اہلِ حمص نے بہت جلد اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد حماۃ، شیزر، معرۃ النعمان اور لاذقیہ بھی یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے۔

(۴)

رومیوں کی پے در پے شکستوں نے قیصرِ روم کو سخت برافروختہ کیا اور اس نے انطاکیہ میں بہت بڑی فوج جمع کر کے شام کا چپہ چپہ مسلمانوں سے خالی کرا لینے کا ارادہ کر لیا۔ یہ فوج جس میں بڑے بڑے آزمودہ کار سپاہی اور افسر شامل تھے، انطاکیہ سے چلی تو ہر طرف غُل پڑ گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو رومیوں کی یلغار کی خبر ہوئی تو انھوں نے مجلس مشاورت منعقد کی جس میں طے پایا کہ جن جن شہروں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے وہاں سے فوجیں ہٹا لی جائیں اور یہ ساری فوجیں سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ یہ بڑا دانش مندانہ فیصلہ تھا کیوں کہ صرف اسی صورت میں رومیوں کی خوف ناک قوّت کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ مقبوضہ شہروں حمص، دمشق وغیرہ کو خالی کرتے وقت مسلمانوں نے ایسے بلند کردار کا مظاہرہ کیا کہ تاریخِ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اللہ کے ان پاک باز بندوں نے مقبوضہ شہروں سے نکلتے وقت وہاں کے باشندوں کو جزیہ کی رقمیں یہ کہہ کر لوٹا دیں کہ فی الحال ہم تمھاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے تم سے جزیہ لینا ہمارے لیے ناجائز ہے۔ مسلمانوں کے بلند کردار کا عیسائیوں اور یہودیوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ روتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ خدا تم کو پھر واپس لائے۔

تمام مسلمان شام کے مفتوحہ شہروں کو خالی کر کے یرموک پہنچے اور وہاں پاؤں جما کر کھڑے ہو گئے۔ اسی مقام پر وہ فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ تمام اسلامی فوج کی تعداد مل ملا کر تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی۔ اس کے مقابلے میں رومی فوج کی تعداد دو تین لاکھ کے قریب تھی۔ پہلے دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے۔ رومی سپہ سالار باہان نے چاہا کہ مسلمان روپیہ لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ بعض مؤرّخین کے بیان کے مطابق اس نے پیش کش کی کہ مسلمانوں کے سپہ سالار کو دس ہزار، ہر افسر کو ایک ایک ہزار اور ہر سپاہی کو سو سو دینار دیئے جائیں گے لیکن مسلمانوں نے یہ پیش کش قبول نہ کی اور لڑائی کا آغاز ہو گیا۔

اسلامی فوج کے میسرہ کے افسر حضرت یزید بن ابوسفیانؓ تھے وہ اس شان سے لڑے کہ شجاعت بھی آفرین پکار اٹھی۔ رومی بھی اس معرکے میں بڑی بے جگری سے لڑے اور کئی بار مسلمانوں کی صفوں کو ابتر کر دیا۔ ایک موقع پر تو وہ مسلمانوں کو دھکیلتے دھکیلتے عورتوں کے خیموں تک پہنچ گئے۔ اسلام کی غیور بیٹیاں یہ حالت دیکھ کر بے اختیار خیموں سے باہر آ گئیں اور خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر رومیوں پر حملہ آور ہوئیں۔ اس وقت حضرت یزید بن ابوسفیانؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت سعیدؓ بن زیدؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور حضرت قباث بن اشیمؓ اس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں تھا۔ اتفاق سے حضرت یزیدؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ جو فوج کو جوش دلاتے پھرتے تھے ادھر آ نکلے۔ انھوں نے بیٹے کو پکار کر کہا، ''جانِ پدر اس وقت میدان میں ایک ایک سپاہی شجاعت کے جوہر دکھا رہا ہے تو مسلمانوں کا ایک سپہ سالار ہے اور سپاہیوں کی نسبت تجھ پر شجاعت کا زیادہ حق ہے تو خدا سے خوف کرتا رہ، ہر حال میں اسی پر نگاہ رکھ، تجھے چاہیے کہ تو اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ آخرت کا طالب، جنگ میں پامرد اور شدائدِ جنگ کا برداشت کرنے والا ہو اگر آج تیری فوج میں سے ایک سپاہی بھی اس میدان میں تجھ سے بازی لے گیا تو تیرے لیے شرم کی جگہ ہے۔''

حضرت یزیدؓ پہلے ہی سر بکف ہو کر لڑ رہے تھے۔ والدِ گرامی کی للکار نے انھیں شعلۂ جوّالہ بنا دیا اور وہ پہلے سے دو چند جوش کے ساتھ لڑنے لگے۔ اسی اثنا میں قیس بن ہبیرہؓ ایک دستۂ فوج کے ساتھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رومیوں پر عقب سے حملہ آور ہوئے۔ اس جنگی چال نے دشمن کی فوج میں کھلبلی ڈال دی اور وہ بڑی بے ترتیبی کے ساتھ بھاگ اٹھی۔ مسلمانوں نے دُور تک رومیوں کا تعاقب کیا اور جگہ جگہ ان کی لاشیں بچھا دیں۔

مسلمانوں کو اس معرکے میں مکمل کامیابی ہوئی اور اس نے قریب قریب شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ہرقل بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور پھر کبھی اس کو شام کی سرزمین پر قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ اب شہر پر شہر فتح ہونے لگے اور شام کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد مسلمان بیت المقدس کی طرف بڑھے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر چند دن تو قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے لیکن پھر ہمت ہار بیٹھے اور حضرت ابوعبیدہؓ کو پیغام بھیجا کہ ہم شہر مسلمانوں کے حوالے

کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطے کہ مسلمانوں کا خلیفہ خود یہاں آ کر ہمارے ساتھ صلح کی شرائط طے کرے اور پھر انھیں معرضِ تحریر میں لا کر ہمارے حوالے کرے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھ کر تمام واقعات کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ بیت المقدس کی فتح (کسی کُشت وخون کے بغیر) آپ کی تشریف آوری پر موقوف ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ خط ملا تو وہ اکابر صحابہؓ سے مشورہ کے بعد چند مہاجرین اور انصار کو ساتھ لے کر بیت المقدس کے لیے چل پڑے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت یزید بن ابی سفیانؓ اور دوسرے فوجی افسروں نے جابیہ کے مقام پر امیر المؤمنین کا استقبال کیا۔ اس وقت یہ اصحاب پُرتکلف لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر برہم ہوگئے۔ گھوڑے سے اتر پڑے اور زمین سے کنکریاں اٹھا کر ان کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا: ''تم لوگوں کو کیا ہوا کہ اس تزئین وتکلّف کے ساتھ میرے استقبال کو آئے ہو؟ دو ہی سال کے عرصے میں تم نے اپنی سادگی ترک کر کے عجمی وضع اختیار کر لی۔'' ان لوگوں نے عرض کی ''امیر المؤمنین ہم نے اپنی سپاہیانہ وضع ترک نہیں کی ہے اس لباس کے نیچے ہمارے ہتھیار موجود ہیں۔'' یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا ''اگر یہ بات ہے تو پھر کچھ مضائقہ نہیں۔''

قیامِ بیت المقدس کے دوران میں ایک دن حضرت یزید بن ابی سفیانؓ نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کی: ''امیر المؤمنین یہاں ہمیں سب کچھ میسر ہے اور اللہ کے فضل سے مسلمان خوش حال ہیں اگر آپ عمدہ کپڑے پہن لیں، اچھی سواری پر سوار ہوں اور مسلمانوں کو بھی ان کے استعمال کی اجازت دے دیں تو اس سے غیروں کی نظروں میں آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا رعب ووقار بڑھ جائے گا۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

> ''نہیں یزید میں اپنی سادہ وضع ہرگز ترک نہ کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ رومیوں کی نظر میں میری عزت بڑھے اور اللہ کی جناب میں میری وقعت کم ہو جائے۔''

حضرت یزیدؓ خاموش ہوگئے اور امیر المؤمنین اخیر تک اپنی سادہ وضع پر قائم رہے۔ ان کی سادگی نے عیسائیوں کو بے حد متاثر کیا۔ معاہدہ صلح طے پا جانے کے چند دن بعد حضرت عمرؓ نے مدینہ منوّرہ کو مغادرت کی۔ ۱۸ھ میں اسلامی لشکر میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی (طاعونِ عمواس)۔

اس میں ہزاروں مسلمانوں نے وفات پائی۔ ان میں امیرِ شام حضرت ابو عبیدہؓ کی جگہ حضرت یزید بن ابوسفیانؓ کو شام کا والی مقرر کیا اور حکم بھیجا کہ فوراً قیسار یہ کی مہم پر روانہ ہو جاؤ۔ حضرت یزیدؓ سترہ ہزار مجاہدین کے ساتھ قیسار یہ پہنچے اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اثنائے محاصرہ میں وہ سخت بیمار ہو گئے اور اپنے بھائی امیر معاویہؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر دمشق چلے آئے۔ یہیں ۱۸ ہجری یا ۱۹ ہجری میں انھوں نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ ایک روایت میں ہے کہ امیر معاویہؓ نے ان کی زندگی ہی میں قیسار یہ فتح کر کے انھیں مطّلع کیا۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کو اس فتح کی اطلاع دی۔ دوسری روایت کے مطابق امیر معاویہؓ نے یہ مہم ان کی وفات کے بعد سر کی۔ بہر صورت حضرت یزید بن ابی سفیانؓ شام کی فتوحات میں شروع سے اخیر تک نمایاں حیثیت سے شریک رہے اور اپنی شجاعت واستقامت کے اَن مِٹ نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کر گئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبید اللہ بن عباسؓ

①

حضرت عبید اللہؓ، حبر الامۃ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ وہ ہجرتِ نبوی سے ایک سال پہلے (۱۲ نبوّت میں) پیدا ہوئے۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ اپنی اولاد میں ان کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اپنے عمِ محترم حضرت عباسؓ کے بچوں سے بہت محبت تھی اور آپؐ ان پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔

بارہا ایسا ہوا کہ آپؐ نے عبد اللہؓ، عبید اللہؓ اور کثیرؓ (ابنائے حضرت عباسؓ) کو بلایا اور ان سے فرمایا، بچو! تم میں سے جو دوڑ کر مجھ کو سب سے پہلے ہاتھ لگائے گا، میں اس کو فلاں چیز دوں گا۔ تینوں بھائی دوڑ کر آپؐ کی طرف جاتے۔ کوئی آپؐ کے سینہ سے چمٹ جاتا، کوئی پشت مبارک پر چڑھ جاتا۔ آپؐ سب کو سینہ سے لگاتے اور خوب پیار کرتے۔

حضرت عباسؓ نے ۸ ہجری میں فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اپنے اہل وعیال سمیت مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ آ گئے اس وقت حضرت عبید اللہؓ کی عمر نو برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تھے اور فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال (۱۱ ہجری) کے بعد حضرت عبید اللہؓ اپنے والدِ گرامی حضرت عباسؓ اور والدہ ماجدہ حضرت ام الفضل لبابہؓ کے علم و فضل سے استفاضہ کرتے رہے۔ اپنے بڑے بھائی حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے تبحرِ علمی کے

بے حد مدّاح تھے۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں حضرت عبد اللہؓ کے بارے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''میں نے عبد اللہ بن عباسؓ سے بڑھ کر سنت کا عالم، ان سے زیادہ صائب الرائے اور ان سے بڑا دقیق النظر کسی کو نہیں دیکھا۔''

انھوں نے اپنے ایک فرزند عبد اللہؒ کو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا شاگرد بنا دیا تھا۔

۲

۳۵ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے حضرت عبید اللہ بن عباسؓ کو یمن کا والی مقرر کیا۔ پھر ۳۶ ہجری اور ۳۷ ہجری میں ان کو امیرِ حج بنایا اور ان دونوں سالوں کے حج انھی کی امارت میں ہوئے۔

۴۰ ہجری میں امیر معاویہؓ والیِ شام نے بسر بن ابی ارطاۃ کو حجاز اور یمن پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس نے کسی مزاحمت کے بغیر مکہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ پر قبضہ کر لیا اور پھر یمن کی طرف بڑھا جہاں حضرت عبید اللہؓ حضرت علیؓ کی طرف سے منصبِ امارت پر فائز تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پوشیدہ طور پر حضرت عبید اللہؓ کو اطلاع دی کہ بسر بن ابی ارطاۃ یمن کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس پر قبضہ کر کے لوگوں سے امیر معاویہؓ کی بیعت لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو لوگ بیعت کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں وہ ان کو نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالتا ہے۔ حضرت عبید اللہؓ کے پاس اتنی فوجی قوّت نہیں تھی کہ وہ بسر بن ابی ارطاۃ کا مقابلہ کر سکیں۔ انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ خود دربارِ خلافت میں جا کر مدد طلب کریں۔ چناں چہ وہ عبد اللہ بن عبد المدان کو یمن میں اپنا نائب بنا کر عازمِ کوفہ ہو گئے۔ ان کی غیر حاضری میں بسر نے یمن پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؓ کے حامیوں کی ایک کثیر تعداد کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔ حضرت عبید اللہؓ کے اہل و عیال یمن ہی میں مقیم تھے۔ شقی القلب بسر نے ان کے دو صغیر السن بچوں کو ان کی والدہ کے سامنے پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ حضرت عبید اللہؓ کو اپنے معصوم بچوں کی شہادت کی خبر ملی تو انھیں سخت صدمہ پہنچا لیکن بڑے ضبط اور حوصلے سے کام لیا اور رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت علیؓ کو بسر بن ابی ارطاۃ کے مظالم کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی سرکوبی کے لیے فوج جمع کرنی شروع کر دی لیکن ابھی ان کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ ابنِ ملجم کی زہر آلود

تلوار نے انھیں جامِ شہادت پلادیا۔ (رمضان ۴۰ھ) اوراس کے ساتھ ہی نظمِ حکومت کی بساط اُلٹ گئی۔ اس سانحۂ جاں گداز کے بعد حضرت عبید اللہؓ نے عزلت گزینی اختیار کرلی اور باقی زندگی خاموشی سے گزار دی۔ ان کے سالِ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ البتہ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں وثوق کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت عبید اللہ بن عباسؓ نے ۵۸ ہجری میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

حضرت عبید اللہ بن عباسؓ سے مروی چند احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ یہ تمام حدیثیں انھوں نے اپنے والدِ گرامی حضرت عباسؓ سے روایت کی ہیں۔ حضرت عبید اللہؓ کے رواۃ میں ان کے فرزند عبداللہؒ اور مشہور تابعی ابن سیرینؒ شامل ہیں۔

(۳)

اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ جس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ اقلیمِ علم وحکمت کے بادشاہ تھے اسی طرح حضرت عبید اللہ بن عباسؓ جود وسخا اور بذل وعطا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کا دسترخوان نہایت وسیع تھا جس سے ہر غریب، مسکین اور حاجت مند کو متمتع ہونے کی کھلی اجازت تھی۔ اس طرح لاتعداد غرباء ومساکین ان کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دسترخوان کے لیے روزانہ ایک اونٹ ذبح کراتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انھیں یہ کہہ کر ہاتھ روکنے کا مشورہ دیا کہ آخر یہ سلسلہ آپ کب تک جاری رکھ سکیں گے؟ حضرت عبید اللہؓ بھائی کا بہت احترام کرتے تھے لیکن ان کا یہ مشورہ ان کو پسند نہ آیا کیوں کہ فیّاضی اور دریا دلی ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ جس دن حضرت عبداللہؓ نے ان کو یہ مشورہ دیا اس دن سے وہ دسترخوان کے لیے ایک کی بہ جائے دو اونٹ ذبح کرانے لگے۔

حضرت عثمان ذوالنّورینؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے عہدِ خلافت میں دونوں بھائیوں کو مختلف ذمے داریاں سونپیں تو انھیں مدینہ منوّرہ کی اقامت ترک کرنی پڑی تاہم جب کبھی وہ مدینہ منوّرہ میں اکٹھے ہوتے تو جہاں حضرت عبداللہؓ کے گھر ان کے خوانِ علم سے ریزہ چینی کے لیے خلقِ خدا ٹوٹ پڑتی تھی وہاں حضرت عبید اللہؓ کے خوانِ نعمت پر سائلوں اور محتاجوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ابنِ اثیرؒ نے ''اسدُ الغابہ'' میں ان کی فیاضی کا ایک دل چسپ واقعہ

بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عبیداللہ بن عباسؓ اپنے غلام کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں شام ہوگئی۔ قریب ہی ایک بدوی کا گھر نظر آیا۔ غلام نے عرض کیا، اندھیرے میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں کہیں ہم راستہ نہ بھول جائیں، مناسب یہ ہے کہ رات بھر کے لیے اس بدوی کے گھر میں قیام کریں۔ حضرت عبیداللہؓ نے فرمایا، تم نے ٹھیک کہا چلو صاحبِ خانہ سے اجازت طلب کریں۔ دونوں بدوی کے پاس پہنچے اور اس سے کہا، بھائی آج کی رات ہم تمھارے مہمان ہیں۔ حضرت عبیداللہؓ بڑے بلند و بالا اور وجیہ آدمی تھے۔ بدوی اپنی فراست سے سمجھ گیا کہ کوئی معزز آدمی ہیں۔ اس نے نہایت خوش دلی سے انھیں اہلاً وسہلاً ومرحباً کہا اور گھر کے اندر جا کر اپنی اہلیہ سے کہا کہ آج ایک معزز شخص ہمارے گھر میں قیام کرے گا، کھانے پینے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کھانے کے لیے اور تو کوئی چیز نہیں البتہ یہ بکری موجود ہے جس کے دودھ پر تمھاری بچی کی گزران ہے۔ بدوی نے کہا، کچھ بھی ہو میں اس بکری کو ذبح کر کے مہمان کو کھانا کھلاؤں گا۔ بیوی نے کہا، کیا معصوم بچی کو مار ڈالو گے؟ بدوی نے کہا جو ہوتا ہے ہو جائے میں مہمان کو بھوکا نہیں رکھ سکتا۔ چناں چہ بکری کو ذبح کر کے حضرت عبیداللہؓ اور ان کے غلام کو کھانا کھلایا۔ حضرت عبیداللہؓ نے میاں بیوی کی گفتگو سُن لی تھی۔ صبح کو بیدار ہوئے تو غلام سے پوچھا، تمھاری تحویل میں کتنی رقم ہے؟ اس نے کہا، پانچ سو دینار ہیں۔ حکم دیا کہ یہ سب اس بدوی کو دے دو۔ غلام نے عرض کیا، سبحان اللہ یا امیر، اس نے ہمیں پانچ درہم کی بکری کھلائی اور آپ اسے پانچ سو دینار دے رہے ہیں؟

حضرت عبیداللہؓ نے برہم ہو کر فرمایا: ''حیف ہے تمھاری عقل پر، خدا کی قسم ہمارا یہ غریب میزبان ہم سے کہیں زیادہ فیّاض اور سیر چشم ہے ہم تو اپنی دولت سے ایک بہت حقیر رقم اسے دے رہے ہیں اور اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو قربان کر کے اپنی تمام متاع ہمارے سامنے پیش کر دی۔'' یعنی بکری جو اس کا سب کچھ تھی ذبح کر کے ہمیں کھلا دی اور اپنی اکلوتی شیر خوار بچی کی زندگی کی پروا بھی نہ کی۔

غلام خاموش ہو گیا اور اس نے اظہارِ تشکّر کے ساتھ یہ رقم بہ اصرار بدوی کو دے دی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت زبرقان بن بدر تمیمی سعدیؓ

(ماہِ نجد)

①

یوں تو سرورِ کائنات فخرِ موجودات ﷺ کے ہر صحابی کی سیرت بھی نورانی تھی اور صورت بھی نورانی لیکن بعض صحابہ کرامؓ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حسنِ صورت اور وجاہت سے نوازا تھا۔ ایسے ہی اصحاب میں عرب کے مشہور قبیلہ بنو تمیم کی شاخ بنو سعد کے ایک فرزند زبرقان بن بدرؓ بھی تھے جو اپنے میدہ وشہاب رنگ اور انتہائی دل کش خدو خال کی وجہ سے ''ماہِ نجد'' کے لقب سے مشہور تھے۔ قبیلے کے لوگ تو خیر اُن سے مانوس ہو چکے تھے لیکن کوئی اجنبی انھیں دیکھتا تو ٹھٹک کر رہ جاتا۔ یہی سبب تھا کہ جب کبھی وہ اپنے وطن سے باہر کسی جگہ جاتے تو اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ لیتے تھے تاکہ ان کا حسن و جمال کسی کو فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ حضرت زبرقانؓ کی کنیت ابو عیاش اور اصل نام حسین تھا لیکن وہ تاریخ میں اپنے عرف یا لقب زبرقان سے مشہور ہوئے۔ نسب نامہ یہ ہے: زبرقان بن بدر بن امرؤ القیس بن خلف بن بہدلہ بن عوف بن کعب بن زید مناۃ بن تمیم۔

حضرت زبرقانؓ کے آباء واجداد کسی زمانے میں بنو تمیم کے بادشاہ تھے۔ چناں چہ وہ شاہی خاندان کا رکن ہونے کی بنا پر اپنے قبیلے میں نہایت عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ بعثتِ نبوی کے وقت وہ ''بنو سعد'' کے سردار تھے یہ وہی قبیلہ تھا جس سے حضورؐ کی دایہ بی بی حلیمہؓ کا تعلق تھا۔ حضرت زبرقانؓ محض ایک قبائلی سردار ہی نہیں تھے بلکہ ایک قادر الکلام

شاعر بھی تھے اور بنوتمیم کے شعراء میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ بنوتمیم طویل عرصہ تک تاج و تخت کے مالک رہے تھے، اس لیے ان کے دماغوں میں خاندانی فخر وغرور کا نشہ سمایا ہوا تھا۔ اسی پندار اور نخوت نے انھیں پورے اکیس برس تک اسلام کی طرف راغب نہ ہونے دیا لیکن آخر وہ وقت آ گیا جب دوسرے تمام قبائلِ عرب کی طرح بنوتمیم بھی آستانۂ نبویؐ کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔

(۲)

فتح مکہ اور غزوۂ حنین (۸ ہجری) کے بعد عرب کے تمام غیر مسلم قبائل پر ہیبتِ حق طاری ہو گئی اور عرب کے گوشے گوشے سے مختلف قبائل کے وفود شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے لیے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہونے لگے۔ ۹ ہجری میں تو اس کثرت سے وفود آئے کہ اس سال کا نام ہی ''عام الوفود'' پڑ گیا۔ بنوتمیم نے بھی سترّ یا اسیّ آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک وفد اُسی سال مدینہ منورّہ بھیجا۔ اس وفد میں قبیلہ تمیم (کی مختلف شاخوں کے) بڑے بڑے رؤسا، شعلہ بیاں خطیب اور بلند پایہ شاعر شامل تھے۔ حضرت زبرقان بن بدرؓ بھی اس وفد کے ایک رکن تھے۔ وفدِ بنوتمیم کے ورودِ مدینہ کے بارے میں مشہور روایت تو یہی ہے کہ وہ بھی دوسرے وفود کی طرح اظہار اطاعت کے لیے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا (یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں اس وفد نے بعض نامعقول شرائط پیش کیں) لیکن ایک روایت یہ بھی ہے (جو امام بخاریؒ اور حافظ ابنِ قیمؒ نے نقل کی ہے) کہ محرم ۹ ہجری میں حضورؐ نے ایک مہم بنوتمیم کے ایک خانوادے بنوعنبر کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمائی کیوں کہ ان لوگوں نے خود بھی خراج ادا کرنے سے انکار کیا تھا اور دوسرے قبیلوں کو بھی منع کیا تھا۔ بنوعنبر کے لوگ اسلامی لشکر کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ مسلمان ان کے باسٹھ افراد کو گرفتار کر کے مدینہ منورہ لے آئے۔ بنوتمیم نے ان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے اقرع بن حابس کی قیادت میں اپنے سرکردہ آدمیوں کا ایک وفد مدینہ منورّہ بھیجا — صورت واقعہ کچھ بھی ہو، اس بات پر سب اہل سِیَر کا اتفاق ہے کہ یہ وفد بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ مدینہ آیا — ''تفسیر مواہب الرحمٰن'' (مولوی سید امیر علیؒ) میں رئیس الوفد اقرع بن حابس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''اُس وقت مجھ میں جہالت اور بدویت موجود تھی اور میں اپنی بے تمیزی سے کاشانۂ نبوی کے سامنے پہنچ کر چلاّیا، اے محمدؐ باہر نکل کر ہمارے پاس آؤ۔''

حضورؐ کو ان کا اکھڑ پن ناگوار تو گزرا لیکن آپؐ سراپا عفو و کرم تھے۔ باہر تشریف لا کر ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی۔ اقرعؓ نے کہا ''محمدؐ میں وہ ہوں کہ خدا کی قسم میری مدح انسان کی عزت کو بڑھا دیتی ہے اور میری ہجو انسان کو داغ لگا دیتی ہے۔'' حضورؐ نے فرمایا، ''یہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔'' اقرع اب بھی خاموش نہ ہوئے اور کہا ''ہم سب سے زیادہ معزز ہیں۔'' حضورؐ نے فرمایا ''تم سے زیادہ معزز یوسفؑ بن یعقوبؑ تھے۔'' اقرع اب اپنے اصل رنگ پر آئے اور کہا ''محمدؐ ہم آپ سے مفاخرت کرنا چاہتے ہیں اپنے شعراء اور خطباء کو اجازت دیں کہ وہ ہمارے شعراء اور خطباء کا مقابلہ کریں۔'' ——بہ قول ابن اثیر صاحبِ ''اُسدُ الغابہ'' حضورؐ نے فرمایا: ''میں فخاری اور شعر بازی کے لیے مبعوث نہیں ہوا لیکن اگر تم اسی کے لیے آئے ہو تو یونہی سہی تم اپنا کمال دکھاؤ، ہم جواب دیں گے۔''

اقرع نے اپنے وفد کے ایک رکن عطاردؓ بن حاجب کو اشارہ کیا کہ وہ اٹھ کر تقریر کریں۔ عطارد ایک آتش بیان خطیب تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بنو تمیم کے جاہ و حشم، تموّل، عالی نسبی، اثر و اقتدار، شجاعت و بسالت، فیاضی اور مہمان نوازی کا ذکر کیا۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو حضورؐ نے حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ کو حکم دیا کہ وہ عطارد کی تقریر کا جواب دیں۔ حضرت ثابتؓ نے کھڑے ہو کر پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔ اس کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت، آپؐ کی دعوت، نزولِ قرآن اور مہاجرین و انصار کے فضائل کو ایسے بلیغ اور مؤثّر پیرایہ میں بیان کیا کہ ساری مجلس ساکت ہو گئی۔

اب بنو تمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر شعر و شاعری کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے اور اپنی قوم کی شان میں ایک پُر زور قصیدہ پڑھا جس میں خودستائی، تعلّی اور نخوت کے سوا کچھ نہ تھا تاہم اس کے زورِ بیان اور فصاحت و بلاغت میں کوئی کلام نہ تھا۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ زبرقان کے اشعار سن کر خود جنابِ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا، ''اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا'' (بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے) زبرقانؓ بیٹھے تو حضورؐ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ ان کا جواب دیں۔ انھوں نے اٹھ کر زبرقانؓ ہی کے بحر اور قافیہ میں فی البدیہہ ایسے فصیح اور بلیغ اشعار سنائے کہ بنو تمیم انگشت بدنداں ہو گئے اور رئیسِ وفد اقرعؓ بن حابس کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

''باپ کی قسم، محمدؐ کا خطیب ہمارے خطیب سے برتر ہے اور محمدؐ کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔ ان کی آوازیں ہماری آوازوں سے زیادہ دل کش اور شیریں ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ صرف خدائے واحد ہی عبادت کے لائق ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔''

تمام اہلِ وفد نے ایک زبان ہو کر ان کی رائے سے اتفاق کیا اور پھر سب نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے ہاتھ رحمتِ عالم ﷺ کے دستِ مبارک میں دے دیئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت اقرعؓ کی سفارش پر حضورؐ نے بنوعنبر کے تمام قیدی بھی رہا کر دیے۔

یہ وفد مدینہ منوّرہ سے چلنے لگا تو حضورؐ نے حضرت زبرقان بن بدرؓ کو اپنی طرف سے بنوسعد کا امیر مقرر فرمایا۔ گویا جو اعزاز انھیں دورِ جاہلیت میں حاصل تھا، ان کے قبولِ اسلام کے بعد بھی حضورؐ نے اس کو برقرار رکھا۔

(۳)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو یکایک سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ انصار، قریش اور بنوثقیف کے سوا عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی حد تک اس فتنہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بنوتمیم کی بہت سی شاخیں بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا لیکن حضرت زبرقانؓ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ حق پر قائم رہے اور اپنے قبیلہ بنوسعد کو بھی اس میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ انھوں نے اس پُر آشوب دور میں بھی حسبِ دستور اپنے قبیلہ سے زکوٰۃ وصول کی اور اسے بارگاہِ خلافت میں روانہ کیا۔ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے اخلاص اور استقامت سے بہت خوش ہوئے اور ان کا اعزاز اور مرتبہ برقرار رکھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بھی حضرت زبرقانؓ بنوسعد کی امارت پر فائز رہے۔ ایک مرتبہ وہ زکوٰۃ کی رقم لے کر مدینہ منوّرہ آرہے تھے کہ راستے میں نامور شاعر حطیہ مل گیا۔ دورانِ گفتگو میں اس نے بتایا کہ میں صحرا کی زندگی سے تنگ آچکا ہوں، اب عراقِ عرب جا رہا ہوں تاکہ وہاں کے نعائم سے متمتع ہو سکوں۔ حضرت زبرقانؓ عیش و آرام کی زندگی کو ناپسند کرتے تھے اور اس پر صحرا کی بود و باش اور سادہ زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے حطیہ کو

عراقِ عرب جانے سے روک دیا اور اس سے کہا کہ وہ ان کی واپسی تک ان کے گھر مہمان کی حیثیت سے قیام کرے۔ حطیہ اس وقت تو لوٹ گیا لیکن اس کے دل میں حضرت زبرقانؓ کے بارے میں تکدّر پیدا ہو گیا کہ انھوں نے اس کے شاعرانہ ولولے پورے نہ ہونے دیئے۔ چناں چہ اس نے ان کی ہجو کہہ ڈالی۔ حضرت زبرقانؓ چاہتے تو اس کا جواب دے سکتے تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد وہ اس قسم کی (ہجویہ) شاعری سے کنارہ کش ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ دربارِ خلافت میں حطیہ کی شکایت کریں۔ حطیہ کے اشعار اس قسم کے تھے کہ بہ ظاہر ان پر ہجو کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت زبرقان کی شکایت پر تذبذب میں پڑ گئے اور انھوں نے شاعرِ رسول اللہؐ حضرت حسان بن ثابت سے رائے طلب کی کہ حطیہ کے اشعار پر ہجو کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ انھوں نے فیصلہ دیا کہ یہ ہجویہ اشعار ہی ہیں۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حطیہ کو قید کر دیا۔

حافظ ابنِ عبد البرؒ نے ''استیعاب'' میں لکھا ہے کہ چند دن بعد حضرت زبیر بن العوّامؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حطیہ کی رہائی کی سفارش کی۔ حضرت عمر فاروقؓ ان جلیل القدر صحابہؓ کا بہت لحاظ کرتے تھے انھوں نے ان کی بات مان لی اور حطیہ کو آئندہ کے لیے توبہ کرا کے رہا کر دیا۔

حضرت زبرقانؓ حق بات کہنے میں بہت جری تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ امیر معاویہؓ کے عہد کے نام ور گورنر زیاد بن ابیہ نے ایک مرتبہ لوگوں پر بہت سختی کی تو وہ اس کے پاس گئے اور برملا کہا کہ لوگ تمھاری سختیوں سے نالاں ہیں اپنا ہاتھ ان سے روکو۔

حضرت زبرقانؓ کے سالِ وفات کے بارے میں کتبِ سِیَر خاموش ہیں البتہ امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت تک ان کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ اگر کبھی انھیں مکہ معظّمہ جانے کا اتفاق ہوتا تو اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ لیتے تھے تا کہ ان کے غیر معمولی حسن و جمال پر لوگوں کی نظر نہ پڑے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت جارود بن عمرو عبدیؓ

(۱)

۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے اردگرد کے بادشاہوں اور رئیسوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ایک خط منذر بن ساویٰ والیِ بحرین کو بھی لکھا اور حضرت علاء بن عبداللہ حضرمیؓ کے ہاتھ روانہ فرمایا۔ منذر پر اس خط کا بہت اچھا اثر پڑا اور وہ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اہلِ بحرین کی ایک بڑی تعداد بھی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئی۔ عرب کا مشہور قبیلہ عبدالقیس بحرین ہی میں آباد تھا۔ یہ قبیلہ مدت سے نصرانیت قبول کر چکا تھا۔ بحرین میں اسلام کے قدم آئے تو اس قبیلہ کے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے لیکن باقی اپنے مذہب پر قائم رہے۔

۸ ہجری میں مکہ پر پرچمِ اسلام بلند ہوا تو دشمنانِ اسلام پر ہیبتِ حق طاری ہو گئی اور عرب کے کونے کونے سے مختلف قبائل کے وفود اظہارِ اطاعت کے لیے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے لگے۔ ۹ھ یا ۱۰ھ میں قبیلہ عبدالقیس کے عیسائیوں نے بھی اپنا ایک وفد مدینہ منوّرہ بھیجا۔ بہ قول ابنِ سعدؒ یہ وفد بیس آدمیوں پر اور بہ قول حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ یہ وفد بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوا تو اس کے سردار نے آگے بڑھ کر عرض کیا:

> ''اے محمد (ﷺ)! میں پہلے ہی ایک آسمانی دین نصرانیت کا پابند ہوں۔ اب آپ کے دین کے لیے اپنے دین کو چھوڑنے والا ہوں۔ کیا میرے تبدیلِ دین سے آپ میری نجات کے ضامن ہوں گے؟''

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہاں میں ضامن ہوں۔ اسلام تمھارے دین سے بہتر ہے۔''

حضورؐ کا ارشاد سن کر رئیسِ وفد فوراً کلمۂ توحید پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اراکینِ وفد نے بھی ایمان قبول کرلیا۔ حضورؐ کو ان کے قبولِ اسلام پر بڑی مسرت ہوئی اور آپؐ نے ان کی بڑی عزت وتوقیر کی۔ وفدِ عبدالقیس کے یہ سردار جن کو خود ساقیِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات کی ضمانت دی اور جن کے قبولِ اسلام سے آپؐ بے حد مسرور ہوئے، حضرت جارود بن عمروؓ تھے۔

(۲)

حضرت جارود بن عمروؓ کا شمار اہلِ کتاب صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ اہلِ کتاب صحابہؓ سے وہ اصحابِ رسولؐ مراد ہیں جو قبولِ اسلام سے پہلے یہودی یا نصرانی تھے۔ حضرت جارودؓ کا اصل نام بشر تھا اور کنیت ابومنذر تھی۔ جارودان کا لقب تھا۔ اس لقب نے اتنی شہرت پائی کہ اصل نام لوگ بھول گئے۔ کتبِ سِیَر میں ان کا نسب نامہ صرف اتنا ہی درج ہے:

بشر (جارودؓ) بن عمرو بن معلّٰی عبدی۔

بعض روایتوں میں حضرت جارودؓ کے والد کا نام حنش اور بعض میں ''العلاء'' بھی آیا ہے، شاید یہ ان کے والد کے لقب ہوں۔

حضرت جارودؓ قبیلہ عبدالقیس کے نہایت ذی اثر اور سر برآوردہ رؤسا میں سے تھے۔ وہ نہایت بہادر اور مہم جُو آدمی تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے ایک دفعہ انھوں نے قبیلہ بکر بن وائل پر چھاپہ مارا اور اس کے تمام مویشی اور مال واسباب حتیٰ کہ سوئی سلائی تک لوٹ کر لے گئے۔ ''جرد'' کے معنی ''بے برگ وبار'' کے ہیں اس لیے جارودان کا لقب پڑ گیا۔ یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ بنوعبدالقیس کے لیے مایۂ افتخار بن گیا اور شعراء اپنے کلام میں حضرت جارودؓ کا نام ایک ہیرو کے طور پر پیش کرنے لگے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:

فدسناهم بالخيل من كل جانب
كما جرّد الجارود بكر بن وائل

یعنی ہم نے ہر طرف سے دشمن کو اپنے لشکر کے ذریعہ پامال کر ڈالا جس طرح کہ جارود نے بکر بن وائل کو صاف کر ڈالا تھا۔

حضرت جارودؓ کے قبولِ اسلام کے بارے میں جو روایت اوپر بیان کی گئی ہے یہ سیرۃ ابنِ ہشام سے ماخوذ ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضوؐر نے فرمایا:

''جارود تم نے اور تمھاری قوم نے آنے میں بہت دیر کی۔''

حضرت جارودؓ نے ندامت کا اظہار کیا اور عرض کی ''یارسول اللہ اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ میں نے انجیل میں آپ کی صفات پڑھی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کے آنے کی بشارت دی ہے۔''

پھر انھوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ اپنا دستِ مبارک تو پھیلائیں۔''

حضوؐر نے اپنا دستِ مبارک آگے بڑھایا تو حضرت جارودؓ نے لپک کر اس کو تھام لیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ (تاریخ ابنِ عساکر)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جارودؓ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور انھیں انجیل پر بھی عبور حاصل تھا۔ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے بارگاہِ نبوی میں یہ اشعار ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کیے:

(۱) ـــــ شهدت بان اللّٰه حق وسامحت
بنات فوادی بالشهادة والنهضی

(۲) ـــــ فابلغ رسول اللّٰه انی رسالة
بانی حنیف حیث کنت من الارض

(۳) ـــــ واجعل لنفسی دون کل ملمة
لکم جنة من عرضکم عرضی

(۴) ـــــ قال لم تکن و اری بیثرب فیکم
فانی لکم عند الاقامة والخفض

(۱) میں نے شہادت دی کہ اللہ حق ہے اور میرے جذبات نے بھی اس شہادت اور عمل میں میرا ساتھ دیا۔

(۲) میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیغام پہنچادو کہ میں زمین کے جس حصے میں بھی رہوں گا دینِ حنیف پر قائم رہوں گا۔

(۳) ہر مصیبت کے وقت میں اپنی جان پیش کر دوں گا۔

اے مسلمانو میری عزت تمھاری عزت کے لیے ڈھال ہے۔

(۴) اگر چہ میرا مستقل قیام یثرب میں نہیں ہے مگر میں اس عارضی اقامت میں بھی تمھارا ہی ہوں۔

شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے بعد حضرت جارودؓ اور ان کے ساتھیوں نے کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ پھر انھوں نے وطن جانے کے لیے رختِ سفر باندھا۔

حافظ ابنِ قیمؒ نے ''زادالمعاد'' میں لکھا ہے کہ چلنے سے پہلے انھوں نے بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کی:

''یارسول اللہ ہماری کفالت کے لیے کچھ عنایت فرمائیے۔

حضوؐر نے فرمایا: ''اس وقت بیت المال خالی ہے۔''

انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ہمارے علاقے میں لاوارث اونٹ مارے مارے پھرتے ہیں کیا ان پر مالکانہ قبضہ جائز ہے؟

ارشاد ہوا: ''لاوارث اونٹ پر مالکانہ قبضہ دوزخ کی آگ کا مستحق ٹھہرا دیتا ہے۔''

ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ مدینہ سے چلتے وقت حضرت جارودؓ نے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہمارے وفد کے لیے سواریوں کا انتظام کیا جائے۔ اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ ان لوگوں کے لیے سواریوں کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اس پر حضرت جارودؓ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ ہمیں راستے میں دوسروں کی بہت سی سواریاں ملیں گی (آوارہ اونٹ ملیں گے) کیا ان کو پکڑ کر سوار ہونے کی اجازت ہے؟''

حضوؐر نے فرمایا: ''ہرگز نہیں۔ انھیں آگ سمجھو آگ۔''

غرض حضرت جارودؓ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہو کر وطن واپس گئے۔

(۳)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریرآرائے خلافت ہوئے۔ ابھی وہ اچھی طرح حالات کا جائزہ بھی نہ لینے پائے تھے کہ سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ قریشِ مکہ، مہاجرین وانصارِ مدینہ اور بنوثقیف کے سوا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو اس فتنے سے تھوڑا بہت متاثّر نہ ہوا ہو۔ صدیقِ اکبرؓ نے نہایت عزم وہمت اور قوّتِ ایمانی کے ساتھ اس ہول ناک فتنے کا مقابلہ کیا اور چند ماہ کے اندر اندر اس کو کچل کر رکھ دیا۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ قبیلہ عبدالقیس بھی فتنۂ ارتداد کی لپیٹ میں آ گیا لیکن حضرت جارودؓ نہ صرف پورے عزم وثبات کے ساتھ اسلام پر قائم رہے بلکہ سردارِ قبیلہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے اہلِ قبیلہ کو ارتداد سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے بحرین کے دوسرے لوگوں کو بھی اسلام پر قائم رہنے کی پُرزور تلقین کی۔ ان کی مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ گم راہ ہونے سے بچ گئے۔ جن لوگوں نے ان کی آواز پر کان نہ دھرے اور مرتدین کے ساتھ مل گئے وہ نہایت عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ خلیفۃ الرسولؐ نے حضرت علاء بن عبداللہ حضرمیؓ کو ایک مضبوط لشکر دے کر بحرین کی مہم پر مامور کیا تھا۔ حضرت علاءؓ نے بحرین پہنچ کر مرتدین کی ایسی سرکوبی کی کہ آئندہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت قدامہ بن مظعونؓ بحرین کے گورنر ہو کر آئے۔ ایک دفعہ بعض رومیوں نے حضرت جارودؓ کو بتایا کہ ہم نے قدامہؓ کو شراب پیتے دیکھا ہے۔ حضرت جارودؓ اپنے گورنر کی یہ لغزش گوارا نہ کر سکے اور سیدھے مدینہ منوّرہ پہنچ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کی:

''امیر المؤمنین قدامہ نے شراب پی ہے اس پر حدِ شرعی جاری کیجیے۔''

حضرت عمرِ فاروقؓ نے شہادت طلب کی۔ حضرت جارودؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کا نام لیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے کہا:

''میں نے خود تو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ نشہ کی حالت میں قے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''صرف اتنی شہادت سے جرم ثابت نہیں ہوتا۔''

مزید تحقیقات کے لیے انھوں نے حضرت قدامہؓ کو بحرین سے طلب کیا۔ جب وہ آئے تو حضرت جارودؓ نے ان پر حد جاری کرنے کا مطالبہ کیا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''تم گواہ ہو، مدعی نہیں ہو، تمھارا کام گواہی دینا تھا وہ تم دے چکے اب تم خاموش رہو۔''

اس وقت حضرت جارودؓ خاموش ہو گئے لیکن دوسرے دن پھر حضرت قدامہؓ پر حد جاری کرنے کے لیے اصرار کیا۔ شہادت ناکافی تھی اس لیے حضرت عمرؓ کو حضرت جارودؓ کا اصرار ناگوار گزرا اور فرمایا:

''جارود تم تو مدعی بنے جاتے ہو حالاں کہ شہادت صرف ایک ہے۔''

اس پر حضرت جارودؓ نے کہا: ''امیر المؤمنین میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں، حد جاری کرنے میں دیر نہ کریں۔''

اس اصرار پر حضرت عمرؓ کو کچھ شبہ ہوا اور انھوں نے فرمایا:

''جارود تم اپنی زبان پر قابو رکھو ورنہ میں سختی سے پیش آؤں گا۔''

اس تنبیہ پر حضرت جارودؓ جوش میں آ گئے اور کہا:

''امیر المؤمنین، حق یہ نہیں ہے کہ آپ کا ابنِ عم شراب پیے اور آپ اُلٹے مجھ کو سختی کی دھمکی دیں۔''

اس موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا کہ آپ کو شک ہو تو قدامہ کی بیوی کو بلا کر پوچھ لیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت قدامہؓ کی بیوی ہندہ کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی تصدیق کی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت قدامہؓ سے فرمایا: ''قدامہ حد کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

حضرت قدامہؓ نے عرض کیا: ''امیر المؤمنین اگر بالفرض میں نے ان لوگوں کی شہادت کے مطابق شراب پی بھی، تو آپ کو مجھ پر حد جاری کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔''

حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

حضرت قدامہؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ (المآئدہ: ۹۳)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے جب کہ انھوں نے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کیے پھر پرہیز کیا اور ایمان لائے پھر پرہیز کیا اور نیکوکاری کی۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''تم تاویل میں غلطی کر رہے ہو، تم کو قطعی حرام چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے تھا۔''

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت قدامہؓ پر حدِ شرعی جاری کرائی اور حضرت جارودؓ مطمئن ہو کر وطن واپس گئے۔

حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ بعد حضرت جارودؓ نے بصرہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی، وہاں سے وہ ان مجاہدین میں شامل ہو گئے جو ایران میں مصروف جہاد تھے۔ انھوں نے بہ اختلاف روایت فارس یا نہاوند کی لڑائی میں بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک لڑکا منذر چھوڑا۔ اسی کے نام کی نسبت سے ان کی کنیت ابومنذر تھی۔

حضرت جارودؓ اگرچہ عہدِ رسالت کے بہت آخر میں اسلام لائے تھے تاہم فضل و کمال سے تہی دامن نہ تھے۔ ان سے مروی چند احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں جن کو محمد بن سیرینؒ، ابوالقموسؒ، ابومسلم الجذمیؒ اور زید بن علیؒ نے روایت کیا ہے۔ صحابۂ کرامؓ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ان سے روایت کی ہے۔ مسندِ احمد بن حنبل میں یہ حدیث حضرت جارودؓ ہی سے مروی ہے:

''مومن کی گم شدہ چیز پر جس نے مالکانہ قبضہ کیا اس نے خود کو آگ میں جلایا۔''

اہلِ سیر نے حضرت جارودؓ کے اخلاص فی الدّین، حق گوئی، جرأت اور بے باکی کی بڑی تعریف کی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت محمد بن طلحہؓ

(۱)

۴ھ یا ۵ھ کا ذکر ہے کہ جلیل القدر صحابی حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ (یکے از اصحابِ عشرہ مبشّرہ) کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے آقا و مولا ﷺ کے اسمِ گرامی پر اس کا نام محمد رکھا اور اسے اٹھا کر حصولِ برکت کے لیے بارگاہِ رسالت میں لے گئے۔ حضورؐ نے پوچھا، اس کا نام کیا رکھا گیا ہے۔ حضرت طلحہؓ نے عرض کی ''محمد''۔ حضورؐ نے فرمایا، اچھا تو اس کی کنیت بھی (میری کنیت پر) ابو القاسم ہے۔ پھر آپؐ نے بچے کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور اس کے لیے دعائے خیر و برکت فرمائی۔ اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ ابو القاسم محمد بن طلحہؓ بڑے ہو کر اخلاقِ حسنہ کا پیکرِ جمیل بنے اور زہد و عبادت میں اپنے غیر معمولی انہماک کی بنا پر خاصانِ خدا میں شمار ہوئے۔

(۲)

حضرت ابو القاسم محمد بن طلحہؓ کا تعلق قریش کے خاندان بنو تیم سے تھا اور وہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے نسبتِ قریبہ رکھتے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

محمد بن طلحہؓ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ بن کعب۔

مرہ بن کعب پر ان کا نسب نامہ رسولِ اکرم ﷺ کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے۔

ماں کا نام حمنہ بنتِ جحشؓ تھا۔ ان کا شمار مشہور صحابیات میں ہوتا ہے۔ وہ اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنتِ جحشؓ کی حقیقی اور سرورِ عالم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اس نسبت سے حضرت محمد بن طلحہؓ حضورؐ کے بھانجے تھے۔

صحابی باپ اور صحابیہ ماں کے آغوشِ تربیت میں پرورش پا کر حضرت محمد بن طلحہؓ محاسنِ اخلاق کے اعتبار سے ایک مثالی شخصیت بن گئے۔ اس کثرت سے عبادت کرتے تھے کہ لوگوں میں ''سجادؔ'' (بہت سجدے کرنے والا) کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ تاریخِ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جن کو ''سجادؔ'' کا لقب دیا گیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی حضرت زید بن خطّابؓ کے پڑوتے کا نام بھی محمد تھا۔ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت زیدؓ کے پڑوتے کو پکار کر بُرا بھلا کہا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو معلوم ہوا تو ان کو بلا کر فرمایا کہ تمھارے نام کی وجہ سے ''اسمِ محمد'' کو سب وشتم کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ آج سے تمھارا نام ''محمد'' کے بہ جائے عبدالرحمٰن ہے۔

پھر انھوں نے حضرت طلحہؓ کے لڑکوں کے پاس پیغام بھیجا کہ تمھارا اور تمھاری اولاد میں سے جس جس کا نام محمد ہے اسے بدل دیا جائے۔ حضرت محمد بن طلحہؓ نے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو کر عرض کی:

''امیر المؤمنین میرے نام ''محمد'' کو خود رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا تھا۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا، اگر یہ سچ ہے تو جاؤ رسول اللہ ﷺ کے پسند کیے ہوئے نام کو میں نہیں بدل سکتا۔

(۳)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے وقت حضرت محمد بن طلحہؓ کم سن تھے اور عہدِ شیخینؓ میں ان کا لڑکپن تھا اس لیے کوئی خاص کارنامہ دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ حضرت عثمان ذوالنّورینؓ کے عہدِ خلافت میں پورے جوان ہو گئے اور ایک عابدِ شب بیدار (سجاد) کی حیثیت سے شہرت پائی۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے بڑے بڑے صحابہؓ بھی ان سے دُعائے خیر و برکت کراتے تھے۔

امیر المؤمنین حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے خلاف شورش برپا ہوئی اور باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کر لیا تو حضرت محمد بن طلحہؓ قریش کے ان معدودے چند جوانوں میں تھے

جو کاشانۂ خلافت کے دروازے پر کھڑے ہو کر باغیوں کی مزاحمت کر رہے تھے۔ اس کش مکش میں حضرت محمد بن طلحہؓ، حضرت حسن بن علیؓ اور قنبر مولیٰ حضرت علیؓ زخمی ہو گئے لیکن انھوں نے باغیوں کو دروازے کے اندر گھسنے نہ دیا۔ البتہ بعض فسادی پڑوس کے مکان سے دیوار پھاند کر اندر چلے گئے اور امیر المؤمنینؓ کو شہید کر ڈالا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس سانحۂ جاں گداز کا علم ہوا تو انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ فوراً حضرت عثمان شہیدؓ کے مکان پر پہنچے، اپنے فرزندوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو مارا اور حضرت محمد بن طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو سخت سرزنش کی کہ تم لوگوں کے یہاں ہوتے ہوئے یہ واقعہ کیسے رونما ہوا۔ انھوں نے عرض کیا، ہم کیا کر سکتے تھے، قاتل مکان کی پشت سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ دروازے سے ہم نے کسی کو نہیں آنے دیا۔

حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو ''قصاصِ عثمانؓ'' کے مطالبہ نے زور پکڑا۔ اسی سلسلہ میں جمل کی افسوس ناک لڑائی پیش آئی۔ ایک فریق کی قیادت امُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کر رہی تھیں اور دوسرے کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ـــــ حضرت محمدؓ کا دلی میلان حضرت علیؓ کی طرف تھا لیکن والدِ گرامی حضرت طلحہؓ کی خاطر اُمّ المؤمنینؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ لڑائی کے آغاز میں انھوں نے اُمّ المؤمنینؓ سے عرض کی:

> ''امّاں جان، بیٹے کے لیے کیا ارشاد ہوتا ہے؟'' امُّ المؤمنینؓ سمجھ گئیں کہ وہ لڑائی میں حصہ نہیں لینا چاہتے۔ فرمایا ''تمھارا دل مطمئن نہیں ہے تو تم خیر بنی آدم کا طریقہ اختیار کرو اور اپنا ہاتھ روک لو۔''

اُمّ المؤمنینؓ کا ارشاد سن کر حضرت محمدؓ نے تلوار نیام میں ڈال لی، زرہ اتار کر زمین پر بچھا دی اور اس پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت انھوں نے سر پر سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ حضرت علیؓ کو ان کے خیالات اور مجبوریوں کا علم تھا، انھوں نے اپنے لشکر میں اعلان کرا دیا کہ سیاہ ٹوپی والے (محمدؓ) پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے لیکن جنگ کے ہنگامہ میں ان کا امتیاز نہ ہو سکا یا دانستہ کسی شخص نے ان کو شہید کر ڈالا۔

لڑائی کے اختتام پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت حسنؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کو ساتھ لے کر اپنے مقتولین کو تلاش کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں گئے۔ اچانک حضرت حسنؓ کی

نظر ایک لاش پر پڑی جو منہ کے بل زمین پر پڑی تھی۔ انھوں نے اسے سیدھا کیا تو بے اختیار منہ سے نکلا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ پھر فرمایا، خدا کی قسم یہ قریش کا فرزند ہے۔

حضرت علیؓ نے پوچھا، جان پدر کیا بات ہے؟ انھوں نے عرض کیا ''یہ محمد بن طلحہؓ کی لاش ہے۔'' حضرت علیؓ کو یہ سن کر سخت صدمہ پہنچا، لاش کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا:

''ربّ کعبہ کی قسم یہ سجاد ہے اس نے والد کی اطاعت میں جان دی۔ بڑا نیک فطرت اور پاک باز جوان تھا۔''

حضرت حسنؓ بھی حضرت محمدؓ کی شہادت سے سخت غم زدہ ہو گئے۔ ابنِ اثیرؒ اور امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر انھوں نے پدر گرامی سے مخاطب ہو کر کہا، ''میں آپ کو اس لڑائی سے روکتا تھا لیکن آپ نے فلاں فلاں شخص کا مشورہ قبول کر لیا۔''

اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا، اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ کاش میں آج سے بیس سال پہلے مر گیا ہوتا۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت محمدؓ بن طلحہؓ کو بھی دوسری لاشوں کے ساتھ بصرہ کے قریب سپردِ خاک کر دیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن بدیل خزاعیؓ

(۱)

حضرت عبداللہ بن بدیلؓ اسلام کے اُن فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے پہلے عہدِ رسالت میں اور پھر خلفائے راشدینؓ کے عہد میں اپنی شجاعت وشہامت کے انمٹ نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے اور شجاعانِ اسلام میں شمار ہوئے۔ ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنوخزاعہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عبداللہ بن بدیلؓ بن ورقاء بن عمرو بن ربیعہ بن عبدالعزیٰ بن ربیعہ بن جری بن عامر بن مازن خزاعی۔

حضرت عبداللہؓ کے والد بدیل بن ورقاءؓ بنی خزاعہ کے سرداروں میں سے تھے۔ وہ قبولِ اسلام سے پہلے بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے راہ و ربط رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپؐ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کا قبیلہ صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ ہجری) کے زمانے میں مسلمانوں کا حلیف ہوگیا تھا اور صلح نامہ کی ایک شرط کے مطابق مشرکینِ مکہ اس بات کے پابند تھے کہ وہ بنوخزاعہ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائیں گے اور نہ ان کے دشمنوں کی مدد ان کے مقابلے میں کریں گے۔ لیکن چند ماہ بعد قریش کے حلیف قبیلہ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کیا تو مشرکینِ قریش نے کھلم کھلا بنوبکر کی مدد کی یوں انھوں نے معاہدۂ صلح کو عملاً توڑ دیا۔

بنوبکر نے قریش کے ساتھ مل کر بنوخزاعہ پر جو ظلم ڈھایا، بنوخزاعہ کے ایک وفد نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی۔ چالیس آدمیوں پر مشتمل اس وفد میں بدیل بن ورقاءؓ اور

ان کے صاحب زادے عبداللہؓ بھی شامل تھے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ جن اسباب کی بنا پر سرورِ عالم ﷺ نے ۸ ہجری میں مکہ پر لشکر کشی کی ان میں سے ایک سبب بنوخزاعہ کی حمایت بھی تھا۔ فتح مکہ سے پہلے حضرت عبداللہؓ اور ان کے والد بدیلؓ مسلمانوں کے محض حلیف تھے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد وہ شرفِ اسلام سے بھی بہرہ ور ہو گئے۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ قبولِ اسلام کے وقت حضرت بدیلؓ کی عمر ۹۷ سال کی تھی لیکن ان کی صحت مندی کی یہ کیفیت تھی کہ ڈاڑھی کے تمام بال سیاہ تھے۔ بیعتِ اسلام لیتے وقت حضورؐ نے ان سے پوچھا: ''تمھاری عمر کیا ہے۔''

انھوں نے عرض کیا: ''ستانوے سال''

آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمھارے جمال اور بالوں کی سیاہی میں برکت دے۔''

فتح مکہ کے بعد دونوں باپ بیٹے (حضرت بدیلؓ اور حضرت عبداللہؓ) حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں شریک ہوئے۔ غزوۂ حنین کے بعد مالِ غنیمت اور مشرک قیدیوں کی نگرانی پر حضورؐ نے حضرت بدیلؓ کو مامور فرمایا۔

۱۰ ہجری میں حضرت بدیلؓ اور حضرت عبداللہؓ نے حجۃ الوداع میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

دونوں باپ بیٹے غزوات میں شریک ہو کر اپنے وطن کو لوٹ جایا کرتے تھے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ نے حضرت بدیلؓ کو ایک خط بھیجا تھا۔ وہ اس کو حرزِ جان بنا کر رکھتے تھے۔ اواخرِ عہدِ رسالت میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو وفات کے وقت یہ مکتوبِ مبارک حضرت عبداللہؓ کے حوالے کرتے ہوئے وصیت کی کہ جب تک یہ گرامی نامہ تمھارے پاس رہے گا تم لوگ خیر و برکت میں رہو گے۔

(۲)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو یکایک عرب کی فضا دگرگوں ہو گئی اور ہر طرف فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے تاہم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بے مثال قوتِ ایمانی اور عزم و ہمت کی بہ دولت چند ماہ کے اندر اندر اس فتنہ کا استیصال

ہوگیا۔ اس پُر آشوب دَور میں حضرت عبد اللہ بن بدیلؓ نے نہایت استقامت سے پرچم حق تھامے رکھا اور اپنے قبیلے کو بھی اس فتنہ کی آگ سے بچانے کی پوری کوشش کی۔ وہ بنوخزاعہ کے سردار ابن سردار ہی نہیں تھے بلکہ شجاعت وشہامت میں بھی اپنا جواب آپ تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت کے اواخر میں حضرت عبد اللہ بن بدیلؓ کو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مدد کے لیے ایران روانہ کیا اور انھیں ہدایت کی کہ اصفہان پر لشکر کشی کریں۔ اس زمانے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ قم وکاشان کی مہموں میں مصروف تھے اور انھیں اصفہان کی طرف پیش قدمی کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن بدیلؓ کے پہنچنے سے ان کا بار ہلکا ہوگیا۔ اصفہان ایران کا بڑا اہم صوبہ تھا اور ایرانیوں نے اس کے دفاع کے لیے بڑی جمعیت فراہم کر رکھی تھی۔ حضرت عبداللہ بن بدیلؓ صوبہ اصفہان میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ان کا مقابلہ شہر براز جادویہ سے ہوا جو ایک بااثر اصفہانی رئیس استندار کے لشکر کا آزمودہ کار افسر تھا اور اپنی فوج کے ہراول کی قیادت کر رہا تھا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئیں تو شہر براز جادویہ نبکارتا ہوا میدان میں نکلا اور للکار کر کہا، اگر کسی میں ہمت ہے تو میرے مقابلے میں آئے۔ حضرت عبداللہ بن بدیلؓ اس کی للکار سن کر جوشِ شجاعت سے بے قرار ہوگئے اور لپک کر اس کے سامنے پہنچ گئے۔ جادویہ نے ان پر کئی وار کیے لیکن وہ خالی دے گئے اور پھر خود اپنی تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس کو خاک وخون میں لٹا دیا۔

شہر براز جادویہ کی ہلاکت کی خبر سن کر استندار کی ہمت پست ہوگئی اور اس نے معمولی شرائط پر صلح کرلی۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن بدیلؓ نے آگے بڑھ کر اصفہان کے نواحی قصبہ ''جی'' کا محاصرہ کرلیا۔ اہلِ جی نے بہت جلد ہتھیار پھینک دیئے اور جزیہ دینا منظور کرکے مطیع ہوگئے۔

''جی'' کی تسخیر کے بعد حضرت عبداللہؓ نے خاص شہر اصفہان کو جا گھیرا۔ وہاں کے حاکم فادوسفان نے حضرت عبداللہ بن بدیلؓ کو پیغام بھیجا کہ دوسروں کی جانیں کیوں ضائع ہوں ہم تم لڑکر خود فیصلہ کرلیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ فادوسفان تیس منتخب بہادروں کے ساتھ شہر سے نکل کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن حضرت عبداللہؓ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس موقع پر اس نے حضرت عبداللہؓ سے کہا کہ آؤ ہم تم دونوں ایک دوسرے سے نپٹ لیں۔ حضرت عبداللہؓ نے اس کی تجویز

بلا تامّل مان لی اور فوراً اس کے مقابلے پر جا کھڑے ہوئے۔ فادوسفان ایران کا مانا ہوا جنگجو تھا اس کو یقین تھا کہ کسی دِقّت کے بغیر اپنے مقابل کو زیر کر لے گا۔ لیکن جب مقابلے کا آغاز ہوا تو حضرت عبداللہؓ نے اس کو لوہے کے چنے چبوا دیئے، اور تلوار کا ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ فادوسفان کے گھوڑے کی زین کو کاٹتا ہوا نکل گیا اور وہ خود بڑی مشکل سے بچا۔ اب وہ سمجھ گیا کہ تھوڑی دیر اور مقابلہ جاری رہا تو اس کی جان کی خیر نہیں، ڈھٹائی سے بولا، میں تم جیسے بہادروں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا، میں اس شرط پر شہر حوالہ کرنے کو تیار ہوں کہ باشندوں میں سے جو چاہے جزیہ دے کر شہر میں رہے اور جو چاہے شہر چھوڑ کر نکل جائے۔ حضرت عبداللہؓ نے یہ شرط منظور کر لی اور فادوسفان نے شہر اُن کے حوالے کر دیا۔ اصفہان کو مسخّر کرنے کے بعد حضرت عبداللہؓ اصفہان کے دوسرے علاقوں کی طرف بڑھے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان سب کو فتح کر لیا۔

۲۸ ہجری میں (بہ عہدِ خلافت حضرت عثمان ذوالنّورینؓ) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے جو اس وقت امارتِ بصرہ پر فائز تھے، حضرت عبداللہ بن بدیلؓ کو کرمان کی مہم پر مامور کیا۔ علّامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن بدیلؓ نے طبیس اور کرین کے دو مضبوط قلعوں کو فتح کر لیا۔ ان قلعوں کی تسخیر سے خراسان کی طرف بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ اسے کچھ عرصہ بعد حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے فتح کر لیا۔

(۳)

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ امیر معاویہؓ والیِ شام نے ان کی خلافت کو تسلیم نہ کیا اور دونوں بزرگوں میں شدید اختلافات کا آغاز ہو گیا۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ کا بیان ہے کہ اس نزاع میں حضرت عبداللہ بن بدیلؓ نے حضرت علیؓ کی پرجوش حمایت کی اور جنگِ صفین کے آغاز سے پہلے حضرت علیؓ کے حامیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''لوگو معاویہؓ نے جس بات کا دعویٰ کیا ہے اس کے وہ ہرگز مستحق نہیں ہیں۔ اس دعویٰ میں وہ جس شخص کی مخالفت کر رہے ہیں وہ یقیناً اس کا مستحق ہے خدا کی قسم تم لوگ یقیناً حق پر ہو، اللہ کا نور اور برہان تمھارے ساتھ ہے۔ سرکشوں سے مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ اللہ ان کے مقابلے میں تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے گا۔''

جنگِ صفّین کے عارضی التوا کے بعد جب دوبارہ جنگ شروع ہوئی تو حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن بدیلؓ کو پیدل فوج کا افسر بنایا۔ جنگ کا سلسلہ مدّت تک جاری رہا۔ متحارب فوجوں کے چھوٹے چھوٹے دستے ایک دوسرے کے مقابلے میں آتے تھے اور لڑ بھڑ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن بدیلؓ عراقی سواروں کا ایک دستہ لے کر نکلے۔ شامیوں کی طرف سے ابواعور سلمی شامیوں کا ایک دستہ لے کران کے مقابلے پر نکلا۔ دیر تک فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ پھر عبداللہ بن بدیلؓ جوشِ شجاعت میں شامیوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے اس ٹیلے کی طرف بڑھے جہاں امیر معاویہؓ خیمہ زن تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ شامی فوج کا جو سپاہی عبداللہؓ کے سامنے آتا ہے وہ اسے مار گراتے ہیں تو اپنے ساتھیوں سے کہا، دیکھتے کیا ہو اگر لوہا کام نہیں کرتا تو پتھروں سے کام لو۔ اس پر شامیوں نے حضرت عبداللہؓ پر پتھروں کا مینہ برسا دیا اور حضرت علیؓ کے یہ جاں نثار شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر گئے۔ امیر معاویہؓ ان کی لاش کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

یہ شخص قوم کا مینڈھا تھا اور شاعر کے اس قول کے مصداق تھا:

اخُو الحَرُب اِنْ عَضّتُ بِهِ الحَرُب عَضّها
وَ اِنْ شَمَّرَتْ عَنْ سَاقِهَا الحَرُب شمَّرا
کَسلَيْثِ عَرِيُسنٍ بَاتَ يَحْمِى عَرِينَهُ
رَمَتُهُ المَنَايَا قَصُدها و تقطرَّا

”وہ مردِ میدان تھا، اگر جنگ اسے دانتوں سے کاٹتی تھی تو وہ جنگ کو کاٹ لیتا تھا۔ اگر جنگ پائنچے چڑھا لیتی تھی تو وہ بھی پائنچے چڑھا لیتا تھا۔ وہ کچھار کے شیر کی مانند تھا جو اپنے مامن کی مدافعت کر رہا ہو ایسے عالم میں اسے موت کے تیروں نے بے خطا نشانہ بنا لیا اور وہ لڑ کھڑا کر ایک پہلو پر گر گیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حویطب بن عبدالعزیٰؓ

①

۱۸/ذوالحجہ ۳۵ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں حشر برپا ہوگیا —— چند شریر النفس باغیوں نے حرمِ رسولؐ کی حرمت کو پامال کرڈالا اور اپنے عہد کی عظیم اور مقدس ترین ہستی کو نہایت سفّاکی سے شہید کرڈالا—— پیکرِ جودوسخا، مجسمۂ حلم وتحمل، خلیفۂ عرب وعجم، خویشِ رسول سیّدنا حضرت عثمان ذوالنّورین کی نعش اپنے گھر میں بے گوروکفن پڑی تھی، باغی ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور ان بدبختوں کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ ضعیف العمر قاریِ قرآن خلیفۂ شہیدؓ کے جسدِ مبارک کو سپردِ خاک کیا جائے۔ ان پرخطر حالات میں دوسرے دن رات کو چند (بہ قول بعض سترہ) دلیر مسلمان سربہ کفن ہوکر امیر المؤمنین کے گھر پہنچے اور ان کی خون آغشتہ میت کو اٹھایا۔ پھر ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور جان پر کھیل کر جنت البقیع کے پیچھے حشِ کوکب میں سپردخاک کیا۔ ان دلیر مسلمانوں میں سو برس سے زیادہ عمر کے ایک نورانی صورت بزرگ بھی تھے۔ انھوں نے یہ فرض انجام دینے کے لیے نہ اپنی جان کی پروا کی اور نہ اپنی کبرسنی اور نقاہت کو آڑے آنے دیا۔ یہ بزرگ ابومحمد حویطب بن عبدالعزیٰؓ تھے۔

②

حضرت ابومحمد حویطب بن عبدالعزیٰؓ کا تعلق قریش کے خاندان عامر بن لؤیؒ سے تھا۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:

حویطب بن عبدالعزیٰؓ بن ابوقیس بن عبدِود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لؤی۔

حضرت حویطبؓ اپنے قبیلے کے رؤسا میں سے تھے اور قریش کے ذی اثر اور متموّل ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ زمانۂ جاہلیت کے ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، آفتابِ رسالت فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تو حضرت حویطبؓ ساٹھ برس کے بیٹے میں تھے۔ دعوتِ توحید نے ان پر خاص اثر کیا اور انھوں نے کئی مرتبہ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونا چاہا لیکن ہر بار بنواُمیہ کے رئیس حکم بن اُمیہ نے انھیں یہ کہہ کر اس سعادت سے محروم رکھا کہ اس عمر میں نیا مذہب قبول کرنا تمھاری غیرت کے منافی ہے، آبائی مذہب کو ترک کر کے تم اس عزت اور مرتبہ سے ہاتھ دھو بیٹھو گے جو اس وقت تمھیں قوم میں حاصل ہے۔

بعثتِ نبوی سے فتح مکہ تک کا زمانہ حضرت حویطبؓ نے کس طرح گزارا، اس کا حال ابنِ سعدؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ نے خود حضرت حویطبؓ کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:

''میں بدر کی لڑائی میں بھی مشرکین کے ساتھ تھا۔ میں نے بہ چشمِ خود دیکھا کہ ملائکہ آسمان سے اتر رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت سمجھ لیا کہ اس آدمی (محمد ﷺ) کی حفاظت کی گئی ہے تاہم میں نے جو کچھ دیکھا اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا چناں چہ ہم شکست کھا کر مکہ واپس گئے۔ میں مکہ میں ٹھہرا رہا اور قریش ایک ایک دو دو کر کے اسلام لاتے رہے۔ صلح حدیبیہ کے دن بھی میں موجود تھا۔ اور اس معاملہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ صلح نامہ کا آخری گواہ میں تھا اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا، قریش کو محمدؐ کی طرف سے وہی دیکھنا ہوگا جو ان کو برا لگتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ عمرۃ القضا کے لیے مکہ تشریف لائے تو بہت سے قریش مکہ سے باہر چلے گئے لیکن میں اور سہیل بن عمرو مکہ میں اس ارادہ سے ٹھہرے رہے کہ وقت پورا ہونے پر مسلمانوں کو مکہ سے نکل جانے کے لیے کہیں۔ چناں چہ تیسرا دن ہوتے ہی میں نے اور سہیل نے آپؐ کے پاس جا کر کہا کہ آپ کی شرط پوری ہو چکی آپ اب اس شہر سے تشریف لے جائیے۔ آپؐ نے اسی وقت حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ منادی کر دیں، سورج چھپنے سے پہلے پہلے جتنے مسلمان میرے ہم راہ آئے ہیں ایک بھی مکہ میں نہ رہے۔''

(طبقات ابنِ سعد، الاصابہ)

رمضان ۸ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے مکہ معظّمہ پر پرچمِ اسلام بلند کیا تو حضرت حویطبؓ پر کیا بیتی، اس کا حال بھی انھوں نے خود اس طرح بیان کیا ہے:

''جب رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے بعد شہر میں داخل ہوئے تو مجھے انتہائی خوف محسوس

ہوا میں اپنے گھر سے نکل گیا۔ اپنے اہل وعیال کو مختلف محفوظ مقامات میں پہنچا دیا اور خود عوف کے باغ میں پناہ لی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ابوذر غفاریؓ میری طرف آرہے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان پرانی دوستی تھی لیکن اس وقت میں انھیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ انھوں نے پکار کر کہا، ابومحمد رک جاؤ۔ میں رک گیا۔ انھوں نے پوچھا بھاگ کیوں رہے ہو؟ میں نے کہا، تمھارے نبیﷺ آگئے ان کے خوف سے بھاگ رہا ہوں۔

ابوذرؓ نے کہا، تم اللہ کے دیئے ہوئے امان میں ہو —— یہ سن کر میں ان کے پاس گیا اور سلام کیا۔ انھوں نے کہا، چلو اپنے گھر چلو۔ میں نے کہا، میرے لیے گھر جانے کی کوئی سبیل بھی ہے خدا کی قسم مجھ کو تو یہ گمان ہے کہ میں گھر تک زندہ نہیں پہنچ سکتا یا تو راستے ہی میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا اور اگر گھر پہنچ بھی گیا تو کوئی مسلمان گھر میں گھس کر مجھ کو مار ڈالے گا۔ اور میرے بال بچے بھی مختلف مقامات پر ہیں۔

ابوذرؓ نے کہا، اپنے بال بچوں کو کسی جگہ اکٹھا کرلو، تم کو میں خود تمھارے گھر پہنچا دوں گا۔

چناں چہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چلے اور بلند آواز سے یہ اعلان کرتے گئے کہ حویطب کو امان مل چکا ہے ان کو کوئی شخص نہ چھیڑے۔

ابوذرؓ مجھے بہ حفاظت گھر پہنچا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آپؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ سوائے چند اشتہاری مجرموں کے باقی سب لوگوں کو امن ہے؟ مجھے حضورؐ کا ارشاد کے علم ہوا تو میں مطمئن ہوگیا اور اپنے بال بچوں کو گھر لے آیا۔ پھر ابوذرؓ میرے پاس آئے اور کہا، ابومحمد کب تک اور کب تک؟ بھلائی کے بہت سے موقعے ہاتھ سے نکل گئے، اب بھی وقت ہے —— چلو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام لے آؤ۔ آپؐ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بھلے، سب سے زیادہ صلۂ رحمی کرنے والے اور سب سے زیادہ بردبار ہیں ان کے شرف واعزاز میں تمھارا شرف واعزاز ہے۔

میں نے کہا، میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

چناں چہ میں ابوذرؓ کے ساتھ بطحا کے مقام پر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ کے پاس حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ میں نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ حضورؐ کو سلام کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

انھوں نے کہا، السّلام علیک، ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ میں نے آپؐ کو سلام کیا۔

آپؐ نے کہا، ''وعلیکم السلام اے حویطب''
میں نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں ـــــ اور بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''تمام حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے تمھیں ہدایت دی۔''
میرے قبولِ اسلام سے آپؐ بہت خوش ہوئے۔ پھر آپؐ نے مجھ سے کچھ قرض طلب کیا۔ میں نے چالیس ہزار درہم بہ طور قرض دیئے۔''

قبولِ اسلام کے وقت حضرت حویطبؓ کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن اس بڑھاپے کے باوجود انھوں نے غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ حنین کے مالِ غنیمت میں سے حضورؐ نے ان کو سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ غزوۂ طائف کے بعد حضرت حویطبؓ مکہ معظّمہ سے مدینہ منوّرہ کو منتقل ہو گئے۔

(۳)

حضرت عمر فاروقؓ، حضرت حویطبؓ کو بہت مانتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہدِ خلافت میں حدودِ حرم کو ازسرِ نو مقرر کرنا چاہا اور اس مقصد کے لیے صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کو نامزد کیا۔ حضرت حویطبؓ بھی اس جماعت کے ایک رکن تھے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے خلاف شورش برپا ہوئی تو حضرت حویطبؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ نے باغیوں کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنی مفسدانہ روش سے باز نہ آئے یہاں تک کہ امیر المومنینؓ کی شہادت کا سانحۂ جاں گداز پیش آیا۔ باغیوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی کو خلیفۂ مظلومؓ کی نعش دفن کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بالآخر حضرت حویطبؓ اور سولہ دوسرے مسلمانوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر یہ کام انجام دیا۔
حضرت حویطبؓ بڑے حق گو اور بے باک تھے۔ امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں مروان بن الحکم مدینہ منوّرہ کا گورنر مقرر ہوا۔ حضرت حویطبؓ ایک دن اس کے پاس گئے تو اس نے طنزاً کہا، ''بڑے میاں آپ نے اسلام لانے میں اتنی دیر کیوں کی، بہت سے نوجوان اس سعادت کے حصول میں آپ پر سبقت لے گئے۔
حضرت حویطبؓ نے جواب دیا۔ ''بھائی میں نے کئی بار قبولِ اسلام کا ارادہ کیا تھا لیکن

تمھارے باپ (حکم بن امیہ) نے غیرت دلا کر مجھے اس شرف سے محروم رکھا۔'' مروان یہ سن کر فرطِ خجالت سے چپ ہوگیا لیکن حضرت حویطبؓ نے پھر فرمایا، شاید تم کو معلوم نہ ہو کہ تمھارے باپ نے عثمان بن عفانؓ پر قبولِ اسلام کے جرم میں کیا کیا ستم ڈھائے۔ اس پر مروان اور بھی نادم ہوا اور اس نے پھر کبھی حضرت حویطبؓ سے طنز آمیز گفتگو نہ کی۔

حضرت حویطبؓ نے امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں مدینہ منوّرہ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت سوا سو سال کے قریب عمر تھی ـــــ حضرت حویطبؓ سے مروی چند احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ یہ حدیثیں انھوں نے بعض کبار صحابہؓ سے روایت کی ہیں۔ ان کے رواۃِ حدیث میں ان کے فرزند ابوسفیانؒ اور عبداللہ بن بریدہؒ شامل ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عباس بن مرداسؓ

(۱)

حضرت ابوالفضل عباس بن مرداسؓ کا شمار رحمتِ عالم ﷺ کے اُن فدائیوں میں ہوتا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں ایک اونچے درجے کے شاعر، اعلیٰ درجہ کے شہسوار (فارس) اور اپنے قبیلے کے سردار ہونے کے باوجود شراب خواری سے سخت متنفّر تھے حالاں کہ بادہ وجام اس زمانے میں شاعری، شہسواری اور ریاست کا لازمہ تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے پوچھا، اے سردار آپ شراب کیوں نہیں پیتے کہ یہ طبیعت میں سرور پیدا کرتی ہے اور قوت وہمت بھی۔

انھوں نے جواب دیا: ''میں قوم کا سردار ہوکر احمق نہیں بننا چاہتا۔ خدا کی قسم میرے پیٹ میں وہ چیز کبھی نہیں جاسکتی جو عقل وہوش سے محروم کردے۔''

حضرت عباس بن مرداسؓ کا تعلق نجد کے قبیلہ بنوسلیم سے تھا جو بنوقیس بن عیلان کی ایک شاخ تھا۔ یہ قبیلہ اپنی شرافتِ نفس، جود وسخا اور شجاعت وبسالت کی بنا پر قبائلِ عرب میں امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر خود سیّد المرسلین ﷺ نے اس قبیلہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی:

''بلاشبہ ہر قوم کی ایک پناہ گاہ ہوتی ہے اور عرب کی پناہ گاہ قیس بن عیلان ہے۔''

حضرت عباسؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عباسؓ بن مرداس بن ابی عامر بن حارثہ بن عبد بن عبس بن رفاعہ بن حارث بن حی بن حارث بن بہثہ بن منصور السلمی۔

حضرت عباسؓ نامور مرثیہ گو صحابیہ الخنساءؓ بنتِ عمرو کے سوتیلے بیٹے تھے اور اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ان کا شمار شعرائے مخضر مون میں ہوتا ہے یعنی وہ شعراء جنھوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا اور اسلام کا بھی۔

اگرچہ حضرت عباسؓ کو شاعری میں اپنی نامور سوتیلی ماں حضرت خنساءؓ جیسا مرتبہ تو حاصل نہ ہوسکا تاہم اس معاملہ میں انھیں اپنے بہن بھائیوں پر جو سب کے سب نہایت اچھے شاعر تھے، برتری حاصل تھی۔ ان میں سے ایک بھائی سراقہ بن مرداس اور بہن عمرۃ بنتِ مرداس ان کے بعد زندہ رہے۔ انھوں نے حضرت عباسؓ کی وفات پر دل دوز مرثیے کہے۔

(۲)

ابنِ ہشامؒ نے حضرت عباس بن مرداسؓ کے قبولِ اسلام کے متعلق ایک عجیب روایت بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ کو اپنے والد سے ایک بت ملا جس کا نام ضمار تھا۔ باپ کے حکم کے مطابق حضرت عباسؓ اس بُت کی پوجا کیا کرتے تھے ان کے اہلِ قبیلہ کا بھی یہی شعار تھا۔ ایک دفعہ عباسؓ آدھی رات کو اس بُت کی پرستش کر رہے تھے کہ انھیں ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی منادی کہہ رہا ہے ''پیغمبرِ آخر الزّماںؐ کا ظہور ہو چکا ہے اور ضمار کی بربادی کا وقت آ گیا ہے۔'' دوسری مرتبہ کسی شخص نے کڑک کر انھیں سوتے سے جگایا اور ایسے ہی الفاظ کہے۔ حضرت عباسؓ کے لیے یہ تنبیہ کافی تھی۔ انھوں نے ضمار کو آگ میں جھونکا اور فوراً عازمِ مدینہ ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کے دستِ حق پرست پر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس زمانے میں حضورؐ فتح مکہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ آپؐ نے حضرت عباسؓ کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے قبیلہ میں واپس جائیں اور قبیلہ کے مسلمانوں کو ساتھ لے کر آپؐ کو القدید کے مقام پر ملیں۔

حضرت عباسؓ اپنے قبیلے میں واپس گئے اور بڑے موثّر اور پُرزور انداز میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ بنو سلیم کے بیشتر لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور اپنے بُت کو جلا کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے لیکن حضرت عباسؓ کی اہلیہ حبیبہ بنت الضّحاک السلمی کی مت ماری گئی۔ وہ دعوتِ توحید قبول کرنے کی بہ جائے حضرت عباسؓ کے قبول اسلام پر سخت برافروختہ ہوئی اور انھیں

چلی کٹی سناتی اپنے خاندان والوں میں واپس چلی گئی۔ حضرت عباسؓ نے حضورؐ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کیا اور فتح مکہ (رمضان ۸ ہجری) کے موقع پر اپنے قبیلے کے نو سو مسلّح بہادر سواروں کے ہم راہ القدید کے مقام پر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مکہ میں داخلہ کے وقت آپؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ یوں وہ ان دس ہزار نفوسِ قدسی میں شامل ہو گئے جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے کتابِ استثنا میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی:

> ''خداوند سینا سے آیا، شعیر سے ان پر آشکارا ہوا اور کوہِ فاران سے ان پر جلوہ گر ہوا۔ اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ان کے لیے آتشیں (نورانی) شریعت تھی۔''

اس موقع پر حضرت عباسؓ نے ایک پرزور قصیدہ کہا جس میں فتح پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

(۳)

فتح مکہ کے بعد حضرت عباس بن مرداسؓ نے حنین اور اوطاس کے غزوات میں دادِ شجاعت دی۔ حضورؐ نے جعرانہ کے مقام پر حنین کا مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو حضرت عباسؓ کو ''مؤلفۃ القلوب'' میں شامل فرمایا۔ ''مؤلفۃ القلوب'' وہ بارسوخ (نومسلم) عرب سردار تھے جن کے بارے میں حضورؐ کو حکم ہوا تھا کہ مدارات وعطا سے ان کی تالیفِ قلب کریں تاکہ دوسرے لوگ بھی اسلام کی طرف راغب ہوں۔ حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ عام طور پر مؤلفۃ القلوب کو مالِ غنیمت میں سے سو سو اونٹ فی کس عطا ہوئے لیکن حضرت عباسؓ کو (کسی وجہ سے) کم اونٹ ملے۔ انھوں نے دوسرے سرداروں کے مقابلے میں اپنا حصہ کم دیکھ کر ایک قصیدے میں شکوہ کیا۔ حضورؐ نے یہ قصیدہ سنا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے فرمایا، ''اقطع عنی لسانہ'' (اس کی زبان کاٹ دو) حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کا ہاتھ پکڑا اور کہا، میرے ساتھ چلو۔ راستے میں حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا، اے علی کیا آپ میری زبان کاٹیں گے؟ انھوں نے کہا، تم میرے ساتھ چلے آؤ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ غرض وہ حضرت عباسؓ کو اونٹوں کے گلّے میں لے گئے اور ان سے فرمایا کہ اس گلّے میں سے اپنی پسند کے سو اونٹ چن لو۔ انھوں نے سو اونٹ چن لیے اور خوش ہو گئے۔

حنین اور اوطاس کے غزوات کے بعد حضرت عباسؓ نے غزوۂ طائف میں حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ وہ ہر لڑائی کے خاتمہ پر پرزور قصیدہ کہتے تھے۔

ابنِ سعدؒ نے ''طبقات'' میں لکھا ہے کہ مذکورہ غزوات کے علاوہ حضرت عباس بن مرداسؓ اور غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ لڑائی کے زمانے میں آتے تھے اور لڑائی ختم ہونے پر اپنے وطن (بنوسلیم کے علاقے میں) واپس چلے جاتے تھے۔ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر بھی حضورؐ کے ہم رکاب تھے۔ ابنِ ماجہؒ اور بیہقیؒ نے حجۃ الوداع کے سلسلے میں حضرت عباس بن مرداسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

> ''رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کی بخشش کی دُعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دُعا کو قبول فرماتے ہوئے کہا، میں نے سب کو بخش دیا لیکن ظالم کو نہیں بخشوں گا اور مظلوم کا حق اس سے ضرور لوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا، اے پروردگار اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت عطا فرمادے اور ظالم کو بخش دے لیکن یہ دعا عرفہ کی شام کو قبول نہیں کی گئی۔ پھر جب مزدلفہ میں صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پھر یہی دعا مانگی اور آپؐ کی خواہش کے مطابق آپؐ کی دُعا قبول کر لی گئی۔ (اللہ تعالیٰ نے ظالم کو بھی بخش دیا) راوی کا بیان ہے (کہ قبولیتِ دُعا کے بعد) رسول اللہ ﷺ ہنسے یا مسکرائے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں یہ وقت ہنسنے کا نہیں ہے کس چیز نے آپؐ کو ہنسایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ ہنساتا رہے۔ آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس کو جب معلوم ہوا کہ خداوندِ بزرگ و برتر نے میری دعا کو قبول فرمالیا ہے اور میری اُمت کو بخش دیا ہے تو وہ سر پر خاک ڈالتا اور واویلا کرتا ہوا بھاگ نکلا۔ اس کو پریشان و بدحواس دیکھ کر مجھ کو ہنسی آگئی۔'' (مشکوٰۃ شریف جلد اوّل)

اہلِ سِیَر نے حضرت عباسؓ بن مرداس کے سالِ وفات کی تصریح نہیں کی لیکن اتنا ضرور ثابت ہے کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں حیات تھے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ بصرے کے قریب آباد ہوگئے تھے اور اکثر شہر میں آتے رہتے تھے جہاں اہلِ بصرہ اُن سے حدیثیں سنا کرتے تھے۔

اگرچہ فضل و کمال کے اعتبار سے حضرت عباس بن مرداسؓ کوئی امتیازی درجہ نہیں رکھتے تھے تاہم ان سے مروی کچھ احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔

علّامہ یوسف بن زکی المزّیؒ نے "تہذیب الکمال" میں لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ کے فرزند کنانہؒ نے ان سے روایت کی ہے۔

حضرت عباسؓ کے فرزند جلہمہؒ کا شمار بھی ان رواۃِ حدیث میں ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

(۴)

حضرت عباس بن مرداسؓ شاعری میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کا کلام جاہلیت کے زمانے کے کلام سے بالکل مختلف ہے کیوں کہ یہ ان کے تأثراتِ اسلامی کا آئینہ دار ہے اور اس میں نورِ ہدایت کی جھلک ہے۔ سرورِ عالم ﷺ کی مدح میں ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

یا خاتم النباء انک مرسل بالحق کل ھدی السبیل ھداک

"اے خاتم المخبرین آپ حق کے ساتھ بھیجے گئے ہیں اور اللہ نے آپ کو ہدایت کے تمام راستوں کی راہ دکھا دی ہے۔"

ان الالہ نبی علیک محبۃ فی خلقہ و محمداً اسما کا

"اللہ نے آپ کو اپنی مخلوق کی محبت کی بنیاد قرار دیا ہے اور آپ کا نام محمدؐ رکھا ہے۔"

"دائرۂ معارفِ اسلامیہ" (دانش گاہِ پنجاب) کے مطابق حضرت عباس بن مرداسؓ کی شہرت میں ان کے کلام کے محاسن کے دوش بہ دوش بہ ظاہر ان کی شخصی وجاہت کو بھی دخل تھا۔ اگرچہ ان کا کوئی دیوان مرتّب نہیں کیا گیا لیکن ان کا جو کلام موجود ہے اس سے وہ ایک زبان آور اور قادر الکلام شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ عہدِ رسالت کے بعض غزوات کے موقع پر انھوں نے جو قصیدے کہے ابنِ ہشامؒ نے انھیں "سیرۃ النبویہ" میں نقل کیا۔ ان کے علاوہ ان کے کچھ مشہور قصیدے یہ ہیں:

(۱) مہاجات ـــــ جو ان کے اور ان کے ہم قبیلہ خفاف بن ندبہ کے درمیان ہوئی۔

(۲) قصیدہ جو انھوں نے اس موقع پر کہا جب انھوں نے یمن میں بنوزبید پر ایک کامیاب حملہ کیا۔

(۳) قصیدہ جو انھوں نے ضمار کو جلانے اور اسلام قبول کرنے کے متعلق لکھا۔

(۴) قصیدہ جو انھوں نے غزوۂ حنین کے بعد مالِ غنیمت میں سے اپنا حصہ کم ہونے کے بارے میں کہا اور جسے سن کر سرورِ عالم ﷺ نے ان کا حصہ دوسرے مؤلفۃ القلوب سرداروں کے برابر کر دیا۔

حضرت عباس بن مرداسؓ کا کلام جہاں زبان کی مقامی خصوصیات کا مظہر ہے وہاں ان کے جوشِ شجاعت اور حبِ رسولؐ کا آئینہ دار بھی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن عامرؓ

(۱)

۴ ہجری کا ذکر ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حصول برکت کے لیے ایک نومولود بچہ پیش کیا گیا۔ عہدِ رسالت میں مہاجرین اور انصار نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں لاتے اور ان کے لیے دعائے خیر و برکت کے متمنی ہوتے۔ یہ بچہ بھی اسی دستور کے مطابق حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ نے اس بچے پر شفقت بھری نظر ڈالی پھر اس کے منہ میں اپنا لعابِ دہن ڈال کر اس کے لیے زندگی، صحت اور خوش بختی کی دُعا مانگی۔ بچے نے حضورؐ کے لعابِ دہن کو بڑی رغبت اور مزے سے نگل لیا۔ اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا:

''یہ (بچہ بڑا ہوکر) مسقی (سیراب کرنے والا) ہوگا۔''

عرب میں پیاسوں کو پانی پلانے والے یا سیراب کرنے والے کو بڑا خوش بخت اور بلند رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ طفلِ خوش نصیب جن کے منہ میں سیّد الانبیاء والمرسلین ﷺ نے اپنا لعابِ دہن ڈالا اور جن کے بارے میں ''مسقی'' ہونے کی پیش گوئی فرمائی، حضرت عبداللہ بن عامرؓ تھے۔

حضرت عبداللہ بن عامرؓ قریش کے معزز خاندان بنوعبدِ شمس کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد عامر بن کریز سرورِ عالم ﷺ کی پھوپھی البیضاء بنتِ عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ اس نسبت سے عامر بن کریز حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی اور عبداللہ بن عامرؓ آپؐ کے بھتیجے ہوتے تھے۔

اس طرح حضرت عبداللہؓ کی پھوپھی اروی بنتِ کریز حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی والدہ تھیں، اس ناتے سے حضرت عثمان غنیؓ حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

حضرت عبداللہؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبداللہ بن عامر بن کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبدِ شمس بن عبدِ مناف بن قصی۔

عبدِ مناف پر ان کا سلسلۂ نسب حضور ﷺ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ حضورؐ کے پردادا ہاشم بن عبدِ مناف، حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے جدِ اعلیٰ عبدِ شمس بن عبدِ مناف کے حقیقی بھائی تھے۔

(۲)

حضرت عبداللہ بن عامرؓ کا شمار صغارِ صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ عہدِ رسالت اور عہدِ صدیقی میں وہ کم سن تھے۔ عہدِ فاروقی میں ان کا عنفوانِ شباب تھا۔ اربابِ سِیَر نے عہدِ رسالت اور شیخینؓ کے پورے دَور میں ان کے کسی خاص کارنامہ کا ذکر نہیں کیا البتہ قرائن سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اِن کی تعلیم و تربیت نہایت عمدہ طریقے سے ہوئی کیوں کہ بعد میں وہ نہ صرف اپنی عسکری اور انتظامی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک رجلِ عظیم ثابت ہوئے بلکہ اپنی سخاوت، ذاتی اوصاف و خصائل اور اپنے متعدد رفاہی کاموں کی وجہ سے بھی شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ جہاں تک ان کی فوجی قابلیت کا تعلق ہے انھیں کسی تردّد کے بغیر قرنِ اوّل کے عظیم ترین مسلمان جرنیلوں کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

عام روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عامرؓ پہلی مرتبہ ۲۹ھ ۶۴۹-۶۵۰ء میں اس وقت منظرِ عام پر آئے جب خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنّورینؓ نے انھیں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی جگہ بصرہ کا والی (گورنر) مقرر کیا۔ لیکن مولانا سید ابوظفر ندوی نے ''تاریخِ سندھ'' میں لکھا ہے کہ اس سے پہلے حضرت عثمانؓ انھیں ۲۵ھ میں سیستان کی مہم پر بھیج چکے تھے۔ سیستان اگرچہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہو چکا تھا لیکن کابل جو اس وقت صوبہ سیستان کا ایک حصہ تھا، ابھی تک مسخر نہیں ہوا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عامرؓ سیستان پہنچ کر وہاں سے کابل پر حملہ آور ہوئے اور شہر کا محاصرہ

کرلیا۔ اہلِ کابل قلعہ سے باہر نکل کر بڑی بہادری سے لڑے لیکن حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے انھیں شکستِ فاش دی اور کابل پر پرچم اسلام بلند کردیا۔ یہ ہندستان کا وہ دروازہ تھا جسے مسلمانوں نے بہ زورِ شمشیر فتح کیا لیکن جیسے ہی عرب فوج واپس گئی کابل پھر خود مختار ہوگیا۔

۲۹ ہجری میں حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے ولایتِ بصرہ کی ذمہ داری سنبھالی تو ان کی عمر پچیس برس کی تھی اور ان کی حوصلہ مندی اور شجاعت اپنے پورے شباب پر تھی۔ صوبۂ بصرہ کی اس زمانے میں بڑی اہمیت تھی اور اس کا والی تمام مشرقی ممالک کا حاکمِ اعلیٰ متصوّر ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے بصرہ آکر اپنے زیرِ امارت علاقوں کے حالات کا جائزہ لیا تو وہ یہ دیکھ کر متحیر ہوگئے کہ کابل سمیت اکثر مفتوحہ ممالک باغیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے تہیہ کرلیا کہ وہ نہ صرف باغیوں کو مطیع کریں گے بلکہ غیر مفتوحہ علاقوں کو بھی خلافتِ اسلامیہ کے زیرِ نگین کریں گے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جوشِ جہاد سے سرشار مجاہدین پر مشتمل متعدد لشکر مرتّب کیے اور انھیں آزمودہ کار افسروں کی قیادت میں مختلف علاقوں کی تسخیر پر مامور کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے خود ایک مضبوط لشکر کے ساتھ فارس پر چڑھائی کی اور اصطخر، وراب جرد اور جور (فیروزآباد) پر قبضہ کرکے اس صوبے کی تسخیر پایۂ تکمیل تک پہنچادی۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ جس زمانے میں وہ جور کی تسخیر میں مشغول تھے، اصطخر کے باشندوں نے بغاوت کردی اور وہاں کے مسلمان حاکم کو قتل کرڈالا۔ حضرت عبداللہؓ جور کو فتح کرنے کے بعد اصطخر کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک ہی ہلّے میں اس کو دوبارہ فتح کرکے باغیوں کو قرار واقعی سزا دی۔ اس کے بعد انھوں نے کاربان اور قیشجان کے شہروں پر اپنا تسلّط قائم کیا، اور پھر ایک لشکر بھیج کر کرمان کے علاقے کو مطیع و منقاد بنایا۔

سیستان میں اہلِ کابل مسلمانوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے ان کی سرکوبی کے لیے عبداللہ بن عمیر لیثی کو سیستان کا حاکم بنا کر بھیجا۔ انھوں نے وہاں پہنچتے ہی کابل پر یلغار کی اور باغیوں کے سارے کس بَل نکال کر کابل پر قبضہ کرلیا۔ یہ سب ۲۹ھ کے واقعات ہیں۔

۳۰ھ ۶۵۱ء میں حضرت عبداللہ بن عامرؓ آندھی اور طوفان کی طرح خراسان کی طرف بڑھے اور ھیاطلہ (Ephthalites) کو شکست دے کر دو تین سال کے اندر اندر مرو، بلخ اور ہرات

تک سارے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ حضرت عبداللہؓ ایک طرف خود جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھے دوسری طرف وہ اپنے ماتحت افسروں کو مختلف اطراف و جوانب کی تسخیر کے لیے روانہ کررہے تھے۔ احنفؓ بن قیس کو قہستان، یزید جرشی ـــــ کورستاق زام، اسود بن کلثومؒ کورستاق بہق اور عبداللہ بن معمر کو مکران کی تسخیر اور انتظام کے لیے مامور فرمایا۔

علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو خط لکھا کہ کسی شخص کو ہندستان کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجو۔ انھوں نے حکیم بن جبلہ عبدی کو روانہ کیا۔ وہ واپس آئے تو حضرت عثمانؓ نے ان سے وہاں کے حالات دریافت کیے، انھوں نے عرض کیا:

''امیر المؤمنین، وہاں پانی کی بہت قلّت ہے اور وہاں کے لوگ ڈاکو ہیں۔ تھوڑی فوج جائے تو لوٹ لی جائے اور زیادہ جائے تو پیاس سے برباد ہو جائے۔''

اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو حکم بھیجا کہ اپنی فوج کو ہندستان میں داخل ہونے سے منع کردو۔

یہ روایت مشکوک معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے ایک جرنیل عبدالرحمٰن بن سمرہ نے موجودہ بلوچستان میں داخل ہوکر کئی مقامات فتح کیے۔ اس وقت حضرت عثمان غنیؓ ہی کا دورِ خلافت تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو کوئی امتناعی حکم بھیجا ہوتا تو وہ کبھی اپنے کسی فوجی افسر کو حدودِ ہند میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتے۔

ابن اثیرؒ نے بالکل اسی قسم کا واقعہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں ہندستان جانے والے شخص کا نام حکیم بن جبلہ عبدی کی بہ جائے صحار عبدی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے بعض وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کو ہندستان کی طرف بڑھنے سے منع فرمایا تھا۔

(۳)

مختلف مہمات پر مامور کیے گئے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے فوجی افسروں نے جو کارنامے انجام دیئے یہاں ان کا ذکر بے محل نہ ہوگا کیوں کہ یہ افسر حضرت عبداللہؓ ہی سے ہدایات حاصل کرتے تھے۔

حضرت ابنِ عامرؓ نے عبداللہ بن عمیر لیثی کو سیستان کا اور عبدالرحمٰن بن عبیس کو کرمان کا والی مقرر کیا تھا۔ ان دونوں نے وہاں امن وامان قائم رکھنے کے لیے بڑے عمدہ انتظامات کیے لیکن ان دونوں صوبوں کے باشندے سخت شورش پسند تھے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فساد برپا کر دیتے۔ ابنِ عامرؓ کو ان حالات کی اطلاع ملی تو وہ خود خراسان پہنچے اور ابنِ اثیرؒ کے بیان کے مطابق سیستان کی حکومت ربیع بن زیاد حرثی کو دی اور مجاشع بن مسعود کو کرمان کا والی مقرر کیا۔

مجاشع بن مسعودؓ نے کرمان پہنچ کر پہلے وہاں کے ایک اہم شہر ہمید کو فتح کیا۔ اس کے بعد شورش پسندوں کو کچل کر سیستان کے دار الحکومت ''سیرجان'' پر اپنا تسلّط قائم کیا۔ عام باشندوں کو تو انھوں نے معافی دے دی البتہ باغیوں اور مفسدوں کے سرداروں کو جلاوطن کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے جیرفت کو مسخر کیا اور پھر قفص کے پہاڑوں میں ایک خوں ریز جنگ کے بعد وہاں کے باشندوں کو مطیع کیا۔

''قفص'' کے بارے میں مولانا سید ابوظفر ندوی نے'' تاریخِ سندھ'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قفص بہ ظاہر قبچ کا معرب معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قبچاق (ترکستان) کے باشندے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے (یا فاتحانہ) کسی زمانہ میں ہندستان کے مغربی پہاڑوں میں آبسے تھے۔ غالباً انھی کو آج پٹھان اور بلوچ کہا جاتا ہے۔

احنف بن قیسؓ قہستان کی طرف بڑھے تو ترکوں نے ابنِ عامر کی خدمت میں ایک وفد بھیج کر صلح کر لی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ احنفؓ نے ترکوں کو بہ زورِ شمشیر مغلوب کر کے قہستان پر قبضہ کیا۔

یزید جرشیؓ نے رستاق زام کے علاقے پر یلغار کی اور باخرز، رستاق زام اور جوین کو فتح کر لیا۔ اسود بن کلثومؓ نے رستاق بہق پر حملہ کیا لیکن وہ اس معرکے میں شہید ہو گئے تاہم ان کے جانشین ادھم بن کلثومؓ نے دشمنوں کو شکست دی اور بہق پر پرچمِ اسلام بلند کر دیا۔

عبیداللہ بن معمرؓ نے مکران میں اپنے قدم جما کر تمام باغیوں کی سرکوبی کی اور فتح پر فتح حاصل کرتے ہندستان کی سرحد تک پہنچ گئے۔

ربیع بن زیادؓ نے سیستان پہنچ کر پہلے قلعہ زالق پر قبضہ کیا لیکن جب اہلِ زالق نے اطاعت کا حلف اٹھایا تو یہ قلعہ ان کو واپس کر دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کئی خوں ریز معرکوں

کے بعد کرکویہ، زاشت، ناشروز اور شرواز کے شہر مسخر کیے اور پھر زرنج کا محاصرہ کرلیا۔ اہل زرنج پہلے تو قلعہ بند ہو کر خوب مقابلہ کرتے رہے لیکن پھر محاصرہ کی سختی سے تنگ آ گئے اور صلح کا پیغام بھیجا۔ ربیع نے گفت وشنید کے لیے ان کے حاکم کو جاں بخشی کا وعدہ کر کے بلا بھیجا۔ اِدھر انھوں نے اپنے سپاہیوں کو ایسے کپڑے پہنا دیئے اور ان کی ہیئت ایسی بنا دی کہ ان کو دیکھ کر خوف آتا تھا پھر خود ایک لاش پر بیٹھ گئے اور ایک لاش تکیہ کی جگہ اپنے پیچھے رکھ لی۔ حاکمِ زرنج ان سے ملاقات کے لیے آیا تو یہ کیفیت دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے بلا حیل وحجت مسلمانوں کی شرطیں مان کر شہر کے دروازے کھول دیئے۔ زرنج کی تسخیر کے بعد ربیع نے دریائے سناروز کو پار کیا اور ''اصطبل رستم'' نام کے ایک اہم قصبے پر حملہ آور ہوئے۔ اہل قصبہ نے پہلے تو مقابلہ کیا لیکن جب دیکھا کہ مسلمانوں سے نبرد آزما ہونا ان کے بس کی بات نہیں تو ہتھیار پھینک دیئے اور اطاعت قبول کر لی۔ غرض ربیع تمام سیستان میں امن وامان قائم کر کے زرنج واپس آ گئے۔ ایک سال کے بعد وہ اپنا ایک نائب سیستان میں چھوڑ کر عبداللہؓ بن عامر سے ملنے خراسان آئے۔ ان کے سیستان سے جاتے ہی باغیوں نے پھر سر اٹھایا اور نائب کو سیستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو ان حالات کی خبر ہوئی تو انھوں نے ایک آزمودہ کار جرنیل حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کو سیستان کی از سرِ نو تسخیر پر مامور کیا اور ساتھ ہی اس کی امارت کا پروانہ لکھ دیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ جو شرفِ صحابیت کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی عسکری صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھے آٹھ ہزار جاں بازوں کے ساتھ سیستان میں داخل ہوئے اور تمام مزاحمتوں کو کچلتے ہوئے زرنج پہنچ گئے۔ زرنج کے ایرانی حاکم ایران بن رستم نے شہر کے دروازے بند کر لیے لیکن بالآخر اس کی قوتِ مقاومت جواب دے گئی اور اس نے بیس لاکھ درہم اور دو ہزار غلام دے کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جس دن حضرت عبدالرحمٰنؓ نے زرنج پر حملہ کیا، اہل زرنج اپنے کسی تیوہار کے جشن میں مشغول تھے۔ مسلمانوں کو اچانک اپنے سر پر پایا تو حواس باختہ ہو گئے اور کسی مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔

زرنج کو مسخر کرنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان تمام علاقوں پر لوائے توحید بلند کیا جو زرنج اور کش کے درمیان تھے۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوظفر ندوی اپنی کتاب ''تاریخِ سندھ''

میں لکھتے ہیں:

''عبد الرحمٰن بن سمرہؓ ان تمام علاقوں پر قابض ہو گئے جو زرنج اور کش کے درمیان تھے۔ یہ علاقہ گو اِس وقت بلوچستان میں شامل ہے مگر اُس عہد میں ہندستان کے ماتحت تھا کیوں کہ اس وقت تک بلوچستان کے نام کا کوئی صوبہ نہ تھا بلکہ مکران اور سیستان بھی سندھ سے ملے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے ہندستان کی سرزمین پر یہ پہلا حملہ خشکی کی طرف سے ہوا اور یہی پہلا علاقہ ہندستان کا ہے جو مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور خود صحابۂ رسولؐ کے مقدّس ہاتھوں سے مفتوح ہوا۔''

گویا حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرہ بت کدۂ ہند میں شمعِ توحید روشن کرنے والے مجاہدین کے قائد تھے اور ہندستان کے دوسرے تمام مسلم فاتحین (محمد بن قاسمؒ، شہاب الدین محمد غوریؒ، اور محمود غزنویؒ) کے پیش رو تھے۔

اس کے بعد حضرت عبد الرحمٰنؓ رخج کی طرف بڑھے اور دادن (یا دواء) کے اہم شہر تک پہنچ گئے۔ اس شہر کے قریب ایک پہاڑ پر ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جو ایک مستحکم قلعہ کی صورت میں تھا۔ اس میں زور نامی ایک دیو پیکر بُت نصب تھا جس کی نسبت سے اس پہاڑ کو ''کوہِ زور'' کہا جاتا تھا۔ یہ بُت خانہ بت پرستوں کے نزدیک بہت مقدّس تھا، وہ دُور دُور سے اس کی زیارت کو آتے اور بیش قیمت چڑھاوے بت کی نذر کرتے۔ اہلِ دادن بھاگ کر اس بُت خانہ میں پناہ گزیں ہوئے اور شہر کے دروازے بند کر دیئے۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے بت خانہ اور شہر دونوں کا محاصرہ کر لیا اور اس میں اتنی سختی برتی کہ بت پرستوں کو ایک خطیر رقم دے کر صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ علّامہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ دادن کے بت خانے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا طلائی بت نصب ہے جس کی آنکھوں میں نہایت بیش قیمت ہیرے جڑے ہیں۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے پہلے اپنے نیزے سے اس بت کی آنکھیں نکالیں اور پھر اس کے ہاتھ توڑ ڈالے۔ اس کے بعد انھوں نے وہاں کے حاکم اور باشندوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو یہ ہیرے اور اپنے بُت کے طلائی ہاتھ اٹھالو۔ مجھے ان کی حاجت نہیں ہے۔ میں نے یہ کام تمھیں صرف یہ دکھانے کے لیے کیا ہے کہ بت کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے اس لیے ان کی عبادت کرنا گویا اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے۔ اے لوگو! عبادت کے لائق صرف ایک اللہ کی ذات ہے وہی ہر شے کا مالک اور وہی ہر ایک کے نفع اور

نقصان پر قادر ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ تو امید ہے وہ تمھارے سینے کھول دے گا اور تم دینِ اسلام کو اچھی طرح سمجھ جاؤ گے۔"

دادن کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے زابل (غزنہ) اور بست کو فتح کیا اور پھر زرنج واپس آ گئے۔ اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کے لشکر میں خواجہ حسن بصریؒ اور بہت سے دوسرے علماء وفقہاء بھی شامل تھے۔ ان بزرگوں نے مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی ترویج واشاعت کے لیے زبردست جدوجہد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی۔

(۴)

حضرت عبداللہ بن عامرؓ ایک طرف اپنے جرنیلوں کو لڑا رہے تھے اور دوسری طرف خود دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول تھے۔ چناں چہ وہ اشبند، زادہ، بشت، اسفرائن، خواف، رخ اور ارعیان کے شہروں کو مسخر کرتے ہوئے نیشاپور کے دار الحکومت ابرشہر تک پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ اہلِ شہر کئی ماہ تک مقابلہ کرتے رہے لیکن ایک رات کو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مسلمان شہر کے گلی کوچوں میں پھر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ شہر کے چند محافظ رازداری کے ساتھ ابنِ عامرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جان بخشی کا وعدہ لے کر شہر کا ایک دروازہ کھول دیا۔ مسلمان باہر منتظر کھڑے تھے وہ فوراً شہر میں داخل ہو گئے۔ حاکمِ شہر نے اپنی فوج کے چند دستوں کے ساتھ قلعہ میں پناہ لی لیکن وہ بھی زیادہ عرصہ محاصرے کی سختی برداشت نہ کرسکا اور دس لاکھ درہم سالانہ خراج دینے کے وعدہ پر صلح کرلی۔ اس طرح نیشاپور کا تمام صوبہ مسلمانوں کے حلقۂ اطاعت میں آ گیا۔

نیشاپور کی تسخیر کے بعد حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے عبداللہ بن خازم کو "نساء" کے علاقے کی طرف روانہ کیا۔ حاکمِ نساء نے تین لاکھ درہم پر صلح کرلی اس کو دیکھ کر ابیورد کے حاکم نے بھی چار لاکھ درہم خراج دینا منظور کرلیا۔ اب ابنِ عامرؓ نے عبداللہ بن خازم کو سرخس کی تسخیر پر مامور کیا۔ انھوں نے سرخس پر یلغار کی تو وہاں کے حاکم زادویہ نے معمولی مزاحمت کے بعد اطاعت قبول کرلی۔ سرخس سے ابنِ حازم نے یزید بن سالم کی سرکردگی میں کچھ فوج بھیج کر کیف اور نبیۃ کے شہر بھی فتح کرلیے۔ طوس کے حاکم نے مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب اپنی طرف

بڑھتے دیکھا تو وہ بہ نفسِ نفیس حضرت عبداللہ بن عامرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چھ لاکھ درہم سالانہ خراج دینا منظور کر کے اسلامی حکومت کا اطاعت گزار بن گیا۔

عبداللہ بن خازم کو سرخس کی طرف بھیج کر ابنِ عامرؓ خود بھی نچلے نہیں بیٹھے وہ ایک مضبوط فوج کے ساتھ ہرات کی طرف بڑھے۔ حاکمِ ہرات کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ بہ عجلتِ تمام حضرت عبداللہ بن عامرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیہ دینا منظور کر کے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے دیکھا دیکھی مروشاہ جہاں کے حاکم نے بھی جزیہ دینا قبول کر لیا اور ۲۲ لاکھ درہم سالانہ دینے کا اطاعت نامہ لکھ دیا۔ اب ابنِ عامرؓ نے احنف بن قیسؓ کو طخارستان روانہ کیا۔ انھوں نے کئی قلعے اور شہر مطیع کرنے کے بعد طخارستان کے مرکزی شہر مروالروز کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر نے سخت مقابلہ کیا لیکن بالآخر اطاعت قبول کر لی۔ اسی اثنا میں حضرت احنفؓ کو اطلاع ملی کہ دشمنوں کی ایک کثیر تعداد جوز جان میں جمع ہے۔ انھوں نے حضرت اقرع بن حابس تمیمیؓ کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ حضرت اقرعؓ نے دشمنوں کو شکست دے کر جوز جان فتح کر لیا۔ اب حضرت احنف نے طالقان اور فاریاب کا رُخ کیا اور ان دونوں شہروں کو فتح کرتے ہوئے بلخ پہنچ گئے۔ اہلِ بلخ کو مقابلہ کی ہمت نہ پڑی اور انھوں نے چار لاکھ درہم سالانہ جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

اُدھر حضرت عبداللہ بن عامرؓ دریائے جیحوں (Oxus) کو عبور کر کے ماوراء النہر میں داخل ہو گئے۔ اہلِ ماوراء النہر مسلمانوں کی طاقت سے آگاہ تھے انھوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ مقابلہ کرنے کی بہ جائے صلح کر لی جائے۔ چناں چہ ان کا ایک نمائندہ وفد بے شمار گھوڑے، ریشمی کپڑے، لونڈی غلام اور مختلف قسم کے تحائف لے کر حضرت عبداللہ بن عامرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صلح کی درخواست کی۔ حضرت عبداللہؓ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور قیس بن الہیثم کو ماوراء النہر میں اپنا قائم مقام بنا کر دارالحکومت کو مراجعت کی۔

تمام اربابِ سِیَر نے عہدِ عثمانی میں حضرت عبداللہ بن عامرؓ کی شان دار فتوحات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ماوراء النہر، اصفہان، حلوان، کرمان، سرخس، غزنی، کابل، ہرات، مرو، اصطخر، نیشاپور وغیرہ سب انہی کے ہاتھ پر پہلی بار یا دوبارہ فتح ہوئے حتیٰ کہ مسلمانوں کے قدم بلوچستان تک پہنچ گئے۔

ابنِ عامرؓ کی فتوحات کا حال پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی حوصلہ منداور بہادر جرنیل تھے اور اپنے دور میں عسکری صلاحیتوں کے اعتبار سے آپ اپنا جواب تھے۔ ان کی فتوحات کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ انھوں نے حتی الوسع خوں ریزی سے پرہیز کیا۔ جس شہر یا علاقے کے باشندوں نے صلح کی درخواست کی۔ انھوں نے اسے قبول کرلیا اور لوگوں کو امان دے دی۔

(۵)

حضرت عبداللہ بن عامرؓ اپنی فتوحات کی تکمیل کر چکے تو وہ حج کے موسم میں بصرہ سے مکہ معظّمہ آئے اور حجِ شکرانہ ادا کیا۔ حج کے بعد انھوں نے پہلے مکہ میں اور پھر مدینہ میں جا کر مہاجرین وانصار پر انعام واکرام کی بارش کردی۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ اپنی وسیع فتوحات کے دوران میں انھیں جو غنائم حاصل ہوئے تھے اس کا بڑا حصہ انھوں نے مہاجرین وانصار میں تقسیم کردیا۔ ان اصحاب پر حضرت عبداللہؓ کی اس فیاضی کا بہت اچھا اثر ہوا اور انھوں نے ابنِ عامرؓ کو ڈھیروں دُعائیں دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے اپنے دارالحکومت بصرہ کو مراجعت کی اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی مظلومانہ شہادت (۳۵ھ) تک اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے رہے۔

''دائرہ معارفِ اسلامیہ'' میں ہے کہ جس زمانے میں باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کررکھا تھا، حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے امیر المؤمنین کی مدد کرنے کی کوشش کی جو بے نتیجہ رہی لیکن اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی نیک نفسی اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو خانہ جنگی اور حرمِ مدینہ کو مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بننے سے بچانے کے لیے اپنے گورنروں سے مدد طلب ہی نہیں کی ورنہ ان کے جاں نثار جرنیل جنھوں نے لاکھوں مربع میل علاقہ مسخر کرڈالا تھا اگر اپنی فوجیں لے کر امیر المؤمنینؓ کی مدد کو پہنچ جاتے تو مٹھی بھر شورش پسندوں کی کیا حقیقت تھی کہ ان کے سامنے ٹھہر سکتے۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو قصاصِ عثمانؓ کے سلسلے میں جمل کی افسوس ناک لڑائی پیش آئی۔ اس لڑائی میں حضرت عبداللہ بن عامرؓ شروع سے اخیر تک اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ رہے اور ابوحنیفہ دینوری کے بیان کے مطابق لڑائی میں انصار، بنوقیس اور بنوثقیف کی قیادت کی۔ (الاخبار الطّوال)

ابنِ اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سنی تو وہ سخت دل گیر ہوئے کیوں کہ سیدنا عثمانؓ نہ صرف خلیفۂ برحق تھے بلکہ ان کے قریبی عزیز بھی تھے۔ چوں کہ ان کی شہادت کے بعد سخت بدامنی پھیل گئی تھی۔ وہ بیت المال کا روپیہ لے کر بصرہ سے مکہ آگئے وہاں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے ملاقات ہوئی تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کی نیت سے شام جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ میرے ساتھ بصرہ چلیے، وہاں ہمیں کافی مددگار مل جائیں گے۔ چناں چہ وہ سب ان کے ساتھ بصرہ آئے اور وہیں جنگِ جمل کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان جنگِ صفّین کا آغاز ہوا تو حضرت عبداللہؓ نے امیر معاویہؓ کا طرف دار ہونے کے باوجود اس لڑائی میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی البتہ فریقین کے درمیان التوائے جنگ کا جو معاہدہ ہوا اس پر دوسرے لوگوں کے علاوہ انھوں نے بھی گواہ کی حیثیت سے اپنے دستخط ثبت کیے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت کے بعد سیّدنا حضرت حسنؓ ان کے جانشین ہوئے۔ امیر معاویہؓ نے ان پر لشکر کشی کی تو حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو ہراول کا افسر بنایا۔ حضرت حسنؓ پہلے اپنی فوج کے ساتھ مدائن تشریف لائے، وہاں سے مقابلہ کے لیے نکلے اور ساباط میں خیمہ زن ہوئے۔ ساباط کے اثنائے قیام میں انھوں نے اپنی فوج میں لڑائی سے پہلو تہی کے آثار پائے۔ بعض خارجیوں نے تو آپ کی تحقیر کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ جراح بن قبیضہ نامی ایک بدبخت نے حملہ کر کے آپ کا زانوئے مبارک زخمی کر دیا۔ اس پر سیّدنا حسنؓ مدائن واپس آگئے اور زخم مندمل ہونے تک قصرِ ابیض میں تشریف فرما رہے۔ جب زخم پوری طرح بھر گیا تو پھر مقابلہ کے لیے نکلے۔ اس دوران میں امیر معاویہؓ بھی انبار پہنچ چکے تھے۔ عبداللہ بن عامرؓ اور حضرت حسنؓ کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو حضرت ابنِ عامرؓ نے سیدنا حسنؓ کے پاس قاصد بھیج کر سلام اور یہ پیغام بھیجا کہ میری حیثیت محض امیر معاویہؓ کے مقدمۃ الجیش کی ہے وہ خود ایک جرّار لشکر کے ساتھ انبار پہنچ چکے ہیں۔ آپ کو اپنی ذات اور اپنے حامیوں کی قسم لڑائی کو ملتوی کر دیں۔

سیدنا حضرت حسنؓ کے ساتھیوں نے یہ پیام سنا تو لڑائی سے گریز پا ہونے لگے حضرت حسنؓ نے ان کی کم زوری کو بھانپ لیا۔ چناں چہ وہ پھر مدائن واپس آ گئے۔ ان کے واپس جاتے ہی ابنِ عامرؓ نے آگے بڑھ کر مدائن کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت حسنؓ پہلے ہی باہمی کشت وخون کو ناپسند کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کا رویہ دیکھ کر چند شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ ابنِ عامرؓ نے یہ شرطیں امیر معاویہؓ کے پاس بھجوا دیں، انھوں نے سب کو من وعن منظور کرلیا۔

۴۱ ہجری میں امیر معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو دوبارہ بصرہ کا گورنر بنا دیا۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ امیر معاویہؓ نے بصرہ کی امارت پر کسی دوسرے شخص کو مامور کرنا چاہا تھا لیکن ابنِ عامرؓ نے ان سے کہا کہ بصرہ میں میرا بہت سا مال ومتاع ہے اگر کوئی اور شخص وہاں کا گورنر بنا تو وہ سب برباد ہو جائے گا۔ اس پر امیر معاویہؓ نے انھیں ہی بصرہ کی ولایت سونپ دی۔

(٦)

حضرت عبداللہ بن عامرؓ دوسری مرتبہ بصرہ کے گورنر بن کر آئے تو انھیں اطلاع ملی کہ کابل، ہرات، بوشنج، بلخ، باذغیس وغیرہ کے شہر اور علاقے باغی ہو چکے ہیں۔ انھوں نے باغیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے قیس بن الہیثم کو خراسان، عبداللہ بن خازم کو ہرات اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کو سیستان کی طرف روانہ کیا۔ قیس بن الہیثم باغیوں کو کچلتے ہوئے بلخ پہنچے اور شہر کو مسخر کر کے وہاں کے مشہور آتش کدۂ نو بہار کو مسمار کر دیا۔ عبداللہ بن خازم نے ہرات، بوشنج اور باذغیس کے باغیوں پر کاری ضربیں لگا کر اپنا مطیع بنایا۔

عبدالرحمٰن بن سمرہؓ علاقے پر علاقہ فتح کرتے کابل تک پہنچ گئے اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اہلِ کابل نہایت شوریدہ سر تھے اس لیے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے محاصرے میں نہایت سختی کی۔ ایک رات فصیل پر منجنیقوں سے ایسی شدید سنگ باری کی کہ ایک جگہ شگاف پڑ گیا۔ انھوں نے عباد بن حصین کو فوج کا ایک دستہ دے کر شگاف کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ صبح کو شہر والوں نے باہر نکل کر پُرزور مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے پیش قدمی کر کے خواش، بست، رزان اور خشک کے

شہر فتح کیے اور پھر رخج کو جا گھیرا۔ اہلِ رخج نے تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد ہتھیار پھینک دیئے اور اطاعت قبول کر لی۔ رخج کی تسخیر سے فارغ ہو کر حضرت عبد الرحمٰنؓ نے ایک خوں ریز جنگ کے بعد غزنہ کو دوبارہ فتح کیا۔ پھر انھوں نے قندھار پر پرچم اسلام بلند کیا اور ایک بار پھر کابل کی طرف بڑھے جہاں کے باشندے ان کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اپنی عادت کے مطابق پھر باغی ہو گئے تھے۔ کابلیوں نے پرزور مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں نے انھیں بری طرح کچل دیا اور کابل میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لیے۔

۴۳ ہجری میں حضرت عبد اللہ بن عامرؓ نے عبد اللہ بن سوار عبدی کو سواحلِ ہند کے شورہ پشت لوگوں کو سزا دینے کے لیے چار ہزار مجاہدین کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ مکران میں کئی ماہ رہے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ انھوں نے قیقان والوں کو سخت شکست دی اور مالِ غنیمت لے کر سیدھے دمشق پہنچے۔ وہاں انھوں نے امیر معاویہؓ کی خدمت میں کئی قیقانی گھوڑے پیش کیے۔

۴۴ ہجری میں ابن عامرؓ نے مہلب بن ابی صفرہ کی قیادت میں ایک مہم سندھ کی طرف روانہ کی۔ بہ قول ابنِ اثیرؒ مہلب نے سندھ کی سرحد پر جنگ کی اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس کے بعد وہ فتح کا پرچم اڑاتے وطن واپس آئے۔

بعض مؤرّخین نے لکھا ہے کہ مہلب بن ابی صفرہ درۂ خیبر کے راستے سرزمین ہند میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں پشاور سے ملتان تک کا سارا علاقہ سندھ میں شامل تھا۔ مہلب پہلے عرب سپہ سالار ہیں جو درۂ خیبر کے راستے ہند یا سندھ میں داخل ہوئے۔

حضرت عبد اللہ بن عامرؓ کو دوسری مرتبہ بصرہ کی امارت پر فائز ہوئے تین ہی سال گزرے تھے کہ امیر معاویہؓ نے انھیں معزول کر دیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ وہ قبائل سے بہت نرمی کا سلوک کرتے تھے اور امیر معاویہؓ کے نزدیک یہ بات بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ چناں چہ ابنِ عامرؓ کی جگہ ایک سخت گیر والی کو بصرہ بھیج دیا۔ معزولی کے بعد حضرت عبد اللہؓ بن عامر باختلافِ روایت مدینہ منوّرہ یا مکہ معظّمہ چلے آئے اور عزلت گزینی اختیار کر لی۔

ان کے سالِ وفات کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے ۵۷ھ لکھا ہے اور بعض نے ۵۸ھ۔

ایک روایت میں ۵۹ ہجری بھی آیا ہے۔

(۷)

حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے اپنوں اور بیگانوں سے اپنی عسکری صلاحیتوں ہی کا لوہا نہیں منوایا بلکہ مخلوقِ خدا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بے نظیر کارنامے سرانجام دیئے۔ انھوں نے آغوشِ مادر میں محسنِ انسانیت ﷺ کا لعابِ دہن چاٹا تھا اور لسانِ رسالتؐ سے ان کے بارے میں یہ الفاظ نکلے تھے:

''یہ بچہ (بڑا ہو کر) مسقی (سیراب کرنے والا) ہوگا۔''

خیر الخلائق ﷺ کی یہ پیش گوئی حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے حق میں یوں پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں عرب کی خشک سرزمین کے باشندوں کو زیادہ سے زیادہ پانی مہیا کرنے کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے انھوں نے بصرہ میں دو نہریں کھدوائیں۔ ان کے علاوہ نہر اُبُلّہ کی تعمیر کرائی۔ میدانِ عرفات میں حاجیوں کو پانی کی تکلیف ہوتی تھی۔ اُنھوں نے وہاں بڑے بڑے تالاب اور حوض بنوا کر نہروں کا پانی ان میں ڈالا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مقامات پر بڑی کثرت سے کنوئیں کھدوائے اور بے آب و گیاہ زمینوں میں مختلف طریقوں سے پانی کی بہم رسانی کے انتظامات کیے۔ خلقِ خدا اور خشک زمینوں کو سیراب کرنے کے علاوہ انھوں نے اور بھی بہت سے رفاہِ عام کے کام کیے۔ النّباج اور قریتین میں شجرکاری کی اور بصرہ میں بہت سے مکانات خرید کر بازار بنوایا۔

سرکاری سطح پر رفاہی کام کرنے کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے ذاتی حیثیت میں بھی مخلوقِ خدا کو بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ طبعاً نہایت فیاض اور مخیّر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے انتہا مال و دولت سے نوازا تھا۔ دو مرتبہ بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے، اس اعلیٰ منصب کی معقول تنخواہ تھی۔ اپنے زمانۂ امارت میں سینکڑوں فتوحات حاصل کیں۔ ان میں مالِ غنیمت کا حصہ بھی ملتا رہا۔ ابن اثیرؒ نے ''اسدُ الغابہ'' میں لکھا ہے کہ مکہ معظّمہ کے نواح میں باغات اور زمینوں کی صورت میں بھی ان کی کافی جائداد تھی۔ پھر انھوں نے ایک کثیر رقم مختلف نوعیت کے کاروبار میں لگا رکھی تھی اس سے بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس طرح وہ قریش کے سربرآوردہ رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جس قدر دولت دی تھی اسی کے مطابق ان کا دل بھی کشادہ بنایا تھا۔

اپنا مال و دولت بے دریغ راہِ خدا میں خرچ کرتے رہتے تھے اور سینکڑوں غریبوں، یتیموں اور حاجت مندوں کی پرورش کرتے تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے مٹھیاں بھر بھر کر حاجت مندوں کو دیتے تھے۔ ابن اثیرؒ نے ان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

کان احد الاجواد الممدوحین

یعنی وہ عرب کے ان فیاضوں میں سے ایک فیاض تھے جن کی لوگ (شعراء) مدح کرتے تھے۔

بصرہ سے حج کرنے کے لیے مکہ آئے اور پھر مدینہ گئے تو ہزاروں روپے مہاجرین اور انصار میں تقسیم کیے اور ان کو خوش کر دیا۔ ان کی فیاضی اور سخاوت کا اعتراف بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ کو بھی تھا۔ ابنِ جریر طبریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی جگہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بصرہ سے چلتے وقت اہلِ بصرہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''تمھارے پاس قریش کا ایک معزز نوجوان آرہا ہے جو تم پر اس طرح (ہاتھوں سے بتا کر) روپیہ پیسہ برسائے گا۔''

حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے وفات پائی تو مشہور شاعر زیاد اعجم نے ایک پرزور مرثیہ لکھا جس میں خصوصیت کے ساتھ ابنِ عامرؓ جیسے مردِ سخی کی وفات کے ساتھ ان کی بے نظیر فیاضی کے خاتمہ کا سخت ماتم کیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرو بن سعید امویؓ

①

غزوۂ تبوک (۹ ہجری) کے بعد سرورِ عالم ﷺ کو ایک ایسے جاں نثار کی ضرورت محسوس ہوئی جو دیانت و امانت سے متصف ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ اس سلسلہ میں آپؐ کی نگاہِ انتخاب اپنے جس شیدائی پر پڑی وہ بنو امیہ کے چشم و چراغ تھے اور تمام مطلوبہ اوصاف کے حامل تھے۔ حضورؐ نے انھیں خیبر، فدک اور تبوک کا عامل مقرر فرمایا اور اپنی دعاؤں کے ساتھ مدینہ منوّرہ سے روانہ فرمایا۔ یہ صاحب اپنے فرائضِ مفوّضہ نہایت حسن وخوبی اور تندہی سے انجام دیتے رہے یہاں تک کہ سرورِ عالم ﷺ وصال پا گئے۔ انھوں نے یہ روح فرسا خبر سنی تو فرطِ الم سے نڈھال ہو گئے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ مدینہ منوّرہ واپس آ گئے جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند نشینِ خلافت ہو چکے تھے۔ خلیفۃ الرسول نے انھیں پھر عہدِ رسالت کے عہدے پر واپس بھیجنا چاہا اور ان سے فرمایا، تم سے بڑھ کر اس عہدے کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ انھوں نے یہ کہہ کر واپس جانے سے معذرت کی کہ اے خلیفۃ الرسول، رسول اللہ ﷺ کے بعد میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔

سرورِ کائنات ﷺ کے یہ جاں نثار جن پر حضورؐ کو غیر معمولی اعتماد تھا اور جو حضورؐ کی وفات کے بعد کسی قسم کا منصب اور عہدہ قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، حضرت عمرو بن سعید اُموی تھے۔

②

سیّدنا ابو عقبہ عمرو بن سعیدؓ ''السابقون الاوّلون'' کی مقدّس جماعت کے ایک رکن تھے

اور اپنے اخلاص فی الدّین اور دوسرے اوصافِ حمیدہ کی بہ دولت اہلِ حق میں بڑا بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کا تعلق بنواُمیّہ سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ بن عبدِ شمس بن عبدِ مناف بن قصی۔

والدہ کا نام صفیہ تھا جو بنومخزوم سے تھیں اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی پھوپھی تھیں۔ حضرت عمروؓ کے والد اور دادا سخت مشرک تھے لیکن ان کے بڑے بھائی خالد بن سعیدؓ نہایت نیک فطرت تھے۔ سرورِ عالم ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو انھوں نے بلا تامّل اس پر لبیک کہا۔ حضرت عمروؓ بھی سعید الفطرت تھے۔ انھوں نے بھائی کی پیروی کی اور ان کے قبولِ اسلام کے چند دن بعد وہ بھی حلقۂ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ باپ اور دوسرے اہلِ خاندان نے ان پر قبولِ اسلام کے ''جرم'' میں بے پناہ سختیاں کیں لیکن نشۂ توحید ایسا نہیں تھا جو سختیوں کی ترشی سے اتر جاتا۔ اسی زمانے میں ان کے بھائی ابان بن سعید نے (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) دونوں بھائیوں کی ہجو کہی جس کا ایک شعر یہ تھا:

الا لیت میتا بالظریبۃ شاھد

لما یفتری فی الدین عمرو و خالد

یعنی کاش ظریبہ میں موت کی نیند سونے والا (سعید بن عاص بن امیہ جو ظریبہ میں دفن تھا) دیکھتا کہ عمروؓ اور خالدؓ نے دین میں کیا افترا کیا ہے۔

حضرت عمرو بن سعیدؓ بھی شعر وشاعری میں درک رکھتے تھے انھوں نے یہ ہجو سنی تو انھوں نے بھی اس کا جواب نظم میں دیا جس کا مقطع یہ تھا:

ندع عنک میتا قد مضی بسبیلہ

و اقبل علی الحق الذی ھو اظھر

یعنی اب اس موت کی نیند سونے والے کا ذکر چھوڑ وہ اپنا راستہ لے چکا اور اس حق کی طرف آ جس کا حق ہونا بالکل ظاہر ہے۔

جب مشرکین کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو ۵ بعدِ بعثت میں حضورؐ نے مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چناں چہ اس سال ایک چھوٹا سا قافلہ عازمِ حبشہ ہو گیا۔ اگلے سال تقریباً سو ذکور واناث پر مشتمل ایک بڑے قافلے نے حبش کی طرف ہجرت کی اس میں

حضرت عمرو بن سعیدؓ، ان کی اہلیہ حضرت فاطمہ بنتِ صفوان کنانیہؓ اور بھائی حضرت خالد بن سعیدؓ بھی اپنی اہلیہ کے ہم راہ شامل تھے۔ حضرت عمروؓ اور حضرت خالدؓ اپنے اہلِ خاندان سمیت تیرہ برس تک حبش میں غریب الوطنی کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔ غزوۂ خیبر کے زمانہ میں حبش سے مدینہ آئے۔ گو وہ اس میں شریک نہ ہو سکے تاہم حضورؐ نے مالِ غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا۔

(۳)

مدینہ آنے کے بعد حضرت عمرو بن سعیدؓ فتح مکہ کے موقع پر ان دس ہزار قدوسیوں میں شریک ہوئے جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے ''کتابِ استثنا'' میں اس طرح اشارہ کیا گیا تھا:

> ''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں (نورانی) شریعت ان کے لیے تھی۔''

غزوۂ فتح (۸ ہجری) میں حضرت عمرو بن سعیدؓ نے حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کرنے کے بعد غزوۂ حنین، اور غزوۂ طائف میں دادِ شجاعت دی۔ جیشِ عسرۃ (غزوۂ تبوک) میں بھی حضرت عمرو بن سعیدؓ ان تیس ہزار سرفروشوں میں شامل تھے جنھیں مدینہ منوّرہ سے سرحدِ شام تک تین سو میل کے پرصعوبت سفر میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کی سعادت نصیب ہوئی۔ غزوۂ تبوک سے واپسی پر حضورؐ نے انھیں مدینہ منوّرہ کے مغربی علاقوں خیبر، فدک اور تبوک وغیرہ کا عامل مقرر فرمایا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد وہ مدینہ منوّرہ واپس آ گئے —— ابھی واپس آئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ سلطنتِ روم سے معرکہ آرائی کا آغاز ہو گیا۔ شام اس زمانے میں رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام پر فوج کشی کی تو حضرت عمرو بن سعیدؓ شام جانے والے مجاہدین میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ دو تین معرکوں کے بعد مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان اجنادین کے مقام پر نہایت سخت لڑائی ہوئی (۱۳ ہجری)۔ حضرت عمرو بن سعیدؓ اس معرکے میں بڑی بے جگری سے لڑے اور کئی بار دشمن کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ ایک نازک موقع پر جب دشمن نے مسلمانوں پر زبردست دباؤ ڈال رکھا تھا، انھوں نے مسلمانوں کو ثابت قدمی اور استقلال کی تلقین کی اور پھر یہ کہتے ہوئے کہ میں

مسلمانوں کے قدموں میں لغزش آتے نہیں دیکھ سکتا، مردانہ وار دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ جو سامنے آیا اسے مار گرایا اور برابر رومیوں کے قلبِ لشکر کی طرف بڑھتے گئے۔ آخر بے شمار رومیوں نے اس مردِ مجاہد کو گھیر لیا اور تیروں تلواروں اور خنجروں کا مینہ برسا دیا یہاں تک کہ ان کا سارا بدن زخموں سے چھلنی ہوگیا۔ جب تلوار چلانے کی سکت نہ رہی تو زمین پر گر گئے اور جامِ شہادت پی کر خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ ان کے جسم پر تیس سے زیادہ زخم شمار کیے گئے۔ حضرت عمرو بن سعیدؓ اور ان جیسے دوسرے شہیدوں کا خون رائگاں نہ گیا۔ رومیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی اور وہ اپنے ہزاروں آدمی کٹوا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت عمرو بن سعیدؓ نے اپنے جوشِ ایمان کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خون کو گرماتے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سعید بن عاصؓ

①

حضرت سعید بن عاصؓ کا شمار اُن صغارِ صحابہ میں ہوتا ہے جو اپنی بعض خصوصیات، خداداد صلاحیتوں اور کارناموں کی بہ دولت ناموری اور شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے۔ حضرت سعیدؓ کا تعلق بنوامیہ سے تھا اور ان کے آباء واجداد بڑے بااثر اور ذی وجاہت رئیس تھے۔ حضرت سعیدؓ کے دادا ابواحیحہ سعید بن عاص کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ وہ جس رنگ کا عمامہ باندھتا تھا مکہ میں کوئی دوسرا شخص اس رنگ کا عمامہ نہیں باندھ سکتا تھا۔ اہل مکہ نے اس شخص کو ''ذوالتاج'' (تاج والا) کالقب دے رکھا تھا۔

ابواحیحہ سعید بن عاص ذوالتاج کی اولاد میں اس کے پانچ بیٹوں، خالد، عمرو، ابان، عبیدہ اور عاص نے تاریخ میں بڑی شہرت پائی۔ خالدؓ، عمروؓ اور ابانؓ کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ اسلام سے بہرہ ور کیا جب کہ عبیدہ (ابوذات الکرش) اور عاص اپنے کفر پر قائم رہے۔ یہ دونوں غزوۂ بدر (۲ھ) میں حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت سعیدؓ اسی عاص مقتول بدر کے فرزند تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

سعید بن عاص بن ابواحیحہ سعید ذوالتاج بن عاص بن امیہ بن عبدالشمس بن عبدِمناف بن قصی۔

عبدِمناف پر ان کا سلسلۂ نسب سرورِ عالم ﷺ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ ماں کا نام اُمِّ کلثوم تھا جو قریش کے خاندان عامر بن لوئیؓ سے تھیں۔ حضرت سعیدؓ کو براہِ راست فیضانِ نبوی

سے بہرہ یاب ہونے کا موقع بہت کم ملا تاہم حضوؐر کے وصال (۱۱ھ) کے بعد انھوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذو النورینؓ اور بعض دوسرے صحابہٴ کرامؓ سے مقدور بھر کسبِ فیض کیا اور فضلاءِ صحابہؓ میں شمار ہونے لگے۔ اربابِ سیَر کا بیان ہے کہ وہ نہایت بہادر، طبّاع اور دانش مند آدمی تھے۔ ان کو عربی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور ان کا لہجہ سرورِ عالم ﷺ کے لہجے سے مشابہت رکھتا تھا۔

ابنِ عساکرؒ نے عہدِ رسالت سے متعلق حضرت سعید بن عاصؓ کے بچپن کا ایک واقعہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی زبانی اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک کپڑا پیش کیا اور ساتھ ہی عرض کی:

''یارسول اللہ میں نے یہ نیت کر رکھی تھی کہ یہ کپڑا عرب میں سب سے بزرگ ہستی کو دوں گی۔ اب یہ آپ کی خدمت میں لائی ہوں۔''

اس وقت حضرت سعیدؓ بن عاص حضوؐر کے پاس کھڑے تھے۔ آپؐ نے اس عورت کا ہدیہ قبول فرمایا اور پھر اس سے فرمایا، یہ کپڑا اس لڑکے کو دے دے۔ اس نے حضوؐر کے حکم کی تعمیل کی۔ اس وجہ سے اس کپڑے کا نام سعدیہ مشہور ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضرت سعیدؓ پر حضوؐر کی غیر معمولی شفقت ظاہر ہوتی ہے۔

(۲)

حضرت سعیدؓ عہدِ رسالت اور عہدِ صدیقی میں نابالغ تھے۔ عہدِ فاروقی میں جوان ہوئے لیکن اس دَور میں تحصیلِ علم کے سوا ان کی کسی دوسری سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ ۲۴ھ میں حضرت عمر فاروق کی شہادت کے بعد حضرت عثمان ذو النّورینؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے قرآنِ پاک کی کتابت پر خاص توجہ دی اور اس کے متعدد نسخے نقل کروانے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے انھوں نے جن صحابہٴ کرامؓ کو مامور فرمایا، ان میں حضرت سعید بن عاصؓ بھی شامل تھے۔ ۲۹ھ ۶۴۹ - ۶۵۰ء میں حضرت عثمانؓ نے حضرت سعیدؓ کو ولید بن عقبہ کی جگہ کوفہ کا والی (گورنر) مقرر کیا۔ ولایتِ کوفہ کے زمانے میں حضرت سعیدؓ نے کئی شان دار عسکری کارنامے سرانجام دیئے۔ کوفہ میں اپنے منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے فوراً بعد

انھوں نے جرجان اور طبرستان پر چڑھائی کی۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت سعیدؓ کے لشکر میں حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بہت سے دوسرے نوجوانانِ قریش شامل تھے۔ ان کی لشکر کشی کی اطلاع حضرت عبداللہ بن عامرؓ والیِ بصرہ کو ملی تو وہ بھی طبرستان کی طرف بڑھے لیکن حضرت سعیدؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی طبرستان کے بیشتر اہم مقامات دباوند، طمیسہ، رویان، نامند وغیرہ فتح کر لیے۔ جرجان کے حکمراں کو حضرت سعیدؓ کی فاتحانہ یلغار کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے دو لاکھ خراج دینا منظور کر کے اطاعت قبول کر لی۔ علامہ بلاذریؒ کے بیان کے مطابق کوہستانی علاقہ کے لوگوں نے بھی صلح کر لی۔ اسی زمانے میں آذربائیجان کے لوگوں نے سرکشی اختیار کی اور ہر طرف شورش برپا کر دی۔ حضرت سعیدؓ نے ایسی عسکری تدابیر اختیار کیں کہ چند دن کے اندر اندر ان لوگوں کے کس بل نکل گئے اور وہ خاکِ نامرادی چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت سعیدؓ کو ولایتِ کوفہ پر فائز ہوئے چار پانچ سال ہی گزرے تھے کہ اہلِ کوفہ ان سے ناراض ہو گئے۔ ان کی ناراضی کے کیا اسباب تھے؟ اہلِ سِیَر نے ان کی تصریح نہیں کی۔ کوفیوں نے ان کے خلاف امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کے پاس شکایت کی۔ اس کے نتیجے میں حضرت سعیدؓ کو ۳۴ھ میں اپنے عہدے سے دست کش ہونا پڑا۔ دست کشی کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ امیر المؤمنینؓ نے انھیں معزول کر دیا۔ دوسری یہ کہ امیر المؤمنینؓ نے اہلِ کوفہ کی شکایت پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس پر کوفے کے دس آدمی بشمول مالک الاشتر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے اور حضرت سعیدؓ کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ حضرت سعیدؓ بھی اس وقت کوفہ سے مدینہ آئے ہوئے تھے اور اس وقت امیر المؤمنینؓ کی خدمت میں موجود تھے۔ امیر المؤمنینؓ نے اہلِ کوفہ کی شکایت کو بے وزن قرار دیا اور حضرت سعیدؓ کو اپنے عہدے پر واپس جانے کا حکم دیا۔ مالک الاشتر نے بلا توقف کوفہ کو مراجعت کی اور اہلِ کوفہ کو حضرت سعیدؓ کے خلاف سخت اشتعال دلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت سعیدؓ کوفہ کو واپس جا رہے تھے، مالک الاشتر کے زیرِ اثر کوفیوں کی ایک بڑی جماعت نے ان کا راستہ روک لیا اور انھیں مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ پھر مالک الاشتر نے کوفہ کی جامع مسجد میں ایک بڑا اجتماع کیا اور اس میں اپنی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے

والیِ کوفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے پہلے تو یہ ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا لیکن جب سب لوگوں نے امیر المؤمنینؓ کی وفاداری کا حلف اٹھایا تو وہ والی بننے پر رضامند ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو انھوں نے حضرت سعیدؓ کو واپس کوفہ بھیجنا مناسب نہ سمجھا اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے تقرر کی توثیق کر دی۔ اس کے بعد حضرت سعیدؓ مدینہ منوّرہ ہی میں رہے۔

(۳)

۳۵ ہجری میں باغیوں نے امیر المؤمنین حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے مکان کا محاصرہ کیا تو حضرت سعید بن عاصؓ نے کچھ دوسرے نوجوان صحابہ کے ساتھ مل کر کاشانۂ خلافت کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ اس سلسلے میں باغیوں کے ساتھ جھڑپ میں وہ شدید مجروح ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا تو حضرت سعیدؓ کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ دل گرفتگی کے عالم میں مکہ جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خونِ عثمانؓ کے قصاص کا علَم بلند کیا اور حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور اپنے دوسرے حامیوں کے ساتھ بصرہ کی جانب روانہ ہوئیں تو حضرت سعیدؓ بھی ان کے ساتھ ہو لیے لیکن مرّ الظہران یا ذاتِ عرق کے قریب پہنچ کر ان سے الگ ہو گئے اور مکہ جا کر عزلت گزینی کو ترجیح دی۔ انھوں نے نہ تو جنگِ جمل میں حصہ لیا اور نہ جنگِ صفین میں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت کے چند ماہ بعد حضرت حسنؓ امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تو امیر معاویہؓ نے حضرت سعیدؓ کو مدینہ کا والی مقرر کیا لیکن کچھ دنوں کے بعد انھیں معزول کر کے ان کی جگہ مروان بن الحکم کو مدینہ کا عامل بنا دیا۔ (ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت سعیدؓ اور مروان کا عزل ونصب وقفے وقفے سے دو مرتبہ عمل میں آیا) حضرت سعیدؓ نے آخری عمر میں مدینہ منوّرہ سے تین میل کے فاصلے پر ''العقیق'' میں مستقل اقامت اختیار کر لی جہاں ان کی مملوکہ اراضی تھی۔ یاقوت حموی نے ''معجم البلدان'' میں لکھا ہے کہ ''العقیق'' یا ''عرصۃ العقیق'' ایک وسیع میدان تھا۔ عام طور پر وہاں مکانات تعمیر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حضرت سعیدؓ نے حکومت سے خاص اجازت حاصل کر کے اپنی رہائش کے لیے ایک وسیع مکان بنوایا، کنواں لگوایا اور

باغات ونخلستان بنوائے۔ انھوں نے باختلافِ روایت ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں اسی مکان میں وفات پائی۔ بہ قول حافظ ذہبیؒ ان کی میت مدینہ منورہ لائی گئی اور جنت البقیع میں سپردِ خاک کی گئی۔

حضرت سعیدؓ نے اپنے پیچھے سات بیٹے چھوڑے، عمر، محمد، عبداللہ، یحییٰ، عثمان، عنبسہ اور ابان۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ حضرت سعیدؓ کے کئی اور بھائی تھے لیکن عاص کی نسل حضرت سعیدؓ کی اولاد ہی سے چلی۔

(۴)

اربابِ سِیَر نے حضرت سعیدؓ کی شرافت، شجاعت، شہامت، عقل وحزم، وقار وحلم، حق پسندی اور جود وسخا کی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے۔ حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ امیر معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ سعید بن عاصؓ اپنی ذہانت، قابلیت اور فہم وتدبّر کی بنا پر خلیفہ بننے کے لائق ہیں۔

علّامہ ابنِ اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت سعیدؓ کا والد عاص غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس غزوہ میں اس کا ہم نام عاص (بن مغیرہ) اپنے بھانجے حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ اس اشتراکِ نام کی وجہ سے دھوکا ہوتا تھا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعیدؓ کے والد عاص کو مارا۔ چوں کہ بنو امیہ میں خاندانی عصبیت بہت زیادہ تھی۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ شاید سعیدؓ انھیں اپنے باپ کا قاتل سمجھ کر اپنے دل میں ان کے خلاف کدورت رکھتے ہوں، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ایک دن انھوں نے حضرت سعیدؓ سے کہا ''سعید میں نے بدر میں تمھارے والد کو نہیں بلکہ اپنے مشرک ماموں عاص کو قتل کیا تھا۔'' حضرت سعیدؓ نے فوراً جواب دیا، اگر آپ نے میرے والد کو بھی قتل کیا ہوتا تو کیا مضائقہ تھا۔ آپ حق پر تھے اور وہ حق کا دشمن تھا۔ حضرت عمرؓ کو اُن کے جواب پر خوش گوار حیرت ہوئی۔ حضرت سعیدؓ کی سخاوت اور دریا دلی کی کوئی حد ونہایت نہیں تھی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی سائل ان کے دروازے پر آئے اور خالی ہاتھ واپس چلا جائے۔ ان کی فیاضی دستِ سوال دراز کرنے والوں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ایسے حاجت مند شرفاء بھی جو غیرت کی وجہ سے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے، ان کی سخاوت سے متمتع ہوتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے پاس پہنچتے اور بلاسوال ان کی حاجتیں پوری کرتے تھے۔ اگر کوئی سائل ایسے وقت آجاتا جب ان کے پاس

روپیہ نہ ہوتا تو اس کو ایک تحریری یادداشت دے دیتے کہ جب روپیہ آجائے تو وصول کرلے۔

ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت سعیدؓ امارت کوفہ کے زمانے میں ہر جمعہ کی رات کو کوفہ کی مسجد میں نمازیوں میں دیناروں سے بھری ہوئی تھیلیاں تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس کام پر ایک خاص غلام مقرر کر رکھا تھا۔ چناں چہ شبِ جمعہ کو مسجد میں نمازیوں کا غیر معمولی ہجوم ہوتا تھا۔ اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ بھی ان کا سلوک بہت فیاضانہ تھا۔ کپڑے، غلّے، نقدی اور دوسری اشیائے ضرورت سے اکثر ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دن اپنے تمام بھائی بھتیجوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔

حافظ ابنِ عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ امارتِ مدینہ سے معزول ہونے کے بعد ایک دن مسجد سے نکلے تو ایک شخص ان کے ساتھ ہولیا۔ اس نے واضح الفاظ میں تو سوال نہ کیا لیکن حضرت سعیدؓ بھانپ گئے کہ حاجت مند ہے۔ انھوں نے اپنے ایک غلام کو بُلا بھیجا اور اس سے بیس ہزار کا وثیقہ لکھوا کر اس شخص کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا، جب میرا وظیفہ ملے گا تو اس وثیقہ میں لکھی ہوئی رقم تمھیں مل جائے گی۔ لیکن ابھی اس رقم کو ادا کرنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ حضرت سعیدؓ فوت ہوگئے۔ اس شخص نے یہ وثیقہ ان کے فرزند عمرو کو دیا۔ انھوں نے فوراً وثیقہ کی رقم ادا کردی۔

ایسی ہی فیاضیوں اور داد و دہش کی وجہ سے ان پر اَسّی ہزار کا قرض ہوگیا۔ وفات سے پہلے تمام بیٹوں کو بلا کر پوچھا تم میں سے کون میرا وصی بننا چاہتا ہے۔ بڑے لڑکے نے اپنے آپ کو پیش کیا تو فرمایا اگر میرے وصی بننا چاہتے ہو تو میرا قرض بھی ادا کرنا ہوگا۔

بیٹے نے پوچھا، کتنا قرض ہے؟''

فرمایا، ''اَسّی ہزار''

بیٹے نے حیرت سے پوچھا، ''اتنا قرض کیسے ہوگیا؟''

فرمایا، بیٹا، ان سفید پوش شرفاء اور غیور لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے میں جو گردشِ زمانہ سے مجبور ہو کر میرے پاس آتے تھے لیکن سوال کرنے سے اس قدر شرماتے تھے کہ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میں ان کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ جاتا تھا کہ حاجت مند ہیں۔ انھیں سوال کرنے کا موقع ہی نہ دیتا تھا اور ان کی حاجت پوری کر دیتا تھا۔

حضرت سعیدؓ کی عقل و دانش کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بہت سے اقوال ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ان کے اس قسم کے متعدد اقوال حافظ ابن حجرؒ نے ''الاِصابہ'' میں نقل کیے ہیں۔ان میں سے کچھ یہ ہیں:

- شریف سے مذاق نہ کرو کہ وہ تم سے نفرت کرنے لگے گا، (خار کھانے لگے گا)۔
- کمینہ سے مذاق نہ کرو کہ وہ جری ہو جائے گا۔
- جس نے سوال کیا اس کا سوال پورا کر دو اور اس بات کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو کہ وہ حقیقتاً محتاج ہے یا نہیں۔
- کوئی شریف آدمی گردشِ زمانہ کا شکار ہو جائے تو خود آگے بڑھ کر اس کی مدد کرو تا کہ وہ سوال کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔
- کسی چیز کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنے میں احتیاط سے کام لو۔ایسا نہ ہو کہ آج ایک چیز کی تعریف کر دی اور کل اس کی مذمّت کرنے لگو۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عباس بن عبادہ انصاریؓ

(۱)

۱۰ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ تبلیغِ حق کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ اہلِ طائف کی بدبختی کہ انھوں نے نہ صرف دعوتِ توحید کو رد کر دیا بلکہ عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھ کر آپؐ سے سخت بدسلوکی بھی کی۔ لیکن حضورؐ عزم و استقامت کا پہاڑ تھے آپؐ اہلِ طائف کے رویہ سے مطلق دل برداشتہ نہ ہوئے اور مکہ واپس تشریف لا کر حسب سابق تبلیغ حق میں مشغول ہو گئے۔ آپؐ کا معمول تھا کہ ایّام حج میں زائرین حرم کے پاس جا کر انھیں دعوتِ توحید دیتے تھے اور وقتاً فوقتاً مختلف قبائل میں جا کر ان کے سامنے بھی دینِ حق پیش کرتے تھے۔ رؤسائے قبائل بڑے روکھے سوکھے جواب دیتے تھے اور زائرینِ حرم پر بھی دعوتِ توحید کا چنداں اثر نہ ہوتا تھا لیکن ۱۱ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب صورت پیدا کی۔ حضورؐ تبلیغ کرتے کرتے منیٰ میں چند ایسے خیموں کے پاس پہنچ گئے جہاں یثرب سے آئے ہوئے چند سعید الفطرت لوگ قیام پذیر تھے۔ یہ قبیلہ خزرج کے چھ آدمی تھے۔ حضورؐ نے جب ان کے پاس پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور بڑائی بیان کرنی شروع کی تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے قرآنِ حکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی تو ان کے دل بالکل ہی پگھل گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا، واللہ یہ تو وہی نبی آخر الزّماں ہیں جن کا تذکرہ ہر وقت یہود یثرب کی زبان پر رہتا ہے دیکھنا یہود کہیں ہم سے قبولِ حق میں سبقت نہ لے جائیں—— یہ کہہ کر سب اسی وقت مشرف بہ ایمان ہو گئے۔

قبیلہ خزرج کے ان چھ نفوسِ قدسی کا قبولِ اسلام گویا یثرب میں صبحِ سعادت کا طلوع تھا۔ انھوں نے یثرب واپس جا کر نہایت تندہی سے دینِ حق کی تبلیغ شروع کر دی۔ یوں چراغ سے چراغ جلنے لگا اور یثرب کے سعید الفطرت لوگ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ چناں چہ اگلے سال ۱۲ بعدِ بعثت میں بارہ مسلمان سرورِ کائنات ﷺ کی زیارت اور بیعت کا شرف حاصل کرنے کے لیے مکہ پہنچے، اللہ کے ان بارہ پاک باز بندوں میں قبیلہ خزرج کی شاخ بنوسالم کے ایک فرزند عباسؓ بن عبادہ (بن نضلہ بن مالک بن عجلان بن زید بن غنم بن سالم بن عمرو بن عوف بن خزرج) بھی شامل تھے۔ ان کا شمار اپنے قبیلے کے بہادر جوانوں میں ہوتا تھا۔ شجاعت اور شہامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں فطرتِ سعید سے بھی نوازا تھا۔ انھوں نے توحید کی آواز کانوں میں پڑتے ہی بلا تامّل اس پر لبیک کہا اور آنے والے موسمِ حج میں گیارہ دوسرے یثربی اہلِ ایمان کے ساتھ مکہ جا کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور ان چھ باتوں پر حضور پرنور ﷺ کی بیعت سے مشرف ہوئے:

(۱) ہم شرک نہ کریں گے۔
(۲) ہم چوری نہ کریں گے۔
(۳) ہم بدکاری نہ کریں گے۔
(۴) ہم کسی کی چغلی نہ کریں گے اور نہ کسی پر جھوٹی تہمت لگائیں گے۔
(۵) ہم اپنی لڑکیوں کو قتل نہ کریں گے۔
(۶) ہم رسولِ اکرم ﷺ کی تمام اچھی باتوں میں اطاعت کریں گے۔

تاریخ میں یہ بیعت ''بیعت عقبۂ اولیٰ'' کے نام سے مشہور ہے۔

واپسی کے وقت ان اصحاب نے حضورؐ سے درخواست کی کہ انھیں قرآن پڑھانے اور دین کی باتیں سکھانے کے لیے ایک معلم عطا کریں۔ حضورؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو یہ خدمت تفویض فرمائی اور ان کو اس مقدس قافلے کے ساتھ یثرب روانہ کر دیا۔

(۲)

حضرت مصعب بن عمیر کی تبلیغی مساعی سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا

پھیل گیا۔ ۱۳ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں یثرب سے پانچ سو آدمیوں کا ایک قافلہ حج کے لیے مکہ روانہ ہوا تو اس میں خزرج اور اوس کے پچھتر اہلِ ایمان بھی شامل ہو گئے۔ (۷۳ مرد اور ۲ عورتیں) ان میں حضرت عباس بن عبادہؓ بھی شامل تھے۔ ان اصحاب نے یثرب سے چلتے وقت فیصلہ کیا تھا کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت دیں گے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے ایک رات مقرر کی اور یثربی اہل ایمان اپنے قافلے کے مشرکین سے درپردہ رات کے اندھیرے میں عقبہ کی گھاٹی میں جمع ہوئے۔ حضورؐ بھی اپنے چچا حضرت عباسؓ کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ حضرت عباسؓ کو انصار کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے برادرانِ یثرب، محمد (ﷺ) اپنے خاندان میں نہایت معزز و محترم ہیں۔ ان کی دعوت سے اختلاف رکھنے والے بیشتر اہلِ مکہ ان کے سخت دشمن ہیں تاہم ہم نے ہمیشہ دشمنوں سے ان کی حفاظت کی ہے اور آئندہ بھی اپنی پوری طاقت سے کریں گے۔ اگر تم اپنے وعدوں کو پورا کر سکتے ہو تو کوئی بات کرنا۔ خوب سمجھ لو کہ محمدؐ سے کوئی عہد و پیمان کرنا ہولناک مصائب اور خوں ریز جنگوں کو دعوت دینا ہے اس لیے سب کچھ سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ورنہ اُن کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔''

حضرت عباسؓ کی تقریر سن کر حضرت براء بن معرورؓ جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

''اے عباس ہم نے تیری بات سنی تو ہماری بھی یاد رکھ کہ ہم نامرد نہیں ہیں، ہم نے تلواروں کی گود میں پرورش پائی ہے.....''

دوسرے انصار نے ان کی بات کاٹ کر کہا ''یارسول اللہ آپ بھی کچھ فرمائیے۔''

حضورؐ نے قرآنِ حکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور اہلِ یثرب کو اسلام پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی، پھر فرمایا:

''میں تم سے اس بات کی بیعت لیتا ہوں کہ تم جس طرح اپنی جانوں اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو اسی طرح میری حفاظت کرو گے اور اشاعتِ دین میں میری اعانت کرو گے۔''

حضرت براء بن معرورؓ نے آپؐ کا دستِ مبارک پکڑ لیا اور کہا:

''یارسول اللہ، خدا کی قسم ہم اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی حفاظت و اعانت کریں گے۔''

حضرت ابوالہیثم بن تیہانؓ نے ان کی بات کاٹ کر کہا:

''یارسول اللہ اس وقت ہمارے اور یہود کے درمیان معاہدات ہیں جو بیعت کے بعد فسخ ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اقتدار اور قوت پا کر ہمیں چھوڑ دیں۔''

حضورؐ متبسم ہوئے اور فرمایا:

''بلکہ میرا خون تمھارا خون اور میرا ذمہ تمھارا ذمہ ہے۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو تم جس سے لڑو گے میں بھی اس سے لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔''

حضورؐ کے ارشادات سُن کر سب یثربی اہلِ ایمان بیعت کے لیے لپکے۔ اس وقت حضرت عباس بن عبادہؓ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''دوستو! اچھی طرح سمجھ لو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ بیعت عرب وعجم کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ خوب جان لو کہ تم پر ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ ہمارے شرفا قتل ہوں، ہمارا مال برباد ہو جائے، ہماری عزت و ناموس خطرے میں پڑ جائے۔ اس وقت ایسا نہ ہو کہ مشکلات و مصائب کے ہجوم سے گھبرا کر تم محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دو۔''

سب انصار نے بیک آواز کہا:

''ہاں ہاں ہم سب خطرات کو دیکھ کر بیعت کر رہے ہیں۔''

اس کے بعد حضورؐ نے انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''میں تم سے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے یہ چاہتا ہوں کہ ہم کو پناہ دو اور جس طرح اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو، ہماری بھی کرو۔''

سوال ہوا:

''یارسول اللہ اگر ہم یہ سب کام کریں تو اس کا صلہ ہمیں کیا ملے گا۔''

حضورؐ نے فرمایا: ''جنت''

یہ سن کر انصار کے قلوب ایمان و یقین کے نور سے منوّر ہو گئے اور وہ بولے:

''تو جو کچھ آپ چاہتے ہیں ہم اس کے لیے راضی ہیں۔''

اس کے بعد سب یکے بعد دیگرے حضورؐ کی بیعت سے مشرف ہو گئے۔

یہ بیعت تاریخ میں بیعت عقبہ ثانیہ، بیعت عقبۂ کبیرہ اور بیعت لیلۃ العقبہ کے ناموں سے مشہور ہے اور تاریخ اسلام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ واقعی یہ عرب وعجم اور جن وانس سے جنگ کرنے کی بیعت تھی۔ اس وقت سرزمین عرب کا ذرّہ ذرّہ علم بردارانِ حق کے خون کا پیاسا تھا اور عرب کے کسی قبیلے کی یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اہلِ حق کی حمایت کا اعلان کرے۔ اس وقت ارضِ یثرب کے یہ مقدّس انسان اٹھے اور انھوں نے کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کو مکہ کے درِ یتیم ﷺ کے قدموں میں لا ڈالا اور آپؐ سے استدعا کی کہ ارضِ یثرب کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمائیں۔ اپنے آقا و مولاؐ سے انھوں نے اس مقدّس رات کو جو پیمانِ وفا باندھا اپنے عمل سے انھوں نے واقعی سچ کر دکھایا—— مبارک تھیں وہ ہستیاں جنھوں نے سردھڑ کی بازی لگا کر یہ پیمانِ وفا باندھا اور زندگی کے آخری دم تک پورے صدق واخلاص کے ساتھ اسے نباہا۔

اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ جب یہ بیعت ہو چکی تو حضرت عباس بن عبادہؓ نے اُٹھ کر بڑے جوش سے کہا:

"یا رسول اللہ اگر آپؐ پسند فرمائیں تو ہم صبح ہوتے ہی دشمنانِ حق کو اپنی تلواروں کا مزہ چکھا دیں۔"

حضورؐ نے فرمایا، "نہیں ابھی اس کا حکم نہیں ہوا"

(۳)

بیعت عقبۂ کبیرہ کے بعد حضرت عباس بن عبادہؓ اور ان کے دو تین ساتھی مکہ ہی میں مقیم ہو گئے۔ (ایک دوسری روایت کے مطابق وہ یثرب واپس گئے اور پھر وہاں سے مکہ آئے اور مکہ کے اہلِ حق کے ساتھ رہنے لگے) سرورِ عالم ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت الی المدینہ کا اذن دیا تو وہ بھی ان کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ اسی لیے ان کو مہاجری انصاری کہا جاتا ہے۔

سرورِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت کے بعد چند دن قباء میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے خاص یثرب (مدینہ) میں نزولِ اجلال فرمایا۔ انصارِ مدینہ نے اپنے دیدہ و دل آپؐ

کے سامنے فرشِ راہ کر دیئے اور ایسے والہانہ جوش وخروش سے آپ کا استقبال کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ حضورؐ بنوسالم کے محلے سے گزرے تو بنوسالم کے عمائدین میں سے حضرت عباس بن عبادہؓ اور حضرت عتبان بن مالکؓ نے نہایت عقیدت اور اخلاص کے ساتھ آپ کو اہلاً وسہلاً کہا اور بہ صد ادب التجا کی کہ ہمارا غریب خانہ حاضر ہے۔ حضورؐ اس میں قدم رنجہ فرمائیں لیکن یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مقدّر میں لکھ رکھی تھی۔ اس لیے سرورِ کونین ﷺ ان کے جذبۂ اخلاص کی تحسین کرتے اور دعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم فرمائی تو حضرت عباس بن عبادہؓ کو جلیل القدر مہاجر صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کا دینی بھائی بنایا۔

رمضان ۲ ہجری میں غزوۂ بدر الکبریٰ پیش آیا۔ حضرت عباس بن عبادہؓ کسی خاص وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اس کی تلافی انھوں نے اگلے سال غزوۂ اُحد میں شریک ہو کر اس طرح کی کہ سر سے کفن باندھ کر پیش کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق ان کو مکہ کے ایک مشرک سفیان بن عبدِ شمس نے شہید کیا۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے ''الِاصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عباس بن عبادہؓ اپنی شہادت سے پہلے کچھ عرصہ اصحابِ صفہ میں بھی شامل رہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حرام بن ملحان انصاریؓ

سرورِ عالم ﷺ نے ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو بعض انصاری صحابہؓ نے بڑے ذوق وشوق سے آپؐ سے قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کی اور پھر اسی ذوق وشوق سے یہ تعلیم دوسروں کو بھی دی۔ قرآنِ حکیم سے غیر معمولی شغف رکھنے والے ان اصحاب میں مدینہ منوّرہ کے ایک جوانِ رعنا حرام بن ملحانؓ بھی تھے۔ اُن کا تعلق انصار کے معزز ترین خاندان بنونجار سے تھا۔

نسب نامہ یہ ہے:

حرامؓ بن ملحان بن خالد بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج۔

حضرت ام سلیمؓ اور حضرت ام حرامؓ جن کا شمار نہایت جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے، حضرت حرام بن ملحانؓ کی بہنیں تھیں۔ وہ دُور کے رشتہ سے رسولِ کریم ﷺ کی خالہ ہوتی تھیں، اسی نسبت سے حضرت حرامؓ بھی حضورؐ کے ماموں ہوتے تھے۔

حضرت حرام بن ملحانؓ کا شمار انصار کے سابقین اوّلین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ہجرتِ نبوی سے پہلے اپنی بہنوں کے ساتھ ہی قبول اسلام کا شرف حاصل کیا ـــــ رحمتِ عالم ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو انھوں نے اپنے دوسرے انصاری بھائیوں کے ساتھ والہانہ جوش و خروش سے آپؐ کا استقبال کیا اور پھر شب و روز نبوت کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہونے لگے یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں قرآن وسنت کے عالم بن گئے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ وہ اکثر قرآن پڑھا کرتے تھے اور رات کو قرآن کا درس دیا کرتے تھے، اسی بنا پر ''قاری'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

حضرت حرامؓ نہایت ہی مخلص مسلمان تھے اور ان کے جوشِ ایمان کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ رات کو درسِ قرآن سے فارغ ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور صبح تک نمازیں پڑھتے رہتے۔ دن کے وقت انھوں نے مسجدِ نبوی اور اصحابِ صفّہ کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ وہ مسجدِ نبوی میں پانی بھر کر رکھتے پھر جنگل جا کر لکڑیاں لاتے اور انھیں فروخت کر کے اصحابِ صفّہ اور دوسرے محتاج مسلمانوں کے لیے سامانِ خورد ونوش مہیا کرتے۔ اپنے اعلیٰ اخلاق اور جذبۂ اخلاص کی بہ دولت انھوں نے بارگاہِ رسالت میں درجۂ تقرب حاصل کر لیا تھا اور رحمتِ دو عالم علیہ وسلم کی محبت اور شفقت کا مورد بن گئے تھے۔

رمضان ۲ ہجری میں حق و باطل کا معرکۂ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت حرامؓ کو اصحابِ بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ وہ شروع سے اخیر تک سر بکف ہو کر لڑے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اگلے سال ۳ ہجری میں غزوۂ احد میں بھی شریک ہوئے اور اپنی شجاعت و بسالت کے جوہر دکھائے۔

صفر ۴ ہجری میں بنو کلاب کا رئیس ابو براء عامر بن مالک نجد سے مدینہ منوّرہ آیا اور سرورِ عالم علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اپنے کچھ آدمیوں کو میرے ساتھ بھیجیں جو میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ حضورؐ نے اس کی درخواست قبول کرنے میں تامّل فرمایا کیوں کہ چند دن پہلے بنو عامر کا سردار عامر بن طفیل جو ابو براء کا بھتیجا تھا، یہ پیغام بھیج چکا تھا کہ محمدؐ مجھے اپنا جانشین بنائیں یا نرم زمین والوں پر وہ حکومت کریں اور سخت زمین والوں پر میں۔ ورنہ میں ہزاروں جنگجوؤں کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کر دوں گا ـــــ لیکن ابو براء نے بار بار یقین دلایا کہ جو مسلمان اس کے ساتھ جائیں گے وہ ان کی حفاظت اور سلامتی کا ضامن ہو گا۔

صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے (ابو براء کی یقین دہانی پر) ستر صحابۂ کرامؓ کو حضرت حرام بن ملحانؓ کی قیادت میں نجد کی طرف بھیجا۔(۱) ان میں زیادہ تعداد انصار اور اصحابِ صفّہ کی تھی جو قرآنِ کریم کے حافظ تھے اور قرّاء کے لقب سے

(۱) امام ابنِ اسحاقؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کا بیان مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے ابو براء کے ساتھ چالیس صحابۂ کرامؓ بھیجے اور ان کا قائد حضرت منذر بن عمرو انصاریؓ کو مقرر فرمایا۔ حضرت حرام بن ملحانؓ بھی ان چالیس صحابہ میں شامل تھے۔ ہم نے صحیح بخاری کی روایت کو ترجیح دی ہے۔

مشہور تھے۔ حضورؐ نے عامر بن طفیل کے نام ایک خط بھی اس جماعت کے ہاتھ روانہ کیا۔ یہ اصحاب مدینہ سے رخصت ہوکر بیرِ معونہ کے مقام پر جا کر ٹھہر گئے۔ یہ مقام مکہ معظّمہ اور عسفان کے درمیان واقع تھا۔ واقدی کا بیان ہے کہ یہ بنی سلیم کا ایک چشمہ تھا جو بنی عامر اور بنو سلیم کے علاقوں کے درمیان واقع تھا۔

حضرت حرام بن ملحانؓ سرورِ عالم ﷺ کا والا نامہ لے کر عامر بن طفیل کے پاس گئے۔ اُس بد بخت نے حضورؐ کا والا نامہ پڑھنا تک گوارا نہ کیا اور عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے پیچھے سے آ کر حضرت حرامؓ کو نیزہ مارا جو ان کے جسم کے آر پار ہوگیا۔ حضرت حرامؓ نے خون کا چلو بھر کر اپنے چہرے اور سر پر چھڑکا اور فرمایا: فُزْتُ وَ رَبِّ الکعبۃ'' (رب کعبہ کی قسم میں کام یاب ہوگیا) ساتھ ہی زمین پر گرے اور تاجِ شہادت سر پر رکھے خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔

واقدی کا بیان ہے کہ جس شخص نے حضرت حرام بن ملحانؓ کو نیزہ مارا وہ جبار بن سلمٰی کلابی تھا۔ جبار نے بعد میں لوگوں سے حضرت حرامؓ کے اس قول کا مطلب پوچھا کہ ''میں کام یاب ہوگیا'' سے کیا مراد ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جنت کے حصول میں کام یاب ہوگیا۔ جبار نے یہ سن کر کہا۔ ''خدا کی قسم انھوں نے سچ کہا۔'' اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

حضرت حرامؓ کی شہادت کے بعد عامر بن طفیل نے اپنے قبیلے بنو عامر سے کہا کہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرو، لیکن ان لوگوں نے ابو براء کی پناہ کی وجہ سے اس میں عذر کیا اس پر عامر نے اردگرد کے بعض قبائل بنو سلیم، رعل اور ذکوان وغیرہ کو جمع کر کے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق مسلمان حضرت حرامؓ کی شہادت کی خبر سن کر خود موقع پر پہنچ گئے۔ عامر بن طفیل اور اس کے کثیر التعداد ساتھیوں نے مٹھی بھر مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا اور دو کے سوا باقی سب کو ایک ایک کر کے شہید کر ڈالا۔ ان دو میں سے ایک حضرت کعب بن زید انصاریؓ تھے جو شدید زخمی ہوئے اور کفّار نے انھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ دوسرے حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ تھے جنھیں نجدیوں نے گرفتار کرلیا بعد میں وہ موقع پا کر بھاگ نکلے۔ (یا بہ روایتِ دیگر عامر بن طفیل کی ماں نے اپنی ایک منت پوری کرنے کے لیے انھیں آزاد کردیا)

حضرت عمرو بن امیہ نے مدینہ پہنچ کر اس دردناک واقعہ کی خبر سرورِ عالم ﷺ کو دی تو آپؐ کو شدید صدمہ پہنچا۔ آپؐ عام طور پر کسی کے لیے بددعا نہیں کرتے تھے لیکن اصحابِ بیئرِ معونہ کی الم ناک شہادت نے آپ کو اس قدر غم زدہ کیا کہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ مسلسل ایک ماہ تک بدبخت قاتلوں کے حق میں بددعا کرتے رہے۔ حضوؐر نے حضرت حرام بن ملحانؓ کو ہمیشہ یاد رکھا۔ آپؐ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اِمِّ حرامؓ اور اُمِّ سلیمؓ پر رحم آتا ہے کہ ان کے بھائی نے مظلومانہ شہادت پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حسیل الیمانؓ

اہلِ سِیَر نے حضرت حسیل الیمانؓ کا نام تین طریقوں سے لکھا ہے، حسیل (بروزنِ حسین)، حسِیل (بروزنِ قتیل) اور حسل۔ ان کی کنیت ''ابو حذیفہ'' پر سب اربابِ سِیَر کا اتفاق ہے۔ حضرت ابو حذیفہ حسیلؓ کا تعلق غطفان کے خاندان عبس سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

حسیلؓ بن جابر بن عمرو بن ربیعہ بن فرودہ بن حارث بن مازن بن قطیعہ بن عبس ——

حافظ ابنِ عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ حسیلؓ کے دادا کا نام یمان تھا اس لیے وہ بھی یمان کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس کی شہرت کا سبب یہ ہے کہ انھوں (حسیل کے دادا یا بہ روایتِ خود حسیلؓ) نے اپنے قبیلہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور بھاگ کر مدینہ آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے بنی عبد الاشہل سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا اور اسی خاندان کی ایک خاتون ربابؓ بنتِ کعب (بن عدی بن عبد الاشہل) سے نکاح کر لیا۔ چوں کہ یمنی تھے اس لیے ان کے حلیف انھیں الیمان کہنے لگے۔

حضرت حسیلؓ کے قبولِ اسلام کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت ہے کہ وہ اپنے فرزند حضرت حذیفہؓ کے ساتھ ہجرتِ نبوی سے قبل شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ بہ قول ابنِ اثیرؒ حضرت حذیفہؓ ہجرت سے پہلے مکہ پہنچے اور سرورِ عالم ﷺ سے ہجرت اور نصرت کے بارے میں دریافت کیا۔ حضورؐ نے ان کے لیے ہجرت کے بہ جائے نصرت تجویز کی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت حسیلؓ، ان کی اہلیہ رباب بنت کعبؓ اور دو فرزندوں حذیفہؓ اور صفوانؓ نے ہجرت کے بعد (حضورؐ کے مدینہ میں رونق افروز ہونے کے فوراً بعد) اسلام قبول کیا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حسیلؓ اپنے فرزند حضرت حذیفہؓ کے

ہم راہ غزوہ میں شریک ہونے کے لیے نکلے۔ اتفاق سے راستہ میں مشرکین قریش کے ہاتھ پڑ گئے۔ انھوں نے کہا، تم شاید محمد (ﷺ) کے پاس جا رہے ہو ہم تمھیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ حضرت حسیلؓ نے کہا، ہم مدینہ جاتے ہیں اس پر تم کو کیا اعتراض ہے؟ مشرکین نے کہا، اچھا تو قسم کھاؤ کہ لڑائی میں (محمدؐ کی حمایت میں) شریک نہ ہو گے۔ دونوں نے طوعاً و کرہاً لڑائی میں شریک نہ ہونے کا وعدہ کر لیا۔ اس پر کفّار نے انھیں رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، اپنے عہد پر قائم رہو اور گھر واپس جاؤ۔ باقی رہی فتح و نصرت تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ہم اسی سے طلب کریں گے۔

غزوۂ احد (۳ ہجری) میں حضرت حسیلؓ اپنے فرزند حضرت حذیفہؓ کے ساتھ مشرکین سے لڑنے کے لیے نکلے۔ حضورؐ نے حضرت حسیلؓ کا ضعف دیکھا تو آپؐ نے انھیں ایک دوسرے ضعیف العمر بزرگ حضرت ثابت بن وقشؓ کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے پاس ایک بلند ٹیلے پر (یا ایک قلعے میں) بٹھا دیا۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے ان دونوں کو عورتوں اور بچوں کی حفاظت پر مامور فرمایا۔ میدانِ کارزار گرم ہوا تو دونوں بزرگوں کو جوشِ جہاد نے بے تاب کر دیا۔ ایک نے دوسرے سے کہالا اب لک (کلمۂ غیرت یعنی تیرا باپ مرے) ہم یہاں کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں آج نہ مرے کل مرے چلو اللہ کی راہ میں لڑیں شاید اللہ تعالیٰ نعمتِ شہادت نصیب کرے۔ چناں چہ دونوں بزرگ تلواریں سونت کر میدانِ وغا میں پہنچ گئے۔ حضرت ثابت بن وقشؓ کو مشرکین نے شہید کر دیا۔ حضرت حسیلؓ کو مسلمان افراتفری کے عالم میں پہچان نہ سکے اور ان پر تلواریں مارنے لگے۔ حضرت حذیفہؓ ہر چند پکارتے رہے ''یہ میرے والد ہیں، یہ میرے والد ہیں'' لیکن لڑائی کے ہنگامے میں کسی نے ان کی نہ سنی اور حضرت حسیلؓ مسلمانوں کے ہاتھوں جامِ شہادت پی کر جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔

حضرت حذیفہؓ کو والدِ گرامی کی شہادت کا صدمہ تو بہت ہوا لیکن انھوں نے بڑے صبر سے کام لیا اور ''یغفر اللہ لکم'' (اللہ تم لوگوں کی مغفرت فرمائے) یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے حضرت حذیفہؓ کو بلا کر بہت افسوس کا اظہار فرمایا اور جیبِ خاص سے حضرت حسیل شہیدؓ کی دیت عطا فرمائی، لیکن حضرت ابو حذیفہؓ کی حمیت نے

اسے لینا گوارا نہ کیا اور انھوں نے اسے مساکین پر صدقہ کر دیا۔ حضورؐ نے ان کے جذبۂ خیر کی تحسین فرمائی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے یہ واقعہ سنا تو فرمایا کہ قاتل اور مقتول دونوں ماجور و مثاب ہیں (دونوں کو جہاد کا اجر و ثواب ملے گا)۔

حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ حضرت رباب بنتِ کعبؓ کے بطن سے حضرت حسیلؓ کے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ حذیفہؓ، سعد، صفوانؓ، مدلج اور لیلٰی۔ ان میں سے صرف حضرت حذیفہؓ اور حضرت صفوانؓ کو قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت حذیفہؓ کو بارگاہِ نبوی میں درجۂ تقرب حاصل ہوا اور وہ ''صاحب السرّ'' (رسول اللہ ﷺ کے رازداں) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا شمار اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔

رضی اللہ تعالٰی عنہ

حضرت عبد اللہ بن زید (بن عاصم) انصاریؓ

(۱)

حضرت ابو محمد عبد اللہ بن زید بن عاصمؓ نے اس جلیل القدر ماں کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی تھی جس کی کتابِ حیات میں سرورِ کونین ﷺ سے بے پناہ عقیدت و محبت اور راہِ حق میں اپنی جان، اولاد اور مال قربان کر دینے کے جذبہ کے ابواب اتنے روشن ہیں کہ آج بھی ان کی تابانی سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہ خاتون تھیں نسیبہ بنتِ کعبؓ جو تاریخ میں اپنی کنیت امِ عمارہ سے مشہور ہیں اور پھر وہ اس بھائی کے ساتھ پلے بڑھے جس نے اپنا بند بند کٹا دیا لیکن راہِ حق سے منہ موڑنا گوارا نہ کیا۔ اُن کے جلیل القدر بھائی تھے حبیب بن زید بن عاصمؓ۔

حضرت عبد اللہ بن زید خزرج کی معزز ترین شاخ بنو نجار کے چشم و چراغ تھے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبد اللہؓ بن زید بن عاصم بن کعب بن عمرو بن عوف بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مازن بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج۔

حضرت عبد اللہؓ کے والد زید بن عاصم نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا۔ وہ حضرت عبد اللہؓ کے بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ ان کی والدہ حضرت اُمِّ عمارہ نہایت نیک فطرت خاتون تھیں۔ ان کا شمار انصار کے سابقون الاوّلون میں ہوتا ہے۔ وہ اس زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئیں جب بیعت عقبۂ اولیٰ (۱۲ نبوت) کے بعد حضرت مصعبؓ بن عمیر یثرب میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ۱۳ نبوّت میں انھیں ان پچھتر نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا

جنھوں نے لیلۃ العقبہ میں رحمتِ دو عالم ﷺ کی بیعت کی اور اس عہد کے ساتھ آپؐ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت دی کہ ہم اپنی جانوں مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی حمایت و حفاظت کریں گے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ام عمارہؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ اور حضرت حبیبؓ ان کے ساتھ ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے اور بعض میں ہے کہ جب حضورؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو وہ اس وقت مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان روایات کی تطبیق یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ ہجرتِ نبوی سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ ہی مسلمان ہو گئے لیکن حضورؐ سے بیعت کا شرف ہجرت کے بعد حاصل کیا۔

(۲)

غزوۂ بدر (رمضان ۲ ہجری) میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی شرکت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض اربابِ سِیَر کے نزدیک وہ غزوۂ بدر میں شریک تھے اور بعض نے لکھا ہے کہ ان کی عمر اس وقت پندرہ برس سے کم تھی اس لیے اس میں شریک نہ ہو سکے البتہ غزوۂ بدر کے بعد عہدِ رسالت کے تمام غزوات میں ان کے شریک ہونے پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے۔

علّامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ احد (۳ ہجری) میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ اپنی والدہ حضرت اُمِّ عمارہؓ اور بھائی حضرت حبیب بن زیدؓ کے ساتھ شریک ہوئے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ ان کی والدہ نے تو اس لڑائی میں ایسی عدیم المثال شجاعت اور استقامت کا مظاہرہ کیا کہ خاتونِ احد کے لقب سے مشہور ہو گئیں۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمان انتشار کا شکار ہو گئے تو اس وقت حضورؐ کے قریب گنتی کے چند سرفروش باقی رہ گئے۔ اس سے پہلے حضرت اُمِّ عمارہؓ دوسری خواتین کے ساتھ مشکیزوں میں پانی بھر بھر کر مجاہدین کو پلا رہی تھیں اور زخمیوں کی خبر گیری کر رہی تھیں۔ جب انھوں نے حضورؐ کو خطرے میں دیکھا تو مشکیزہ پھینک کر تلوار اور ڈھال سنبھال لی اور حضورؐ کے قریب پہنچ کر کفار کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔ بار بار یورش کر کے حضورؐ کی طرف بڑھتے اور حضرت اُمِّ عمارہؓ انھیں دوسرے سرفروشوں کے ساتھ مل کر تیر اور تلوار سے روکتیں۔ اتنے میں ایک مشرک نے تاک کر ان کے سر پر اپنی تلوار کا وار کیا۔ انھوں نے اسے اپنی ڈھال پر روکا

اور پھر اس کے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ گھوڑا اور سوار دونوں زمین پر آ رہے۔ سرورِ عالم ﷺ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ کو پکار کر فرمایا:

''عبداللہ اپنی ماں کی مدد کر''

وہ فوراً ادھر لپکے اور تلوار کے ایک ہی وار سے حملہ کرنے والے مشرک کو جہنم واصل کر دیا۔ عین اس وقت ایک دوسرا مشرک تیزی سے ادھر آیا اور حضرت عبداللہؓ کا بایاں بازو زخمی کرتا ہوا نکل گیا۔ حضرت اُمِّ عمارہؓ نے اپنے ہاتھ سے حضرت عبداللہؓ کا زخم باندھا اور پھر فرمایا:

''بیٹے جاؤ جب تک دم میں دم ہے لڑو۔''

حضورؐ نے ان کا جذبۂ فدویت دیکھ کر فرمایا ''اے اُمِّ عمارہ جتنا حوصلہ تجھ میں ہے اور کسی میں کہاں ہوگا۔''

اسی اثنا میں وہی مشرک جس نے حضرت عبداللہؓ کو زخمی کیا تھا، پلٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ حضورؐ نے حضرت اُمِّ عمارہؓ سے فرمایا، ''اُمِّ عمارہ سنبھلنا، یہ وہی بد بخت ہے جس نے عبداللہ کو زخمی کیا تھا۔'' حضرت اُمِّ عمارہؓ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹیں اور تلوار کا ایسا کاری وار کیا کہ وہ دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ سرورِ عالم ﷺ یہ دیکھ کر متبسّم ہو گئے اور فرمایا: ''اُمِّ عمارہ تو نے اپنے بیٹے کا خوب بدلہ لیا۔''

غرض حضرت اُمِّ عمارہؓ اخیر تک اسی طرح سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑتی رہیں یہاں تک کہ سخت زخمی ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے جسم پر بارہ زخم لگے۔ لڑائی کے بعد حضورؐ نے خود ان کی مرہم پٹی کروائی اور کئی بہادر صحابہ کا نام لے کر فرمایا:

''واللہ آج اُمِّ عمارہ نے ان سب سے بڑھ کر بہادری دکھائی۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ اُحد کے دن میں دائیں بائیں جس طرف نظر ڈالتا تھا اُمِّ عمارہ ہی اُمِّ عمارہ لڑتی نظر آتی تھیں۔

(۳)

غزوۂ احد کے بعد حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے غزوۂ احزاب میں دادِ شجاعت دی۔ ۶ ہجری میں انھوں نے حدیبیہ میں بیعتِ رضوان کا عظیم الشان شرف حاصل کیا اور یوں

''اصحاب الشجرہ'' کی اس مقدّس جماعت میں شامل ہو گئے جس کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوش نودی کی بشارت دی۔ اس کے بعد وہ اپنی والدہ کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے، پھر ۷ ہجری میں والدہ کے ساتھ عمرۃ القضا میں حضوؐر کی معیت کا شرف حاصل کیا۔ ۸ ہجری میں ان کو ان دس ہزار قدوسیوں میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی جو فتح مکہ کے موقع پر سرورِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے اور جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے توریت (کتابِ استثنا) میں یوں پیشین گوئی کی گئی تھی:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا فاران سے ان پر جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ان کے لیے آتشیں شریعت تھی۔''

اسی سال انھوں نے غزوۂ حنین میں دادِ شجاعت دی، والدہ بھی ساتھ تھیں۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو ایکا ایکی سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اٹھی۔ مرتدین میں سب سے طاقت ور نجدی قبیلہ بنو حنیفہ کا رئیس مسیلمہ کذاب تھا۔ اس نے نبوّت کا دعویٰ کر کے اور شعبدہ بازیوں کے بل پر چالیس ہزار جنگ جو بدوی اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیے۔ اسی زمانہ میں حضرت عبد اللہؓ کے بھائی حضرت حبیب بن زیدؓ عمان سے مدینہ آ رہے تھے کہ ظالم مسیلمہ کے ہاتھ پڑ گئے۔ اس نے ان کو بھی ارتداد پر مجبور کیا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ مسیلمہ نے ان کے جسم کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالا لیکن وہ آخر دم تک یہی کہتے رہے ''میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔''

ان کی مظلومانہ شہادت کی خبر سن کر حضرت اُمِّ عمارہؓ اور حضرت عبد اللہؓ کو سخت صدمہ پہنچا لیکن حضرت حبیبؓ کی ثابت قدمی پر خدا کا شکر بجا لائے اور عہد کر لیا کہ مسیلمہ سے اس ظلم کا بدلہ لے کر رہیں گے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مسیلمہ کی سرکوبی پر مامور کیا تو حضرت اُمِّ عمارہؓ اور حضرت عبد اللہؓ دونوں حضرت خالدؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ مسیلمہ نے لڑائی کی زبردست تیاری کر رکھی تھی۔ اس نے چالیس ہزار جنگ جو مسلمانوں

کے مقابلے میں لا کھڑے کیے۔ عقرباء (یمامہ) کے مقام پر مرتدین اور اہلِ حق کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ کبھی مسلمان پیچھے ہٹ جاتے اور کبھی وہ مرتدین کو پیچھے دھکیل دیتے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے لڑائی کا یہ رنگ دیکھا تو انھوں نے مسلمانوں کے تمام قبائل کو الگ الگ کر دیا اور اعلان کیا کہ ہر قبیلہ اپنے اپنے علم کے نیچے لڑے تا کہ پتہ چل جائے کہ آج کون شجاعت اور عزم و ثبات کا حق ادا کرتا ہے۔ اس تدبیر کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ہر قبیلے نے شجاعت اور ثابت قدمی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی اور مرتدین کا منہ پھیر دیا۔ مسیلمہ نے اپنی فوج میں ہزیمت کے آثار دیکھے تو اس نے اپنے مریدوں کو پکار کر کہا کہ اپنا ننگ و ناموس بچانا ہو تو بچالو۔ حضرت اُمِّ عمارہؓ اور حضرت عبداللہؓ شروع ہی سے مسیلمہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے اب انھوں نے اسے تاک لیا۔ حضرت اُمِّ عمارہؓ زخم پر زخم کھاتی اور اپنی برچھی سے راستہ بناتی اس کی طرف بڑھیں۔ اس کوشش میں انھیں گیارہ زخم آئے اور ایک ہاتھ بھی کلائی سے کٹ گیا۔ مسیلمہ کے قریب پہنچ کر اپنی برچھی سے اس پر حملہ کیا چاہتی تھیں " ہتھیار اس پر ایک ساتھ پڑے اور وہ کٹ کر گھوڑے سے نیچے جا پڑا۔ اُمِّ عمارہؓ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پہلو میں حضرت عبداللہؓ کو کھڑے پایا اور قریب ہی حضرت وحشیؓ (قاتلِ حمزہؓ) کھڑے تھے۔ وحشیؓ نے اپنا حربہ مسیلمہ پر پھینکا تھا اور عبداللہؓ نے اسی وقت اس پر تلوار کا وار کیا تھا۔ حضرت اُمِّ عمارہؓ اور حضرت عبداللہؓ دونوں حضرت حبیبؓ کے قاتل اور مسلمانوں کے اس بدترین دشمن کی موت پر سجدۂ شکر بجالائے۔ حضرت خالدؓ نے بڑی تندہی سے حضرت اُمِّ عمارہؓ کا علاج کرایا یہاں تک کہ ان کے تمام زخم مندمل ہو گئے۔

(۴)

اس واقعہ کے بعد حضرت عبداللہ بن زیدؓ طویل عرصہ تک حیات رہے لیکن خلفائے راشدینؓ اور امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں ان کے مشاغل اور سرگرمیوں کے بارے میں کتبِ سِیَر خاموش ہیں۔ ۶۳ ہجری میں وہ اس وقت منظرِ عام پر آئے جب اہلِ مدینہ نے یزید کی بیعت توڑ کر حضرت عبداللہ بن حنظلہ انصاریؓ کو اپنا امیر بنا لیا۔ یزید کو اہلِ مدینہ کے طرزِ عمل کی اطلاع پہنچی تو اس نے ان کو بہ زور مطیع بنانے کے لیے ایک مضبوط لشکر بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ نے

اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے اہلِ شہر سے اس بات پر بیعت لینا شروع کردی کہ آخری دم تک یزیدی لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو بیعت کے لیے کہا گیا تو انھوں نے پوچھا، بیعت کی شرط کیا ہے؟ جواب ملا ''موت'' انھوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد اس شرط پر کسی سے بیعت نہیں کرسکتا۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ کے ہاتھ پر موت کی بیعت نہ کرنے کے باوجود وہ یزید کی حکومت سے سخت بیزار تھے اور اس کے لشکر کے خلاف لڑنا ان کے نزدیک جہاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ اپنے دو بیٹوں خلاد اور علی کو ساتھ لے کر دوسرے اہلِ مدینہ کی طرح یزیدی لشکر سے نبرد آزما ہوئے، اور نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے بیٹوں سمیت شہید ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ برس کے لگ بھگ تھی۔

علم و فضل کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن زیدؓ ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ کتبِ حدیث میں ان سے مروی متعدد احادیث موجود ہیں۔ ان کے راویوں میں عباد بن تمیمؒ، سعید بن مسیّبؒ، یحییٰ بن عمارہؒ، عبادہ بن حبیبؒ اور واسع بن حیانؒ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے مروی صحیحین کی یہ چار حدیثیں بہت مشہور ہیں۔

① غزوۂ حنین کے بعد رسول اللہ ﷺ نے لوگوں میں خوب مالِ غنیمت تقسیم فرمایا اور تالیفِ قلوب پر بھی خرچ کیا لیکن انصار کو کچھ نہ دیا جس سے انصار کے دل میں کچھ رنج پیدا ہوا کہ اوروں کو بہت کچھ ملا مگر انھیں کچھ نہ ملا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے جماعتِ انصار کیا میں نے تمھیں گم راہ نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمھیں ہدایت دی اور کیا تم جدا جدا نہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے سبب تمھیں ملا دیا اور کیا تم مفلس اور بھوکے نہ تھے اللہ تعالیٰ نے میری وساطت سے تمھیں مال دار کردیا، جب حضورؐ یہ احسانات گنوا رہے تھے تو انصار ہر بات کے جواب میں کہتے جاتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم پر بہت احسان کیے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ تمھیں کس چیز نے اکسایا کہ اللہ کے رسول پر اعتراض کرو۔ انھوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی ہمارے محسن ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں اگر تم چاہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ تم بھی تو ایسی تنگی ترشی ہی کی حالت میں ہمارے پاس آئے تھے اور ہم نے تمھاری عزت کی تھی۔

پھر فرمایا، اے گروہِ انصار کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ تو اونٹ بکریاں اور مال ومنال اپنے گھروں کو لے جائیں اور تم اللہ کے نبی کو اپنے گھر لے جاؤ۔ اگر ہجرت نہ ہوتی (میں ہجرت کر کے نہ آیا ہوتا) تو میں انصار ہی میں شریک ہوتا۔ اگر لوگ کسی دوسرے راستہ یا وادی کی طرف جائیں تو میں انصار ہی کی وادی کو پسند کروں گا۔ انصار میرے اتنے قریبی ہیں کہ دوسرے لوگ اتنے قریبی نہیں (جن کو زیادہ یا تالیفِ قلب کے طور پر مالِ غنیمت دیا گیا ہے)۔

اے انصار میرے بعد تم جلدی اپنے پر غیر کی ترجیح دیکھو گے مگر تمھیں صبر کرنا ہوگا یہاں تک کہ مجھ سے حوض (کوثر) پر آملو۔

۲ رسول اللہ ﷺ نمازِ استسقا کے لیے نکلے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا کی۔ پھر اپنی چادر کو پھیرا اور دو رکعت نماز پڑھی اور قرأت بلند آواز سے کی (— ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے یہ نماز عیدگاہ میں پڑھی)۔

۳ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ شکایت کی کہ مجھے نماز میں ہر بار وضو ٹوٹ جانے کا وہم پڑ جاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جب تک ہوا خارج ہونے کی آواز نہ آئے یا بو نہ آئے اس وقت تک نماز سے نہ پھرو (ناحق شک اور وہم میں نہ پڑو)۔

۴ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ وضو کس طرح کیا کرتے تھے۔ انھوں نے پانی کا برتن منگایا اور لوگوں کے سامنے وضو کر کے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے اسی طرح وضو کرتے دیکھا۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے اس طرح وضو کیا۔ انھوں نے پہلے پانی کے برتن سے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا اور ان کو تین مرتبہ دھویا۔ پھر برتن سے کلی کے لیے پانی لیا اور کلی کی اور ناک میں پانی دے کر اس کو جھاڑا۔ تین مرتبہ اس طرح کیا۔ پھر برتن سے پانی لے کر تین مرتبہ منہ کو دھویا۔ پھر پانی لے کر دونوں ہاتھوں کو دو دو مرتبہ کہنیوں تک دھویا۔ پھر پانی لے کر سر کا مسح اس طرح کیا کہ دونوں ہاتھوں کو پیشانی کے اوپر سے لے کر پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لے آئے۔ پھر دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا۔

مسند احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ حضرت عبداللہ

بن زیدؓ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ ان کے یہاں تشریف لے گئے تو وہ پانی لائے اور آپؐ نے وضو کیا۔ حضرت عبداللہؓ نے آپؐ کے وضو کرنے کا طریقہ یاد کرلیا۔ چناں چہ ایک زمانہ کے بعد لوگوں نے ان سے حضورؐ کے وضو کرنے کا طریقہ پوچھا تو انھوں نے خود ان کے سامنے وضو کرکے بتلایا کہ حضورؐ اس طرح وضو کرتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سُراقہ بن عمرو انصاریؓ

سیدنا حضرت سراقہ بن عمرو انصاریؓ کا شمار ان عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عہدِ رسالت کے ہر شرف سے بہرہ ور کیا اور پھر خلعتِ شہادت سے سرفراز فرمایا۔ ان کا تعلق انصار کے معزز ترین خاندان بنونجار (خزرج) سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

سراقہؓ بن عمرو بن عطیہ بن خنساء بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مالک بن نجار۔

حضرت سراقہؓ کے قبولِ اسلام کا زمانہ اربابِ سِیَر نے متعین نہیں کیا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرتِ نبوی سے کچھ عرصہ پہلے یا فوراً بعد سعادت اندوزِ ایمان ہو گئے۔

غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت سراقہؓ کو سب سے پہلے اصحابِ بدر میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب میں دادِ شجاعت دی۔

ذی قعدہ ۶ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے عمرہ کے لیے مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ کا عزم فرمایا۔ اس موقع پر چودہ سو صحابہ کرامؓ (مہاجرین و انصار) آپؐ کے ہم رکاب تھے ان میں حضرت سراقہ بن عمروؓ بھی شامل تھے۔ قریش کو مسلمانوں کے عزمِ مکہ کی اطلاع ملی تو وہ انھیں مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے مرنے مارنے پر تُل گئے۔ حضورؐ کو کفارِ مکہ کے ارادے کا علم ہوا تو آپؐ راستہ بدل کر حدیبیہ کے مقام پر خیمہ زن ہو گئے اور وہاں سے ایک سفیر قریش کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ قریش تھوڑی مدّت کے لیے ہم سے صلح کا معاہدہ کر لیں۔ قریش نے عروہ بن مسعود ثقفیؓ کو (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اپنا سفیر بنا کر مسلمانوں کے پاس بھیجا۔ وہ حضورؐ سے گفتگو کر کے

واپس مکہ گئے اور قریش کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں سے صلح کرلیں لیکن قریش نے ان کی بات نہ مانی۔ حضوؐر نے پھر ایک سفیر قریش کے پاس بھیجا۔ قریش نے اس سے بدسلوکی کی۔ ایک روایت کے مطابق اس پر حملہ کیا لیکن وہ بچ گیا۔ اب حضوؐر نے اتمامِ حجت کے لیے حضرت عثمان غنیؓ کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز کی حمایت میں مکہ گئے لیکن قریش نے انھیں مکہ میں روک لیا۔ اُدھر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کردیئے گئے۔ یہ خبر سن کر مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا۔ حضوؐر نے فرمایا، اگر یہ خبر صحیح ہے تو جب تک ہم عثمانؓ کے خون کا بدلہ نہ لیں گے یہاں سے نہ جائیں گے۔ یہ فرما کر آپؐ ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور وہاں پر موجود تمام صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اسی کا نام بیعتِ رضوان ہے یعنی اللہ کی خوش نودی کی بیعت کیوں کہ یہ بیعت کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اپنی خوش نودی ظاہر فرمائی:

لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ

(الفتح:۱۸)

''تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب تجھ سے اس درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔''

حضرت سراقہ بن عمروؓ بھی ان خوش بخت صحابہ میں تھے جن کو بیعتِ رضوان کا عظیم شرف حاصل ہوا۔

بعد کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر صحیح نہ تھی لیکن مسلمانوں کے جوش و خروش اور جذبۂ حق کا یہ اثر ہوا کہ قریش ہمت ہار گئے اور انھوں نے بعض شرائط پر مسلمانوں سے صلح کرلی۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مسلمان اس سال واپس جائیں اور اگلے سال آکر عمرہ کرلیں (لیکن مکہ میں وہ صرف تین دن قیام کرسکیں گے)۔ چناں چہ ذی قعدہ ۷ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جمعیت کے ہم راہ مکہ معظّمہ تشریف لائے اور بڑے ذوق وشوق سے عمرۃ القضا ادا کیا۔ اس موقع پر بھی حضرت سراقہ بن عمروؓ کو حضوؐر کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔

صلح حدیبیہ کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے آس پاس کے رئیسوں اور بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ایک خط شرحبیل بن عمرو والیِ بصریٰ کے نام بھی لکھا اور حارث بن عمیر ازدیؓ کو یہ خط دے کر شرحبیل کے پاس بھیجا۔ اس ظالم نے حضرت حارثؓ کو شہید کر ڈالا۔ حضورؐ نے حضرت حارثؓ کا بدلہ لینے تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک لشکر حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں روانہ کیا۔ اس لشکر میں حضرت سراقہ بن عمروؓ بھی شامل تھے۔ اُدھر شرحبیل کی مدد کے لیے قیصرِ روم نے ایک جرار لشکر بھیج دیا۔ مسلمان اور نصرانی مؤتہ کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو ان میں ایک اور چالیس کی نسبت تھی لیکن مسلمان اللہ کے بھروسے پر دشمن کی مہیب طاقت سے ٹکرا گئے۔ سپہ سالار حضرت زید بن حارثہؓ نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے علم سنبھالا وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ نے قیادت سنبھالی، انھوں نے بھی جامِ شہادت پیا تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے مسلمانوں کی کمان ہاتھ میں لی اور اس بہادری سے لڑے کہ مسلمانوں کو دشمن کے ٹڈی دل کی زد سے نکال لائے۔ حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے علاوہ جن سرفروشوں نے اس لڑائی میں اپنی جانیں حق کی خاطر قربان کیں حضرت سراقہ بن عمروؓ انھی میں شامل تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت زیاد بن لبید انصاریؓ

(۱)

سیدنا حضرت ابوعبداللہ زیاد بن لبیدؓ مدینہ منوّرہ کے ان پچھتر نفوسِ قُدسی میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ کے درِ یتیم ﷺ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور اپنی جان، مال اور اولاد کی طرح آپؐ کی حفاظت ونصرت کا عہد کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عرب کا ذرّہ ذرّہ محسنِ انسانیت ﷺ اور آپؐ کے نام لیواؤں کے خون کا پیاسا تھا اور آپؐ کو اپنے ہاں بلانا اہلِ مکہ ہی کو نہیں سارے عرب کو دعوتِ مبارزت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اللہ کے ان پاک باز بندوں نے اپنا سب کچھ راہِ حق میں داؤ پر لگا دیا نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے اور نہ کسی مصیبت اور ملامت کو۔ لیلۃ العقبہ کی بیعت نے ان کو ایک ایسا شرف عطا کر دیا جو قیامت تک ان کی جلالتِ قدر کا نشان بنا رہے گا۔ حضرت زیاد بن لبیدؓ کا تعلق قبیلۂ خزرج کی شاخ ''بنو بیاضہ'' سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

زیادؓ بن لبید بن ثعلبہ بن سنان بن عامر بن عدی بن امیہ بن بیاضہ بن عامر بن زریق بن عبد حارثہ بن مالک بن غضب بن جشم بن خزرج۔

حضرت زیاد بن لبیدؓ اپنے خاندان کے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ مدینہ منوّرہ میں اسلام کے مبلّغِ اوّل حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغی مساعی سے اوس اور خزرج کے جن نیک نفس لوگوں نے دعوتِ حق پر لبیک کہا، حضرت

زیاد بن لبیدؓ بھی ان میں شامل تھے۔ اس طرح وہ انصار کے سابقین اوّلین کی مقدس جماعت کے رُکن بن گئے۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں انھوں نے بیعت عقبہٴ کبیرہ میں شرکت کی سعادتِ عظمٰی حاصل کی۔ اس بیعت کے بعد جب مدینہ میں مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تو حضرت زیادؓ، مدینہ کے تین دوسرے بزرگوں، حضرت ذکوان بن عبدِ قیسؓ، حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہؓ اور حضرت عقبہ بن وہبؓ کے ساتھ مکہ پہنچے اور کچھ عرصہ کے بعد بہت سے مکی صحابہؓ کے ساتھ واپس آئے۔ اس بنا پر یہ اصحاب مہاجری انصاری کے لقب سے مشہور ہوئے۔

(۲)

مکہ سے ہجرت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے چند دن قبا میں قیام فرمایا۔ پھر آپؐ ایک مقررہ دن کو خاص مدینہ منوّرہ میں داخل ہوئے۔ یہ دن مدینہ منوّرہ کی تاریخ کا سب سے تابناک دن تھا۔ انصارِ مدینہ نے والہانہ ذوق وشوق سے آپؐ کا استقبال کیا اور حقیقی معنوں میں اپنے دیدہ و دل آپؐ کے سامنے فرشِ راہ کر دیئے۔ حضوؐر بنو بیاضہ کے محلے سے گزرے تو حضرت زیاد بن لبیدؓ نے اھلاً وسھلاً کہا اور قیام کے لیے اپنا مکان پیش کیا لیکن کارکنانِ قضاوقدر نے اس شرف کے لیے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کو منتخب کر رکھا تھا اس لیے حضوؐر نے ان سے فرمایا (جیسا کہ آپؐ مکان پیش کرنے والے دوسرے اصحاب سے کہہ چکے تھے) ''میری اونٹنی کو آزاد چھوڑ دو، یہ حکم کی پابند ہے، اللہ کی جانب سے خود منزل تلاش کرلے گی۔''

مدینہ منوّرہ میں حضوؐر کے مستقل قیام کے بعد حضرت زیاد بن لبیدؓ اکثر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور فیضانِ نبوی سے خوب خوب بہرہ یاب ہوتے۔ اس طرح وہ فضلاءِ صحابہؓ میں شمار ہونے لگے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اب علم کے اٹھنے کا وقت آپہنچا۔ حضرت زیادؓ کو بارگاہِ نبویؐ میں اتنا تقرب حاصل تھا کہ وہ بے تکلفی سے بات کرلیتے تھے۔ انھوں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ اب تو علم لوگوں کے رگ وریشے میں سرایت کرچکا ہے اس کے اٹھنے کا وقت کیسے آگیا۔''

حضوؐر نے ان کی اس جسارت کو کم فہمی پر محمول فرمایا اور ذرا سخت الفاظ میں یوں فہمائش کی:

''اے زیاد تیری ماں تجھ کو روئے میں تو تم کو بہت دانا آدمی سمجھتا تھا۔ کیا تم کو نظر نہیں آتا کہ یہود اور نصاریٰ تورات اور انجیل پڑھتے ہیں لیکن اس سے کچھ نفع نہیں حاصل کرتے۔''

حضرت زیادؓ اس فہمائش پر لرز اٹھے اور عرض کیا، ''بے شک یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آپؐ نے سچ فرمایا۔''

حضرت زیادؓ کو جہاد فی سبیل اللہ کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے بدر، احد، احزاب، اور عہدِ رسالت کے اکثر دوسرے غزوات میں حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

(۳)

محرم ۹ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے صدقہ وزکوٰۃ وصول کرنے کے لیے الگ الگ محصّلین مقرر فرمائے تو حضرت زیاد بن لبیدؓ کو حضرموت کا محصل مقرر فرمایا اور ساتھ ہی وہاں کا عامل بھی۔ حضورؐ صرف اسی شخص کو کسی منصب پر فائز کرتے تھے جو خود اس کا خواہش مند نہ ہو اور اس کی ذمہ داریوں کو بہ طریقِ احسن نباہنے کا اہل ہو۔ حضورؐ کے مقرر کیے ہوئے اس معیار کی روشنی میں حضرت زیادؓ کے کردار اور قابلیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑکے تو اہلِ یمن کی ایک بڑی تعداد بھی اس فتنہ کی لپیٹ میں آگئی اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ـــــ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت مہاجر بن امیہؓ کو نجران، کندہ اور حضرموت کے مرتدین کی سرکوبی پر مامور فرمایا اور حضرت زیاد بن لبیدؓ کو بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے لکھا۔ حضرت مہاجر بن امیہؓ نجران اور صنعاء کے مرتدین کو کچل کر کندہ کی طرف بڑھے۔ مآرب اور حضرموت کے درمیان پہنچے تو حضرت زیاد بن لبیدؓ کا خط ملا جس میں کندہ پر جلد سے جلد حملہ کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی۔ یہ خط ملتے ہی حضرت مہاجرؓ تیزی سے چل کر حضرت زیادؓ کے پاس پہنچ گئے۔ کندہ میں چار قلعے تھے جن کو مجر کہتے تھے۔ اہلِ کندہ کا سردار (یا بادشاہ) اشعث بن قیس قلعہ زبرقان میں تھا۔ حضرت مہاجرؓ اور حضرت زیادؓ نے زبرقان پر حملہ کیا۔ مرتدین تابِ مقاومت نہ لاسکے اور بھاگ کر قلعہ نجیر میں چلے گئے۔ حضرت مہاجرؓ اور حضرت زیادؓ نے اس کا نہایت سختی سے محاصرہ کرلیا۔ جب اشعث محاصرہ سے تنگ آگیا تو اس نے حضرت زیادؓ کو پیغام بھیجا کہ اتنے آدمیوں کو امان دے دیں تو میں

قلعہ آپ کے سپرد کردوں گا۔ حضرت زیادؓ نے اس کو منظور کرلیا اور اشعث کو کہلا بھیجا کہ معاہدہ لکھ کرلے آؤ میں اس پر اپنی مہر ثبت کردوں گا۔ وہ معاہدہ قلم بند کرکے لایا تو حضرت زیادؓ نے حسبِ وعدہ اس پر اپنی مہر ثبت کردی۔ اس کے بعد اشعث نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ مرتدین کی ایک جمعیت نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن ان میں سے بیشتر مارے گئے اور باقی کو مسلمانوں نے گرفتار کرلیا۔ عہد نامہ دیکھا گیا تو اس میں اشعث بن قیس کا نام نہیں تھا وہ گھبراہٹ میں اپنا نام لکھنا بھول گیا تھا۔ اس لیے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مدینہ منوّرہ بھیج دیا گیا جہاں اس نے ارتداد سے توبہ کرکے دوبارہ اسلام قبول کرلیا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت زیادؓ نے مرتدین پر شب خون مار کر فتح حاصل کی اور اشعث بن قیس کو گرفتار کرکے خلیفۃ الرسولؐ کے پاس بھیج دیا۔ بہرصورت حضرت زیادؓ نے مرتدین کے استیصال کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کا خاتمہ کردیا۔ صدیقِ اکبرؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے عہدِ خلافت میں حضرت زیادؓ کو حضرموت کی امارت پر قائم رکھا۔ اس منصب سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے کوفہ (یا بہ روایتِ دیگر شام) کی سکونت اختیار کرلی اور وہیں ۴۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت زیاد بن لبیدؓ سے چند احادیث مروی ہیں جن کو عوف بن مالکؓ، سالم بن ابی الجعدانؓ اور جبیر بن نفیرؓ نے روایت کیا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ

(شاعرِ رسول اللہ ﷺ)

①

دورِ جاہلیت کے عرب اُمّی ہونے کے باوجود اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اس زمانے کی بہت سی قوموں پر فوقیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ ناخواندہ، ناشائستہ اور غیر مہذب تھے لیکن زبان کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اپنی خطابت و شاعری پر اُن کو اس قدر ناز تھا کہ دنیا کی دوسری قوموں کو عجم (گونگا) قرار دیتے تھے۔ ہر قبیلہ کا شاعر اپنی قوم کے فضائل و محامد کا علم بردار ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنے زورِ بیان سے جس کو چاہتے سر بلند کر دیتے تھے اور جس کو چاہتے بدنام و رسوا کر ڈالتے، ذاتی پسند یا ناپسند کے علاوہ وہ اپنی شاعری کو قومی اور سیاسی ضروریات کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ قبائل کی عزت و ناموس اور حکمرانوں کی آبرو ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی، اس لیے بڑے بڑے سردار اُن کے آگے آنکھیں بچھاتے تھے اور بڑے بڑے سورما ان سے خوف کھاتے تھے۔ جب وہ کسی کی مدح یا ہجو میں شعر کہتے تو وہ برقی رَو کی طرح سارے عرب میں پھیل جاتے اور زبان زدِ عوام و خواص ہو جاتے۔ عربوں کے یہی لیل و نہار تھے کہ عرب کی ''وادیِ غیر ذی زرع'' میں محمد عربی ﷺ کا ظہور ہوا ـــــ آپؐ کی دعوتِ توحید کا مشرکینِ مکہ نے جو جواب دیا اسی کا نتیجہ تھا کہ آپؐ اپنا گھر بار اور وطنِ عزیز چھوڑ کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے لیکن مشرکینِ نافرجام کا دل اس سے بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور ان کے شعراء نے

سرورِ عالم ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی ہجو میں اشعار کہہ کہہ کر عرب میں پھیلانے شروع کر دیئے۔ یہ اشعار چند دن کے اندر اندر ہزاروں میل دور تک پہنچ جاتے تھے اور مدینہ منوّرہ تو مکہ سے صرف تین سو میل دور تھا۔ جب مسلمانوں تک آئے دن ایسے اشعار پہنچنے لگے تو ان کو سخت تکلیف ہوئی اور انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے درخواست کی کہ آپ شعرائے مکہ کی ہجووں کا جواب دیں۔ انھوں نے فرمایا، میں اس کام کے لیے تیار ہوں بشرطے کہ رسول اللہ ﷺ اجازت دیں۔ ان کا جواب سن کر صحابۂ کرامؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی:

''یا رسول اللہ ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، شعراءِ مشرکین آپؐ کی اور آپؐ کے جاں نثاروں کی ہجویں کہہ کہہ کر عرب میں ان کی اشاعت کر رہے ہیں۔ آپ ارشاد فرمائیں تو علیؓ ان کی خرافات کا جواب دیں۔''

حضوؐر نے فرمایا: ''علی اس کام کے لیے موزوں نہیں ہیں۔''

پھر آپؐ نے انصار کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''جن لوگوں نے میری تلوار سے مدد کی ہے کیا وہ اپنی زبان سے میری مدافعت نہیں کر سکتے؟''

حضوؐر کا ارشاد سن کر پختہ عمر کے ایک انصاری صاحب رسولؐ اٹھ کھڑے ہوئے، اپنی زبان نکال کر حضوؐر کو دکھائی اور پھر بڑے جوش سے عرض کی:

''یا رسول اللہ اس کام کے لیے میں حاضر ہوں۔ خدا کی قسم مجھے بہ صرائے شام اور صنعائے یمن کے درمیان اس کلام سے زیادہ کوئی کلام پسند نہ ہوگا جو دشمنانِ رسالت کے جواب میں ہو۔''

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''تم ان لوگوں کی ہجو کیسے کرو گے جن کے خاندان سے میں خود ہوں۔''

انھوں نے عرض کی:

''اے اللہ کے سچے رسول میں آپؐ کو ان میں سے اس طرح نکالوں گا جس طرح آٹے کے خمیر میں (یا گندھے ہوئے آٹے میں) سے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔''

حضوؐر نے ان صاحب کی پیش کش کو بہ نظرِ تحسین دیکھا اور ان کو مشرکین کی ہجو گوئی کا جواب دینے کی خدمت تفویض فرما دی —— پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ ان صاحبؓ نے اپنے

زورِ کلام سے ایک طرف تو شعراءِ مشرکین کا ناطقہ بند کردیا اور دوسری طرف رحمتِ عالم ﷺ کی مدح وتوصیف بیان کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں۔ یہ خوش بخت صاحبِ رسولؐ جن کو دربارِ نبیؐ کا سب سے بڑا شاعر اور مداح ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا، حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت حسان بن ثابتؓ کا تعلق قبیلہ خزرج کی معزز ترین شاخ بنونجار سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

حسانؓ بن ثابت بن منذر بن حرام بن عمرو بن زید مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج۔

ان کی مشہور کنیت ابوالولید ہے۔ اسماءالرجال کی کتابوں میں ابوالحسام اور ابوعبدالرحمٰن کنیتیں بھی آئی ہیں۔ شاعرِ رسول اللہ (ﷺ) لقب تھا۔

والدہ کا نام فریعہ بنتِ خالد تھا۔ وہ خزرج کے خاندان بنوساعدہ سے تھیں اور رئیسِ خزرج حضرت سعد بن عبادہؓ کی بنت عم ہوتی تھیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

فریعہؓ بنتِ خالد بن خنیس بن لوذان بن عبدود بن زید بن ثعلبہ بن خزرج بن کعب بن ساعدہ۔

ان کو بھی قبولِ اسلام اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت حسانؓ نے جس خاندان میں ہوش کی آنکھیں کھولیں وہ شعروشاعری سے لگاؤ اور طویل العمری کی بنا پر خاص شہرت کا حامل تھا۔ حضرت حسانؓ کے پردادا حرام بن عمرو نے ایک سوبیس سال کی عمر پائی۔ ان کے دادا منذر کی عمر بھی ایک سوبیس برس کی ہوئی۔ باپ ثابت بھی ایک سوبیس برس زندہ رہے۔ خود حضرت حسانؓ نے بھی اتنی ہی عمر پائی۔ مبرد نحوی کا بیان ہے کہ شاعری حضرت حسانؓ کے خاندان میں کئی پشتوں تک رہی۔ ان کے پردادا، دادا اور باپ بھی شاعر تھے اور بیٹے اور پوتے بھی۔ رہی ان کی اپنی شاعری، تو اس میں انھوں نے وہ کمال حاصل کیا

کہ اپنے دور کے بہترین شاعر تسلیم کیے گئے۔ مشہور ناقدِ سخن ابوعبیدہؒ کا قول ہے کہ حضرت حسانؓ کی تین خصوصیات ان کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں:

۱- وہ دورِ جاہلیت میں خزرج (یا اہلِ مدینہ) کے شاعر تھے۔

۲- عہدِ رسالت میں رسول اللہ ﷺ کے شاعر تھے۔

۳- زمانۂ اشاعتِ اسلام میں تمام یمن کے بہترین شاعر تھے۔

ابوعبیدہؒ ہی کا قول ہے کہ بالاتفاق صحرا کے تمام باشندوں میں اہلِ مدینہ کے پھر قبیلہ عبدالقیس کے اور پھر بنوثقیف کے اشعار اچھے ہیں اور اہلِ مدینہ میں سب سے بڑے شاعر حسانؓ ہیں۔

حضرت حسانؓ کے آباء واجداد اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ قلعۂ فارع جو مسجدِ نبوی سے مغرب کی جانب باب الرحمۃ کے سامنے واقع تھا، اُن کا مسکن تھا۔

حضرت حسانؓ ہجرتِ نبوی سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے پیدا ہوئے، اور ہجرتِ نبوی کے موقع پر ساٹھ یا پینسٹھ سال کی عمر میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا جتنا عرصہ جاہلیت میں گزارا، قریب قریب اتنا ہی عرصہ حالتِ اسلام میں جیے۔ اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہونے سے پہلے وہ تمام عرب میں اپنی شاعری کا سکہ بٹھا چکے تھے اور عرب کا بچہ بچہ انھیں ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔

قبولِ اسلام سے پہلے حضرت حسانؓ کے لیل و نہار کیا تھے؟ مختلف مؤرّخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اوس اور خزرج کی باہمی جنگوں میں وہ اپنے قبیلے کی تعریف میں پرجوش اشعار کہتے تھے اور اس کو انتقامی کارروائیوں پر ابھارتے تھے۔ لڑائیوں سے فرصت ملتی تو ملوکِ حیرہ وغسّان کے درباروں میں چلے جاتے اور ان کی شان میں پرزور قصیدے کہہ کر انعام واکرام وصول کرتے۔ ملوکِ غسّان (آلِ جفنہ) کی مدح میں ان کا یہ رنگ تھا:

يُغشونَ حَتّىٰ ما تهرّ كلابهُم — لا يسئلون عن السواد المقبل
بيض الوجوه كريمة احسابهم — شم الاتون من الطراز الاوّل

''وہ (ان کے ممدوح) اس قدر فیاض ہیں کہ ان کے یہاں ہمیشہ مہمان آتے

رہتے ہیں۔ ان کے کتے اجنبیوں پر بھونکتے نہیں (مطلب یہ کہ ان کے پاس اس کثرت سے مہمان آتے ہیں کہ ان کے کتے ان سے مانوس ہوگئے ہیں اور ان پر بھونکتے نہیں) اور نہ وہ خود کسی سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے کہاں سے اور کس مقصد کے لیے آیا ہے۔''

یہ گورے چہروں اور اعلیٰ حسب والے پچھلے لوگوں میں سے اونچی ناکوں والے ہیں ـــــ''

اہلِ عرب بادشاہوں کی مداحی کو نہایت ذلیل پیشہ سمجھتے تھے لیکن حضرت حسانؓ ملوکِ غسان یا آلِ جفنہ کی مدح صرف اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ دل کھول کر انعام دیا کرتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ان کے یک جدی تھے۔ ان کی ثنا خوانی کو وہ اپنی قوم کی مدح سمجھتے تھے اور اپنی قوم کی مدح کرنا اور اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا ہر عرب شاعر اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت حسانؓ کا قبیلہ خزرج ''ازد'' کی ایک شاخ تھا اور علماء انساب کے نزدیک ''ازد'' بنو قحطان ہیں اور ان کا اصلی وطن یمن ہے۔ حضرت حسانؓ کا سلسلۂ نسب ایک جانب سے غساسنہ یا آلِ جفنہ تک پہنچتا ہے جو شام کی غسانی ریاست کے حکمراں تھے اور دوسری طرف لخمیین سے جو عراقِ عرب میں واقع حیرہ کے بادشاہ تھے کیوں کہ ان سب کا مورثِ اعلیٰ عمرو مزیقیاء بن عامر بن ماء السماء تھا۔ عمرو مزیقیا کا ایک بیٹا جفنہ نامی شام کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کی نسل سے کم و بیش انیس بادشاہ ہوئے۔ اسی کے نام کی نسبت سے غساسنہ کو آلِ جفنہ بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت حسّانؓ آلِ جفنہ کی مدح بڑے اچھوتے انداز میں کرتے ہیں:

اولاد جفنة حول قبرا بينهم

قبر ابن مارية الكريم المفضل

''جفنہ کی اولاد اپنے باپ ابنِ ماریہ کی قبر کے گرد رہتی ہے جو نہایت سخی اور فیاض تھا۔''

مطلب یہ کہ آلِ جفنہ عرب کے عام قبائل کی طرح خانہ بہ دوش نہیں ہیں بلکہ بادشاہ ہیں اور دل جمعی کے ساتھ اپنے باپ کی قبر کے ارد گرد رہتے ہیں۔ ان کی جائے سکونت بہت سرسبز اور شاداب ہے اس لیے ان کو صحراؤں کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں۔

خود حضرت حسانؓ کو اپنی شرافتِ نسبی پر بڑا ناز تھا۔ ایک دفعہ کسی شاعر نے ان کے سامنے اپنے آباء و اجداد کی تعریف میں کچھ اشعار پڑھے جن میں اپنے حسب و نسب کو دوسروں کے حسب و نسب پر فوقیت دی گئی تھی:

حضرت حسانؓ نے اس کے جواب میں کہا:

الم ترنا اولاد عمرو بن عامر　　لنا شرف یعلو علیٰ کل مرتق
رسا فی قرار الارض ثم سمت له　　فروعٌ تسامیٰ کل نجم محلق
ملوکٌ و ابناء الملوک کاننا　　سواری نجومٍ طالعاتٍ بمشرق
اذا غاب منها کوکب لاح بعده　　شهابٌ متیٰ ما یبدو لارض تشرق

''کیا تو نہیں جانتا کہ ہم عمرو بن عامر کی اولاد میں سے ہیں۔ ہم کو ایک ایسا نسبی فخر حاصل ہے جو ہر بلند مرتبہ شخص پر فوقیت رکھتا ہے۔
ہماری خاندانی جڑیں زمین کی تہہ تک پہنچ گئی ہیں پھر اس سے ایسی شاخیں بلند ہوئیں جو ہر بلند ستارہ کا مقابلہ کرتی ہیں۔
ہم میں بادشاہ اور شاہ زادے پیدا ہوتے رہے ہیں گویا ہم چمکتے ہوئے ستارے ہیں جو مشرق سے طلوع ہوتے رہے ہیں جب ان کا کوئی ایک ستارہ غائب ہوا تو دوسرا نمودار ہو گیا جو زمین کو برابر روشن کرتا رہا۔''

زمانۂ حال کے بعض فاضل محققین نے خزرج و اوس (انصار) کو نابت بن اسمٰعیل کی اولاد ثابت کیا ہے (قحطانی نہیں بلکہ عدنانی) لیکن حضرت حسان کے دَور میں انھیں قحطانی ہی سمجھا جاتا تھا۔

(۳)

عہدِ جاہلیت میں حضرت حسانؓ بھی دوسرے شعراء کی طرح شراب کے رسیا تھے۔ ایک مرتبہ شام گئے وہاں بنی بکر بن وائل کا مشہور شاعر اعشیٰ مل گیا۔ دونوں ایک کلوار (مے فروش) کی دکان پر گئے اور خوب شراب پی۔ اس کے بعد حسانؓ وہیں پڑ کے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو سنا، اعشیٰ کلوار سے کہہ رہا تھا ''اس کو قرض لینے کی ضرورت نہ ہوتی لیکن اس کے پاس دام نہیں۔'' یہ سنتے ہی انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور بہ ظاہر سو گئے، یہاں تک کہ اعشیٰ کی آنکھ لگ گئی جب دیکھا کہ وہ غافل سو گیا ہے تو چپکے سے اٹھے اور کلوار کی دکان پر جتنی شراب تھی سب خرید لی اور اس کو زمین پر لنڈھانا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ بہتے بہتے اعشیٰ کے نیچے پہنچی۔ اس کے کپڑے بھیگے تو چونک کر اٹھ بیٹھا۔ حسانؓ کو شراب کا دریا بہاتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ انھوں نے میری بات سن لی۔ بہت کچھ

خوشامد اور عذر خواہی کی۔ اب حضرت حسانؓ کو جوش آ گیا اور انھوں نے بہت سے پر جوش اشعار اپنی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کی تعریف میں فی البدیہہ کہہ کر اعشیٰ کو سنائے۔ وہ ساکت وصامت ہو کر رہ گیا۔ (قبولِ اسلام کے بعد حضرت حسانؓ نے کبھی شراب کو چھوا تک نہیں)

ایک دفعہ بازارِ عکاظ میں نابغہ ذبیانی سے ملے جو اس زمانے کا سر آمدِ روزگار شاعر تھا۔ اس وقت وہ حضرت خنساءؓ کے اشعار سن رہا تھا۔ خنساءؓ اپنے دَور کی عدیم النظیر شاعرہ تھیں اور مرثیہ گوئی میں جواب نہ رکھتی تھیں، وہ چلی گئیں تو حضرت حسانؓ نے نابغہ کو اپنے اشعار سنانا شروع کیے۔ ان کو سن کر نابغہ کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

اِنَّکَ لَشَاعِرٌ (بلاشبہ تم شاعر ہو)

ایک اور روایت کے مطابق اس نے یہ الفاظ کہے ''تم شاعر ہو اور بنی سلیم کی بہن جو ابھی گئی ہے (خنساءؓ) وہ مرثیہ گو ہے۔''

ایک دن سرِ راہ بیٹھے چند دوستوں کو اپنے اشعار سنا رہے تھے کہ دورِ جاہلیت کا نامور شاعر حطیہ ادھر سے گزرا۔ وہ بھی کھڑا ہو کے ان کا کلام سننے لگا۔ حسانؓ اس کو پہچانتے نہ تھے۔ خیال کیا، کوئی دیہاتی گنوار ہے۔ کہنے لگے ''بدوی تو کیا سن رہا ہے؟''

اس نے کہا ''اس میں کوئی مضائقہ تو نہیں نظر آتا۔''

یہ جواب اس نے ایسی بے پروائی کی شان سے دیا کہ وہ اور برافروختہ ہو گئے اور خشم ناک لہجے میں پوچھا، ''تیری کنیت کیا ہے؟''

اس نے کہا، ابوملیکہ''

حسانؓ بولے۔ ''میری نظر میں اس سے زیادہ تیری ذِلّت کیا ہو سکتی ہے کہ زنانہ نام پر تو نے اپنی کنیت رکھی ہے۔''

پھر پوچھا! ''تیرا نام کیا ہے؟''

اس نے کہا، ''حطیہ''

نام سنا تو پہچانا اور چونکے مگر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا:

''تو اب آپ تشریف لے جائیں، خدا حافظ۔''

وہ خاموشی سے چلا گیا۔

یہی حطیہ حضرت حسانؓ کے کمالِ شاعری کا اس قدر معترف تھا کہ انھیں ''اشعر العرب'' (عرب کا سب سے بڑا شاعر) کہا کرتا تھا۔

مختصر یہ کہ حضرت حسان بن ثابتؓ زمانۂ جاہلیت ہی میں عرب کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہونے لگے تھے لیکن ان کا سرمایۂ افتخار جاہلی دَور کی شاعری نہیں بلکہ ان کا وہ کلام ہے جو ان کے قبولِ اسلام کے بعد معرضِ وجود میں آیا اور اہلِ حق کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔

(۴)

حضرت حسان بن ثابتؓ شعر و ادب کی اصطلاح میں مخضرمی شاعر ہیں یعنی وہ شاعر جس نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا ہو اور اسلام کا بھی۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے وقت ان کا عالم ضعیفی تھا لیکن ان کی شاعری ایک اور انداز میں جوان ہوگئی —— اب وہ دورِ جاہلیت کے تکلّف اور تصنّع سے بالکل پاک تھی۔ عہدِ رسالت میں حضرت حسانؓ کی زندگی کا سب سے جلی عنوان جہاد باللسان ہے۔ ایک طرف انھوں نے دشمنانِ حق شعرائے مشرکین کی خرافات کا ایسا دنداں شکن جواب دیا کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور دوسری طرف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اس جوشِ اخلاص و عقیدت سے کی کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ جھوم اٹھا اور تمام سعید الفطرت روحوں نے ان پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت حسانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر اپنے نفس اور زبان سے جہاد کیا ہے۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسانؓ نے غزواتِ نبویؐ میں شریک ہوکر جہاد بالسیف بھی کیا، لیکن جمہور اربابِ سِیَر کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسانؓ طبعی لحاظ سے (دل کے) کم زور تھے۔ اسّ لیے کسی غزوہ میں شریک ہوکر تلوار سے جہاد نہ کر سکے۔ اگر فی الواقع وہ غزوات میں اپنی تلوار کے جوہر نہ دکھا سکے تو ہماری رائے میں اس کی وجہ ان کی ''بزدلی'' نہ تھی بلکہ ''معذوری'' تھی۔ قبولِ اسلام کے وقت ان کی عمر ساٹھ برس سے اوپر تھی اور نظر بھی دھندلا رہی تھی جو بالآخر بالکل معدوم ہوگئی۔ اس لیے ہمیں حسنِ ظن سے کام لینا

چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ضعفِ پیری اور کم زوریِ نظر کی بنا پر لڑائی میں عملاً حصہ لینے سے معذور تھے۔ اس کی تلافی انھوں نے حق کی حمایت، اہلِ حق کی مدافعت اور مدحِ رسولؐ میں اپنی زبان آوری سے کردی۔ بالفاظِ دیگر حضرت حسانؓ غزواتِ نبوی میں شریک تو ضرور ہوئے لیکن ان میں انھوں نے فولاد کی تلوار سے کام لینے کی بہ جائے زبان کی تلوار سے کام لیا۔

ابنِ اثیرؒ نے غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے سلسلے میں حضرت حسانؓ سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس غزوہ میں سارے عرب کے مشرکین اور یہود نے متحد ہوکر مدینہ منوّرہ پر دھاوا بول دیا تھا اور خاص مدینہ منوّرہ کے اندر یہودِ بنی قریظہ نے غدّاری پر کمر باندھی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ بہت بڑا امتحان تھا لیکن اللہ کے ان پاک باز بندوں کے پائے استقامت میں لمحہ بھر کے لیے بھی لغزش نہ آئی اور وہ سر بکف ہوکر کفر و شرک کے مہیب طوفان سے ٹکرا گئے۔ اس موقع پر حضورؐ نے مسلمان خواتین اور بچوں کو بنی قریظہ کے مارِ آستین یہودیوں کے شر سے بچانے کے لیے قلعہ فارع میں منتقل کردیا جو حضرت حسانؓ کے خاندان کا مسکن تھا۔ آپؐ نے بہ نظرِ احتیاط حضرت حسانؓ کو خواتین اور بچوں کی نگرانی کے لیے قلعہ میں چھوڑ دیا کیوں کہ یہودِ بنی قریظہ اور قلعہ فارع کے درمیان مسلمانوں کا کوئی دستہ موجود نہ تھا۔ انھی پر آشوب ایام میں ایک دن ایک یہودی قلعے کی طرف آ نکلا اور قلعے میں موجود لوگوں کی سن گن لینے لگا۔ حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہ بنتِ عبد المطلبؓ بھی موجود تھیں، انھوں نے یہودی کو تجسس میں مصروف پایا تو حضرت حسانؓ سے کہا کہ باہر نکل کر اس یہودی کو قتل کردیں۔ حضرت حسانؓ نے کہا، عبد المطلب کی بیٹی خدا آپ کو معاف فرمائے آپ جانتی ہیں کہ میں اس یہودی سے لڑنے کے قابل نہیں۔

حضرت صفیہؓ بہت دلیر خاتون تھیں۔ وہ حضرت حسانؓ کا جواب سن کر خود اٹھیں، خیمے کی ایک چوب اکھاڑی اور باہر نکل کر اس یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ واپس آکر حضرت حسانؓ سے کہا کہ اب جا کر یہودی کا سر کاٹ ڈالیں اور اس کا سامان اتار لائیں۔

حضرت حسانؓ بولے: ''اے عبد المطلب کی بیٹی مجھے سامان سے کیا واسطہ؟'' (یا یہ کہ مجھے اس کی خواہش نہیں)

غزوۂ بنو مصطلق (۵ ہجری) سے واپسی پر اِفک کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ اس میں

منافقین نے اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگائی۔ رأس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول ان سب میں پیش پیش تھا۔ اس موقع پر حضرت حسانؓ سے یہ لغزش سرزد ہوگئی کہ وہ ایک دو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ منافقین کے فریب میں آگئے اور ان کی ہاں میں ہاں ملادی۔ اللہ تعالیٰ نے امُّ المؤمنینؓ کی پاک دامنی کی تصدیق کردی تو حضورؐ نے فریب خوردہ مسلمانوں پر قرآن کی مقرر کردہ حد جاری کی۔ ان میں حضرت حسانؓ بھی شامل تھے۔ منافقین نے اُمُّ المؤمنینؓ کے ساتھ ایک نہایت مخلص اور پاک باز صحابی حضرت صفوان بن معطل سلمیؓ کو متہم کیا تھا۔ ان کو اس تہمت طرازی سے اس قدر رنج ہوا کہ جوشِ حمیت میں حضرت حسانؓ پر تلوار چلادی۔

ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت حسانؓ نے بارگاہِ رسالت میں حضرت صفوان بن معطلؓ کی شکایت کی۔ حضورؐ نے اس کے قصاص (یا معاوضہ) میں حضرت حسانؓ کو کھجوروں کا ایک باغ دلوادیا اور انھوں نے اس باغ میں سکونت اختیار کرلی۔ لیکن صحیح بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت حسانؓ کے ایک قریبی رشتہ دار حضرت ابوطلحہ انصاریؓ (یکے از رؤساء بنونجار) نے اپنی نہایت قیمتی جائداد بیرحا کو صدقہ کرکے (حضورؐ کے فرمان کے مطابق) اپنے اعزہ میں تقسیم کیا تو یہ باغ حضرت حسانؓ کے حصے میں آیا۔

اگرچہ حضرت حسانؓ سے واقعۂ افک میں لغزش ہوگئی تھی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو قدرتاً اس سے سخت رنج ہوا تھا لیکن وہ نہایت اعلیٰ ظرف کی مالک تھیں، انھوں نے حضرت حسانؓ کو (ان پر حد جاری ہونے کے بعد) معاف کردیا۔ اگر کوئی ان کے سامنے حضرت حسانؓ کی برائی کرتا تو وہ اس کو منع کرتیں اور فرماتیں، وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مشرکین کو جواب دیا کرتے تھے اور آپؐ کا دفاع کرتے تھے۔

(۵)

سرورِ عالم ﷺ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو جو خدمت تفویض فرمائی (یا جس خدمت کا انھوں نے بیڑا اٹھایا) انھوں نے اس کو اس حسن وخوبی اور جوش وجذبہ کے ساتھ انجام دیا کہ حضورؐ کے لطف وکرم کا موردِ بن گئے۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کے حکم سے ان کے لیے مسجدِ نبوی میں منبر بچھایا جاتا تھا جس پر کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر وہ کفّار کی ہجوؤں کا جواب دیتے تھے یا اپنے آقا ومولاؐ کی مدح میں زمزمہ پیرا ہوتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے، حسان کے ہجویہ اشعار کفار کے لیے اندھیرے میں ملنے والے تیروں سے بھی زیادہ کارگر ہیں۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت حسانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے حسان میری طرف سے جواب دے'' ساتھ ہی دعا کی —— ''الٰہی روح القدس کے ذریعہ اس کی مدد کر۔''

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

''اے حسان مشرکین کی ہجو کر جبریلؑ تیرے ساتھ ہے۔''

فی الحقیقت متعدد مواقع پر حضورؐ نے حضرت حسانؓ کے اشعار کی تحسین فرمائی انھیں دعائیں بھی دیں اور شعراءِ مشرکین کی خرافات کا جواب دینے کی تلقین بھی فرمائی۔ قریب قریب تمام غزوات میں اور ہر اہم موقعہ پر حضرت حسانؓ نے اہلِ حق کی حمایت میں اور مشرکین کے خلاف نہایت پر جوش اشعار کہے جنھوں نے حضورؐ کو مسرور کیا اور اعدائے حق کے سینوں میں چھید ڈال دیئے۔ خود فخریہ فرماتے ہیں:

لسانی صارم لا عیب فیه

و بحری لا تکدره الدلاء

''میری زبان قاطع تلوار کی طرح تیز ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور میرے کلام کا سمندر ایسا صاف و شفاف ہے جو ڈول ڈالنے سے گدلا نہیں ہوتا۔'' (مطلب یہ کہ کسی ناقد کی تنقید اس میں عیب نہیں پیدا کر سکتی)

ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ کسی مشرک کی ہجو کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے یہ شعر کہے:

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْهُ ۔۔۔ وَ عِنْدَ اللّٰهِ فِیْ ذَالِکَ الْجَزَاءُ

وَ جِبْرِیْلُ اَمِیْنُ اللّٰهِ فِیْنَا ۔۔۔ وَ رُوْحُ الْقُدُسِ لَیْسَ لَهُ کِفَاءُ

''تو نے محمد (ﷺ) کی ہجو کی تو میں نے آپؐ کی طرف سے اس کا جواب دیا اور اس بات کی جزا اللہ کے ہاں ہے اور ہم میں اللہ کا امین جبریل ہے اور روح القدس ہے جس کا کوئی ہمسر نہیں۔''

حضورؐ نے سنا تو فرمایا:

جزاک اللہ علی اللہ الجَنَّۃ

(ہاں ہاں اللہ کے ہاں تیری جزا جنت ہے)

دراصل یہ شعر اس قصیدہ کے ہیں جو حضرت حسانؓ نے فتح مکہ کے موقع پر کہا۔ شاید کسی اور موقع پر بھی انھوں نے یہ شعر پڑھے ہوں۔

بدر الکبریٰ، اُحد اور احزاب کے غزوات میں انھوں نے نہایت ولولہ انگیز اشعار کہے۔ اسی طرح مشہور دشمنِ اسلام یہودی شاعر کعب بن اشرف کے قتل پر بڑے پرجوش انداز میں اظہارِ مسرت کیا۔

۹ ہجری میں بنوتمیم کا وفد مدینہ منوّرہ آیا اور مسلمانوں سے مفاخرہ کیا۔ ان کے شاعر زبرقان بن بدرؓ نے (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اپنی قوم کی تعریف میں بہت سے فصیح و بلیغ اشعار پڑھے۔

سرورِ عالم ﷺ نے حضرت حسانؓ کو حکم دیا کہ اٹھو اور زبرقان کو جواب دو۔ انھوں نے اٹھ کر اسی ردیف و قافیہ میں فی البدیہہ ایسے شان دار اشعار کہے کہ رئیس بنوتمیم اقرع بن حابسؓ بے اختیار پکار اٹھے:

''محمدؐ — باپ کی قسم تمھارا شاعر ہمارے شاعر سے اچھا ہے۔''

سرورِ عالم ﷺ حضرت حسانؓ پر کس قدر شفیق تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ ہجری) کے بعد حضورؐ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو مقوقس والیِ مصر کے پاس مبلّغِ اسلام بنا کر بھیجا۔ مقوقس نے اسلام تو قبول نہ کیا البتہ حضرت حاطبؓ کی بے حد تعظیم و تکریم کی۔ جب وہ مصر سے چلنے لگے تو مقوقس نے سرورِ عالم ﷺ کے لیے بہت سے تحائف و ہدایا ان کے ساتھ کر دیئے۔ ان میں دو قبطی بہنیں ماریہؓ اور سیرینؓ بھی تھیں۔ یہ دونوں حضرت حاطبؓ کی تبلیغ سے مشرف بہ اسلام ہوگئیں۔ مدینہ منوّرہ پہنچ کر حضرت حاطبؓ نے انھیں حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے حضرت ماریہؓ کو اپنے حرم میں داخل فرما لیا اور حضرت سیرینؓ کو حضرت حسانؓ کی ملکِ یمین میں دے دیا۔ اس طرح حضرت حسانؓ حضورؐ کے ہم زلف بن گئے۔ حضرت سیرینؓ کے بطن سے حضرت حسان کے صاحب زادے عبدالرحمٰنؓ پیدا ہوئے۔ انھوں نے بھی ایک نغز گو شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ عبدالرحمٰنؓ حضورؐ کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔

حضرت حسانؓ سرورِ عالم ﷺ کے بعد بھی طویل عرصہ تک حیات رہے۔ اس دوران میں وہ کبھی کبھی مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر لوگوں کو اپنے اشعار سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں اسی طرح اپنے اشعار پڑھ رہے تھے امیر المؤمنینؓ نے دیکھا تو منع فرمایا کہ مسجد میں اشعار نہ پڑھیے۔ حضرت حسانؓ جلال میں آگئے اور فرمایا: ''میں آپ سے بہتر ہستی کے سامنے مسجد نبوی کے اندر اشعار پڑھا کرتا تھا، اس لیے مجھے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' حضرت عمر فاروقؓ ان کا جواب سُن کر خاموش ہو گئے۔

عہدِ جاہلیت میں آخری غسانی فرماں روا جبلہ بن ایہم، حضرت حسان بن ثابتؓ کا خاص ممدوح اور مربّی تھا۔ حضرت حسانؓ اس کی تعریف میں پرزور قصائد کہا کرتے تھے اور وہ ان پر سیم وزر کی بارش کرتا رہتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں جبلہ بڑی شان وشوکت سے مدینہ منوّرہ آیا اور امیر المؤمنینؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا لیکن نخوتِ شاہی اس کے دماغ سے نہ گئی۔ طوافِ کعبہ کے دوران میں اس کے جبے (یا ازار) پر ایک بدوی کا پاؤں آگیا۔ جبلہ نے غضب ناک ہو کر اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی ناک کا بانسہ پھوٹ گیا۔ بدوی نے بارگاہِ خلافت میں شکایت کی۔ امیر المؤمنینؓ نے جبلہ کو حکم دیا کہ یا تو بدوی کو راضی کرو ورنہ شریعت کے مطابق وہ تمھارے منہ پر ویسا ہی تھپّڑ مار کر اپنا قصاص لے گا۔

جبلہ نے ایک رات کی مہلت مانگی جو امیر المؤمنینؓ نے دے دی۔ جبلہ اسی رات مدینہ منوّرہ سے بھاگ گیا اور مرتد ہو کر ہرقل شاہِ روم کے پاس قسطنطنیہ چلا گیا جہاں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت عمر فاروقؓ نے جثّامہ بن مساحق کنانی کو دعوتِ اسلام کا خط دے کر ہرقل کے پاس قسطنطنیہ بھیجا۔ ہرقل نے اسلام کی دعوت تو قبول نہ کی البتہ قاصد کی بڑی آؤ بھگت کی۔ جثّامہ واپس آنے لگے تو ہرقل نے ان سے کہا کہ اپنے ایک عرب بھائی جبلہ بن ایہم سے ملتے جاؤ۔ جثّامہ جبلہ سے ملنے گئے تو اس کے وہی ٹھاٹھ باٹھ دیکھے جو کسی بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ طلائی برتن، زرّیں کرسیاں، مطلاّ قالین، غلاموں اور لونڈیوں کی پوری فوج۔ جبلہ نے جثّامہ کی بڑی تعظیم وتکریم کی۔ ان کے سامنے کھانا پیش کیا اور پھر چند نازک اندام لونڈیوں کو حکم دیا کہ کوئی نغمہ چھیڑ کر مجھے خوش کر دو۔ انھوں نے سازوں پر نہایت خوش الحانی سے بنو غسان کی مدح میں کہا گیا، ایک قصیدہ پڑھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:

للّٰہ دَرُّ عصابۃ نادمتھم　　　یومًا نجلق فی الزّمان الاوّلِ

''کیا خوب تھے وہ لوگ جن سے ان کے زمانہ میں ایک دن میں قصرِ حلق میں ان کا ہم نشین ہوا تھا۔''

ان اشعار میں جبلہ اور اس کے خاندان کی عظمت اور دریا دلی کی مدح کی گئی تھی۔ یہ اشعار سن کر جبلہ بے اختیار ہنسنے لگا اور جثامہ سے پوچھنے لگا'' جانتے ہو یہ کس کے اشعار ہیں؟'' انھوں نے کہا، ''نہیں'' جبلہ نے کہا یہ حسان بن ثابتؓ کا کلام ہے۔ اس کے بعد اس نے کچھ اور نازنینوں کو حکم دیا کہ اب ذرا مجھے رُلا دو۔ انھوں نے اپنے ساز درست کیے اور چند اشعار گائے جن کا مطلع یہ تھا:

لمن الدار اقضرت بمعان　　　بین علی التبوک فالجمان

''مقامِ معان میں تبوک کے اس طرف اور وادیِ جمان میں یہ کس کا مکان ہے جو اجڑ گیا ہے۔''

یہ اشعار نہ تھے بلکہ فی الحقیقت شاہانِ بنی غسان کے قصرِ شاہی کے اجڑنے کا مرثیہ تھا۔ ان کو سن کر جبلہ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا اور اس نے جثامہ سے پوچھا، جانتے ہو یہ کس کے اشعار ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ بولا، یہ بھی حسان بن ثابتؓ ہی کے شعر ہیں۔ پھر اس نے حضرت حسانؓ کے چند شعر خود پڑھے جن میں ایک شعر یہ تھا:

فیا لیت امی لم تلدنی و لیتنی　　　رجعت الی الامر الّذِی قال لی عمر

''کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور کاش میں وہی بات مان لیتا جو عمرؓ نے مجھ سے کہی تھی۔''

ان اشعار سے معلوم ہوتا تھا کہ جبلہ اپنے مرتد ہونے پر پشیمان ہے، اثنائے گفتگو میں اس نے رسولِ اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی بھی بڑے ادب و احترام سے لیا لیکن قسطنطنیہ میں اس کو جو عیش و آرام میسّر تھا اس کو چھوڑنے پر اس کی طبیعت آمادہ نہ ہوئی اور وہ دوبارہ نعمتِ اسلام کے حصول سے محروم رہا۔ اشعار پڑھ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر جثامہ سے پوچھا'' کیا حسان بن ثابتؓ زندہ ہیں؟''

جثامہ نے کہا'' ہاں وہ زندہ ہیں لیکن بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے ہیں۔''

جبلہ نے اسی وقت پانچ صد دینار اور پانچ قیمتی خلعت منگوا کر ان کے حوالے کیے اور

کہا کہ حسان کو میرا سلام کہنا اور یہ دینار اور خلعت میری طرف سے انھیں پیش کرنا۔

جثامہ نے مدینہ منوّرہ پہنچ کر امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو یہ واقعہ سنایا تو انھوں نے حضرت حسانؓ کو بلا بھیجا۔ وہ آئے اور سلام کے بعد فوراً کہا: ''امیر المؤمنین مجھے یہاں آلِ جفنہ کی روحوں کی خوش بو آرہی ہے۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اسی ذریعہ سے آپ کی مدد کردی۔'' پھر انھیں جبلہ کے بھیجے ہوئے دینار اور خلعت دیئے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جبلہ نے حضرت حسانؓ کے لیے ایک قیمتی خلعت اور چند اعلیٰ درجہ کے اونٹ بھیجے تھے اور جثامہ سے کہا تھا کہ مدینہ پہنچ کر حسانؓ کو زندہ پانا تو یہ خلعت اور اونٹ ان کو میری طرف سے ہدیۃً دے دینا اور اگر وفات پا گئے ہوں تو خلعت ان کے گھر میں دے دینا اور ان اونٹوں کو ان کی قبر پر لے جا کر ذبح کر دینا —— (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت حسان بن ثابتؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۵۴ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ایک سو بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک فرزند (عبد الرحمٰنؓ) چھوڑا۔ حضرت حسانؓ نے چند حدیثیں رسولِ اکرم ﷺ سے روایت کی ہیں۔ ان کے راویانِ حدیث میں حضرت براء بن عازبؓ، حضرت سعید بن مسیّبؒ، حضرت عروہ بن زبیرؒ، حضرت ابوسلمہ بن عبد الرحمٰنؒ اور حضرت خارجہ بن زید بن ثابتؒ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

(۶)

حضرت حسان بن ثابتؓ کا شمار اپنے دَور کے عظیم ترین عرب شعراء میں ہوتا ہے، ان کے بعض ہم عصروں نے تو انھیں عرب کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے لیکن جس چیز نے ان کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھا اور ان کے مرتبہ کو عظمتِ ثریّا سے ہم کنار کر دیا وہ ان کا اُس ذاتِ گرامیؐ کا شاعر ہونا تھا جو اللہ تعالیٰ کے بعد کائناتِ ارضی و سماوی کی بزرگ ترین ہستی ہے۔ فی الحقیقت ان کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ وہ شاعرِ رسول اللہ ﷺ تھے۔

حضورؐ کی عظمت کا نقش حضرت حسانؓ کے دل پر بچپن ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ:

"میں سات آٹھ برس کا لڑکا تھا کہ ایک دن علی الصباح ایک یہودی نے مدینہ کے تمام یہودیوں کو پکار کر جمع کیا اور جب سب آ گئے تو کہا، وہ ستارہ طلوع ہو گیا ہے جس کے طالع میں آج ہی شب کو محمد (ﷺ) کی ولادت ہوگی۔ اس کے بعد جب آپؐ مبعوث ہوئے اور مدینے میں تشریف لائے تو وہ یہودی اگرچہ اس وقت زندہ موجود تھا مگر کم بخت ایمان نہ لایا۔"

حضرت حسانؓ اسی دن سے نبی آخر الزماں ﷺ کی زیارت کے مشتاق تھے۔ حضورؐ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو انھوں نے والہانہ ذوق وشوق سے آپؐ کی زیارت اور بیعت کا شرف حاصل کیا اور پھر تمام شاعرانہ صلاحیتوں کو اپنے آقاؐ کی مدح اور مدافعت کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے اس جوشِ اخلاص سے حضورؐ کی مدح کا حق ادا کیا کہ کسی دوسرے کے لیے ان کی پروازِ خیال کی بلندی تک پہنچنا محال ہو گیا۔ ذرا یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

وَ اَحۡسَنُ مِنکَ لَمۡ تَرَ قَطُّ عَیۡنِیۡ
وَ اَجۡمَلُ مِنکَ لَمۡ تَلِدِ النِّسَاءَ
خُلِقۡتَ مُبَرَّأً مِّنۡ کُلِّ عَیۡبٍ
کَاَنَّکَ قَدۡ خُلِقۡتَ کَمَا تَشَآءَ

(یا رسول اللہ) آپؐ سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے ہرگز نہیں دیکھا اور نہ آپ سے زیادہ خوب رو کسی عورت نے کوئی بچہ جنا۔

آپ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے گویا آپ جیسا پسند فرماتے تھے ویسے ہی پیدا ہوئے۔ (یعنی معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے آپؐ کو آپؐ کی مرضی اور منشا کے عین مطابق پیدا کیا ہے)

حضورؐ پرنور کی مدح میں حضرت حسانؓ کے قصائد یا نعتوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تصنّع اور آورد مطلق نہیں ہے بلکہ ہر شعر ان کے وارداتِ قلبی کا عکاس ہے۔

انھوں نے حضورؐ کی شان میں سینکڑوں اشعار کہے لیکن کسی ایک شعر میں بھی کوئی خلافِ حقیقت بات نہ کہی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نَبِیٌّ اَتَانَا بَعۡدَ یَاسٍ وَ فَتۡرَةٍ   مِنَ الرُّسُلِ وَالۡاَوۡثَانِ فِی الۡاَرۡضِ نُعۡبَدُ

وہ اللہ کے ایک نبی ہیں جو مایوسی اور انبیاء کے گزرنے کے بعد ہمارے پاس تشریف لائے جب دنیا میں بتوں کی پرستش ہونے لگی تھی۔

فَامسیٰ سِرَاجًا مُستَنِیرًا وَ هَادِیًا		یَلُوحُ کَمَا لَاحَ الصَّقِیلُ المُهَنَّدُ

وہ ہمارے لیے روشن چراغ بن گئے اور ہادی، وہ اس طرح درخشاں و تاباں نمودار ہوئے جیسے صیقل کی ہوئی ہندی تلوار چمکتی ہے۔

وَ اَنذَرَنَا نَارًا وَّ بَشَّرَ جَنَّةً		وَ عَلَّمَنَا الإِسلَامَ اللّٰهَ نَحمَدُ

انھوں نے ہم کو آتشِ جہنم سے ڈرایا اور جنت کی خوش خبری سنائی۔ انھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی جس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ہجرتِ نبوی کے سلسلہ میں وہ اہلِ مکہ کی حرماں نصیبی اور اہلِ مدینہ کی خوش بختی پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

لَقَد خَابَ قَومٌ مَالَ عَنهُم نَبِیُّهُم		وَ قُدِّسَ مَن یَسرِیُ اِلَیهِ وَ یَغتَدِی

بے شک وہ قوم نامراد ہوئی جن کے پاس سے ان کا نبی چلا گیا اور ان لوگوں نے عزت پائی جن کے پاس وہ تشریف لائے اور انھوں نے صبح کی (یا صبح و شام سفر طے کر کے پہنچے)۔

تَرَحَّلَ عَن قَومٍ، فَزَالَت عُقُولُهُم		وَ حَلَّ عَلٰی قَومٍ بِنُورٍ مُجَدَّدٍ

جس قوم سے اس کا پیغمبرؐ چلا گیا اس کی عقل بھی جاتی رہی اور جن لوگوں میں تشریف لا کر پیغمبرؐ نے قیام فرمایا ان کو اپنے نور سے روشن کر دیا۔

هَدَاهُم بِهٖ بَعدَ الضَّلَالَةِ رَبُّهُم		وَ اَرشَدَهُم مَن یتبَعُ الحَقَّ یَرشُدٖ

ان (اہلِ مدینہ) کے رب نے ان کو گم راہی کے بعد ہدایت نصیب فرما دی اور ان کو سیدھا راستہ دکھایا۔ جو حق کی پیروی کرتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے۔

ان چند اشعار سے حضرت حسّان بن ثابتؓ کے عشقِ رسولؐ کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں اشعار ان کے دیوان میں جگہ جگہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

(۷)

حضرت حسانؓ نے رحمتِ عالم ﷺ کی مدح کے ساتھ ساتھ کفّار کی ہجو میں بھی دفتر کے دفتر کہہ ڈالے۔ انھوں نے اس جوش خروش سے حضورؐ اور آپؐ کے نام لیواؤں کی مدافعت کی

اور شعراءِ مشرکین کی ہجوؤں کا جواب ایسے مؤثّر اور پُر زور الفاظ میں دیا کہ وہ سر پیٹ کر رہ گئے۔ حضرت حسّانؓ کی ہجوؤں میں اتنی تیزی، گرمی، کاٹ اور فصاحت و بلاغت ہوتی تھی کہ کفّار اس سے پناہ مانگتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضورؐ کے دوسرے دو جاں نثاروں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالک انصاریؓ نے بھی شعراءِ مشرکین کی ہجوؤں کا جواب نہایت مؤثّر پیرائے میں دیا لیکن اس باب میں حضرت حسّانؓ کی مساعیِ جمیلہ سب پر فوقیت لے گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب شعراءِ قریش کی ہجوؤں کا جواب دینے کا ارادہ کیا گیا تو حضور ﷺ نے حضرت کعب بن مالکؓ کو کہلا بھیجا کہ قریش کی ہجو کا جواب دو۔ انھوں نے تعمیلِ ارشاد کی لیکن حضورؐ کو ان کی جوابی ہجو پسند نہ آئی۔ پھر آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو یہ کام کرنے کے لیے فرمایا، انھوں نے بھی ہجو کا جواب دیا مگر حضورؐ کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد حضرت حسّانؓ کو پیغام بھیجا کہ تم یہ کام کرو۔ لوگ ان کے پاس گئے اور حضورؐ کا پیغام پہنچایا تو انھوں نے بے ساختہ کہا:

> ''اب وقت آیا ہے کہ وہ شیر بلایا جائے جو اپنی دُم ہلا رہا ہے۔''
>
> پھر انھوں نے بڑے پُر عزم لہجے میں کہا، ''میں ان کو اپنی زبان سے ٹھیک کر دوں گا (یا ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا)'' —— اور واقعی انھوں نے جو کہا تھا اسے کر دکھایا۔
>
> (مسند احمد جلد ۴ حاشیہ صفحہ ۱۶۷)

حضورؐ نے حضرت حسّانؓ کو شعراءِ مشرکین کے مقابلہ میں اپنی اور اپنے صحابہؓ کی مدافعت پر مامور فرمایا تو انہیں ہدایت فرمائی کہ جواب دینے سے پہلے ابوبکرؓ سے مشورہ کر لیا کرو کیوں کہ وہ انسابِ عرب سے خوب واقف ہیں۔ چناں چہ حضرت حسّانؓ اکثر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں جاتے تھے اور ان سے انساب کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کو بتلاتے تھے کہ ہجو میں فلاں فلاں عورتوں کو چھوڑ دینا وہ رسول اللہ ﷺ کی دادیاں ہیں —— حضرت حسّانؓ اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ وہ اپنے اشعار میں مشرکینِ قریش پر اس طرح چوٹ کرتے تھے کہ سرورِ عالم ﷺ اور قریش سے نسبی تعلق رکھنے والے صحابہٴ کرامؓ پر مطلق کوئی حرف نہ آتا تھا۔

ابولہب حضورؐ کا چچا تھا لیکن اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ حضرت حسّانؓ اس کی ہجو اس طرح کرتے ہیں:

اَبَـا لهـبٍ ابـلـغ بِـاَنَّ مُـحَـمَّـدًا
سَيَعْلُو بِمَا ادى و ان كنت راغما

ابولہب کو پہنچا دو کہ محمد ﷺ فریضۂ نبوّت ادا کرنے کی وجہ سے ضرور بلند مراتب حاصل کریں گے اگر چہ یہ بات تیری خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

و ان كـنـت قـد كـذبـتـهُ و خَذَّلتهُ
وَحيدًا و طاوعت الهجين الضراغما

اگر چہ تو نے آپؐ کو جھٹلا دیا اور (خاندان میں) تنہا تو نے آپؐ کو رسوا کرنے کی کوشش کی اور بزدل کمینوں کی تو نے پیروی کی۔

سَـمَـتْ هَـاشِـمٌ لا كـرَمـات و العُلٰى
وَ غـوُدِرْتَ فى كاب من اللّوم جانبا

بنی ہاشم عزت اور بلند مراتب پر فائز ہوئے لیکن تو ملامت کے رنج وغم میں آلودہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔

حضورؐ کے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث قبول اسلام سے پہلے اسلام کے سخت دشمن تھے۔ انھوں نے حضورؐ کی ہجو کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔ حضرت حسانؓ نے ان کی اس طرح خبر لی:

لـعـمـر كُ اِنّ اِلّـكَ مِـن قريـش
كَـاِلّ السَـقـبِ مـن رال النعـام

تیری جان کی قسم تیرا رشتہ قریش سے ایسا ہی ہے جیسا کہ اونٹ کے بچے کا رشتہ شتر مرغ کے بچے سے ہو۔

فـلا تـفـخـر بـقـوم لست منهم
و لا تك كـالـلـئـام بنی هشـام

تو ایسی قوم پر فخر مت کر جن میں سے تو نہیں ہے تو تو خبیث بنی ہشام جیسا بھی نہیں۔

رؤساءِ قریش میں ابوجہل اسلام کی مخالفت میں سب سے پیش پیش تھا۔ معرکۂ بدر میں وہی کفّار کو مکہ سے کھینچ لایا تھا۔ حضرت حسّانؓ نے اس کی مذمت اس طرح کی:

فقد لعن الرحمٰن جمعًا یقودھم
دعِیٌّ بنی شجع لحرب محمدٍ

بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے گروہ پر لعنت کی جس کو شجاعت کا ایک جھوٹا دعویدار، محمد ﷺ سے لڑنے کے لیے لایا ہے۔

مشومٌ لعینٌ کان قدمًا مبغضا
یبین فیہ اللوم من کان یھتدِ

وہ خبیث اور لعین ہے، ہمیشہ سے اس کو برا سمجھا جاتا ہے جو شخص راہِ حق کی ہدایت پاتا ہے وہ اس کو ملامت کرتا ہے۔

فدَلّاھم فی الغی حتّٰی تھافتوا
و کان مُضلاً اَمرُہٗ غیر مرشدِ

وہ لوگوں کو گم راہی کی طرف راغب کرتا ہے یہاں تک کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ حالاں کہ اس کا حکم گم راہ کرنے والا ہے ہدایت کرنے والا نہیں۔

فانزل ربی للنبی جنودہ
و ایّدہ بالنصر فی کل مشھد

اللہ نے نبی کریم ﷺ کی مدد کے لیے اپنا لشکر بھیجا اور ہر لڑائی میں اللہ نے آپؐ کی نصرت و فتح سے تائید کی۔

عبداللہ بن زبعریٰ قبولِ اسلام سے پہلے قریش کے سربرآوردہ شاعر تھے۔ غزوۂ اُحد میں ایک اتفاقی حادثہ کی بنا پر مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ابنِ زبعریٰ نے اس کو مشرکین کی فتح قرار دیا اور چند فخریہ اشعار کہے جس میں حضرت حسّانؓ کو مخاطب کر کے اہلِ حق کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ حضرت حسّانؓ نے اس کا نہایت مسکت جواب دیا، غزوۂ اُحد کی حقیقی نوعیت واضح کی اور ساتھ ہی غزوۂ بدر میں کفّار کی شرم ناک شکست یاد دلا کر ابنِ زبعریٰ کو غیرت دلائی۔ ذرا ان کے جواب کے تیور دیکھیے:

ذھبت بابن الزبعریٰ وقعۃٌ
کان من الفضل فیھا لو عدل

ابن الزبعریٰ کو اس لڑائی (اُحد) کا حال خوب معلوم ہے اگر وہ انصاف سے کام لے تو فضیلت ہمارے ہی لیے ہے۔

لقد نِلتُم و نلنا منکم
و لذاک الحرب احیانا دول

بے شک تم نے ہم سے اور ہم نے تم سے خوب انتقام لیا۔ کبھی کبھی لڑائی اسی طرح پلٹے کھایا کرتی ہے۔

اذ شددنا شدةً صارقةً
فاجأناکُمُ الیٰ سفح الجبل

جب ہم نے (جنگِ بدر) میں سخت حملہ کیا تو ہم نے تم کو پہاڑی کے نشیب میں دھکیل دیا۔

فسدحنا فی مقامٍ واحدٍ
منکم سبعین غیر النتحل

ہم نے تم میں سے ستر آدمیوں کو ایک ہی جگہ پچھاڑ دیا، جس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں۔

واسرنا منکم اعدادھم
فانصرفتُم مثل اَفلاتِ الحجل

ہم نے تم میں سے بہتوں کو اسیر کر لیا اور تم شکست کھا کر مرغابیوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔

فقلنا کلَّ راسٍ منکم و قتلنا کل حجحاج رفل

ہم نے تم میں سے ہر سردار کو قتل کیا اور ہر ذی رتبہ بہادر کو مارا۔

نحن لا، انتم بنی استاھھا
نحن فی الباس اذا لباس نزل

ہم نہیں، تم دُم دبا کر بھاگنے والے ہو۔ جب معرکۂ کارزار برپا ہوتا ہے ہم میدانِ کارزار میں ہوتے ہیں۔

ابی بن خلف سخت بد باطن مشرک تھا۔ ایک مرتبہ (ہجرتِ نبوی سے پہلے) وہ ایک بوسیدہ ہڈی لے کر حضورؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا، ''تم کہتے ہو کہ اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا، بتاؤ

اس ہڈی کو کون زندہ کرسکتا ہے؟'' حضرت حسّانؓ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابی بن خلف، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابوجہل کی مذمّت اس طرح کرتے ہیں:

لقد ورث الضلالة عن ابیہ

اُبیّ یومَ فارقہ الرَّسُولُ

بے شک ابی اپنے باپ کی گم راہی کا وارث ہوا ہے جب کہ اس نے رسول اللہؐ سے جدائی اختیار کی۔

اجئت محمداً عظماً رمیماً

لِتکذبہ وکانت بہ جھولُ

کیا تو محمد ﷺ کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا ہے تاکہ تو انھیں جھٹلا سکے حالاں کہ تو خود اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے۔

وَ نَبَّ ابنا ربیعة اذ اطاعَا

اَبَا جَھلٍ لِاُمّھا الھبولُ

ربیعہ کے دونوں بیٹے تباہ ہوگئے جب انھوں نے ابوجہل کی پیروی کی۔ ان کی مائیں ان پر رونے والیاں ہیں۔

ایک مرتبہ عرب کے ایک قبیلے کا سردار حارث بن عوف بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کسی صاحب کو میرے ہمراہ کردیں تاکہ وہ میرے قبیلے کو دین کی تعلیم دے، میں اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔ حضورؐ نے ایک انصاری صحابی کو اس کے ہمراہ کردیا۔ ان کو ساتھ لے کر حارث اپنی قوم میں گیا مگر اس کی قوم نے غداری کی اور انصاری صاحبِ رسول کو شہید کر ڈالا۔ چند دن بعد حارث بن عوف اپنے قبیلے کی غداری پر اظہارِ ندامت کے لیے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ کو یہ المناک واقعہ سُن کر بہت دُکھ ہوا لیکن حارث کی لجاجت آمیز معذرت کو دیکھتے ہوئے آپؐ ازراہِ مروّت خاموش رہے۔ اس موقعہ پر حضرت حسّانؓ نے حارث اور اس کے قبیلے کی بدعہدی پر برجستہ دو شعر کہے۔ انھیں سن کر حارث اس قدر پریشان اور خائف ہوا کہ حضورؐ کی خدمت میں گڑگڑا کر عرض کی:

''اے محمد (ﷺ) میں اس شخص (حسّانؓ) کی ہجو سے بچنے کے لیے آپؐ سے پناہ

چاہتا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے کہ اپنی زبان کی تلخی اگر سمندر میں ملا دے تو خدا کی قسم سمندر کا سارا پانی کڑوا ہو جائے۔''

مختصر یہ کہ حضرت حسّانؓ نے اپنے زورِ کلام سے دشمنانِ حق کا ناطقہ بند کر دیا اور اہلِ حق کو اس قدر مسرور کیا کہ خود لسانِ رسالتؐ سے جنت کی بشارت پائی۔

(۸)

مرثیہ گوئی، عربی شاعری کی ایک نمایاں صنف ہے اگرچہ اس صنف میں حضرت خنساءؓ تمام شعرائے عرب پر فوقیت رکھتی ہیں لیکن حضرت حسّانؓ بھی اس صنف میں بندنہیں تھے۔ انھوں نے جو مرثیے کہے ان میں ان کے کلام کی تمام خصوصیات موجود ہیں بالخصوص ان کے وہ مرثیے جو انھوں نے سرورِ عالم ﷺ کے وصال پر کہے، اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہ مرثیے حضرت حسّانؓ کے عشقِ رسولؐ پر دال ہیں —— یہ بیک وقت نعت یا مدحِ رسولؐ بھی ہیں اور مرثیے بھی جو حضرت حسانؓ کے دُکھ اور حضورؐ سے بے پناہ عقیدت ومحبت کے آئینہ دار ہیں۔

وہ اپنے آقا و مولاؐ کے وصال پر کس طرح خون کے آنسو روتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

بـابـی و امـی مـن شهدت وفـاتـهٗ

فـی یـوم الاثـنین النبی المهتدی

میرے ماں باپ اس ذاتِ گرامیؐ پر قربان ہو جائیں جن کے سانحۂ ارتحال کے وقت میں خود موجود تھا جو دوشنبہ کو پیش آیا۔

فـظـلـلـتُ بـعـد وفـاتـه متبلّدًا

متـلـدّدًا یـا لیتـنـی لـم اُولَـدِ

میں آپ کی وفات کے بعد ہوش وحواس کھو بیٹھا، میں پریشان تھا کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

أ اُقیـم بـعـدک بـالـمدینة بَینَهُمْ

یـا لیتـنـی صبـحـت سم الاسود

کیا آپؐ کے بعد میں مدینہ میں لوگوں کے درمیان ٹھہر سکوں گا، کاش مارِ سیاہ مجھے ڈس لیتا اور میں مر جاتا۔

والّٰلہ اسمع ما بقیت بھا لک
الا بکیت علی النبی مُحَمَّد

خدا کی قسم جب میں کسی مرنے والے کی خبر سنوں گا تو نبی اکرم محمد ﷺ کی وفات پر روؤں گا جب تک بھی زندہ رہوں۔

صلّی الِالٰہَ وَ من یَحُفُّ بِعَرشه
والطیّبُون علی المبارکِ احمدٌ

اللہ اور وہ پاک فرشتے جو اس کے عرش کو گھیرے ہوئے ہیں۔ احمدِ مجتبیٰ پر رحمت نازل کریں۔

کنت السواد لناظری نعمی علیک الناظر
من شَاءَ بعدک فلیمت فعلیک کنت جاذر

آپ میری آنکھوں کی پتلی تھے آپ کے بعد دنیا میرے لیے اندھیر ہوگئی۔ اب کوئی مرے یا جئے میں تو صرف اسی برے دن سے ڈرتا تھا۔

و ھل عدلت یوماً رز به ھالک
رزیة یومٍ مات فیه محمدٌ

کیا کسی ہلاک ہونے والے کی مصیبت اس دن کی مصیبت کا مقابلہ کرسکتی ہے جس دن محمد ﷺ نے رحلت فرمائی۔

یَدُلُّ علی الرّحمٰن من یقتدی به
و ینقذ من ھوِل الخزایا و یُرشِد

آپؐ اللہ کی طرف اس شخص کی رہنمائی فرماتے تھے جو آپؐ کی پیروی کرتا تھا اور رسوائیوں سے بچاتے تھے اور راہِ حق کی طرف ہدایت فرماتے تھے۔

فبکّی رسول اللّٰہ یا عین عبرةً
وَلا اعرَفَنَّکَ الدھر دَمعُکَ یجمدُ

اے آنکھ رسول اللہ (ﷺ) پر آنسو بہا۔ میں نہیں سمجھتا کہ زمانہ میں کبھی تیرے آنسو خشک ہوں گے۔

و مالک لا تبکین ذا النعمة التی

علی الناس سنها سائغ یتغمدُ

تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو ان نعمتوں کو یاد کر کے نہیں روتی جو لوگوں کو فیضیاب کیے ہوئے تھیں اور بے شمار تھیں۔

فجودی علیه بالدموع واعولٰی

لفقد الذی لامثله الدهر یوجدٗ

اے آنکھ رسول اللہؐ پر آنسو بہا اور آہ و زاری کر۔ ایک ایسی ذات کے جانے پر جواب زمانہ میں کبھی نہ پائی جائے گی۔

وما فقد الماضون مثل محمدٗ

ولامثله حتی القیامة یفقدُ

گزرے ہوئے لوگوں نے محمد ﷺ جیسی ہستی کبھی گم نہیں کی اور نہ ان جیسی ذاتِ گرامیؐ اب قیامت تک گم کی جائے گی۔

کان الضیاء و کان النور نتبعهٗ بعد الاله و کان السمع والبصرا

فلیتنا یوم داروهٗ بملحده و غیّبوهٗ والقوا فوقه المدرا

لم یتول اللّٰهُ منا بعدهٗ احدا ولم یُعشِ بَعدَه انثیٰ ولا ذکرا

آپؐ سراپا نور اور ہدایت تھے جن کی اللہ کے بعد ہم پیروی کرتے تھے۔ ہمارے کان اور ہماری آنکھیں آپؐ کے اتباع کے لیے وقف تھیں۔

کاش اس روز جب لوگوں نے آپؐ کو قبر میں چھپا دیا، آپؐ کو گم کر دیا اور آپؐ کی قبر پر مٹی ڈالی، اللہ ہم میں سے کسی کو باقی نہ رکھتا اور ہم میں سے کسی مرد اور عورت کو زندہ نہ چھوڑتا۔

مرثیوں کے ان چند اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت حسّانؓ کو سرورِ عالم ﷺ سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی اور آپؐ کے وصال نے ان کو کس قدر ملول و محزون اور دل شکستہ کر دیا تھا۔

(۹)

حضرت حسّانؓ کے مجموعۂ کلام میں پند ونصائح اور حکمت وموعظت پر بھی مبنی بہت سے اشعار موجود ہیں یہ اشعار نہایت پُر اثر اور دانش وحکمت کا خزینہ ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

و الزم مجالسة الكرام و فعلهم
و اذ لا تبعت فابصرن من تتّبع

شریف لوگوں کے ساتھ بیٹھو اٹھو اور ان کے افعال واعمال کی نقل کرو اور جب کسی کی پیروی کرو تو غور کرو کہ کس کا اتّباع کر رہے ہو۔

اعرض عن العوراء حيث سمعتها
واصفح كانك غافل لا تسمع

بری باتوں کے سننے سے پرہیز کیا کرو جیسے تم نے ان کو سنا ہی نہیں

ندع السوال عن الامور و بحثها
و لرب حافر حفرة هو يصرع

ہم کسی بات کی کھود کرید میں نہیں پڑتے کیوں کہ گڑھا کھودنے والا بسا اوقات اسی میں پچھاڑا جاتا ہے۔

اخلاء الرخاء هم كثيرٌ
و لكن فى البلاء هم قليل

خوش حالی کے زمانے کے بہت دوست ہوتے ہیں لیکن تنگ دستی اور مصیبت میں بہت کم رہ جاتے ہیں۔

لا تنبعنَّ غوايةً لصبابةٍ
ان الغوايةَ كل شر تجمع

عشق ومحبت کی گم راہی میں مت پڑو بے شک اس قسم کی گم راہی تمام برائیوں کو جمع کر دیتی ہے۔

وَ کُلُّ اَخٍ یَقُولُ اَنَا وَفِیٌّ　　وَ لٰکن لَیسَ یَفعَلُ مَا یَقُولُ

سِوَیٰ خِلٌ لَهُ حسب و دِینٌ　　فَذَاکَ لِمَا یَقُوْلُ هو الفعول

ہر دوست یہی کہتا ہے کہ میں باوفا ہوں لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے وقت آنے پر اس پر عمل نہیں کرتا سوائے اس دوست کے جو شریف النسل اور دین دار ہو وہ جو کچھ کہے گا وہی کرے گا۔

اسی طرح کے بیسیوں جواہر پارے حضرت حسّانؓ کے دیوان میں موجود ہیں۔ یہ دیوان ہندستان، تیونس، انگلستان اور بعض دوسرے ملکوں میں طبع ہو چکا ہے۔ حضرت حسّان بن ثابتؓ نے اپنے اشعار کی صورت میں ملتِ اسلامیہ کے لیے جو عظیم سرمایہ چھوڑا ہے وہ بلا شبہ ابد تک ہر مسلمان کے دل میں عشقِ رسولؐ کی شمع فروزاں کرتا رہے گا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو مسعود بدری انصاریؓ

①

رسالت کے مدنی عہدِ باسعادت کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک صاحبِ رسول کو اپنے ایک غلام کی کسی حرکت پر غصہ آگیا اور انھوں نے اس کو کوڑے سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اتنے میں انھوں نے اپنے پیچھے دُور سے ایک آواز سنی لیکن وہ اس آواز کو پہچان نہ سکے۔ جب وہ آواز قریب ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ آواز دینے والے رسولِ اکرم ﷺ ہیں۔ آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"یہ غلام اتنا تیرے قابو میں نہیں جتنا تو خدا کے قابو میں ہے (یا یہ کہ جس اللہ نے تم کو اس غلام پر قادر کیا ہے وہ اس کو تم پر بھی قادر کر سکتا ہے)۔"

رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد سن کر ان صاحبِ رسول کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا اور انھوں نے ندامت آمیز لہجے میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ میں آئندہ کبھی کسی غلام کو نہ ماروں گا اور اس غلام کو میں اللہ کے لیے آزاد کرتا ہوں۔"

یہ صاحبِ رسول جن کو خیر الخلائق ﷺ کا اس قدر ادب و احترام ملحوظ تھا کہ حضورؐ کا اشارہ پاتے ہی ساری زندگی کے لیے کسی غلام پر ہاتھ اٹھانے سے توبہ کر لی اور جس غلام پر ہاتھ اٹھایا تھا اس کو فوراً صرف رضائے الٰہی کی خاطر آزاد کر دیا، حضرت ابو مسعود بدری انصاریؓ تھے۔

②

حضرت ابو مسعود بدری انصاریؓ کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ ان کا نام

عقبہ تھا لیکن وہ اپنی کنیت ابو مسعود سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا تعلق خزرج کے خاندان بنو حارث سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بن اسیرہ بن عسیرہ بن عطیہ بن خدارہ بن عوف بن حارث بن خزرج۔

بدری لقب کا سبب بہ قولِ بعض یہ ہے کہ ان کی سکونت بدر میں تھی اور بہ قولِ بعض یہ کہ وہ اصحابِ بدر میں سے تھے۔

حضرت ابو مسعودؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ وہ ہجرتِ نبویؐ سے ایک دو سال قبل شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور پھر ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ جا کر بیعتِ عقبۂ کبیرہ میں شریک ہونے کی عظیم سعادت حاصل کی۔ اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ کی بیعت کرنے والے اصحاب میں وہ سب سے کم عمر تھے۔

ہجرتِ نبویؐ کے بعد غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت ابو مسعودؓ سب سے پہلے غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ امام ابن اسحاقؒ، حافظ ابنِ عبد البرؒ اور بعض دوسرے اصحابِ سِیَر و مغازی کے نزدیک وہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے۔ لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ان کے شریکِ بدر ہونے پر جزم کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے متعدد حدیثوں سے جو صحیح بخاری میں مروی ہیں ان کے شریکِ بدر ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اگر وہ بدر میں شریک نہ ہوتے تو بھی ان کے مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہ پڑتا کیوں کہ اصحابِ عقبہ کا درجہ بدر میں شریک اُن انصاری صحابہ سے افضل ہے جو بیعتِ عقبہ میں شریک نہیں تھے۔

اُحد اور بعد کے تمام غزوات میں حضرت ابو مسعودؓ کے شریک ہونے پر سب اربابِ سِیَر متفق ہیں۔ گویا وہ ان صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں جن کو عہدِ رسالت کے تمام غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

(۳)

رسولِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو مسعودؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت کے اخیر تک مدینہ منوّرہ میں مقیم رہے البتہ اس دوران میں کچھ عرصہ کے لیے بدر کی

سکونت اختیار کرلی تھی۔ خلیفۂ ثالث رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے دَورِ خلافت کے اخیر میں وہ کوفہ چلے گئے، ایک روایت کے مطابق وہاں انھوں نے اپنا مکان بنوالیا تھا۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سریر آرائے خلافت ہوئے اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خونِ عثمانؓ کے قصاص کے سلسلہ میں علَمِ اصلاح بلند کیا تو اس وقت حضرت ابو مسعودؓ کوفہ میں تھے۔ جنگِ جمل سے پہلے حضرت حسنؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کوفہ تشریف لے گئے تاکہ وہاں کے لوگوں کو حضرت علیؓ کی حمایت پر آمادہ کریں۔ اس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کوفہ کے والی تھے۔ حضرت ابو مسعودؓ انھیں ساتھ لے کر حضرت عمار بن یاسرؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا:

''اے ابو الیقظان آپ کے ساتھیوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس پر اگر میں چاہوں تو ردوقدح نہ کرسکوں۔ لیکن آپ اس سے مستثنیٰ ہیں، آپ نے جب سے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی، میں نے اپنے نزدیک کوئی معیوب بات آپ میں نہیں دیکھی البتہ اس امر میں عجلت کرنا۔ (حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف لڑنے کی تیاری کرنا معیوب ہے)''

حضرت عمّار بن یاسرؓ نے جواب دیا:

''اے ابومسعود! اور میں نے بھی آپ میں اور آپ کے ان ساتھی (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) میں جب سے آپ دونوں صاحبوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی کوئی معیوب بات اپنے نزدیک نہیں دیکھی البتہ اس بات میں آپ لوگوں کا دیر لگانا۔ (حضرت علیؓ کی حمایت پر اٹھنے میں دیر لگانا معیوب ہے)''

یہ گفتگو یہیں تک ختم ہوگئی اور حضرت ابومسعودؓ نے حضرت عمّار بن یاسرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ایک ایک حلہ دے کر رخصت کردیا کہ جمعہ کی نماز پڑھیں۔

اس واقعہ کے چند دن بعد جمل کی افسوس ناک لڑائی پیش آئی۔ حضرت ابومسعودؓ اس میں شریک ہوئے یا نہیں؟ کتب سِیَر اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ وہ اس لڑائی میں شریک نہیں ہوئے۔ البتہ جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلاف شدید صورت اختیار کرگیا تو حضرت ابومسعودؓ نے حضرت علیؓ کی پُر زور حمایت کی۔ حضرت علیؓ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کو اپنے اعتماد کا اہل سمجھتے تھے۔ جنگِ صفّین کے لیے کوفہ سے چلنے

لگے تو حضرت ابو مسعودؓ ہی کو کوفہ میں اپنا جانشین بنایا۔ حضرت علیؓ کی غیر حاضری میں انھوں نے امارت کے فرائض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیئے۔ حضرت علیؓ سے ان کی محبت اور روابط کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی صاحب زادی کی شادی سیّدنا حضرت حسینؓ بن علیؓ سے کردی تھی۔ حضرت حسینؓ کے ایک صاحب زادے زید انھی صاحب زادی کے بطن سے تولّد ہوئے تھے۔

جنگِ صفّین کے بعد حضرت ابو مسعودؓ کے دل میں مدینہ منوّرہ کی محبت اور کشش نے جوش مارا اور وہ کوفہ کی سکونت ترک کر کے پھر مدینہ منوّرہ چلے گئے اور باقی زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا البتہ کبھی کبھی کوفہ آجاتے تھے۔

حضرت ابو مسعودؓ نے امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۴۱ھ سے ۵۰ھ کے درمیان کسی وقت وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ امیر معاویہؓ کے اخیر زمانۂ خلافت (۶۰ھ) تک زندہ تھے لیکن قیاسِ غالب یہ ہے کہ انھوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے امارتِ کوفہ کے زمانے میں وفات پائی۔ یہ زمانہ ۴۱ھ سے ۵۰ھ تک کے عرصہ پر محیط ہے۔

حضرت ابو مسعودؓ کی اولاد میں ایک صاحب زادے اور ایک صاحب زادی کا پتہ چلتا ہے۔ صاحب زادی حضرت حسینؓ کو منسوب تھیں۔ اس نسبت سے حضرت حسینؓ، حضرت ابو مسعودؓ کے خویش تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سمدھی۔ صاحب زادے کا نام بشیر تھا وہ اخیر عہدِ رسالت میں یا اس کے کچھ بعد پیدا ہوئے تھے۔

علم وفضل کے اعتبار سے حضرت ابو مسعودؓ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کا شمار راویانِ حدیث صحابہؓ کے طبقۂ سوم میں ہوتا ہے اور ان سے ایک سو دو احادیث مروی ہیں۔ ان کے مشہور رواۃ حدیث کے نام یہ ہیں:

بشیر بن ابو مسعود عقبہؓ (صاحب زادے) عبداللہ بن یزید خطمیؓ، قیس بن ابی حازمؒ، یزیدؒ بن شریک تیمی، علقمہؒ، ابو وائلؒ، عبدالرحمٰن بن یزید نخعیؒ۔

نہایت حق گو تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ والیِ کوفہ نے نمازِ عصر میں دیر کردی۔ حضرت ابو مسعودؓ اس زمانے میں کوفہ میں موجود تھے۔ انھوں نے ان کو برملا ٹوکا اور فرمایا

کہ نماز صحیح وقت پر پڑھنی چاہیے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے اور آپ کے اوقاتِ نماز وہی تھے جو آپؐ کو (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) جبریلؑ نے بتائے تھے۔

حضرت ابو مسعودؓ لوگوں کو بڑے لطف و انبساط کے ساتھ حضورؐ کے ارشادات سنایا کرتے تھے اور ان کو سنتِ نبوی پر عمل کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے دیکھا کہ لوگ جماعت میں مل کر (برابر برابر) کھڑے ہونے کا چنداں خیال نہیں رکھتے تو انھوں نے فرمایا کہ جب تک تم حضورؐ کی سنت کے مطابق مل کر کھڑے ہوتے تھے تم میں اتفاق تھا، اب تم نے اس سنت کی پابندی کرنا چھوڑ دیا ہے تو تمھارے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔

ایک دن لوگوں سے کہا، تمھیں علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح نماز ادا کرتے تھے۔ پھر خود نماز پڑھا کر بتایا کہ یہ طریقہ تھا حضورؐ کے نماز پڑھانے کا۔

لوگوں کو جلد بازی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ مسندِ ابو داؤد میں ہے کہ ایک مرتبہ حلقہ قائم کر کے بیٹھے تھے۔ اسی حالت میں دو آدمیوں نے آ کر کہا کہ اس حلقہ میں کوئی ہمارا فیصلہ کر سکتا ہے؟ حلقہ میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا، ''میں کر سکتا ہوں۔'' اس پر حضرت ابو مسعود انصاریؓ نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر اس کو ماریں اور فرمایا ''چپ، جلدی سے فیصلہ کرنا مکروہ ہے۔''

حضرت ابو مسعود بدریؓ سے مروی چند احادیث بغرضِ افادہ و تبرّک یہاں درج کی جاتی ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے کسی نیک کام کی ترغیب دی اور پھر وہ شخص وہ نیکی کا کام بجا لایا تو اس بتانے والے شخص کو بھی کرنے والے کے برابر ثواب ہوگا۔ (صحیح مسلم)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، فاحشہ عورت کی کمائی اور کاہن کی (کمائی سے خریدی ہوئی یا اس کی پیش کی گئی) شیرینی سے منع فرمایا ہے۔ (صحیحین)

(۳) رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے شکایت کی کہ میں تو فلاں امام کی وجہ سے صبح کی نماز میں شامل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے وعظ فرمایا اور وعظ میں اتنے خفا ہوئے کہ اس سے پہلے آپؐ کبھی اتنے خفا نہیں ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں کو نماز سے نفرت دلانے والے ہیں پس جو شخص لوگوں کی امامت کرے تو ضرور اختصار کرے۔ (مختصر نماز

پڑھائے، طویل قرأت نہ کرے) کیوں کہ اس کے پیچھے بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی، کچھ بیمار بھی ہوتے ہیں اور کام کاج والے بھی۔ (صحیحین)

(۴) ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی چار اور اصحاب سمیت دعوت کی۔ جب آپؐ اس کے گھر تشریف لے گئے تو اتفاقاً ایک اور شخص بھی ہمراہ چلا گیا۔ آپؐ نے گھر والے سے کہا، یہ شخص ہمارے ساتھ آ گیا ہے اگر تم چاہو تو یہ بھی کھانے میں شریک ہو جائے۔ اس نے کہا، بہت اچھا حضورؐ، میری بھی یہی مرضی ہے۔ (صحیح بخاری)

(۵) رسول اللہ ﷺ نماز میں (نماز کے لیے جماعت کھڑے ہونے کے وقت) ہمیں برابر کرنے کے لیے ہمارے مونڈھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے اور فرماتے تھے برابر ہو جاؤ اور مختلف (آگے پیچھے نہ ہو کہ خدا نہ کردہ اس کی سزا میں تمھارے قلوب باہم مختلف ہو جائیں (اور فرماتے تھے کہ) تم میں سے جو دانش منداور سمجھ دار ہیں وہ میرے قریب ہوں۔ ان کے بعد وہ لوگ ہوں جو اس صفت میں ان کے قریب ہوں اور ان کے بعد وہ لوگ جن کا درجہ ان سے قریب ہو۔ (صحیح مسلم)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن اُنیس جُہنّیؓ

(صاحب عَصا)

①

ہجرت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو اسلام نہ صرف خاص مدینہ منوّرہ بلکہ اس کے نواحی علاقوں میں بھی بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ لیکن یہود اور بعض دوسرے سیاہ باطن مشرکین کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔ وہ ذاتِ رسالت مآب ﷺ اور آپؐ کے نام لیواؤں کے خلاف طرح طرح کے منصوبے بنانے لگے، نہ صرف لوگوں کو قبولِ حق سے روکتے بلکہ حضوؐر کے خلاف شرانگیز اور گم راہ کن باتیں بھی پھیلاتے تھے۔ بنو ہذیل کا ایک شخص خالد بن نبیح بھی ایسے ہی حق دشمن لوگوں میں تھا۔ وہ بڑے ڈیل ڈول کا ایک مہیب صورت آدمی تھا اور اس نے حق کی مخالفت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ تک اس کی شرارتوں اور دسیسہ کاریوں کی خبریں تواتر سے پہنچیں تو ایک دن آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کے سامنے فرمایا:

''خالد بن نبیح سے کون نبٹے گا؟

معاً ایک صاحبِ رسول جن کا نورانی چہرہ ان کے عابدِ شب بیدار ہونے کی شہادت دے رہا تھا، اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی:

''یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، یہ کام میرے سپرد کیجیے اور اس شخص کی کوئی نشانی بتا دیجیے۔''

''(اے نبی) آپ اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر دیں اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی رہو اسی طرف منہ پھیرو۔''

تو حضورؐ نے اپنا منہ فوراً کعبہ کی طرف کرلیا۔ صحابہ کرامؓ نے بھی آپؐ کی اقتدا کی۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ بھی موجود تھے۔

غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت عبداللہ بن انیسؓ سب سے پہلے غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور اس کے بعد دوسرے تمام غزوات میں بھی سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ مولانا سعید انصاری مرحوم نے ''سِیَر انصار'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے۔ لیکن جمہور اہلِ سِیَر نے اصحابِ بدر کی جو فہرست دی ہے اس میں حضرت عبداللہ بن انیسؓ کا نام شامل نہیں ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

بڑے بڑے غزوات میں شریک ہونے کے علاوہ حضرت عبداللہ بن انیسؓ نے بعض خاص مہموں میں بھی شرکت کی۔

بنو ہذیل کے دشمنِ اسلام خالد بن نبیح کے قتل کا واقعہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ٦ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی کہ خیبر کے ایک یہودی رئیس ابو رافع سلام بن ابی الحقیق نے غطفان وغیرہ کو آپؐ کے خلاف بھڑکا کر ایک بڑا جتھا اکٹھا کرلیا ہے اور وہ لوگ شورش پر آمادہ ہیں۔ حضورؐ نے ابو رافع کی سرکوبی کے لیے حضرت عبداللہ بن عتیکؓ کی سرکردگی میں پانچ آدمیوں پر مشتمل ایک مہم خیبر روانہ فرمائی۔ اس مہم میں حضرت عبداللہ بن انیسؓ بھی شامل تھے۔ یہ پانچ مجاہدین سربکف ہو کر خیبر گئے اور ابو رافع کو قتل کر کے مظفر و منصور واپس آئے۔ اس مہم میں شامل باقی تین صحابہؓ کے نام یہ ہیں۔

حضرت ابو قتادہؓ، حضرت مسعود بن سنانؓ اور حضرت خزاعی بن الاسودؓ۔

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ کے سر پر ایک ٹیڑھی لکڑی اس زور سے ماری کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ نے زخم سے کپڑا ہٹایا اور اس پر پھونک ماری، میرا زخم ٹھیک ہو گیا اور پھر کبھی میرے سر میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ (طبرانی)

(۳)

حضرت عبداللہ بن انیسؓ بے حد عبادت گزار تھے۔ ایک مرتبہ رمضان المبارک آیا تو وہ اپنی صحرائی بستی میں مقیم تھے وہاں سے روزانہ مسجدِ نبوی میں آنا ممکن نہ تھا اور وہ لیلۃ القدر میں جاگنا چاہتے تھے جس کی کوئی تاریخ معیّن نہ تھی۔ انھوں نے بارگاہِ نبویؐ میں درخواست کی ''یارسول اللہ میرے لیے کوئی ایک تاریخ مقرر فرمادیں تاکہ اس دن میں مسجدِ نبوی میں حاضر ہوکر شب بیداری کرسکوں۔''

حضورؐ نے انھیں رمضان کی تئیسویں رات کو حاضر ہونے کے لیے ارشاد فرمایا:

چوں کہ اس رات کی تعیین حضرت عبداللہؓ کی درخواست پر ہوئی تھی۔ اِس لیے لوگوں نے اس کی نسبت سے ان کا نام ''لیلۃ الجہنی'' رکھ دیا۔ اس کے بعد جس سال یہ رات آتی تو تمام اہلِ مدینہ مسجدِ نبوی میں جمع ہوجاتے اور صبح تک عبادت میں مشغول رہتے۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے چند سال بعد حضرت عبداللہ بن انیسؓ نے حدودِ مصر کے قریب غزہ کے ساحلی شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ مصر اور افریقہ بھی گئے غالباً ان کے یہ سفر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تھے۔

حضرت عبداللہ بن انیسؓ نے ۵۴ ہجری میں (بعہدِ خلافت امیر معاویہؓ) وفات پائی حافظ ابونعیم اصبہانیؒ نے محمد بن کعبؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے وفات سے پہلے وصیت کی کہ وہ عصا جو حضورؐ نے انھیں مرحمت فرمایا تھا، ان کے ساتھ دفن کیا جائے۔ چناں چہ وہ فوت ہوئے تو وہ عصاءِ مبارک کفن میں ان کے پیٹ پر رکھ دیا گیا اور انھیں عصا سمیت دفن کردیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن انیسؓ سے ۲۴ احادیث مروی ہیں جو انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ سے براہِ راست اور حضرت عمر فاروقؓ سے روایت کی ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ، عبداللہ بن ابی امیہؓ، عبدالرحمٰن وعبداللہ پسران حضرت کعب بن مالکؓ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ جلیل القدر صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ ایک مہینہ کی مسافت طے کر کے صرف ایک حدیث سننے کی خاطر ان کے پاس غزہ تشریف لے گئے تھے۔

عقائد و اخلاق کے سلسلے میں ان کی یہ حدیث بہت مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ یہ ہیں:

- اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔
- ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔
- جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا اور عدالت میں جو قسم کھانے والا قسم کھائے اور اس میں مچھر کے پر کے برابر گڑبڑ کرے تو (اللہ کی طرف سے) اس کے دل میں قیامت تک کے لیے ایک داغ بنا دیا جاتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت رفاعہ بن رافع انصاریؓ

(۱)

سیّدنا حضرت ابو معاذ رفاعہؓ اس عظیم المرتبت باپ کے فرزند تھے جس کو نہ صرف انصار کے سابقون الاوّلون کی مقدّس جماعت کا ایک ممتاز رکن ہونے بلکہ راہِ حق میں اپنی جان قربان کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ہماری مراد حضرت رافع بن مالک زرقیؓ سے ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ۱۱ نبوّت میں مکہ جا کر سرورِ عالم ﷺ کی زیارت اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ پھر ۱۲ نبوت میں اپنے گیارہ رفقاء کے ساتھ دوبارہ مکہ گئے اور حضورؐ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کی اہلیہ اُمِّ مالکؓ اور فرزندِ سعید حضرت رفاعہؓ بھی سعادت اندوزِ ایمان ہوگئے۔ ۱۳ نبوت کے موسمِ حج میں حضرت رافعؓ مدینہ کے ۷۴ اہلِ ایمان کے ساتھ تیسری مرتبہ مکہ آئے اور ''لیلۃ العقبہ'' میں حضورؐ کی زیارت اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ یہ بیعت تاریخ میں ''بیعت لیلۃ العقبہ'' ''بیعت عقبۂ کبیرہ'' یا ''بیعت عقبۂ ثانی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس بیعت کو اس لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا کیوں کہ اسی موقع پر انصار نے حضورؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی اور اس پیمانِ وفا کے ساتھ آپؐ کی بیعت کی کہ ہم اپنی جانوں مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپ کی حفاظت اور مدد کریں گے۔

بعض اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت رافعؓ ۱۳ نبوت میں اپنے فرزندِ سعید حضرت رفاعہؓ کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے ـــــ اس طرح نوجوان رفاعہؓ کو بھی بیعت عقبۂ کبیرہ میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوگیا۔ ان کا تعلق خزرج کی شاخ بنو زریق سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

رفاعہ بن رافع بن مالک بن عجلان بن عمرو بن عامر بن زریق بن عبد حارثہ بن غضب بن جشم بن خزرج۔

حضرت رفاعہؓ کی والدہ حضرت امِّ مالک بنتِ ابی، بنو حبلیؓ، خزرج کے رئیس عبداللہ بن اُبی کی اخیافی بہن تھیں۔ خدا کی قدرت ابنِ ابی تو منافقوں کا سردار بنا اور اس کی بہن، بہنوئی اور بھانجے کو رحمتِ عالم ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

(۲)

ہجرت نبوی کے بعد غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت رفاعہؓ نے سب سے پہلے کفر وحق کے معرکۂ اوّل غزوۂ بدر الکبریٰ میں دادِ شجاعت دی اور بدری صحابی ہونے کا لازوال شرف حاصل کیا۔ اس غزوے میں انھوں نے ایک مشرک وہب بن عمیر جمحی کو گرفتار کیا۔

بدر کے بعد حضرت رفاعہؓ اپنے پدرِ گرامی حضرت رافع بن مالکؓ کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے۔ دونوں باپ بیٹا کفّار کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑے۔ حضرت رافعؓ نے لڑائی میں شہادت پائی اور یوں حضرت رفاعہؓ اپنے جلیل القدر والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔

غزوۂ اُحد کے بعد حضرت رفاعہؓ نے غزوۂ احزاب میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ ذی قعدہ ۶ ہجری میں حضرت رفاعہؓ نے بیعتِ رضوان کی عظیم سعادت حاصل کی اور یوں ''اصحاب الشجرہ'' میں شامل ہو کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی سند سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے غزوۂ خیبر، فتح مکہ اور دوسرے غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد شیخینؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت رفاعہؓ کے مشاغل اور مصروفیات کی تفصیل کتبِ سِیَر میں نہیں ملتی، البتہ خلافتِ مرتضوی میں وہ امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے ایک پُر جوش حامی کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قصاصِ عثمان یا اصلاح کا عَلَم بلند کیا اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ہمراہ بصرہ تشریف لے گئیں تو حضرت علیؓ بہت رنجیدہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے جاں نثاروں کی ایک جماعت کے سامنے فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ کی رحلت ہوئی تو ہم اہلِ بیت ہونے کی بنا پر حضورؐ کی خلافت کا سب سے زیادہ اپنے کو مستحق سمجھتے تھے لیکن جب لوگوں نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تو ہم نے صبر کیا اور فتنہ و فساد سے اجتناب کیا۔ اس کا نتیجہ بہت اچھا رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کیا۔ ان کی شہادت کے بعد عامۃ الناس نے مجھ سے اپنی رضا و رغبت کے ساتھ بیعت کی۔ میں نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ بیعت کرنے والوں میں طلحہؓ اور زبیرؓ بھی شامل تھے لیکن ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا کہ وہ میرے خلاف لڑنے پر تیار ہو گئے ہیں اور لشکر لے کر بصرہ پہنچ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ و فساد کو دیکھ رہا ہے۔''

حضرت رفاعہؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انھوں نے امیر المؤمنینؓ کی تقریر سن کر عرض کی:

''امیر المؤمنین جب حضورؐ نے انتقال فرمایا تو ہم انصار راہِ حق میں اپنی قربانیوں کی بنا پر خلافت کا سب سے زیادہ مستحق اپنے کو سمجھتے تھے لیکن مہاجرین قریش نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے قریبی تعلقات، سبقتِ اسلام اور ہجرت جیسے فضائل بیان کر کے اپنا حق خلافت ثابت کیا ہم نے یہ سمجھ کر کہ کتاب و سنت قائم ہیں اور حق پر عمل ہو رہا ہے، قریش کا حقِ خلافت تسلیم کر لیا اور ہمیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ اب آپ کی بیعت کے بعد کچھ لوگ آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ واللہ ہم آپ کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ آپ جو بھی حکم دیں گے ہم دل و جان سے اس کی تعمیل کریں گے۔''

حضرت رفاعہؓ کی تقریر کے بعد کچھ اور بزرگوں نے بھی اسی قسم کی پُر جوش تقریریں کیں اور حضرت علیؓ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ بصرہ روانہ ہو گئے۔ وہاں جنگِ جمل کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ اس میں حضرت رفاعہؓ حضرت علیؓ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جنگِ صفّین میں بھی حضرت علیؓ کا بھرپور ساتھ دیا۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے ۴۰ ہجری میں شہادت پائی۔ حضرت رفاعہؓ بھی اس کے بعد زیادہ عرصہ نہ جئے۔ انھوں نے باختلافِ روایت ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں وفات پائی۔ اولاد میں صرف دو لڑکوں معاذؒ اور عبیدؒ کے نام معلوم ہیں۔

حضرت رفاعہؓ سے متعدد حدیثیں مروی ہیں ان میں سے تین میں امام بخاریؒ منفرد ہیں۔ ان کے راویوں میں معاذؒ اور عبیدؒ (بیٹوں) اور یحیٰ بن خالد (بھتیجے) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن جبر انصاریؓ

(۱)

۱۲ بعدِ بعثت میں حضرت مصعب بن عمیرؓ اسلام کے مبلّغِ اوّل کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لائے اور اپنی تبلیغی مساعی کا آغاز کیا تو سید الاوس حضرت سعد بن معاذؓ نے انھیں اپنے محلوں میں آنے سے روکا لیکن جب حضرت مصعبؓ نے انھیں نہایت احسن انداز میں اسلام کی دعوت دی تو وہ ان کے حسنِ تکلّم اور حلم وتحمل سے اتنے متاثّر ہوئے کہ فوراً شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوگئے۔ ان کے اثر ورسوخ کی بہ دولت (ان کا اپنا) قبیلہ بنو عبدالاشہل تو اسی دن مسلمان ہوگیا اور اوس کے دوسرے گھرانوں میں بھی اسلام نہایت سرعت سے پھیلنے لگا۔ اسی زمانے میں اوس کی شاخ بنو حارثہ کے ایک سعید الفطرت آدمی عبدالعزیٰ نے بھی قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو ایک دن عبدالعزیٰ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یا رسول اللہ مجھے آپ کے یہاں رونق افروز ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نعمتِ اسلام سے سرفراز کیا۔''

حضورؐ نے مسرت کا اظہار فرمایا اور ان سے پوچھا، ''تمھارا نام کیا ہے؟''

انھوں نے کہا ''عبدالعزیٰ''

ارشاد ہوا ''نہیں آج سے تم عبدالرحمٰن ہو۔''

بنو حارثہ کے یہ چشم وچراغ جن کو بارگاہِ رسالت سے ''عبدالرحمٰن'' نام عطا ہوا تاریخ میں اپنی کنیت ابوعبس سے مشہور ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوعبس عبدالرحمٰن بن جبر بن عمرو بن زید بن جشم بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

۱۳ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں مدینہ کے پچھتر اہلِ ایمان مکہ گئے اور لیلۃ العقبہ میں حضورؐ کی زیارت اور بیعت کی پھر آپؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ حضرت ابوعبسؓ تو بعض وجوہ کی بنا پر بیعت لیلۃ العقبہ میں شریک نہ ہو سکے البتہ ان کے ایک دوست حضرت ابو بردہ بن نیارؓ کو اصحابِ عقبہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوگئی۔ حضرت ابو بردہؓ مکہ سے واپس آئے اور حضرت ابوعبسؓ کو مکہ میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا تو وہ جوشِ ایمان سے بے قرار ہوگئے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابوعبسؓ نے حضرت ابو بردہؓ کو ساتھ لیا اور اپنے قبیلے کے بت توڑ ڈالے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد سرورِ عالم ﷺ مدینے تشریف لائے تو اپنے دوسرے انصاری بھائیوں کے ساتھ حضرت ابوعبسؓ نے بھی حضورؐ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور مہاجرین (صحابہؓ) کی نہایت خوش دلی سے میزبانی کی۔ ہجرت کو پانچ ماہ گزرے تو حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان دینی بھائی چارہ (عقدِ مواخاۃ) قائم کرادیا۔ حضرت ابوعبسؓ کی مواخات جلیل القدر مہاجر صحابی حضرت خنیس بن حذافہؓ سے قائم ہوئی۔

(۲)

حضرت ابوعبسؓ انصار کے ان چند گنے چنے افراد میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں بھی عربی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ علّامہ ابنِ اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں ان کے بارے میں لکھا ہے: — ''وہ اسلام سے پہلے عربی لکھ لیتے تھے۔''

ہجرتِ نبوی کے بعد حضرت ابوعبسؓ اکثر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور فیضانِ نبوی سے مقدور بھر بہرہ یاب ہوتے۔ اس طرح انھوں نے علومِ قرآن و حدیث میں اچھی خاصی دست گاہ حاصل کرلی۔

غزوات کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے انھوں نے غزوۂ بدر الکبریٰ میں دادِ شجاعت دی اور بدری صحابی ہونے کا عظیم شرف حاصل کیا۔ اس وقت وہ ۴۸ برس کے پیٹے میں تھے۔

سرورِ عالم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہودِ مدینہ سے بقائے باہمی کی

بنیاد پر معاہدۂ صلح و آشتی کرلیا تھا۔ یہود نے اس معاہدے پر، جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے، بہ ظاہر تو دستخط کردیئے لیکن درپردہ وہ اہلِ حق کے خلاف ریشہ دوانیوں میں سرگرم رہے۔ ان سب میں پیش پیش ان کا ایک رئیس کعب بن اشرف تھا۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرّر اور قادرالکلام شاعر تھا اور مسلمانوں کو مطلق خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اپنے خبثِ باطن کا اظہار وہ اشعار کے ذریعے حضورؐ کے خلاف مسلسل زہر اگل کر کرتا رہتا۔

حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ اس بدبخت نے ایک موقع پر حضورؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بھی بنایا لیکن ناکام رہا۔ غزوۂ بدر میں مشرکینِ قریش کو شکست ہوئی تو کعب نے مقتولینِ قریش کے پُردرد مرثیے کہے پھر قریش سے تعزیت کے لیے مکے گیا اور وہاں کئی دن مقیم رہ کر ان کو اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے پر ابھارتا رہا۔ مدینہ واپس آیا تو پہلے سے دوچند جوش کے ساتھ اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگا اور حضورؐ کی ہجو میں آئے دن تازہ سے تازہ اشعار کہنے لگا۔ اس کی یہ حرکتیں نہ صرف میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کے مترادف تھیں بلکہ صریحاً غدّاری کی تعریف میں آتی تھیں۔ حضورؐ کافی عرصہ اس کی شرارتوں کو نظر انداز کرتے رہے لیکن جب یہ مدینہ منوّرہ کی نوزائیدہ شہری مملکت کے لیے خطرہ بن گئیں تو ایک دن آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کے سامنے کعب بن اشرف کی حرکتوں پر سخت کرب و اضطراب کا اظہار فرمایا اور صحابہ کو اس خطرے کا تدارک کرنے کی ترغیب دی۔ حضورؐ کا ارشاد سن کر انصار کے پانچ سرفروشوں نے تہیّہ کرلیا کہ وہ اس فتنے کا استیصال کرکے رہیں گے لیکن کعب بن اشرف سے نبٹنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کا مسکن یا محل ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس نے اپنی حفاظت کے لیے بہت سے مسلح جوان ملازم رکھے ہوئے تھے تاہم انصاری جانبازوں نے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خاطر اپنی جانوں کو داؤ پر لگادیا اور ایک رات کو کعب کے قلعے میں گھس کر اس کو کیفرِ کردار تک پہنچادیا۔ اسلام کے اس بدترین دشمن کو قتل کرنے والے جانبازوں میں ایک حضرت ابوعبس عبدالرحمٰنؓ تھے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت ابوعبسؓ نے غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب اور عہدِ رسالت کے بیشتر دوسرے غزوات میں دادِ شجاعت دی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اواخرِ عہدِ رسالت میں حضرت ابوعبسؓ نابینا ہوگئے۔ اسی حالت میں ایک دن حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انھیں ایک عصا مرحمت فرمایا کہ اس کو لے کر چلنے میں روشنی معلوم ہوگی۔

حضرت ابو عبس عبد الرحمٰنؓ ۳۴ ہجری میں (بہ عہدِ خلافت حضرت عثمانؓ) سخت علیل ہو گئے۔ امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کو ان کی علالت کا علم ہوا تو وہ عیادت کے لیے تشریف لائے۔ یہ علالت جان لیوا ثابت ہوئی اور اسلام کے اس فرزندِ جلیل نے تقریباً اسّی برس کی عمر میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ امیر المؤمنین حضرت عثمان ذوالنّورینؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور گورستانِ بقیع میں سپردِ خاک کیا۔ حضرت قتادہ بن نعمانؓ، حضرت ابو بردہ بن نیارؓ، حضرت محمد بن مسلمہؓ اور حضرت سلمہ بن سلامہؓ جیسے اکابر صحابہ نے لحد میں اتارا۔

حضرت ابو عبسؓ نے اپنے پیچھے دو لڑکے محمدؒ اور زیدؒ چھوڑے۔

حضرت ابو عبسؓ حدیث بیان کرنے میں بہت محتاط تھے۔ کتبِ حدیث میں ان سے مروی صرف پانچ حدیثیں ملتی ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو عبسؓ بڑھاپے میں اپنے بالوں کو مہندی لگایا کرتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت زید بن ثابت انصاریؓ

①

سرورِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو اس قدیم شہر پر بہارِ تازہ آگئی اور اس کی گلی گلی شمیمِ رسالت کی عطر بیزیوں سے مہکنے لگی۔ ایک دن چند انصاری صحابہؓ بارہ سال کی عمر کے ایک نونہال کو حضوؐر کی خدمتِ اقدس میں لائے اور عرض کیا:

''یا رسول اللہ یہ نوعمر صاحب زادہ بنو نجّار کا چشم و چراغ ہے، اس کو قرآنِ کریم سے اس قدر شغف ہے کہ اب تک سترہ سورتیں حفظ کر چکا ہے۔''

رحمتِ عالم ﷺ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بنو نجّار کے اس فرزندِ سعید سے قرآن پڑھنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ انھوں نے تعمیلِ ارشاد میں فوراً سترہ سورتیں پڑھ ڈالیں۔ حضوؐر کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ آپؐ نے سعادت مند صاحب زادے کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور انھیں دُعائے خیر سے نوازا۔ قرآنِ کریم سے والہانہ شغف رکھنے والے یہ مدنی نونہال جو حاملِ قرآن ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری سے قبل ہی سترہ سورتوں کے حافظ بن چکے تھے، حضرت زید بن ثابت انصاریؓ تھے۔

②

سیّدنا حضرت زید بن ثابت انصاریؓ اُن فضلاءِ صحابہ میں سے ہیں جنھیں اپنی دینی اور علمی خدمات کی بنا پر اساطینِ امت میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی کنیت ابو سعید بھی تھی اور ابو خارجہ بھی۔ بعض نے ایک تیسری کنیت ابو عبد الرحمٰن بھی بیان کی ہے۔ حبر الامت (اُمت کے بہت

بڑے عالم) کاتب الوحی، مقری (قرآنِ حکیم کی قرأت کرنے والے یا قرآنی قرأت پرعبور رکھنے والے) اور فرضی (فرائض میں مہارت رکھنے والے) اُن کے القاب تھے۔ ان کا تعلق خزرج کی معزّز ترین شاخ بنونجّار سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

زیدؓ بن ثابت بن ضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد بن عوف بن غنم بن مالک بن نجّار۔

حضرت زیدؓ کے والد ثابت بن ضحاک ہجرتِ نبوی سے پانچ سال قبل جنگِ بعاث میں مارے گئے تھے۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر صرف چھ برس کی تھی۔ انھوں نے اپنی والدہ نوار بنتِ مالک کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ ہجرت سے ایک سال پہلے (۱۲ بعدِ بعثت) میں اسلام کے مبلّغِ اوّل حضرت مصعب بن عمیرؓ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو ان کی تبلیغی مساعی سے اوس اور خزرج کے سبھی گھرانوں میں اسلام کا چرچا پھیل گیا۔ اس زمانہ میں مدینہ کی جن سعید روحوں نے قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا ان میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی شامل تھے اس وقت اُن کی عمر کل گیارہ برس کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نہایت پاکیزہ فطرت سے نوازا تھا، سعادت اندوزِ اسلام ہوتے ہی نہایت ذوق وشوق سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے لگے یہاں تک کہ مدینہ میں سرورِ عالم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ہی سترہ سورتیں حفظ کرلیں۔ قرآنِ حکیم سے اپنے شغف کی بنا پر وہ انصار میں نہایت عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ حضورؐ مدینے منوّرہ تشریف لائے تو آپؐ حضرت زیدؓ کے حفظِ قرآن کا حال سن کر بہت مسرور ہوئے۔ ہجرتِ نبوی کے بعد حضرت زیدؓ اپنا بیشتر وقت فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے میں گزارتے تھے چوں کہ نہایت ذہین وفطین تھے اس لیے بہت جلد علمی مرتبہ کے لحاظ سے بارگاہِ رسالت کے خاص مقرّبین میں شمار ہونے لگے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضرت زیدؓ نہ صرف عربی میں لکھ پڑھ لیتے تھے بلکہ انھوں نے حضورؐ کے ایما پر عبرانی اور سریانی زبانیں بھی سیکھیں اور بہت تھوڑے عرصے میں ان میں لکھنے پڑھنے کی مشق بہم پہنچالی۔ بعد میں اس کو اور ترقی دی اور توراۃ وانجیل کے عالم بن گئے۔ علّامہ مسعودیؒ نے ''کتاب التنبیہ والاشراف'' میں لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ حبشی، قبطی، رومی اور فارسی زبانیں بھی جانتے تھے جن کو انھوں نے مدینہ میں ان زبانوں کے جاننے والوں سے سیکھا تھا۔

حضرت زیدؓ کا خط نہایت عمدہ تھا اور وہ ایک اچھے نقشہ نگار بھی تھے۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ انھیں حساب میں بھی بڑی دسترس تھی اور وہ حساب کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو آناً فاناً حل کر دیا کرتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ، حضرت زید بن ثابتؓ کی صلاحیتوں کی بہت قدر فرماتے تھے۔ آپؐ نے انھیں کتابت کے عہدہ پر سرفراز فرمایا جس پر وہ حضورؐ کے وصال تک فائز رہے۔ وہ نہ صرف وحی کی کتابت کرتے تھے بلکہ سلاطین اور والیانِ ملک کے جو خطوط آتے تھے، حضورؐ کی طرف سے ان کے جواب بھی لکھتے تھے۔

مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حضرت زیدؓ کو بارگاہِ نبوی میں اس قدر تقرّب حاصل تھا کہ وہ بعض اوقات حضورؐ کے پہلو میں بیٹھ جاتے تھے اور آپؐ ازراہِ شفقت ان کی ران پر اپنا زانوئے مبارک رکھ دیتے تھے۔ ایک دن اسی حالت میں حضورؐ پر وحی نازل ہوئی، حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ ''اس وقت حضورؐ کا زانوئے اقدس مجھ کو اس قدر بھاری معلوم ہوا کہ میں سمجھا اب میری ران چور چور ہو جائے گی۔'' لیکن ادبِ نبوی کا اتنا پاس تھا کہ اُف تک نہ کی اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ بیٹھے رہے۔

سرورِ عالم ﷺ نے کتابتِ وحی کی خدمت متعدد دوسرے صحابہؓ سے بھی لی۔ اسی طرح مکتوب نویسی کا کام بھی کچھ دوسرے صحابہ سے لیا لیکن ان سب میں حضرت زید بن ثابتؓ کا نامِ نامی اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ مسلسل وصالِ نبوی تک یہ کام انجام دیتے رہے۔

مسندِ احمدؒ میں ہے کہ زید بن ثابتؓ قلم دوات، چوڑی ہڈیاں یا پتلے پتلے پتھر وغیرہ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ جب وحی نازل ہوتی تو حضورؐ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ سنتے اسے لکھتے جاتے تھے۔ بعض اوقات حضورؐ ان کو کتابتِ وحی کے بارے میں کوئی خاص ہدایت دیتے تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے انھیں ایک آیت میں ''غیر اولی الضرر'' کے الفاظ بڑھانے کا حکم دیا تو انھوں نے یہ الفاظ ہڈی کے شگاف کے پاس لکھے جو ایک جگہ سے شق تھی۔

دی اور انھیں دُعائے خیر سے نوازا۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ نے چند دوسرے انصار کے ساتھ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی۔ صدیق اکبرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت زیدؓ کو عہدۂ کتابت پر بحال رکھا اور اپنی مجلسِ شوریٰ کا رکن مقرر فرمایا۔ فتنۂ ارتداد کے آغاز میں حضرت زیدؓ نے مدینہ منوّرہ کے دفاع میں خلیفۃ الرسول کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد وہ مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کی خونریز لڑائی میں شریک ہوئے۔ معرکۂ کارزار میں انھیں ایک تیر لگا لیکن اللہ نے جان بچا دی۔ اس لڑائی میں بہت سے حفّاظِ قرآن شہید ہو گئے اس پر خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں قرآنِ پاک کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔ چناں چہ حضرت عمر فاروقؓ کے توجہ دلانے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ کام تفویض کیا کہ وہ لوگوں سے قرآنِ حکیم کے تمام لکھے ہوئے اجزا جمع کر کے قرآن کو ایک مصحف کی صورت میں مدوّن کریں۔ حضرت زیدؓ کو پہلے تو یہ ذمہ داری اٹھانے میں تامّل ہوا لیکن پھر وہ صدیق اکبرؓ کے ترغیب دلانے پر یہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ خلیفۃ الرسول نے اس کارِ عظیم میں انھیں مدد دینے کے لیے پچھتر اصحاب رسول کی ایک جماعت مقرر کر دی۔

اگرچہ حضرت زیدؓ نے قرآنِ حکیم کے تمام اجزا عہدِ رسالت ہی میں جمع کر لیے تھے تاہم جو اجزا ابھی لوگوں کے پاس موجود تھے، انھوں نے یہ تمام بھی ان سے لے کر جمع کر لیے اور پورے قرآن پاک کو یکجا ایک ہی جلد میں لکھ لیا۔ اگر کسی آیت کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا تو دو صحابہؓ کی گواہی کے مطابق اس کو قلم بند کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ قرآنِ حکیم کا یہ نسخہ پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کے پاس رہا۔ ان کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کی تحویل میں آ گیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں مختلف علاقوں کے لوگوں میں اختلافِ قرأت پیدا ہوا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ سے یہ مصحف مانگ بھیجا اور اس کی پانچ نقلیں چار صحابہؓ سے کرائیں۔ پھر ان کو مختلف اسلامی صوبوں میں بھجوا دیا۔ صحیح بخاری کے مطابق جن بزرگوں نے نقل کا کام کیا، حضرت زید بن ثابتؓ بھی ان میں شامل تھے۔

⑤

حضرت عمر فاروقؓ کا عہدِ خلافت آیا تو انھوں نے حضرت زیدؓ کو نہ صرف عہدۂ کتابت اور مجلس شوریٰ کی رکنیت پر بحال رکھا بلکہ منصبِ قضا کی تاسیس کے بعد ان کو مدینہ منوّرہ کا قاضی بھی مقرّر کیا اور ان کی تنخواہ مقرر کی۔ چوں کہ اس وقت کتابت کا کام بہت بڑھ گیا تھا اس لیے حضرت معیقیب دوسیؓ کو ان کا مددگار مقرر فرمایا۔ شروع شروع میں قاضی کے لیے کوئی الگ عمارت تعمیر نہیں کی گئی اس لیے حضرت زیدؓ قاضی کے فرائض اپنے گھر پر ہی انجام دیتے تھے۔ خاص مدینہ شہر اور نواحی علاقوں کے مقدمات ان کے پاس آتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعبؓ اور امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوگئی۔ حضرت اُبی بن کعبؓ نے امیر المؤمنینؓ کے خلاف حضرت زیدؓ کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ فریقین حضرت زیدؓ کی عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت زیدؓ نے ازراہِ تعظیم امیر المؤمنینؓ کے لیے اپنی نشست خالی کر دی۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنے حکام اور عمّال پر کڑی نظر رکھتے تھے انھوں نے حضرت زیدؓ کے اس فعل کو ناپسند کیا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا، یہ انصاف سے بعید ہے مجھے اپنے فریق کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ چناں چہ وہ حضرت ابیؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ مدعا علیہ تھے اور ان کو فریق کے دعویٰ سے انکار تھا اس لیے شرعاً ان پر واجب تھا کہ قسم اٹھائیں۔ حضرت زیدؓ نے خلافت کے احترام کی بنا پر حضرت اُبیؓ سے کہا کہ آپ امیر المؤمنینؓ کو قسم سے معاف کر دیں لیکن حضرت عمرؓ نے یہ رعایت قبول نہ کی اور حضرت زیدؓ کو ہدایت کی کہ آپ عدالت میں خلیفہ اور ایک عام مسلمان کو ایک ہی سطح پر رکھا کریں۔ اس واقعہ کے بعد حضرت زیدؓ نے ہمیشہ حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایات کے مطابق عمل کیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کو حضرت زیدؓ پر بے حد اعتماد تھا۔ وہ ۱۶ھ اور ۱۷ھ میں حج کے لیے مکہ معظّمہ گئے تو مدینہ منورہ میں حضرت زیدؓ کو اپنا جانشین بنایا۔ شام تشریف لے گئے تو اس موقع پر بھی انھیں اپنا جانشین مقرر کر کے مدینہ منوّرہ میں چھوڑ گئے۔ شام سے انھیں خط لکھا تو خلافِ معمول

اپنے نام سے پہلے ان کا نام لکھا یعنی الی زید بن ثابت من عمر بن خطّاب ۔امیر المؤمنین کی غیر حاضری میں حضرت زیدؓ خلافت کی ذمہ داریوں کو نہایت احسن طریقے سے انجام دیتے۔ امیر المؤمنین واپس تشریف لاتے تو ان کی کارکردگی کی تحسین کرتے اور حسنِ خدمت کے انعام میں کچھ جاگیر عطا کرتے۔

حضرت عمر فاروقؓ بیت المقدس تشریف لے گئے تو اپنے ساتھ چند مہاجرین اور انصار کو بھی لے گئے۔ایک روایت میں ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ بھی اس سفر میں امیر المؤمنین کے ہمراہ تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے جب دیوان قائم کیے اور لوگوں کے اُن کے درجہ کے مطابق وظائف مقرر کیے تو وظیفہ کی مقدار اور اس کے مستحق تمام لوگوں کی فہرست حضرت زیدؓ ہی نے تیار کی۔ امام ابو یوسفؒ نے ''کتاب الخراج'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے انصار کے وظائف کی تقسیم کا کام بہ طورِ خاص حضرت زیدؓ کے سپرد کیا۔انھوں نے اس کا آغاز عوالی (قُبا وغیرہ) سے کیا پھر بنوعبد الاشہل کو وظائف دیئے۔ان کے بعد قبیلہ اوس کی دوسری شاخوں کو، پھر قبائلِ خزرج کو اور سب سے اخیر میں اپنا حصہ لگایا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد ۲۴ ہجری میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے بھی حضرت زیدؓ کا اعزاز و اکرام بحال رکھا۔ ۳۱ ہجری میں انھوں نے حضرت زیدؓ کو مدینہ منوّرہ کے مرکزی بیت المال کا افسر مقرّر کیا۔ وہ اس منصب پر کئی سال تک فائز رہے۔امیر المؤمنین حج کے لیے مکہ جاتے تو کاروبارِ خلافت حضرت زیدؓ کے سپرد کر جاتے تھے۔حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے خلاف فتنہ وفساد کی آگ مشتعل ہوئی تو حضرت زیدؓ نے مقدور بھر امیر المؤمنینؓ کا ساتھ دیا اور انصار کو ان کی حمایت پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر چکے تھے کہ ان کی کوئی کوشش کام یاب نہ ہوئی اور امیر المؤمنینؓ کو مفسدوں نے شہید کر ڈالا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زیدؓ اور خلیفۂ شہید کے درمیان اتنے گہرے مراسم تھے کہ لوگ انھیں عثمانی کہتے تھے۔

(۶)

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ' مسند نشینِ خلافت ہوئے۔ ان کے عہدِ خلافت میں جمل اور صفّین کی افسوس ناک لڑائیاں پیش آئیں۔ حضرت زیدؓ نے اگر چہ ان لڑائیوں میں حضرت علیؓ کا ساتھ نہیں دیا تاہم وہ ان کا بدرجۂ غایت احترام ملحوظ رکھتے تھے اور ان کے فضل وکمال کا برملا اعتراف کرتے تھے۔

حضرت زیدؓ عمر کی چھپن منزلیں طے کر چکے تو خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا اور انھوں نے ۴۵ ہجری (بہ روایتِ دیگر ۴۶ ہجری) میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ وفات کی خبر پھیلی تو لوگ غم واندوہ سے نڈھال ہو گئے۔ اس وقت امیر معاویہؓ کی طرف سے مروان بن الحکم مدینہ منوّرہ کا والی تھا۔ اسی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ مداحِ رسولؐ حضرت حسان بن ثابتؓ اس وقت حیات تھے انھوں نے مرثیہ میں یہ شعر کہا:

فمن للقوافی بعد حسان وابنہ   ومن للمعانی بعد زید بن ثابت

''حسان اور اس کے بیٹے کے بعد اور زید بن ثابت کے بعد معنی فہمی ختم ہوگئی۔''

حضرت ابو ہریرہؓ نے ان کی وفات کی خبر سنی تو ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے — ''آج حبر الامۃ اُٹھ گیا''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جنازے اور تدفین میں شریک تھے۔ جب حضرت زیدؓ کو دفنا چکے تو انھوں نے نہایت حسرت کے ساتھ کہا ''دیکھو علم اس طرح جاتا ہے آج علم کا بڑا حصہ دفن ہو گیا۔''

حضرت زیدؓ نے اپنے پیچھے گیارہ بیٹے چھوڑے جو علم وفضل کے اعتبار سے بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ایک فرزند خارجہؒ کا شمار تو ''فقہائے سبعہ'' میں ہوتا ہے۔ پوتوں نے بھی علمی دنیا میں بڑا نام پایا۔ حضرت زیدؓ کی اہلیہ کا نام جمیلہؓ تھا، ان کی کنیت ام العلا اور امِّ سعد تھی اور وہ مشہور صحابی حضرت سعد بن ربیع انصاریؓ شہیدِ اُحد کی صاحب زادی تھیں۔

(۷)

حضرت زید بن ثابتؓ کی جلالتِ علمی کا اندازہ سرورِ عالم ﷺ کے اس ارشاد سے کیا جاسکتا ہے "افرض امتی زید بن ثابت" یعنی میری امت میں سب سے بڑھ کر فرائض (کا علم) جاننے والے زید بن ثابتؓ ہیں۔

فرائض کے علم میں سب سے مشکل ترین مسئلہ میراث کا ہے، قرآنِ کریم میں میراث و وصیت کے بڑے بڑے مسائل اجمالاً بیان کردیئے گئے ہیں لیکن انسانی معاشرے میں اس سلسلے میں عجیب و غریب صورتیں پیش آتی رہتی ہیں، ان کے حل کے لیے جہاں قرآنِ حکیم کے احکام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہاں رسولِ اکرم ﷺ کے ارشادات اور کبار صحابہؓ کے قضایا اور فتاویٰ کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ علم الفرائض دراصل فقہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ حضرت زیدؓ کو قرآن، حدیث، اور فقہ سے اس قدر شغف تھا کہ فرائض میں ان کو خاص مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ ان کا یہی فضل و کمال تھا کہ وہ عہدِ رسالت میں ہی (عنفوانِ شباب میں) مسندِ افتاء پر فائز ہوگئے تھے۔ شیخینؓ کے دورِ خلافت میں بھی وہ مدینہ منوّرہ کے مفتی رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک ان کا مقام و مرتبہ یہ تھا کہ وہ حضرت زیدؓ کی مدینہ میں موجودگی کو اہلِ مدینہ کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے، "اہلِ مدینہ زیدؓ (کے علم) کے محتاج ہیں کیوں کہ جو شے ان کے پاس ہے، کسی کے پاس نہیں ہے۔" یہی سبب تھا کہ انھوں نے حضرت زیدؓ کو مدینہ منوّرہ سے باہر کبھی کسی عہدہ پر مامور نہ فرمایا۔

حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو جابیہ کے مقام پر ہزاروں آدمیوں کے سامنے خطبہ دیا اس میں فرمایا:

"جس کو فرائض کے بارے میں کوئی سوال کرنا ہو وہ زید بن ثابت کے پاس جائے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو خود علم و فضل کے مجمع البحرین تھے، حضرت زیدؓ سے بعض مسائل

میں استفتاء کیا کرتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ زید خلافتِ فاروقی کے حِبر تھے۔ حضرت عمرؓ نے تمام لوگوں کو مختلف بلاد وامصار میں پھیلا دیا تھا اور فتویٰ دینے سے منع کر دیا تھا لیکن زیدؓ مدینۃ النبیؐ میں بیٹھ کر اہلِ مدینہ اور دوسرے لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے۔

رئیس التابعین حضرت سعید بن مسیبؒ کو جب بھی کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا تو وہ اسے حضرت زیدؓ کے اجتہاد اور فیصلوں کی روشنی میں حل کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ زید بن ثابتؓ فیصلوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور جن مسائل کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد یا فیصلہ موجود نہیں ہے۔ ان کے بتاتے وقت وہ سب سے بڑھ کر صاحبِ بصیرت تھے۔

امامِ دارالہجرۃ حضرت مالک بن انسؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد زید بن ثابتؓ مدینہ منوّرہ کے امام تھے۔

امام شافعیؒ فرائض کے تمام مسائل میں حضرت زیدؓ کی تقلید کرتے تھے۔ قرآنی علوم میں حضرت زیدؓ فرائض کے علاوہ قرأۃ میں بھی درجۂ تبحّر رکھتے تھے۔ امام شعبیؒ کا قول ہے کہ ''زیدؓ فرائض کی طرح قرأۃ میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے۔'' سید القرأ حضرت ابی بن کعب انصاریؓ کی زندگی میں تو ان کو پوری شہرت حاصل نہ ہوسکی لیکن ان کی وفات کے بعد ان کو مرجعیتِ عامہ حاصل ہوگئی۔ چوں کہ ان کی قرأۃ قریش کی قرأۃ کے مطابق تھی اس لیے وہ تمام عالمِ اسلام میں مقبولِ عام ہوگئی۔ آج دُنیائے اسلام میں جو قرأت جاری ونافذ ہے وہ حضرت زیدؓ ہی کی قرأت ہے۔ عہدِ رسالت میں حضرت زیدؓ نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ بارگاہِ نبویؐ میں گزارا لیکن وہ حدیث بیان کرنے میں بے حد محتاط تھے اسی لیے ان سے صرف بانوے (۹۲) احادیث مروی ہیں۔ ان میں ۵ متفق علیہ ہیں۔ ان کے راویانِ حدیث میں حضرت امِّ سعدؓ (زوجہ) کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت سہل بن سعدؓ جیسے اکابر صحابہ شامل ہیں۔ تابعین میں حضرت سعید بن مسیّبؒ، ابان بن عثمانؒ، قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ، خارجہ بن زیدؒ، عطاء بن یسارؒ، طاؤس، سہل بن ابی حثمہؒ، بسر بن سعیدؒ اور کچھ دوسرے اصحاب نے ان سے روایت کی ہے۔

تفقہ فی الدّین میں بھی حضرت زیدؓ نہایت بلند مقام رکھتے تھے اور مجتہدین صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں نہ صرف خاص عہدِ رسالت میں فتویٰ دینے کا شرف حاصل ہوا بلکہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت امیر معاویہؓ کی خلافتوں کے دوران میں بھی مدینہ منوّرہ کے مفتی رہے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضرت زیدؓ کے فتاویٰ کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کو جمع کرنے سے کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ کہا کرتے تھے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کا کوئی قول ایسا نہیں جس پر لوگوں نے بالاجماع عمل نہ کیا ہو۔ حضرت زید بن ثابتؓ ان چار صحابہ میں سے ایک ہیں جن کی یہ دولت علمِ فقہ کو ہمہ گیر شہرت اور وسعت نصیب ہوئی۔ دوسرے تین صحابہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔

قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ حضرت زیدؓ حساب میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ شروع شروع میں عربوں کو حساب وریاضی سے کوئی مس نہ تھا یہاں تک کہ انھیں ہزار سے اوپر گنتی بھی معلوم نہ تھی لیکن حضرت زیدؓ نے اپنی ذہانت اور فطانت کی بہ دولت اس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کرلی۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ حنین (۸ ہجری) کے مالِ غنیمت کی تقسیم سرورِ عالم ﷺ نے حضرت زیدؓ کے مشورہ کے مطابق کی۔ اس وقت ان کی عمر صرف انیس برس کی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں جنگِ یرموک کا مالِ غنیمت مدینہ منوّرہ پہنچا تو امیر المؤمنینؓ نے اس کی تقسیم کا کام حضرت زیدؓ ہی کو تفویض کیا۔ یہ کام انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ قحط الرمادہ کے زمانے میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے غلّہ سے بھرے ہوئے بیس جہاز مصر سے بھیجے تو حضرت عمر فاروقؓ، حضرت زیدؓ اور کچھ دوسرے صحابہ کو ساتھ لے کر اس زمانے کی ایک قریبی بندرگاہ جار پر تشریف لے گئے اور غلّہ وصول کر کے دو گوداموں میں بھروا دیا۔ پھر حضرت زیدؓ کو حکم دیا کہ قحط سے متاثّر تمام لوگوں کی ایک فہرست تیار کریں جس میں ہر شخص کا نام اور غلّہ کی مقدار جس کا وہ مستحق ہے درج ہو۔ حضرت زیدؓ نے ایک رجسٹر تیار کیا جس میں قحط زدگان کے کوائف درج کیے اور ہر شخص کو کاغذ کے چیک (Cheque) تقسیم کیے جن کے نیچے امیر المؤمنین کی مہر ثبت تھی، انھیں دکھا کر وہ غلّہ وصول کرسکتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد یہ پہلا موقع

تھا کہ مہر شدہ کاغذی چیک جاری کیے گئے۔ اس اولیت کا سہرا حضرت زید بن ثابتؓ کے سر ہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ کے فضل و کمال کی بنا پر تمام صحابہ کرامؓ ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کو اُن علماء میں شمار کرتے تھے جن کو قرآنِ پاک میں راسخین فی العلم کہا گیا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت زیدؓ گھوڑے پر سوار ہوئے تو حضرت ابن عباسؓ نے رکاب تھام لی۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا، ہائیں یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ تو (میرے آقا و مولا) رسول اللہ ﷺ کے ابنِ عم ہیں اور میرے لیے واجب الاحترام ہیں۔ انھوں نے کہا، علماء اور اکابرِ دین کی یہی شان ہے کہ ان کی رکاب تھامی جائے۔

امیر معاویہؓ کے نزدیک ان کا یہ مرتبہ تھا کہ جو کچھ ان سے سنتے تھے اس کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے اصحابِ رسولؐ بھی ان کے کمالاتِ علمی کے معترف اور مداح تھے۔

۸

حضرت زید بن ثابتؓ نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ عادات و خصائل کے مالک تھے۔ ان کے صحیفۂ اخلاق میں سبقت فی الاسلام، شوقِ علم، حبِ رسولؐ، پیرویِ سنت، حق گوئی اور انکسار سب سے روشن ابواب ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں سعادت اندوزِ ایمان ہوئے اور اس کے ساتھ ہی نہایت ذوق و شوق سے تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ علمی مرتبہ کے لحاظ سے کبار صحابہؓ کی صف میں داخل ہو گئے اور خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے سامنے فتویٰ دینے کے اہل قرار پائے۔ سرورِ عالم ﷺ سے اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ بارگاہِ نبوی میں گزارتے تھے۔ علی الصباح بیدار ہو کر سیدھے حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں پہنچ جاتے تھے۔ اس سحر خیزی کی بہ دولت انھیں بارہا حضورؐ کے ساتھ سحری کھانے اور روزہ رکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ سرورِ عالم ﷺ بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے، انھیں اپنے حجرۂ مبارک کے اندر بُلا لیتے تھے اور پھر نماز کے لیے اپنے ساتھ مسجد لے جاتے تھے۔ بعض اوقات حضورؐ انھیں اپنے پہلو میں بٹھا لیتے تھے۔ وحی نازل ہوتی تو ان کو ساتھ ساتھ لکھاتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی حضورؐ کو عبرانی زبان میں لکھے ہوئے خطوط موصول ہوتے تھے انھیں آپؐ یہود سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ یہ صورتِ حال

آپؐ کے نزدیک اطمینان بخش نہیں تھی کیوں کہ یہودی ان خطوط کے مضمون سے آگاہ ہوکر مسلمانوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ چناں چہ آپؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ تم عبرانی زبان سیکھ لو۔ انھوں نے ارشادِ نبوی کی تعمیل میں دن رات ایک کردیئے اور پندرہ دن کے اندر اندر عبرانی اور سریانی زبانوں پر اتنا عبور حاصل کرلیا کہ ان زبانوں میں لکھے ہوئے خطوط آسانی سے پڑھ لیتے اور ان کے جواب بھی لکھ دیتے تھے۔

حضرت زیدؓ کو پیرویِ سنت کا بڑا اہتمام تھا۔ خود بھی حضورؐ کے ارشادات واحکامات پر عمل کرتے تھے اور لوگوں کو ایسا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کسی کو کوئی کام خلافِ سنت کرتا دیکھتے تو خاموش نہ رہ سکتے اور اس کو منع کرتے۔ مسندِ احمدؒ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شرحبیل بن سعدؒ کو مدینہ منوّرہ کے ایک باغ میں جال لگاتے دیکھا تو بلند آواز سے پکارے، شرحبیلؒ یہ ارضِ حرم ہے اور یہاں شکار کھیلنا منع ہے۔ ایک اور موقع پر شرحبیلؒ کو بازار میں ایک چڑیا پکڑتے ہوئے دیکھا تو انھیں سخت غصہ آیا۔ شرحبیلؒ سے چڑیا چھین کر اڑادی اور ان کو تھپڑ مار کر فرمایا، اے اپنے نفس کے دشمن کیا تجھے علم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منوّرہ کو حرم قرار دیا ہے۔

مروان بن الحکم والیِ مدینہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے لیکن یہ مراسم ان کی حق گوئی میں کبھی مانع نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جلیل القدر صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ نے فضیلتِ صحابہ کے بارے میں مروان کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ مروان نے اسے تسلیم نہ کیا اور حضرت ابوسعیدؓ پر غلط بیانی کا الزام لگایا۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت رافعؓ بن خدیج بھی مروان کے پاس بیٹھے تھے۔ ان دونوں نے فوراً حضرت ابوسعیدؓ کی تصدیق کی اور مروان کے موقف کو غلط قرار دیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ مروان کا معمول تھا کہ مغرب کی نماز پڑھاتے وقت چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھتا تھا۔ حضرت زیدؓ نے ٹوکا کہ تم نے یہ کیا معمول بنا رکھا ہے، رسول اللہ ﷺ تو نمازِ مغرب میں طویل سورتیں پڑھا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شامی تاجر سے زیتون کا تیل خریدا۔ ابھی مال

وہیں رکھا تھا کہ ایک اور خریدار پیدا ہوگیا۔ اس نے ابنِ عمرؓ سے کہا، اتنا منافع دیتا ہوں مجھ سے سودا کرلیجیے۔ حضرت ابنِ عمرؓ اس پر آمادہ ہوگئے کہ کسی نے پیچھے سے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، ابو عبدالرحمٰن ایسا کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، پہلے مال یہاں سے اٹھاؤ پھر بیچو۔

ایک مرتبہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آلِ زبیرؓ سے بیان کیا کہ ایک دن حضور نبی کریمؐ نے ان کے یہاں عصر کے بعد دو رکعت نماز پڑھی تھی۔ ان لوگوں نے اسے سنت سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ حضرت زیدؓ کو معلوم ہوا تو فرمایا، اللہ عائشہؓ کی مغفرت کرے اصل واقعہ یہ تھا کہ دوپہر کے وقت کچھ اعرابی حضورؐ کے پاس آگئے، وہ آپؐ سے مسائل پوچھنے لگے یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا۔ آپؐ ظہر کے صرف فرض پڑھ کر گھر تشریف لے گئے، وہاں ظہر کی چھوٹی ہوئی دو سنّتیں یاد آئیں تو ان کو (عصر کے بعد) پڑھ لیا ورنہ حضورؐ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

ایک مرتبہ جلیل القدر صحابی حضرت رافع بن خدیجؓ نے لوگوں سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کھیت کو کرایہ پر اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔ اس سے لوگوں میں بڑی غلط فہمی پیدا ہو رہی تھی۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے سنا تو فرمایا—— خدائے قدوس، رافع کی مغفرت کرے مجھے ان سے زیادہ اس حدیث کی حقیقت معلوم ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ (کھیت کے کرایہ پر) دو شخص باہم جھگڑ رہے تھے۔ حضورؐ نے انھیں جھگڑتے دیکھا تو فرمایا، اگر حالت یہی ہے (کھیت کو کرایہ پر اٹھانا جھگڑے کا باعث بن جائے تو پھر) کھیت کو کرایہ پر نہ اٹھانا چاہیے۔ رافعؓ نے حضورؐ کے ارشاد کا صرف آخری ٹکڑا سن لیا اور اسی کو لوگوں سے بیان کرنا شروع کر دیا۔

حضرت زیدؓ طبعاً خاموشی اور سکوت کو پسند کرتے تھے اور مجلس میں نہایت وقار سے بیٹھتے تھے۔ تبلیغ وارشاد کے لیے حاکمانِ وقت کے پاس بھی تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مروان کے محل سے نکلے تو شاگردوں نے پوچھا کہ حضرت مروان کے پاس کیسے تشریف لے گئے تھے؟ فرمایا اس نے چند حدیثیں پوچھی تھیں۔ میں نے اس کو بتایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں جو مسلمان کے قلب کو زندہ رکھتی ہیں۔ اوّل ہر کام میں رضائے الٰہی کو مدِنظر رکھنا، دوم حکام وامراء کو نصیحت کرنا، سوم جماعت کے ساتھ رہنا۔

حضرت زیدؓ کے اخلاق میں انکسار کا پہلو بھی بہت نمایاں تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور بڑے لطف وانبساط سے سوالوں کا جواب دیتے البتہ اپنے تبحرِ علمی کی بنا پر کبھی کبھار حرفِ ادّعا زبان سے نکل جاتا تھا (میں فلاں سے زیادہ علم رکھتا ہوں)۔ وہ بڑے ذی اثر بزرگ تھے لیکن مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں فریق بننا ان کو پسند نہیں تھا۔ انھوں نے فتنوں سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھا اور مسلمانوں کی آپس کی آویزش اور نزاع سے کبھی کوئی واسطہ نہ رکھا۔ ان کے مزاج میں حمیتِ اسلام بہت بڑھی ہوئی تھی، اسی بناء پر ذمی کے قتل پر مسلمان کا قتل گوارا نہ کرتے تھے بلکہ دِیت دلواتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت صرمہ بن ابی انس انصاریؓ

(۱)

سرورِ عالم ﷺ کی بعثت سے پہلے اگرچہ تمام اہلِ عرب مجموعی طور پر کفر و شرک اور عصیان و تمرّد کی دَلدَل میں دھنسے ہوئے تھے تاہم ان میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو موحّد اور مسلکِ ابراہیمی کے پیرو تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو غیر اللہ کی عبادت سے تو مجتنب تھے لیکن کسی شریعت میں داخل نہ تھے اور توحید و عبادتِ الٰہی کی طلب میں حضرت ختم المرسلین ﷺ کے ظہور کے منتظر تھے۔ تاریخ میں ایسے اصحاب کو حنفاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسے سعید الفطرت اصحاب، جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی، نہ صرف مکہ اور عرب کے بعض دوسرے علاقوں میں موجود تھے بلکہ یثرب (مدینہ) بھی ان کے وجود سے خالی نہ تھا۔ یثرب کے حنفاء میں ابوقیس صرمہ بن ابی انسؓ اپنی کبرسنی اور پاک بازی کی بنا پر امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ان کا تعلق خزرج کی معزز ترین شاخ بنونجار سے تھا۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:

صرمہؓ بن ابی انس قیس بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن نجّار۔

حضرت صرمہؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ وہ عنفوانِ شباب ہی میں بُت پرستی سے متنفّر ہو گئے اور دنیا ترک کر کے رہبانیت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں وہ ٹاٹ کا لباس پہنتے تھے اور گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر غور و تفکر میں مشغول رہتے تھے۔ ایک مدت کے بعد

گوشۂ عزلت سے نکل کر دنیا کے کام دھندوں میں حصہ لینا شروع کر دیا لیکن بُت پرستی اور اعمالِ رذیلہ سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے۔ اہلِ حق کی طرح غُسلِ جنابت کرتے تھے اور کسی ایسے گھر میں داخل نہ ہوتے تھے جس میں کوئی حائضہ عورت یا جنبی موجود ہو۔ ایک مرتبہ انھوں نے ارادہ کیا کہ رائج الوقت ادیان میں سے جو دین صحیح معنوں میں سعادت و فلاحِ ابدی کی طرف رہ نمائی کرتا ہو اس کو اختیار کر لیں۔ چناں چہ اس اشتیاق نے انھیں دینِ مسیحی کی طرف مائل کیا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اس زمانے کے مسیحیوں نے اپنے دین میں تحریف کر ڈالی ہے اور اس میں بت پرستی کو شامل کر لیا ہے تو وہ قبولِ مسیحیت کے ارادہ سے دست بردار ہو گئے اور دینِ ابراہیمی (دینِ حنیف) اختیار کر لیا۔ گو رہ نمائی کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن وہ اپنی بصیرت اور اپنے شعور کے مطابق خدائے واحد کی عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک عبادت گاہ بنالی جس کو نہایت پاک وصاف رکھتے تھے اور کسی ایسے شخص کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتے جس پر غسل واجب ہو۔ بہ قول حافظ ابنِ حجرؒ وہ اپنی عبادت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے اعبد رب ابراهیم ''میں ابراہیمؑ کے ربّ کی عبادت کرتا ہوں۔''

اسی انداز سے زندگی بسر کرتے حضرت صرمہؓ کی عمر سو برس سے اوپر ہو گئی۔ اپنے پاکیزہ اخلاق اور کبرسنی کی وجہ سے وہ اہلِ مدینہ میں نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

(۲)

ہجرتِ نبوی سے کچھ مدت پہلے یثرب میں اسلام کا چرچا پھیلا اور لوگ نبیِ آخر الزماںؐ کا ذکر کرنے لگے تو حضرت صرمہؓ کے دل نے گواہی دی کہ مکہ میں جس ذاتِ اقدس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ خدا کے سچے رسول ہیں اور دینِ حق کی تبلیغ و ترویج کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر قبولِ ایمان کے لیے بیتاب ہو گئے لیکن ضعفِ پیری اور اضمحلالِ قویٰ نے مکہ معظّمہ کا سفر اختیار کرنے کی طاقت نہ چھوڑی تھی۔ نہایت بے قراری سے مدینہ میں حضورؐ کے ورودِ مسعود کا انتظار کرنے لگے۔ اب ان کے دل میں اگر کوئی تمنّا تھی تو صرف یہ تھی کہ مرنے

سے پہلے پیغمبرِ آخر الزماںؐ کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن اور ٹھنڈی کر لیں۔

بالآخر وہ ساعتِ سعید آ پہنچی جب سرورِ عالم ﷺ نے سرزمین یثرب کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا اس وقت یثرب ''مدینۃ النبیؐ'' بن گیا جس کے در و دیوار زبانِ حال سے یوں نغمہ خواں تھے:

اینک آں سروِ خراماں می رسد — اینک آں گلبرگ خنداں می رسد
شاد باش اے چشمِ ہجرانِ بلا — کز پئے دردِ تو درماں می رسد
شوق کن اے بلبلِ گلزارِ عشق — کاں گل نواز گلستاں می رسد
دردلِ افسردہ روحے می دمد — مردہ تن رامژدۂ جاں می رسد
دور شو اے ظلمتِ شامِ فراق — کافتابِ وصل تاباں می رسد

حضرت صرمہ بن ابی انسؓ فرطِ مسرّت سے بے خود ہو گئے۔ نہایت جوش سے سرکارِ دو عالم ﷺ کا استقبال کیا۔ قبولِ ایمان اور بیعت کے شرف سے بہرہ یاب ہوئے اور اس دولتِ لازوال کے حصول پر سجدۂ شکر بجالائے۔

قبولِ اسلام کے وقت حضرت صرمہؓ کی عمر ایک سو آٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ ضعفِ پیری کی وجہ سے غزوات میں شریک ہونے سے معذور تھے۔ اس کی تلافی انھوں نے یوں کی کہ کثرت سے روزے رکھتے تھے اور اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ عباداتِ الٰہی میں گزارتے تھے۔

(۳)

اللہ تعالیٰ نے حضرت صرمہ بن ابی انسؓ کو شعر و سخن کا نہایت پاکیزہ ذوق عطا کیا تھا۔ ان کا شمار اپنے قبیلہ کے نغز گو شاعروں میں ہوتا تھا۔

اربابِ سیَر نے ان کے متعدد اشعار اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں جنھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے سعدی تھے کیوں کہ ان کے بیشتر اشعار میں برائیوں سے بچنے اور نیکیوں کی طرف سبقت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ صرمہؓ اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرنے کے ساتھ

بالخصوص اس بات میں کہ یہ کس صحابی کی نسبت وارد ہوئی تھی۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ تم اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک کہ سفید دھاگے اور سیاہ دھاگے میں تمیز نہ کی جا سکے۔ اس آیت کو سن کر ایک صحابی نے اپنے پیر کے انگوٹھے میں ایک سفید دھاگا اور ایک سیاہ دھاگا باندھ لیا یا بہ روایتِ دیگر اپنے بستر میں سرہانے کے نیچے ایک سفید اور ایک سیاہ دھاگا رکھ لیا اور جب تک دونوں میں اچھی طرح امتیاز نہ ہونے لگتا اس وقت تک کھاتے پیتے رہتے۔ اس وقت مِنَ الفجر کا لفظ نازل ہوا جس سے واضح ہو گیا کہ سفید اور سیاہ دھاگے سے مراد تاریکی اور روشنی کی دو دھاریاں ہیں۔

حضرت صرمہؓ نے ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سہل بن حنیف انصاریؓ

①

غزوۂ احد (۳ ہجری) میں جب ایک ناگہانی افتاد سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا اور سرورِ عالم ﷺ صرف چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان میں رہ گئے تو ان میں سے ایک نہایت حسین وجمیل صاحبِ رسول حضورؐ کو کسی ضرر سے بچانے کے لیے یہ کہہ کر آپؐ کے آگے کھڑے ہو گئے:

''یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آپؐ میری آڑ میں رہئے خدا کی قسم جب تک میری جان میں جان ہے میں آپؐ کی حفاظت کروں گا اور یہاں سے قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔''

مشرکین کی طرف سے حضورؐ کی طرف جو تیر آتا وہ اس کو روکتے اور جواب میں خود مشرکین پر تیر برساتے۔ حضورؐ کو ان کا جذبۂ فدویت بہت پسند آیا۔ آپؐ بار بار دوسرے صحابہؓ سے فرماتے ''ان کو تیر دو یہ سہل ہیں۔''

یہ صاحبِ رسول جنھوں نے معرکۂ اُحد میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر شروع سے اخیر تک سیّد الانامؐ کی حفاظت کی اور آپؐ کی نظرِ استحسان کے مستحق ٹھہرے —— حضرت سہل بن حنیف انصاریؓ تھے۔

②

حضرت ابوسعد سہل بن حنیف انصاریؓ کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:——
سہلؓ بن حنیف بن واہب بن عکیم بن ثعلبہ بن حارث بن مجدعہ بن عمرو بن جشم بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

حضرت سہلؓ اپنے چھوٹے بھائی حضرت عثمان بن حنیفؓ کے ساتھ ہجرتِ نبوی سے پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس اعتبار سے وہ انصار کے سابقین اوّلین میں سے ہیں۔ ہجرت کے چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین رشتۂ مواخاۃ قائم کرایا تو ابنِ سعدؒ کی روایت کے مطابق حضرت سہل بن حنیفؓ کو حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کا مواخاتی بھائی بنایا (لیکن جمہور اہلِ سِیَر کا خیال ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اپنا بھائی قرار دیا)۔

۲ ہجری میں حق و باطل کے معرکۂ اول غزوۂ بدر الکبریٰ میں حضرت سہل بن حنیفؓ کو اصحابِ بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔

غزوۂ اُحد (۳ ہجری) میں انھوں نے اس شان سے دادِ شجاعت دی کہ سخت افراتفری کے عالَم میں بھی ان کے پائے ثبات میں جنبش نہ آئی۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ اس دن انھوں نے موت پر بیعت کی تھی وہ اختتامِ جنگ تک دشمن پر برابر تیر برساتے رہے اور حضورؐ دوسرے صحابہ سے فرماتے رہے کہ ان کو تیر دیئے جاؤ یہ سہل ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ تفاول کے طور پر کہتے سہل ہے حزن نہیں۔

غزوۂ اُحد کے بعد انھوں نے غزوۂ احزاب میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔

۶ ہجری میں بیعتِ رضوان کی مہتم بالشان سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

حضرت سہلؓ غزوات میں شریک ہونے کے ساتھ فیضانِ نبویؐ سے بھی بہرہ یاب ہوتے رہتے تھے۔ حضورؐ بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت سے بھی متصف فرمایا تھا۔ نہایت خوش جمال اور موزوں اندام تھے۔ کسی غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ تھے قریب ہی ایک نالہ تھا اس میں نہانے لگے۔ ایک انصاری صاحب رسول نے ان کا سڈول جسم دیکھا تو کہنے لگے ''واہ واہ کیسا خوب صورت جسم ہے میں نے آج تک ایسا بدن کبھی نہیں دیکھا۔'' ان کا اتنا کہنا تھا کہ حضرت سہلؓ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کے ساتھی دوڑ کر گئے دیکھا تو تیز بخار سے جسم تپ رہا تھا۔ اٹھا کر لشکر میں لائے۔ سرورِ عالم ﷺ نے پوچھا، کیا بات ہے؟ صحابہؓ نے واقعہ بیان کیا تو فرمایا: ''حیرت ہے لوگ اپنے بھائی کا بدن، یا مال دیکھتے ہیں اور برکت کی دُعا نہیں کرتے اسی لیے نظر لگتی ہے۔''

بارے اللہ تعالیٰ نے خیر کی اور حضرت سہلؓ جلد صحت یاب ہو گئے۔

(۳)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد تک حضرت سہلؓ کے مشاغلِ زندگی کے بارے میں اربابِ سِیَر نے کچھ نہیں لکھا۔ ان کا نام حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے عہدِ خلافت میں اس وقت منظرِ عام پر آتا ہے جب امیر المؤمنین نے انھیں مدینہ کا امیر مقرر فرمایا لیکن یہ مدت بہت مختصر تھی۔ چند دن بعد حضرت علیؓ نے انھیں کوفہ بلا بھیجا اور وہ مدینہ منوّرہ سے کوفہ چلے گئے۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے مختلف صوبوں پر ولاۃ کا تقرّر کیا تو حضرت سہل بن حنیفؓ کو حضرت امیر معاویہؓ کی جگہ شام کا والی نامزد کیا۔ لیکن شام پر امیر معاویہؓ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ حضرت سہلؓ شام کی سرحد پر واقع تبوک کے مقام پر پہنچے تو انھیں امیر معاویہؓ کے سوار ملے اور انھیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے واپس آ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو بتایا کہ امیر معاویہؓ نے آپ کی مخالفت کی راہ اختیار کی ہے اور اہلِ شام نے ان کی بیعت کر لی ہے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگِ صفّین کا آغاز ہوا تو حضرت سہلؓ نے حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔

ابو حنیفہ دینوری کا بیان ہے کہ لڑائی میں ایک موقع پر انھوں نے اہلِ حجاز کی قیادت بھی کی۔

صفر ۳۷ ہجری میں وثیقۂ تحکیم قلم بند کیا گیا تو جن بزرگوں نے حضرت علیؓ کی طرف سے اس پر شہادت ثبت کی، حضرت سہل بن حنیفؓ بھی ان میں شامل تھے۔

جنگِ صفین سے واپس آئے تو سخت دل گرفتہ تھے۔ حضرت ابو وائلؒ نے پوچھا کہ حالات اب کس رُخ پر جا رہے ہیں۔ فرمایا، عجیب مصیبت ہے۔ ایک رخنہ بند کرتے ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں حضرت علیؓ نے انھیں فارس کا امیر مقرر کیا لیکن امارت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی انھیں سخت مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اہلِ فارس نے سرکشی کی راہ اختیار کی

اور انھیں بہ زور فارس سے نکال دیا۔ اب حضرت علیؓ نے زیاد بن ابیہ کو فارس کا حاکم بنایا۔ اس نے وہاں جا کر فارسی باغیوں کے تمام کس بَل نکال دیئے۔

حضرت سہلؓ اگر چہ بہت بہادر اور حوصلہ مند تھے لیکن جنگِ صفّین میں انھوں نے ایک جماعت کے رجحانِ طبع کے خلاف گفتگوئے صلح (تحکیم) کی حمایت کی تو ان لوگوں نے ان پر لڑائی سے جی چرانے (بزدلی) کا الزام لگایا۔ انھوں نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا۔

''ان لوگوں کی رائے صحیح نہیں میں بزدل نہیں ہوں ہم نے جس کام کے لیے تلوار اٹھائی اس کو ہمیشہ آسان کرلیا۔ اگر یومِ ابی جندل (حدیبیہ) میں تلوار سے کام لینا رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے خلاف نہ ہوتا تو میں اس دن بھی مشرکین سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار تھا۔''

حضرت سہل بن حنیفؓ نے ۳۸ ہجری میں بہ مقام کوفہ وفات پائی۔ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے چھ تکبیروں کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھائی اور فرمایا:

''یہ اصحابِ بدر میں سے تھے۔''

(یہ امتیاز اہلِ بدر کی نمازِ جنازہ میں قائم رکھا جاتا تھا)

حضرت سہلؓ نے اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے۔ ابوامامہ اسعدؓ اور عبداللہؓ۔ ابوامامہ اسعدؓ عہدِ رسالت میں پیدا ہوئے تھے۔

حضرت سہل بن حنیفؓ کا شمار راویانِ حدیث صحابہؓ کے طبقۂ چہارم میں ہوتا ہے۔ ان سے چالیس احادیث مروی ہیں۔

انھوں نے سرورِ عالم ﷺ اور حضرت زید بن ثابت انصاریؓ سے روایت کی ہے۔ جن تابعین نے ان سے روایت کی ہے ان میں ابووائلؒ، عبید اللہ بن عبداللہؒ اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ

(۱)

دین سے محبت اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑھا وہ منعمِ حقیقی جسے چاہے یہ نعمت عطا کردے۔ عہدِ رسالت کے اواخر میں اہلِ مدینہ نے ایک کمسِن بچے کے شغفِ دین اور عشقِ رسولؐ کی عجب کیفیت دیکھی۔ یہ بچہ اکثر بارگاہِ نبویؐ میں حاضر رہتا تھا اور بڑے ذوق وشوق سے آپؐ سے دین کی باتیں سیکھتا تھا۔ حضورؐ وعظ کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوتے تو وہ منبر کے قریب بیٹھ جاتا، نہایت غور سے آپؐ کے ارشادات سنتا اور انھیں یاد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ حضورؐ کے پیچھے نمازیں پڑھتا اور رمضان المبارک کی راتوں میں آپؐ کے ساتھ جاگ کر عبادت کیا کرتا تھا۔ حضورؐ کو بھی اس بچے سے بڑی محبت تھی اور آپؐ اس پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے پاس طائف سے انگور آئے۔ یہ بچہ بھی اُس وقت آپؐ کی خدمت میں موجود تھا۔ حضورؐ نے اس کو دو خوشے عنایت کیے اور فرمایا، ''بیٹا ایک خوشہ تمھارا ہے اور ایک تمھاری والدہ کا، گھر جاکر ان کو دے دینا۔'' وہ بچے ہی تو تھے راستہ میں اپنا خوشہ کھایا تو بہت مزہ آیا، دوسرا خوشہ بھی چٹ کر گئے اور ماں کو بتایا تک نہیں۔ چند دنوں کے بعد حضورؐ نے ان سے پوچھا ''کیوں بیٹا اپنی ماں کو انگور کا وہ خوشہ دے دیا تھا۔'' صادق الامین ﷺ کے فیضِ صحبت نے ان کو نہایت راست باز بنا دیا تھا، عرض کیا ''نہیں یارسول اللہ، دونوں خوشے میں نے خود ہی کھالیے تھے۔'' ان کا جواب سُن کر حضورؐ متبسّم ہوگئے اور ان کا کان پکڑ کر فرمایا ''یا غدر (بڑے مکار ہو)۔''

یہ بچہ جس نے سیّد الانبیاء والمرسلین ﷺ کی شفقت اور لاڈ پیار سے حصۂ وافر پایا تھا اور جس کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے والہانہ لگاؤ تھا، حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ تھے۔

(۲)

حضرت ابوعبد اللہ نعمان بن بشیرؓ کا تعلق خزرج کے خاندان بنو حارث سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

نعمان بن بشیر بن سعد بن ثعلبہ بن خلاس بن زید بن مالک اغر بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج الاکبر۔

حضرت نعمانؓ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر سے تین چار ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر کے در و دیوار پر اسلام کو پرتو فگن دیکھا۔ ان کے والد حضرت بشیر بن سعدؓ انصار کے سابقین اوّلین میں سے تھے اور سرورِ کونین ﷺ کے نہایت مخلص شیدائی تھے۔ وہ بیعت عقبۂ کبیرہ (۱۳ نبوت) میں شریک تھے اور بدر، اُحد، احزاب اور دوسرے تمام غزوات میں بھی سرورِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ حضوؐر کے وصال کے بعد انصار کے ایک بڑے طبقے کا خیال یہ تھا کہ رئیسِ خزرج حضرت سعد بن عبادہ ساعدی انصاریؓ کو مسندِ خلافت پر بیٹھنا چاہیے لیکن حضرت بشیر بن سعدؓ نے مہاجرین کے حقِ خلافت کی پُر زور حمایت کی اور انصار میں سے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی۔

حضرت نعمانؓ کی والدہ حضرت عمرہ بنتِ رواحہؓ جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کی ہمشیرہ تھیں اور نہایت مخلص صحابیہ تھیں۔ انھیں اپنے فرزند نعمانؓ سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک خاص جائداد حضرت نعمان کے نام ہبہ کرنی چاہی اور اپنے شوہر حضرت بشیر بن سعدؓ کو بھی اس پر آمادہ کرلیا۔ پھر انھوں نے حضرت بشیرؓ سے کہا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنالیجیے۔ حضرت بشیر ننھے نعمانؓ کو ساتھ لے کر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ آپؐ گواہ رہیے کہ میں اپنی فلاں جائداد اس لڑکے کو دیتا ہوں۔''

حضوؐر نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس کے دوسرے بھائیوں کو بھی اس جائداد میں سے حصہ دیا ہے۔''

حضرت بشیرؓ نے عرض کیا۔ ''نہیں یارسول اللہ''

حضورؐ نے فرمایا۔ ''تو پھر میں ظلم پر گواہ نہیں بن سکتا۔'' ایک اور روایت میں آپؐ سے یہ الفاظ منسوب ہیں، ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل وانصاف کیا کرو۔''

اس پر حضرت بشیرؓ خاموشی سے گھر لوٹ گئے اور حضرت عمرہؓ نے بھی ارشادِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یہ جائداد جو حضرت نعمانؓ کے والدین ان کو بہ طورِ خاص دینا چاہتے تھے کیا تھی؟ اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ کوئی زمین تھی اور بعض میں ہے کہ یہ ایک غلام تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کہا جاتا ہے کہ ہجرتِ نبوی کے بعد حضرت نعمانؓ پہلے بچے تھے جو ایک انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدین کو ان سے غیر معمولی محبت تھی اور وہ ان کو اکثر حضورِ پُرنور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں لے جاتے اور آپؐ سے ان کے لیے دعا کراتے تھے۔ اسی بات سے ننھے نعمانؓ کے دل میں رحمتِ عالم ﷺ کے لیے بے انتہا عقیدت اور محبت پیدا ہوگئی اور وہ فیضانِ نبوی سے خوب خوب بہرہ یاب ہوئے۔ ربیع الاوّل ۱۱ ہجری میں حضورؐ کے وصال کے وقت حضرت نعمانؓ کی عمر آٹھ سال ۷ ماہ کی تھی۔ اس کم عمری کے باوجود انھوں نے حضورؐ کے ارشادات کی ایک کثیر تعداد حفظ کر لی تھی۔

(۳)

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے زمانۂ خلافت میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی کسی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا البتہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت سے سخت صدمہ پہنچا اور وہ ان کا خون آلودہ کرتہ اور ان کی اہلیۂ محترمہ حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق لے گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خلافت کے آغاز ہی میں جب ان کے اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات شروع ہوئے تو حضرت نعمانؓ نے امیر معاویہؓ کا ساتھ دیا۔ امیر معاویہؓ نے حضرت نعمانؓ کا بہت اعزاز واکرام کیا اور اپنے عہدِ خلافت میں انھیں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ مورّخ یعقوبی کا بیان ہے کہ امیر معاویہؓ کے حکم سے حضرت نعمانؓ نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ عین التمر پر حملہ کیا۔ وہاں اس وقت حضرت علیؓ کی طرف سے مالک بن کعب حاکم تھے۔ انھوں نے حملہ آور لشکر کو پسپا

کردیا۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت نعمانؓ خود اس لشکر کی قیادت کر رہے تھے یا انھوں نے کسی دوسرے شخص کو اس مہم پر بھیجا تھا۔

۵۳ ہجری میں دمشق کے قاضی حضرت فضالہ بن عبید انصاریؓ نے وفات پائی تو امیر معاویہؓ نے حضرت نعمانؓ کو ان کا جانشین بنایا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے حضرت نعمانؓ کو یمن کا امیر بنا دیا۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ۵۹ ہجری میں امیر معاویہؓ نے حضرت نعمانؓ کو کوفہ کے اہم صوبہ کا والی مقرر کیا۔ وہ اسی عہدہ پر فائز تھے کہ رجب ۶۰ ہجری میں امیر معاویہؓ نے وفات پائی اور یزید اوّل تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اہلِ کوفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو بنو امیہ کے مخالفین حضرت سلیمان بن صرد الخزاعیؓ کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ طے کیا کہ حضرت حسین بن علیؓ کی خدمت میں خط لکھ کر گزارش کی جائے کہ وہ ان کے پاس کوفے تشریف لائیں۔ ہم لوگ ان کی بیعت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ خط بھیجنے کے بعد اہلِ کوفہ نے اس مضمون کے خطوں کا تار باندھ دیا۔ حضرت حسینؓ کو پے در پے ان کے خطوط ملے تو انھوں نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیلؓ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوفہ بھیجا۔ مسلم بن عقیلؓ کوفہ پہنچے تو بارہ (یا بروایتِ دیگر اٹھارہ) ہزار آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کو ان حالات کی اطلاع ملی تو انھوں نے چشم پوشی سے کام لیا لیکن جب حکومت کے مخالفین کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں تو حضرت نعمانؓ نے منبر پر چڑھ کر لوگوں کے سامنے ایک پُرزور خطبہ دیا جس میں کہا:

''لوگو! خدا سے ڈرو اور فتنہ پیدا نہ کرو کیوں کہ اس میں جانیں ضائع ہوتی ہیں، خونریزی ہوتی ہے اور مال لوٹے جاتے ہیں۔ جو شخص مجھ سے نہ لڑے گا میں بھی اس سے نہ لڑوں گا، جو مجھ پر حملہ نہ کرے گا میں بھی اس پر حملہ نہ کروں گا۔ نہ ظن و گمان کی بنا پر کسی کو پکڑوں گا ہاں جس کا جرم واضح ہو گیا اور پتہ چل گیا کہ اس نے بیعت توڑ دی ہے تو پھر جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہے میں اس پر وار کرتا چلا جاؤں گا خواہ میں بالکل اکیلا ہی کیوں نہ ہوں۔''

اس مجمع میں بنواُمیّہ کا ایک پُرجوش حامی عبداللہ بن مسلم بھی موجود تھا اس کو حضرت نعمانؓ کی نرمی پسند نہ آئی اس نے اٹھ کر کہا:

''اے امیر آپ کا طرزِ عمل کم زوری کے مترادف ہے۔ یہ نرمی کا نہیں سختی کا موقع ہے۔''

حضرت نعمانؓ نے فرمایا— "میں خدا کی معصیت میں قوی ہونے پر اس کی اطاعت میں کم زور رہنے کو ترجیح دیتا ہوں اور جو پردہ خدا نے کسی پر ڈالا ہے میں اس کو چاک نہیں کرنا چاہتا۔"

عبد اللہ بن مسلم وہاں سے اٹھ کر گھر آیا اور یزید کو خط لکھا کہ "کوفہ کی حکومت پر کسی طاقت ور آدمی کو بھیجئے جو آپ کے احکام بہ زور نافذ کر سکے۔ نعمان بہت کم زوری دکھا رہے ہیں۔"

یزید کو یہ خط ملا تو اس نے عبید اللہ بن زیادہ کو کوفہ کا والی مقرر کیا۔ حضرت نعمانؓ عنانِ حکومت اس کے سپرد کر کے شام چلے گئے۔ یہ ۶۰ ہجری کا واقعہ ہے۔ چند دن بعد یزید نے انھیں حمص کا والی مقرر کیا اور اس کی وفات تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی کوفہ سے واپسی کے کچھ عرصہ کے بعد کربلا کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا جس میں سیّدنا حضرت حسینؓ، ان کے متعدد اعزہ و اقارب اور رفقاء نے شہادت پائی۔ سیّدنا حضرت حسینؓ کے پس ماندگان (جو خواتین، حضرت علی زین العابدینؒ بن حسینؓ اور چند بچوں پر مشتمل تھے) دمشق لے جائے گئے۔ جب وہ دمشق میں چند دن قیام کر چکے تو یزید نے ان کو حضرت نعمان بن بشیرؓ کے زیرِ حفاظت مدینہ منوّرہ روانہ کر دیا۔

حضرت نعمانؓ نے جہاں تک بَن پڑا، ان مصیبت زدہ مسافروں کی مدد کی اور راستے میں انھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ جہاں یہ قافلہ منزل کرتا تھا۔ حضرت نعمانؓ اور ان کے ساتھی پردہ کے خیال سے الگ ہٹ جاتے تھے۔ جب یہ قافلہ مدینہ منوّرہ پہنچا تو حضرت زینب بنتِ علیؓ اور حضرت فاطمہ بنتِ علیؓ نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کو ان کے حسنِ سلوک کے عوض اپنے کنگن اور بازو بند اتار کر پیش کیے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ اس وقت ان چیزوں کے سوا ہمارے پاس اور کچھ نہیں کہ آپ کی خدمت کا معاوضہ دیں۔

حضرت نعمانؓ اشک بار ہو گئے اور کہا:

"اے بناتِ رسولؐ خدا کی قسم میں نے جو کچھ کیا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور رسول اللہ ﷺ سے آپ کی قرابت کے خیال سے کیا ہے کسی دنیاوی منفعت کے لیے نہیں کیا۔ یہ زیور لے کر میں اپنا اجر ضائع نہیں کروں گا۔ خدا کے لیے انھیں اپنے پاس ہی رکھیے۔"

(۴)

یزید کو حضرت حسینؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے بھی بڑا خطرہ تھا جو مکہ میں مقیم تھے اور اس کی بیعت پر آمادہ نہیں تھے۔ واقعۂ کربلا کے بعد اس نے چند آدمیوں کو ابنِ زبیرؓ سے بیعت لینے کے لیے مکہ بھیجا۔ ابنِ زبیرؓ نے انھیں یہ جواب دیا کہ:

''میں یزید کی کسی بات کا جواب نہ دوں گا (بہ روایتِ دیگر میں یزید کی کوئی بھی بات نہ مانوں گا) میں باغی نہیں ہوں لیکن میں اپنے کو دوسرے کے قبضہ میں بھی کبھی نہ دوں گا۔''

ان لوگوں نے واپس جا کر یزید کو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے جواب سے آگاہ کیا تو وہ ان کی طرف سے اور بھی کھٹک گیا اب اس نے معززینِ شام کا ایک اور وفد مرتّب کیا اور اسے ابنِ زبیرؓ کے پاس بھیجا۔ اس وفد میں حضرت نعمان بن بشیرؓ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مسجدِ حرام میں جا کر حضرت ابنِ زبیرؓ سے ملے اور انھیں یزید کی بیعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس پر ابنِ زبیرؓ نے وفد کے ایک رکن عبداللہ بن عضاۃ اشعری سے مخاطب ہو کر کہا:

''کیا اس حرم میں میرے ساتھ لڑنا حلال ہوگا؟''

ابنِ عضاۃ نے جواب دیا۔ ''ہاں اگر آپ امیر المؤمنین کی اطاعت نہ کریں۔''

ابنِ زبیرؓ نے حرم کے ایک کبوتر کی طرف اشارہ کر کے کہا ''کیا اس کبوتر کا مارنا حلال ہے۔''

ابنِ عضاۃ نے کہا ''ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ امیر المؤمنین کا نافرمان ہے۔''

ابنِ عضاۃ سے گفتگو کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ کو تخلیہ میں لے گئے اور ان سے کہا:

''میں تمھیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ تیرے نزدیک میں افضل ہوں یا یزید؟''

حضرت نعمانؓ: ''آپ''

حضرت ابنِ زبیرؓ: ''کیا میرے والد افضل ہیں یا یزید کے؟''

حضرت نعمانؓ: ''آپ کے''

حضرت ابنِ زبیرؓ: ''میری والدہ بہتر ہیں یا یزید کی؟''

حضرت نعمانؓ: ”آپ کی۔“

حضرت ابنِ زبیرؓ: ”میری خالہ افضل ہیں یا یزید کی؟“

حضرت نعمانؓ: ”آپ کی۔“

حضرت ابنِ زبیرؓ: ”میری پھوپھی افضل ہیں یا یزید کی۔“

حضرت نعمانؓ: ”آپ کی ـــــــ آپ کے والد زبیرؓ والدہ اسماء بنتِ ابی بکرؓ ـــــ خالہ اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور پھوپھی ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنتِ خویلدؓ۔“

حضرت ابنِ زبیرؓ نے کہا: ”پھر بھی تم مجھ کو مشورہ دیتے ہو کہ میں یزید کی بیعت کرلوں۔“

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے کہا، ”اگر آپ میرا مشورہ چاہتے ہیں تو میں آپ کو یہ رائے نہ دوں گا۔ اور آئندہ کبھی آپ کے پاس آؤں گا بھی نہیں۔“

اس کے بعد یہ وفد واپس یزید کے پاس چلا گیا۔

یزید کی موت اور معاویہ بن یزید کی حکومت سے دست برداری کے بعد ۶۴ ہجری میں حضرت نعمان بن بشیرؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت کرلی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے انھیں اپنی طرف سے حمص کا حاکم مقرر کیا اور شام کے بعض دوسرے اضلاع کا والی ضحاک بن قیس کو بنایا۔ نئے اُموی خلیفہ مروان بن الحکم نے ایک مضبوط لشکر ضحاک بن قیس کو مطیع کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت نعمانؓ کو خبر ہوئی تو انھوں نے کچھ فوج شرحبیل بن ذوالکلاع کی قیادت میں ضحاک بن قیس کی مدد کے لیے بھیجی۔ مرج رہط کے مقام پر مروان کے لشکر اور ضحاک بن قیس کی فوج کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں ضحاک بن قیس کو ہزیمت ہوئی۔ حضرت نعمانؓ کو اطلاع ملی تو وہ رات کو حمص سے نکل کھڑے ہوئے۔ مروان نے خالد بن عدی الکلاعی کو سواروں کا ایک دستہ دے کر تعاقب کے لیے روانہ کیا۔ خالد بن عدی نے انھیں حمص کے نواح میں بیران نامی ایک گاؤں میں جا گھیرا اور شہید کر کے ان کا سر کاٹ لیا۔ پھر اس نے حضرت نعمانؓ کے اہل وعیال کو گرفتار کرلیا اور انھیں حضرت نعمانؓ کے سر سمیت مروان کے سامنے لے جا کر پیش کیا۔ مروان نے حضرت نعمانؓ کا سر ان کی اہلیہ کی گود میں ڈال دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی اہلیہ نے خود درخواست کی کہ ان کا سر میری گود میں دے دو۔ بہر صورت یہ ایک عبرتناک واقعہ تھا۔ اوّل اِس لیے کہ یہ اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ اسلام

لاشوں کی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے اس لیے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ نے بیس سال سے زیادہ عرصہ تک خلوصِ نیت سے بنوامیہ کی خدمت کی لیکن بالآخر ایک اموی حکمران ہی کے ہاتھوں شہادت پائی۔

حضرت نعمانؓ کا واقعۂ شہادت ۶۵ ھ میں پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر ۶۴ برس کے لگ بھگ تھی۔ ان کی اولاد میں تین لڑکوں کے نام معلوم ہیں محمد، بشیر اور یزید۔

(۵)

حضرت نعمان بن بشیرؓ نہایت پسندیدہ عادات وخصائل کے مالک تھے۔ اہلِ سِیَر نے ان کے حلم وتحمل، رحم دلی، نرم مزاجی اور جود وسخا کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کی زندگی کا ایک طویل حصہ سخت پُر آشوب حالات میں گزرا لیکن انھوں نے حتی الوسع خونریزی سے گریز کیا اور نازک سے نازک موقعوں پر بھی اپنی طبیعت کو قابو میں رکھا۔ ابنِ جریر طبری نے ان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے ——"وہ بردبار، عبادت گزار اور عافیت پسند تھے۔"

حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں ان کی فیاضی کے بارے میں ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ (یزید کے عہدِ حکومت میں) جب وہ حمص کے والی تھے، (مشہور شاعر) اعشیٰ ہمدانی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، میں یزید کے پاس گیا اور اس سے مدد کی درخواست کی لیکن اس نے میری درخواست کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اب آپ کے پاس آیا ہوں کہ کچھ قرابت کا پاس کریں اور میرا قرض ادا کر دیں۔ حضرت نعمانؓ اس وقت تہی دست تھے قسم کھا کر کہا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔ اعشیٰ ان کا جواب سن کر بہت مایوس ہوا۔ حضرت نعمانؓ کو اس پر رحم آ گیا کچھ دیر سوچ کر کہا "ہنہ" پھر لوگوں کو جمع کیا اور بیس ہزار کے مجمع کے سامنے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:

"لوگو! اعشیٰ ہمدانی تمھارے پاس آئے ہیں وہ تمھارے ابنِ عم ہیں۔ مسلمان ہیں اور اعلیٰ حسب ونسب رکھتے ہیں۔ گردشِ زمانہ نے ان کو روپیہ کا محتاج کر دیا ہے۔ اب تمھاری کیا رائے ہے۔"

تمام حاضرین نے بیک زبان کہا "آپ جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کریں گے۔"

حضرت نعمانؓ نے فرمایا ''نہیں میں تمھیں اس معاملہ میں کوئی حکم نہیں دوں گا۔تم خود ہی ان کی مدد کی کوئی صورت نکالو۔''

لوگوں نے کہا'' آپ فی کس ایک دینار مقرر کر دیں۔''

انھوں نے فرمایا ''نہیں دو شخص مل کر ایک دینار دیں۔''

سب نے کہا'' بہ سروچشم۔''

اس پر انھوں نے فرمایا کہ اس وقت میں اعشیٰ کو سرکاری خزانہ سے (حساب کر کے) رقم دے دیتا ہوں، جب تنخواہ کا روپیہ برآمد ہوگا تو رقم وضع کر دی جائے گی۔ چناں چہ انھوں نے اعشیٰ کو دس ہزار دینار دیئے تو وہ سراپا شکر و سپاس بن گیا۔اس موقع پر اس نے یہ اشعار کہے۔

فلم ار للحاجات انکما شھا ۔۔۔ کنعمان اعنی ذو الندی ابن بشیر

اذا قال اوفی بالمقال ولم یکن ۔۔۔ کمدل الا الاقوال حبل غرور

فلولا اخو الانصار کنت کنازل ۔۔۔ ثوی لم ینقلب بنقیر

متی اکفر النعمان لم اک شاکرا ۔۔۔ ولا خیر فیمن لم یکن بشکور

یعنی ــــ حاجتوں کے پیش آنے کے وقت میں نے سخی نعمان بن بشیر کی طرح کسی کو نہیں دیکھا۔

جب وہ کچھ کہتے ہیں تو اس کو ایفا کرتے ہیں اس شخص کی طرح نہیں جو لوگوں کی طرف دھوکے کی رسی لٹکاتے ہیں۔

اگر یہ انصاری نہ ہوتے تو میں اس شخص کی طرح ہوتا جو کہیں اتر کر ٹھہرے اور کچھ لے کر نہ لوٹے۔

جب میں نعمانؓ کا کفران کروں تو مجھ میں احسان مندی کا مادہ نہیں کہ جو شکر گزار نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

(۶)

علم و فضل کے اعتبار سے حضرت نعمان بن بشیرؓ نہایت بلند مقام پر فائز تھے یہ درست ہے کہ وہ عہدِ رسالت میں کم عمر تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے علم کا شوق ان کی جبلت میں ودیعت کیا تھا اور ساتھ ہی نہایت قوی حافظہ کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔وہ جو کچھ لسانِ رسالت ﷺ سے سنتے تھے اس کو

۳) ''ایک دن رسول اللہ ﷺ جلدی جلدی مسجد میں تشریف لائے۔ اس وقت آفتاب کو گہن لگ چکا تھا۔ آپؐ نے اتنی دیر تک نماز پڑھی کہ آفتاب صاف ہوگیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ جب چاند اور سورج کو گہن لگتا ہے تو کسی ایسے شخص کی موت پر لگتا ہے جو اس وقت زمین پر سب سے بڑی ہستی ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کو (سورج اور چاند کو) کسی کی موت کی وجہ سے گہن لگتا ہے نہ پیدائش کی وجہ سے۔ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوق ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی تبدیلی اپنی مخلوق میں پیدا کر دیتا ہے۔ لٰہذا جب کسی کو گہن لگا کرے تو نمازیں پڑھا کرو تا آں کہ گہن چھوٹ جائے یا اللہ تعالیٰ کوئی دوسرا کرشمہ دکھلائے۔'' (نسائی)

۴) ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپؐ (اپنے ایک خطاب میں) فرماتے تھے، میں نے تمھیں آتشِ دوزخ سے خبردار کر دیا ہے، میں نے تمھیں دوزخ کے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے۔ آپؐ یہ بات اتنی بلند آواز سے فرما رہے تھے کہ اگر آپؐ اس جگہ ہوتے جہاں اس وقت میں ہوں (اور یہاں سے فرماتے) تو بازار والے بھی آپؐ کے اس ارشاد کو سن لیتے اور (اس وقت آپؐ پر جو خاص کیفیت طاری تھی) یہاں تک کہ آپ کی کمبلی جو اس وقت آپؐ اوڑھے ہوئے تھے آپؐ کے قدموں کے پاس آ گری۔''

(مسند دارمی)

۵) ''رسول اللہ ﷺ ہماری صفوں کو اس قدر سیدھا اور برابر کراتے تھے جیسے تیروں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔ ایک دن آپؐ باہر تشریف لائے اور نماز پڑھانے کے لیے اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے۔ قریب تھا کہ آپ تکبیر کہہ کر نماز شروع کر دیں کہ آپؐ کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جس کا سینہ صف سے کچھ آگے نکلا ہوا تھا تو آپؐ نے فرمایا، اللہ کے بندو، اپنی صفوں کو سیدھا اور بالکل برابر کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے رخ ایک دوسرے کے مخالف کر دے گا۔'' (صحیح مسلم)

حضرت یامین بن عمیرؓ

①

یہودِ مدینہ، اوس اور خزرج کے لوگوں کو اکثر نبیِ آخرالزماںؐ کے ظہور کی خبر دیتے رہتے تھے لیکن ان لوگوں کی حرماں نصیبی دیکھئے کہ جب نبیِ آخرالزماں ﷺ نے مدینہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو انھوں نے آپؐ پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا اور صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ آپؐ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگے۔ لیکن ان کج فطرت لوگوں میں کچھ سعید الفطرت لوگ بھی موجود تھے۔ اُن کو اپنی قوم کی روش پسند نہ آئی اور انھوں نے اپنی قسمت دل و جان سے اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ کر دی۔ ایسے ہی نیک فطرت لوگوں میں ایک صاحب یامین بن عمیرؓ بھی تھے۔ ان کا تعلق یہودِ بنی نضیر سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

یامینؓ بن عمیر بن کعب بن عمرو بن حجاش۔

بعض روایتوں میں ان کے والد کا نام بھی یامین آیا ہے۔ اور ان کا ذکر ''ابن یامین'' کے نام سے کیا گیا ہے۔

بنونضیر نے حضرت یامینؓ کو راہِ راست سے بھٹکانے کے لیے ترغیب وتخویف کے تمام حربوں سے کام لیا لیکن ان کے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی اور سرورِ عالم ﷺ سے ان کی عقیدت اور محبت میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا گیا۔

②

ایک دفعہ بنونضیر کے ایک شریرالنفس شخص عمرو بن حجاش نے یہ منصوبہ بنایا کہ سرورِ عالم ﷺ

کو ایک مکان کے نیچے بلایا جائے اور اوپر سے کوئی وزنی چیز گرا کر آپؐ کو شہید کر دیا جائے۔ حضورؐ کو اس منصوبے کا علم ہو گیا اور یوں اس کی سازش ناکام ہو گئی تاہم آپؐ نے عمرو بن حجاش کی اس ناپاک حرکت کو بہت محسوس کیا۔ یہ شخص حضرت یامین بن عمیرؓ کا چچازاد بھائی تھا۔ حضرت یامینؓ کے قبولِ اسلام کے بعد ایک دن حضورؐ نے ان سے فرمایا:

''یامین، تم نے اپنے بھائی کی حرکت دیکھی؟ وہ مجھے دھوکے سے بلا کر قتل کرنا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے جبریلِ امین کے ذریعے مجھے اس کے عزمِ بد سے آگاہ کر دیا۔''

حضرت یامینؓ حضورؐ کا ارشاد سن کر جوشِ غضب سے بے قرار ہو گئے۔ اسی وقت اٹھے اور عمرو بن حجاش کی تاک میں رہنے لگے۔ ایک دن موقع مل گیا اور جھپٹ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ یوں وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا اور حضرت یامینؓ نے اطمینان کا سانس لیا۔

(۳)

۹ ہجری میں غزوۂ تبوک (جیشِ عسرۃ) پیش آیا۔ اس سال شدید خشک سالی تھی اس لیے بعض مسلمانوں کو سامانِ جنگ اور زادِ راہ فراہم کرنے میں بہت دشواری پیش آئی۔ چند نادار صحابہؓ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور سامانِ سفر کی درخواست کی۔ اس وقت انھیں کچھ دینے کے لیے کوئی شے نہ تھی اس لیے آپؐ نے معذوری ظاہر فرمائی۔ یہ لوگ بڑے پکّے اور مخلص مسلمان تھے اور ہر قیمت پر اپنے آقا و مولاؐ کے ہم رکاب ہو کر جہاد میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن سفر بڑا طویل اور پُرصعوبت تھا اور سواریوں یا زادِ راہ کے بغیر اس کا طے کرنا ممکن نہ تھا۔ جب ان چیزوں کی کوئی صورت نہ نکل سکی تو وہ اپنی محرومی پر مایوس ہو کر رونے لگے۔ قرآنِ حکیم میں ان کی مایوسی اور غم واندوہ کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ (توبہ:۹۲)

''اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر الزام ہے کہ تمھارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس پر تم کو سوار کروں تو وہ لوٹ گئے

اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''

ان نادار صحابہؓ میں حضرت عبداللہؓ بن مغفّل مزنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن کعبؓ بھی شامل تھے۔ اتفاق سے حضرت یامین بن عمیرؓ نے انھیں روتے دیکھ لیا۔ رونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے سامانِ سفر مانگا تھا لیکن نہیں ملا اور ہم میں اتنی مقدرت نہیں کہ اپنے پاس سے سامان فراہم کریں۔ حضرت یامینؓ نے انھیں تسلّی دی اور پھر دو سواریاں اور کچھ زادِ راہ پیش کیا۔ یہ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے۔ ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق حضرت یامینؓ نے ان کو ایک اونٹ اور تھوڑی سی کھجوریں پیش کیں۔ اس مختصر سامان کے ساتھ وہ دونوں غزوۂ تبوک میں شریک ہوئے۔

حضرت یامین بن عمیرؓ کے مزید حالات کتبِ سیَر میں نہیں ملتے یہاں تک کہ ان کا سالِ وفات بھی معلوم نہیں ہے۔

حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں حضرت یامین بن عمیرؓ کے بارے میں لکھا ہے: ''وَ هُوَ مِنَ الْكِبَارِ الصَّحَابة'' (ان کا شمار کبار صحابہ میں تھا)۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کتابیات

اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے براہِ راست یا بالواسطہ خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱- کتاب اللہ ——— قرآن پاک

۲- صحیح بخاری

۳- صحیح مسلم

۴- مسندِ ابوداؤد

۵- مسندِ احمد بن حنبل

۶- جامع ترمذی

۷- مستدرکِ حاکم

۸- مشکوٰۃ

۹- طبقات ابنِ سعدؒ

۱۰- تاریخ الامم والملوک ——— ابنِ جریر طبریؒ

۱۱- الاصابہ فی تمییز الصحابہ ——— حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ

۱۲- تہذیب التہذیب ——— حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ

۱۳- الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب - حافظ ابنِ عبدالبر اندلسیؒ

۱۴- السیرۃ النبویہ ——— ابنِ ہشامؒ

۱۵- زادالمعاد ——— حافظ ابنِ قیمؒ

۱۶- اسد الغابہ ـــــ ابنِ اثیرؒ
۱۷- الکامل فی التاریخ ـــــ ابنِ اثیرؒ
۱۸- البدایہ والنہایہ ـــــ حافظ ابنِ کثیرؒ
۱۹- فتوح البلدان ـــــ بلاذُری
۲۰- الاخبار الطّوال ـــــ ابوحنیفہ دینوری (اردو ترجمہ پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب)
۲۱- ترجمان السنہ ـــــ مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ
۲۲- معارف الحدیث ـــــ مولانا محمد منظور نعمانیؒ
۲۳- خالد سیف اللہ ـــــ ابوزید شلبی
۲۴- الفاروق ـــــ شبلی نعمانیؒ
۲۵- تاریخِ اسلام ـــــ شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم
۲۶- تاریخِ اسلام ـــــ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم
۲۷- سِیَر الصحابہؓ ـــــ (مختلف جلدیں) ـــــ شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم
۲۸- سِیَر انصارؓ ـــــ (جلد اوّل و دوم) ـــــ مولوی سعید انصاری مرحوم
۲۹- سِیَر الصحابہؓ ـــــ (جلد اوّل و دوم) ـــــ مولوی سعید انصاری مرحوم
۳۰- اہلِ کتاب صحابہؓ و تابعین ـــــ حافظ مجیب اللہ ندوی
۳۱- تاریخِ ملت ـــــ قاضی زین العابدین میرٹھی
۳۲- حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ـــــ خورشید احمد فارق
۳۳- المشاہد ـــــ حکیم رحمان علی خان مرحوم
۳۴- دائرۂ معارفِ اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) پنجاب یونیورسٹی۔ مختلف جلدیں۔
۳۵- حیاۃ الصحابہؓ ـــــ مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ